بابتہ ماہ

ہماری دعوت

ماہوار الفرقان

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

چندہ (دیگر ممالک سے) سالانہ ۱۲ شلنگ
اعزازی چندہ سالانہ ۱۵/-/-

چندہ (پاکستان سے) ...... ۶/-/- ...... ۳/-/- ...... -/۱۲/-

بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۳ھ مطابق جون ۱۹۶۳ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو

کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا ــــ پاکستان کے خریدار:- اپنا [illegible] ری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

[illegible]داری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب [illegible] ے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔

اعلان ﴿جولائی اور اگست کا الفرقان یکم اگست کو ایک ساتھ نکلے گا۔ ناظرین جولائی میں انتظار نہ فرمائیں۔﴾

الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

[illegible] پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

۳۱
افتتاح جلد سی و یکم

بسم اللہ الذی بعزتہٖ و جلالہ تتم الصالحات اللھم منک و لک۔

گزشتہ ذی الحجہ کے اختتام کے ساتھ دین کے اس خادم "الفرقان" کی عمر کے تیس سال پورے ہو کر اکتیسواں سال شروع ہو گیا۔ اب یہ شمارہ اکتیسویں جلد کا پہلا شمارہ ہے۔

اب ٹھیک ۳۰ سال پہلے جب اس وادی میں قدم رکھا تھا اور یہ سفر بنام خدا شروع کیا تھا تو بظاہر اسباب ۳ مہینے تک بھی اس کے جاری رہنے کا اطمینان نہیں کیا جا سکتا تھا، بس رب کریم کے فضل و کرم کی امید ہی اپنا سہارا اور تمام تر سرمایہ تھا ـــــ کس زبان سے اس کریم کارساز کا شکر ادا ہو جس کی بارگاہ کرم سے بغیر کسی ادنیٰ استحقاق کے اتنی مدت تک اس غریب اور بے نوا مسافر کو توشہ اور سامانِ حیات عطا ہوتا رہا اور اپنی ناقص فہم و فکر کے مطابق خدمت دین اور اظہارِ حق کی توفیق ملتی رہی، آئندہ کے لیے بھی اس سے یہی امید ہے۔

اندازہ ہے کہ الفرقان کی گزشتہ تیس جلدوں کے صفحات تیس ہزار سے اوپر ہی ہوں گے، دعا اور التجا ہے کہ ان میں جو کچھ حق کہا اور لکھا گیا ہے رب کریم اس کو قبول فرما کر ہمارے صحیفۂ اعمال میں ثبت فرما دے اور اس کے اثر اور نفع کو رہتی دنیا تک جاری رکھے۔ اور جہاں جہاں اپنی نادانی اور جہالت سے نادانستہ، یا نفس کی طغیانی اور شرارت سے دانستہ غلطیاں ہوئیں اُن کو معاف فرما دے اور بخش دے اور اپنی خاص قدرت سے اس طرح ان کو مٹا دے کہ نہ صحیفۂ اعمال میں ان کا کوئی نشان رہے اور نہ کسی بندے کے لیے وہ غلط روی اور گمراہی کا ذریعہ بنیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم، وتب علینا وارحمنا انک انت التواب الرحیم۔

ـــــــ ادارہ الفرقان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

ـــــــــ از محمد منظور نعمانی

اینکہ مے بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

الفرقان کے ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے اس افسوسناک اور المناک قضیہ کا علم ہو چکا ہوگا جو حضرت رائے پوری قدس سرہ کی نعش مبارک کی منتقلی کے بارے میں اٹھا ہوا ہے اور جو ہماری بدقسمتی سے صرف حضرت کے سلسلہ ہی کے لیے نہیں بلکہ نفس تصوّف اور سلوک کے لیے بھی باعث رسوائی ہو رہا ہے۔

حضرت کے وصال سے ۵-۶ مہینے بعد اور اب سے کوئی ۵ ہی مہینے پہلے گزشتہ شعبان میں یہ عاجز سہارنپور گیا ہوا تھا، وہاں ان دنوں حضرت کے حقیقی بھتیجے اور خادمِ خاص مولانا عبدالجلیل صاحب بھی آئے ہوئے تھے (جو حضرت کے جنازہ کو لاہور سے حضرت کے آبائی وطن لے جا کر دفن کرنے کے اصل ذمہ دار بتلائے جاتے ہیں) ان کے اور میرے ایک خاص دوست نے تنہائی میں مجھ سے کہا کہ مولانا عبدالجلیل صاحب نے ان کو بتایا ہے کہ حضرت کے خدام اور متوسلین میں سے فلاں فلاں صاحبوں نے حکومت ہند کے ذریعہ حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرایا ہے کہ حضرت چونکہ قانونی طور پر ہندوستانی شہری تھے اور یہاں کے پاسپورٹ پر پاکستان گئے تھے اس لیے ان کی نعش کو ہندوستان واپس کیا جائے ـــــ میں چونکہ اپنی ناواقفی کی وجہ سے اس وقت تک یہ سمجھتا تھا کہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے اور کوئی حکومت کسی کے کہنے سننے سے ایسا احمقانہ مطالبہ نہیں کر سکتی اس لیے میرے دل نے اس بات کو بالکل قبول نہیں کیا۔ اور میں نے سمجھا کہ کسی نے بالکل بے اصل یہ لغویات اڑائی ہے۔ جیسے مولانا عبدالجلیل صاحب نے اُس بے اعتمادی اور بدگمانی کی بنا پر جو تدفین کے مسئلہ کی وجہ سے ان کے اور حضرت کے بعض دوسرے خدام و متوسلین کے درمیان پیدا ہو چکی ہے حقیقت سمجھ کر باور کر لیا ہے، یا جان بوجھ کر یہ افسانہ تراشا گیا ہے۔ بہرحال میرا خیال یہی رہا اور اس وقت میرے دل میں اگر کچھ بدگمانی پیدا ہوئی تو مولانا عبدالجلیل صاحب ہی کے بارے میں پیدا ہوئی کہ انھوں نے ایسی لغو بات کیوں ہم تک پہونچائی۔

یہاں تک کہ اواخر رمضان اور شروع شوال میں بعض ایسے واقعات سامنے آئے جنھوں نے یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ یہ نہ بے اصل افواہ ہے نہ کسی کا تراشا ہوا "افسانہ" بلکہ "حقیقت" ہے اور واقعۃً حضرت قدس سرہ کے حلقہ ہی کے کچھ حضرات نے حکومت ہند سے یہ مطالبہ کرایا ہے ـــــ اس کے بعد یہ باتیں

اخبارات میں بھی آنے لگیں اور اس کے خلاف ایک اخباری بیان ناچیز کو بھی دینا پڑا جو "ندائے ملت" کے شروع اپریل کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا اس کے بعد میں حجاز مقدس چلا گیا ——— اس پورے سفر کی مختلف منزلوں میں جتنے بھی ایسے حضرات ملے جن کو اس قضیہ کا کچھ علم تھا خواہ وہ ہندوستان کے ہوں، یا پاکستان کے ان سب کو سخت متعجب یا اس تحریک سے انتہائی بیزار اور برافروختہ پایا ——— اب یہاں واپس آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ معاملہ نے نہایت ہی گھنونی شکل اختیار کر لی ہے اور بعض اخبارات میں خوف خدا اور فکر آخرت سے بے پروا ہو کر بالکل الکشنی انداز سے یہ مہم چلائی جا رہی ہے۔

جن لوگوں نے شریعت و شرافت کے اصول اور تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ تحریک چلانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے اُن سے تو کچھ کہنا نہیں لیکن حضرت قدس سرہٗ سے تعلق رکھنے والے جو مخلص حضرات واقعۃً حضرت محبت کے جوش میں اس راہ پر چل رہے ہیں اُن کی خدمت میں اخلاص کے ساتھ صرف دو تین باتیں عرض کرنی ہیں۔

(۱) ایک مسلمان کی حیثیت سے سب سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے کہ اتنی مدت کے بعد کسی کی نعش اکھاڑ کر ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کی جائے؟

میرا تو خیال ہے کہ اللہ کے جس بندہ کی فطرت سلیم ہو اور اس نے شریعت کے مزاج اور اس کی روح کو کچھ بھی سمجھا ہو چاہے کتب فقہ و فتاوی پر اس کی نظر بالکل نہ ہو اس کو ہرگز اس میں شک و تردد نہ ہوگا کہ کسی انتہائی مجبوری کے بغیر شریعت اسلامی اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی ——— لیکن ہم لوگوں کے لیے مسائل میں فیصلہ کن چیز کتب فقہ و فتاوی کی تصریحات ہیں، چنانچہ اس بارہ میں ایک مفصل فتویٰ جس کی تائید و تصدیق ہندوستان و پاکستان کے قریب قریب تمام ہی اکابر و مشاہیر علماء و اصحاب فتویٰ نے کی ہے الفرقان کی اسی اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے ——— اس فتوے میں زیر بحث قضیہ کے اس پہلو کو بھی صاف کر دیا گیا ہے کہ تدفین اگرچہ متوارث اور مسنون طریقہ کے خلاف ہوئی لیکن شرعاً تدفین متحقق ہو گئی ——— ہمارے نزدیک کتب فقہ و فتاوی کی ان تصریحات اور ہندوستان و پاکستان کے اکابر و مشاہیر علماء و اہل فتویٰ کے اس فیصلہ کے سامنے آجانے کے بعد فقہی اور شرعی حیثیت سے اس بحث و نزاع کے جاری رہنے کا کوئی جواز اور اس کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

(۲) ایک دوسرا افسوسناک اور باعث تشویش پہلو اس قضیہ کا یہ ہے کہ جن حضرات نے یہ تحریک اٹھائی ہے خواہ ان کی نیت کتنی ہی نیک ہو اور اپنے اس اقدام میں وہ کتنے ہی مخلص ہوں لیکن ان کے اس اقدام سے ایک بڑے فتنہ کا دروازہ کھل گیا ہے۔ یہ حضرات تو جو کچھ کر رہے ہیں جوش محبت میں کر رہے ہوں گے۔ لیکن فرض کیجیے ہندوستان کے رہنے والے اللہ کے کسی بندہ کا پاکستان میں یا مکہ معظمہ یا مدینہ طیبہ میں انتقال ہو جاتا ہے، اب اگر اس کا کوئی بدخواہ اور کینہ پرور دشمن یہاں کے کسی وزیر یا کسی بڑے لیڈر سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے لیے اب

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— از نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب ۳ ۔ فتح خاں افغان کے نام ——— (نصائح)

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ——— مکتوب شریف جو فقراء سے کمالِ محبت واخلاص کا پتہ دے رہا تھا پہونچا ——— حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ اس محبت پر استقامت بخشے ——— نصیحت جو سعادت مند دوستوں کو کرنی ہے وہ اتباع سنتِ نبویہ اور اجتناب از بدعت نامرضیہ کی نصیحت ہے ——— جو شخص کسی ایسی سنت کو زندہ کرتا ہے جو متروک العمل ہو چکی ہو اس کے لیے سو شہیدوں کا ثواب ہے ——— پس کیا ٹھکانہ ہے اس شخص کے ثواب کا جو فرائض میں سے کسی فرض کو اور واجبات میں سے کسی واجب کو زندہ کرے ——— پس نماز میں تعدیلِ ارکان جو کہ اکثر علماء حنفیہ کے نزدیک واجب اور امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک فرض اور بعض علماء حنفیہ کے نزدیک سنت ہے ——— یہ تعدیلِ ارکان کا عمل اکثر لوگوں سے ترک ہو رہا ہے، اس عمل کا زندہ کرنا بھی سو شہیدوں کے ثواب سے زیادہ ہوگا ——— اسی پر قیاس کر لیا جائے تمام احکامِ شرعیہ کو کہ وہ حلال و حرام اور مکروہ

غیر مکروہ سے متعلق ہیں ـــــ علماء نے فرمایا ہے کہ تین رتی چاندی کا واپس کرنا اس شخص کو جس سے ظلم کے ساتھ بغیر وجہ شرعی یہ چاندی حاصل کی گئی ہے دو سو درہم خیرات کرنے سے بہتر ہے ـــــ علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگرچہ کوئی شخص عمل صالح سنت کے مطابق ہی رکھتا ہو لیکن اس پر تین رتی کسی کا حق رہ گیا ہو، وہ شخص جب تک اُن تین رتی کو ادا نہ کرلے گا (اول وہلے میں) اس کو بہشت میں داخل نہ کیا جائے گا۔

ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ اپنے ظاہر کو احکام شرعیہ سے آراستہ کرکے متوجہ باطن رہنا چاہیے تاکہ غفلت کے ساتھ آلودگی نہ ہو ـــــ (دیگر) بغیر امداد باطن کے احکام شرعیہ سے آراستہ ہونا مشکل ہے ـــــ علماء فتویٰ دیتے ہیں (اور اس پر پورے طریقے سے) عمل درآمد اہل اللہ کرتے ہیں ـــــ باطن کے اہتمام کے ساتھ ساتھ لازم ہے کہ ظاہر کا اہتمام بھی ہو، جو شخص (صرف) باطن میں مشغول ہو اور ظاہر کے درست کرنے سے باز رہے وہ ملحد ہے۔ اس کے احوال باطن استدراج کی حیثیت رکھتے ہیں حال باطن کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ ظاہر احکام شرعیہ سے آراستہ ہو ـــــ طریق استقامت یہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے ـــــ

مکتوب (۸۸)۔ مُلّا بدیع الدین کے نام۔ (رضا بقضا کے بیان میں)

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ بندۂ مقبول وہ ہے کہ اپنے مولائے حقیقی کے فعل پر راضی ہو اور جو شخص اپنی مرضی کا تابع ہے وہ بندۂ نفس ہے ـــــ اگر مولیٰ اپنے بندے کے گلے پر چھری بھی چلا دے تب بھی اسے کو شاداں و خنداں ہونا اور اس فعل مولیٰ کو اپنا پسندیدہ فعل محسوس کرنا بلکہ اس سے لذت یاب ہونا چاہیے اور اگر عیاذاً باللہ اس کو اس فعل سے کراہت ہوتی ہے اور اس کا سینہ تنگ ہوتا ہے تو وہ دائرۂ بندگی سے دور اور قرب مولیٰ سے راندہ و مہجور ہے ـــــ طاعون جب کہ مولائے حقیقی کی مراد ہے چاہیے کہ اس کو اپنی مراد جان کر خوش و خرم ہوں، غلبۂ طاعون سے پیشانی پر بل نہ ڈالیں اور دل تنگ نہ ہوں۔

بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ فعل محبوب ہے اس سے لذت یاب ہوں ـــــ ہر کسی کے لیے موت کا ایک وقت مقرر ہے اس میں کمی و بیشی کا کوئی احتمال نہیں ہے، پس پریشانی کس بات کی ہے؟ ـــــ زیادہ سے زیادہ یہ ہو کہ (دعائیں کرکے) بلاؤں سے عافیت و امان طلب کریں اور اللہ کے غصے سے پناہ ڈھونڈھیں ـــــ بندے کی دعا اور سوال اللہ تعالیٰ کو پسند ہے ـــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو تاکہ میں اس کو قبول کروں ـــــ مولانا عبدالرشید نے آکر تمھارے علاقے کے حالات بیان کیے ـــــ اللہ تعالیٰ تم سب کو بلیات ظاہرہ و باطنہ سے محفوظ رکھے ـــــ

مکتوب (۸۹) - سیادت پناہ میر محب اللہ کے نام ـــــ (نصیحت)

الحمد للہ ـــــ اللہ ہم کو اور تم کو تمھارے آبائے کرام کے راستے پر ثابت قدم رکھے۔ صدقے میں اپنے حبیب سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے ـــــ اس طرف کے فقراء کے احوال و اوضاع، لائق حمد ہیں ـــــ اللہ ہی کے لیے تعریف و شکر ثابت ہے دائم اور اللہ کے نبی پر صلوٰۃ و سلام لازم ہے ہمیشہ ـــــ اللہ تعالیٰ سے تمھاری سلامتی، عافیت اور ثابت قدمی مطلوب ہے۔

مخدوما، مکرما، شفقت آثارا! ـــــ کام کا وقت نکلا جارہا ہے اور جو سکنڈ گزر رہا ہے وہ عمر کا ایک حصہ کم اور موت کا وقت قریب کرتا جاتا ہے ـــــ آج آگاہ نہ ہوئے تو کل بروز قیامت بجز حسرت و ندامت اور کچھ حاصل نہ ہوگا ـــــ کوشش کی جائے کہ اس چند روزہ زندگی میں شریعت مطہرہ کے موافق زندگانی بسر ہو جائے تاکہ نجات کی شکل پیدا ہو ـــــ یہ وقت عمل کا وقت ہے۔ عیش و عشرت کا وقت تو آگے آنے والا ہے جو کہ اس وقت کے عمل کا ثمرہ ہوگا ـــــ عمل کے وقت عیش کرنا اپنی زراعت کو بغیر پکے کھانا اور اس کے ثمرات سے محروم رہنا ہے ـــــ زیادہ کیا لکھوں ـــــ خدا کرے کہ دولت صوری و معنوی حاصل ہو ـــــ

تشریح فرمائی ہے۔ اگر کوئی میری بات کا یقین نہ کرے اس کتاب کا مطالعہ کرے اس میں کرامات و خوارق کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ تمام کرامات و خوارق، اللہ تعالیٰ کی بخشش ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ دولت کشف و کرامت عطا کرتے ہیں اور ایک وہ شخص جو ان سے مرتبے میں بلند ہوتا ہے اس کو کرامات میں سے کچھ بھی عطا نہیں کرتے —— یہ کرامات (محض) تقویت یقین کے لیے عطا فرماتے ہیں۔ جس کسی کو یقین کامل عطا فرمایا گیا ہے اس کو ان کرامات کی حاجت نہیں ہوتی، یہ تمام کرامات، ذکرِ ذات سے کم درجہ ہیں..."

خواجہ عبداللہ انصاریؒ جو شیخ الاسلام کے لقب سے ملقّب ہیں کتاب منازل السائرین میں فرماتے ہیں۔ "فراست دو قسم کی ہے (۱) فراستِ اہلِ معرفت (۲) فراست اہلِ جوع و ریاضت۔ فراست اہلِ معرفت کا تعلق طالبین کی استعداد معلوم کرنے اور اولیائے واصلین کی شناخت کرنے سے ہے اور ریاضت کرنے والے اور ریاضت کے سلسلے میں بھوکا رہنے والوں کی فراست کا تعلق کشفِ صور اور کشفِ احوالِ مغیبات مخلوقات سے ہے۔ چونکہ اکثر انسان جناب قدس سے بے تعلق اور دنیا میں مشغول و منہمک ہیں اس لیے ان کے دل بھی کشف صور اور مغیبات مخلوقات کی خبر دینے کی طرف مائل ہیں۔ ان عوام کے نزدیک یہ خوارق ہی بہت بڑا کمال ہیں۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ خوارق والے بڑے اہل اللہ ہیں اور اللہ کے خاص بندے ہیں۔ عوام، اہلِ حقیقت کے کشف سے اعراض کرتے ہیں اور اہلِ حقیقت بالہام خداوندی جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اہل حق ہوتے جیسا کہ یہ گمان کرتے ہیں تو ضرور ہمارے اور تمام مخلوقات کے احوال غیبی کی خبر دیتے ہیں —— اور جب ان کو ہمارے احوال کے کشف پر قدرت نہیں تو پھر کس طرح ان امور کے کشف پر قادر ہوں گے جو احوالِ مخلوقات سے اعلیٰ ہیں —— یہ لوگ فراست اہلِ معرفت کو جھٹلاتے ہیں جس کا تعلق ذات و صفت خداوندی اور افعال واجبی جل سلطانہٗ سے ہے، اپنے قیاس فاسد کی وجہ سے یہ لوگ اہلِ حقیقت کے علوم و معارف صحیحہ سے محروم رہے اور انھوں نے یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ

مکتوب (۹۲) - سیادت مآب میر محمد نعمان اکبر آبادی کے نام

ولایت، قرب الٰہی کو کہتے ہیں، خوارق و کرامات ولایت کیلئے شرط نہیں، نیز سجدۂ تعظیمی کا بیان

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ——— سیادت مآب برادرم میر محمد نعمان خوش وقت رہیں اور جانیں کہ ظہور خوارق وکرامات، شرطِ ولایت نہیں ہے ——— جس طرح علمار حصولِ خوارق وکرامات کے مکلف نہیں اولیار بھی ظہور خوارق کے مکلف نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ولایت مراد ہے قربِ الٰہی سے اور اللہ تعالیٰ اپنا قرب اپنے اولیار کو اس وقت عنایت فرماتا ہے جب وہ غیر حق کو فراموش کر دیتے ہیں ——— ایک شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا قرب عطا فرماتے ہیں لیکن احوال غائب پر اسکو مطلع نہیں فرماتے۔ ایک دوسرا شخص ہے کہ اس کو اپنا قرب بھی عطا فرماتے ہیں اور اطلاع مغیبات بھی بخشتے ہیں اور ایک تیسرا شخص ہے کہ اس کو قرب کی دولت نہیں دیتے اور مغیبات پر اطلاع دے دیتے ہیں ——— یہ تیسرا شخص اہلِ استدراج سے ہے نفس کی صفائی نے اس کو کشفِ مغیبات میں گرفتار کر دیا اور گمراہی میں ڈال دیا ہے ——— قرآن مجید کی یہ آیت شریفہ اس قسم کے لوگوں کی خبر دے رہی ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ ——— "یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ کسی چیز پر ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یہ لوگ کاذب ہیں ان پر شیطان مسلط ہو گیا ہے پس اس نے ان کے دلوں سے اللہ کے ذکر کو بھلا دیا ہے۔ یہ لوگ لشکرِ شیطان ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ لشکرِ شیطان زیاں کار ہے۔"

——— پہلا اور دوسرا شخص جو دولت قرب سے مشرف ہے اولیار اللہ سے ہے ——— کشف مغیبات کا ہونا نہ ہونا ان دونوں کے اندر کوئی زیادتی و نقصان پیدا نہیں کرتا۔ البتہ درجات قرب کے اعتبار سے ان میں فرق ہوتا ہے ——— بسا اوقات وہ شخص جس کو کشف نہیں صاحب کشف سے افضل اور پیش قدم ہوتا ہے۔ اس قرب کی زیادتی کی وجہ سے جو اس کو حاصل ہوتی ہے ——— صاحب عوارف حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے جو کہ شیخ الشیوخ اور مقبول جمیع صوفیار ہیں اپنی کتاب عوارف المعارف میں اس بات کی

نے ان بزرگوں کو مخلوق کی طرف نظر جانے سے محفوظ رکھا ہے، اپنی جناب قدس کے ساتھ ہی ان کو مخصوص فرما دیا اور اپنے ماسوا سے ہٹا دیا ہے۔ محض اپنی اس حمایت و غیرت کی وجہ سے جو ان کی طرف متوجہ ہے ـــــ اگر اہل حقیقت احوالِ مخلوق کے درپے ہو جاتے تو جناب قدس میں حضوری کی لیاقت ان میں نہ رہتی" ـــــ شیخ الاسلام ہروی نے اس قسم کی باتیں اور بھی ارشاد فرمائی ہیں ـــــ میں نے اپنے خواجہ (حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ) سے سنا ہے فرماتے تھے کہ شیخ محی الدین ابن العربی نے لکھا ہے کہ "بعضے اولیاء کرام جن سے کرامات و خوارق بہت کچھ ظاہر ہوئے۔ آخر وقت میں اس ظہورِ کرامات سے نادم و شرمندہ تھے اور تمنا کرتے تھے کہ کاش یہ تمام خوارق و کرامات ہم سے ظاہر نہ ہوتے"۔ اگر کثرت ظہورِ خوارق کے اعتبار سے فضیلت ہوا کرتی تو اس شرمندگی کے کیا معنی؟ (جو بعض اولیاء کو ظہورِ کرامات پر آخر وقت میں ہوئی) ـــــ رہا یہ سوال کہ جب ظہورِ خوارق، ولایت میں شرط نہیں تو پھر ولی، غیر ولی میں کیونکر امتیاز ہو؟ اور اہلِ حق کی اہلِ باطل سے کس طرح تمیز ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چاہے امتیاز نہ ہو اور اہلِ حق و اہلِ باطل باہم مختلط نظر آیا کریں۔ حق و باطل کا اختلاط تو (ظاہری نظروں میں) اس دنیا میں لازمی ہے ـــــ ولی کو خود اپنی ولایت کا علم ہونا ضروری نہیں ہے ـــــ بہت سے اولیاء اللہ ہیں کہ وہ اپنی ولایت کی اطلاع نہیں رکھتے پھر دوسروں کو ان کی ولایت سے واقف ہونا کس طرح ضروری ہو؟۔ البتہ نبی میں معجزات کے بغیر چارہ کار نہیں تاکہ نبی اور غیر نبی کا امتیاز ہو، اس لیے کہ نبوتِ نبی کا جاننا ضروری ہے ـــــ ولی چونکہ اپنے نبی کی شریعت کی دعوت دیتا ہے اس لیے بس معجزۂ نبی اس کے لیے کافی ہے ـــــ اگر ولی اپنے نبی کی شریعت کے علاوہ کسی اور بات کی دعوت دیتا ہوتا تو اس وقت خارقِ عادات کے بغیر کام نہ چلتا۔ مگر چونکہ اس کی دعوت شریعتِ نبی کے ساتھ مخصوص ہے اس لیے اس کو خارقِ عادات کی چنداں ضرورت نہیں ـــــ علماء ظاہر شریعت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اولیاء ظاہر شریعت کی طرف بھی دعوت دیتے ہیں اور باطن شریعت کی طرف بھی ـــــ وہ اول مریدوں اور حق کے طالبوں کو توبہ اور رجوع الی اللہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور احکامِ شرعیہ کی

ادائیگی کی ترغیب دیتے ہیں پھر ذکر حق کا راستہ بتلاتے ہیں اور تاکید فرماتے ہیں کہ اپنے تمام اوقات کو ذکر الہیٰ میں مستغرق رکھیں حتیٰ کہ ذکر خدا غالب آجائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کو دل میں نہ چھوڑے۔ یہاں تک کہ تمام ماسوا سے ایسا نسیان حاصل ہو جائے کہ اگر تکلف سے بھی اشیاء کو یاد کرے تو وہ اس کو یاد نہ آئیں۔ یقینی بات ہے کہ ولی کو اس دعوت کے واسطے جس کا تعلق ظاہر شریعت اور باطن شریعت سے ہے خوارق کی ضرورت نہیں —— پیری و مریدی نام ہے اسی دعوت کا اس کو خارق عادات و کرامات سے کوئی واسطہ نہیں —— میں کہتا ہوں کہ مرید رشید اور طالب مستعد ہر وقت، سلوک طریق میں پیر و مرشد کے خوارق و کرامات کا احساس کرتا رہتا ہے اور معاملہ غیبی میں ہر وقت اُس سے مدد چاہتا ہے اور مدد پاتا ہے........ مرید احساس خوارقِ پیر کس طرح نہ کرے؟ پیر نے تو اس کے دلِ مردہ کو زندہ کیا ہے اور مشاہدہ و مکاشفہ کی منزل تک پہونچایا ہے........ فی الحقیقت اہل اللہ کا وجود ہی کرامات میں سے ایک مستقل کرامت ہے اور ان کی دعوت، مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔ نیز اُن کا مردہ دلوں کو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے —— اہل اللہ، زمین والوں کے لیے امان اور غنیمت روزگار ہیں۔ ان کے طفیل میں بارشِ برسائی جاتی ہے اور انھیں کے صدقے میں مخلوق کو رزق عطا فرمایا جاتا ہے —— ان کا کلام دوا ہے، اُن کی نظر شفا ہے، یہ ایسی قوم ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بدبخت اور محروم نہیں ہوتا۔

وہ علامت جو اہلِ حق کو اہلِ باطل سے جدا کرتی ہے یہ ہے کہ وہ شریعت پر استقامت رکھتا ہو اور اس کی مجلس میں دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت و توجہ ہو اور ماسویٰ سے بے رغبتی ہو جائے —— ایسا شخص اہلِ حق ہے اور اس کا شمار اولیاء خدا میں سے ہے....... تم نے اپنے مکتوب میں سلطان وقت (جہانگیر) کی خدا طلبی کے متعلق بھی کچھ لکھا تھا اور کچھ اشارہ اس کے عدل و انصاف اور التزام احکام شرعیہ کی جانب کیا تھا اس بات کے مطالعے سے بہت خوشی ہوئی اور ایک کیفیت پیدا ہوئی جس طرح اللہ تعالیٰ نے بادشاہ وقت کے نورِ عدل سے عالم کو منور کر دیا ہے اسی طرح شریعت ملت

محمدیہ کو بھی اس کے حسن اہتمام سے نصرت و عزت بخشے ۔
محبت آثارا! ..... شریعت کا رواج ، سلاطین کے حسنِ اہتمام کے ساتھ (بھی) وابستہ ہے ۔ اس اہتمام نے کچھ عرصے سے ضعف پیدا کر لیا ہے ، ناچار اسلام ضعیف ہو رہا ہے ۔ ہندوستان کے غیر مسلم دلیری کے ساتھ مساجد ڈھا رہے ہیں اور وہاں اپنے معبد تعمیر کر رہے ہیں ... غیر مسلم برملا اپنے مراسم بجا لاتے ہیں ۔ لیکن مسلمان اکثر احکام اسلام کے جاری کرنے سے عاجز ہیں ...... افسوس صد ہزار افسوس بادشاہِ وقت ہمارا ہم مذہب اور ہم فقیر اس زبونی و خرابی کے عالم میں ؟ ___ بادشاہوں کے اعزاز و اکرام سے بھی اسلام کو رونق ہوئی ، علماء و صوفیہ معزز و محترم تھے اور شاہانِ وقت کی تقویت سے وہ ترویج شریعت میں کوشش کرتے رہتے تھے ۔ میں نے سنا ہے کہ ایک روز امیر تیمور گورگان علیہ الرحمہ ، بخارا کے ایک کوچے سے گزر رہے تھے ، اتفاقاً خانقاہِ خواجہ نقشبند قدس سرہٗ کے خادم اس کوچے میں خانقاہ کے کمبلوں کو جھاڑ رہے تھے اور گرد صاف کر رہے تھے امیر تیمور اپنے حسنِ اسلام کی بنا پر اس کوچے میں کچھ دیر ٹھہرے تاکہ خانقاہ کی گرد کو اپنے لیے عبیر و صندل بنا کر درویشوں کے فیوض و برکات سے مشرف ہو جائیں ___ شاید اسی تواضع و عاجزی کی وجہ سے جس کو لے کر وہ اہل اللہ کے ساتھ پیش آتے تھے وہ حسنِ خاتمہ سے مشرف ہوئے ___ منقول ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ امیر تیمور کی وفات کے بعد فرماتے تھے کہ "تیمور انتقال کر گیا اور ایمان سلامت لے گیا" ___ تم جانتے ہو کہ خطبۂ جمعہ میں سلاطین کا نام جو منبر کے نیچے درجے پر اتر کر پڑھتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے ؟ یہ ایک تواضع ہے جس کو سلاطین نے آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ساتھ برتا ہے ___ سلاطین نے یہ بات جائز نہ سمجھی کہ ان کے نام ، اکابر دین کے ناموں کے ساتھ منبر کے ایک ہی درجے پر مذکور ہوں ___ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے ___

اے برادر سجدہ ، جو پیشانی کو زمین پر رکھنے کو کہتے ہیں انتہائی ذلت و شکستگی کو متضمن ہے اور اس میں کمالِ تواضع اور فروتنی پائی جاتی ہے اسی وجہ سے اس قسم کی تواضع و فروتنی

کو صرف) واجب الوجود جل سلطانہ کی عبادت کے ساتھ مخصوص رکھا گیا ہے اس کے غیر کیلئے سجدہ جائز نہیں رکھا گیا ہے ـــــ منقول ہے کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لے جا رہے تھے ایک اعرابی آیا اس نے معجزہ طلب کیا تاکہ اسے دیکھ کر ایمان لائے آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس درخت سے کہہ دے کہ تجھ کو پیغمبر بلاتا ہے۔ چنانچہ وہ درخت اپنی جگہ سے متحرک ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلا گیا۔ وہ اعرابی یہ دیکھ کر اسلام لے آیا۔ اس کے بعد اس نے کہا یا رسول اللہ! اگر آپ فرمائیں تو میں آپ کو سجدہ کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیر اللہ کو سجدہ جائز نہیں ہے۔ اگر میں غیر اللہ کے لیے سجدہ تجویز کرتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے ـــــ بعض (نام نہاد) علماء نے سلاطین کے لیے سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن سلاطینِ عظام کے لائق حال یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے سامنے تواضع و فروتنی کا مظاہرہ کریں اور اس انتہائی تذلل وانکسار (سجدے) کو غیر اللہ کے لیے جائز قرار نہ دیں ـــــ حضرت حق جل مجدہٗ نے ایک عالم کو بادشاہوں کا مسخر اور اُن کا محتاج کر دیا ہے اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر ادا کریں اور ایسی تواضع کو جو کمال عجز وانکساری کی اطلاع دیتی ہے فقط جناب قدس کے لیے ہی مسلم رکھیں اس معاملہ میں کسی کی اس کے ساتھ شرکت نہ ڈھونڈھیں ــ ہر چند کچھ (غیر حقانی) عالم اس سجدۂ تعظیمی کو ان کے لیے جائز قرار دیں۔ لیکن بادشاہوں کے حسن تواضع کا یہ تقاضا ہے کہ وہ خود اس کو جائز نہ سمجھیں۔ هل جزاءُ الاحسان الّا الاحسان ـــــ چونکہ بادشاہ وقت تمام مملکت کا دورہ کر کے دارالخلافہ (آگرہ) آ گئے ہیں اس لیے ممکن ہے کہ یہ فقیر بھی اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو مستقبل قریب میں دارالخلافہ پہونچے ـــــ باقی ملاقات کے وقت ـــــ

والسّلام علیٰ من اتبع الهدیٰ والتزم متابعة المصطفیٰ علیه وعلیٰ آله الصلوات والتسلیمات العلیٰ

مغرب کی جدید جاہلیت اور عرب

مکہ معظمہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک اہم تقریر

اواخر اپریل میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حجاز پہونچنے پر مکہ مکرمہ میں ایک جلسہ استقبال و تکریم منعقد کیا گیا جس میں ملک کے ممتاز ادباء اور اہل علم اور متعدد وزراء اور اعلیٰ سفارتی سطح کے عمائد شریک ہوئے، ان میں خاص طور پر قابل ذکر رابطۂ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری معالی شیخ محمد سرور الصبان، توسیع حرم کے ڈائرکٹر شیخ صالح القزاز، سعودی عرب کی اڈوائزری کونسل کے نائب صدر اور ملک کے ممتاز ترین شاعر و ادیب شیخ احمد بن ابراہیم الغزاوی حجاز کے مشہور ادیب و عالم شیخ عبد القدوس الانصاری عرب کے مشہور خطیب اور داعی شیخ محمد محمود الصواف، حجاز کے متقدر عالم دین شیخ علی علوی مالکی اور شیخ رشید فارسی تھے ۔

اس جلسہ میں پہلے شیخ رشید فارسی نے تعارفی تقریر کے ساتھ اہل مکہ کی طرف سے مولانا کا استقبال کیا بعد میں شیخ احمد بن ابراہیم الغزاوی نے اپنا وہ قصیدہ مدحیہ پڑھکر سنایا جو وہ مولانا کی مدح میں کہہ کر لائے تھے۔ یہ قصیدہ بعد میں مجلۃ الحج نے شائع بھی کیا۔

اس موقع پر مولانا نے جو تقریر کی وہ دنیا کی رسم کے خلاف تشکر و امتنان کے بجائے داعیانہ اور ناقدانہ تھی اسمیں مولانا نے بڑی صراحت اور جرأت کے ساتھ عربوں میں قومیت کے بڑھتے ہوئے موجودہ جاہلی رجحان پر تنقید کی اور قومیت عربیہ کے تصورات کو اسلام کے بالکل منافی اور ملت اسلامیہ کیلئے خطرناک بتایا، تقریر اپنی زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی نہایت مؤثر تھی اس لئے باوجود تلخ ہونے کے خاموشی سے سنی گئی اور عام طور

پسند کی گئی۔ بعد میں مقامی روزنامہ "الندوہ" نے اسکو مکمل شائع کیا۔ جلسہ کی پوری کاروائی مکہ ریڈیو نے رکارڈ کی تھی جس کو بعد میں اسکے صوت الاسلام کے شعبہ نے نشر کیا۔ ذیل میں مولانا کی اس تقریر کا ترجمہ پڑھئے۔

میرے دوستو اور محترم بزرگو! یہ جلسے جو کسی شخص کے استقبال کے لئے منعقد ہوتے ہیں، ان کی اگر کوئی قیمت ہو تو صرف یہ کہ اسکے ذریعہ اسکو بہت سے تعلیم یافتہ، اہل فکر، اہل نظر اور ممتاز اشخاص سے ملنے کا اور ایک جگہ اکٹھا ہو کر پُرسکون فضا میں اُن سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے اور اعتماد، احترام اور توجہ کے ساتھ اسکی بات سُنی جاتی ہے، میری حقیر ذات کے لئے اپنے عزیز دوستوں کی عزت افزائی قبول کرنے کی کوئی وجہ جواز ہو سکتی ہے تو یہ کہ مجھے وہ بات کہنے کا اچھا موقع مل رہا ہے جو اس جگہ کی اہمیت، زمانہ کی نزاکت اور وقت کی قیمت کے مطابق اور لائق ہو سکے جو ہمارے یہ عزیز دوست صرف کر رہے ہیں۔

یہ اس جلسہ کے داعیوں کے لئے ایک مقدس امانت ہے، نیز اس شخص کے حق میں بھی بہت نازک امانت ہے جس کے نام پر اور جس کی عزت افزائی کے لئے یہ جلسہ منعقد ہو رہا ہے، میں اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اس قیمتی موقع کو رائگاں نہ ہونے دیگا۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ جلسہ محض بے مقصد اور بے جان تقریروں پر ختم نہ ہوگا بلکہ یہ مخلصانہ مجلس ایک نئے سفر کا آغاز، بہت سے جذبات و احساسات کی محرک اور بہت سی یادوں کو تازہ اور زخموں کو ہرا کرنے والی ثابت ہوگی اور اس سے وہ مبارک خلش پیدا ہوگی جو ہر تبدیلی اور ترقی اور انسانیت کے ہر صالح انقلاب کے لئے ضروری ہے یہی وہ مبارک خلش ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبودی کا اصل باعث اور آسمانی مذاہب کی کامیابی اور دعوت اسلامی کی فتح کا راز ہے، یہ خلش اس زندگی اور اسکی دلفریبیوں کی طرف سے بے اطمینانی، حاضر و موجود سے بیزاری، غیبی اور غیر مرئی چیزوں کی تمنا، کسی بلند بعید اور دلنواز مستقبل کی جستجو، نئی فتحمندیوں اور نئے آفاق

کی تلاش، تن آسانی اور عیش کوشی سے نفرت، بلند حوصلگی، خطر پسندی اور حوصلہ مندی
کا جذبہ، نفع اور کامیابی ہی کامیابی کے فلسفہ سے بے رغبتی، محض فوائد سے دستبرداری
اور دوسروں کی بہبودی کے لئے اور اصول و عقیدہ کی خاطر نقصان اٹھانے کا
شوق پیدا کرتی ہے۔

یہ وہ مبارک خلش ہے جو صدیوں پہلے تاریخ انسانی میں پہلی بار اس مبارک وادی
کے رہنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوئی اور پھانس بن کر چبھ گئی، اس وقت تک وہ خلش
کے صرف ایک شخصی اور محدود مفہوم سے آشنا تھے، حسد، بغض، عداوت، حرص و طمع،
موت اور بیماری کا خوف، فقر کا اندیشہ، دشمن کا کھٹکا، مسلسل اور طویل جنگیں، ہوشربا گرانی
اور کمر توڑ دینے والے ٹیکس، یہ تھی اسوقت کی خلش جس سے لوگ واقف تھے۔ لیکن اب
اس وادی کے نوجوان پہلی بار ایسے حقائق اور ایسے معانی کے لئے بے چینی اور خلش
محسوس کر رہے تھے جو اس سے کہیں زیادہ بلند اور لطیف اور اس سے کہیں زیادہ وسیع
تھے۔ انکو اپنے ضائع شدہ ماضی اور خوفناک مستقبل سے سخت تشویش اور خراب کردار اور
فاسد اخلاق کی طرف سے سخت فکر تھی۔ اب وہ مظلوم انسانیت کے درد میں اور ان خراب
حالات کی اصلاح کی فکر میں بے چین رہنے لگے جو اسوقت دنیا پر طاری تھے۔ یہ خلش اتنی
بڑھی کہ ہر چیز پر چھا گئی، اس نے پوری دنیا کو بے چین ہونے پر مجبور کر دیا، تاریخ کا رخ بدل دیا
اور انسانیت کو ایک نئی روشنی اور نئی زندگی سے آشنا کیا۔

میرے محترم بزرگو! عرب کے ایک قدیم شاعر نے ایک موقع پر کہا تھا۔

ولی کبد مقروحة من یبیعنی — بها کبدا لیست بذات قروح

اباها علی الناس لا یشترونها — ومن یشتری ذا علة بصحیح

(جب میں نے کہا) میرے پاس ایک زخمی دل ہے کوئی ہے جو اپنا غیر زخمی دیکر اسے لے لے
(تو) لوگوں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور بھلا اچھے کے بدلے خراب کون خریدے گا)
میں شاعر سے معذرت کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا بھی یہی حال ہے، میرا بھی جگر
زخمی اور سینہ چھلنی ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ میں اسکو فروخت کرنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ

وہ میری عزیز ترین متاع، میرا اصل سرمایہ اور میری سب سے بڑی دولت ہو اور اسی کے دم سے میری زندگی کی لذت ہے، اس زندگی میں کیا لطف جس میں کوئی خلش اور بے چینی نہ ہو، وہ انسان کیا انسان جس کے پہلو میں درد بھرا دل اور زخموں سے چور جگر نہ ہو، میری تو دعا اور تمنا ہے کہ آپ میں سے ہر شخص کے پاس ایسا دل ہو، میں اس شاعر کا ہمنوا ہوں جو اس درد کا لذت آشنا ہو، جسے اس تلخی میں شیرینی سے زیادہ مزہ آتا ہو، وہ اس کو اپنی زندگی کی قیمت اور عمر کا حاصل سمجھتا ہو، اور اپنے ناقدین اور نکتہ چینیوں کے لئے اسکے پاس یہ جواب ہو ؎

وقالوا شربت الاثم كلا وانما		شربت التي في تركها عندي الاثم

فلا عيش في الدنيا لمن عاش صاحيا		ومن لم يمت سكرا بها فاته الحزم

على نفسه فليبك من ضاع عمره		وليس له فيها نصيب ولا سهم

(کہتے ہیں کہ تو نے گناہ (شراب) نوش کیا، ہرگز نہیں میں نے ایسی چیز پی ہے جس کا چھوڑنا میرے نزدیک گناہ ہے دنیا میں اس شخص کے لئے کیا مزہ جو ہمیشہ ہوش میں رہا جو اس بیخودی اور سرمستی میں فنا نہیں ہوا وہ کوتاہ نظر ہے اس شخص کو اپنے اوپر رونا چاہیئے جس نے اپنی پوری عمر گنوادی اور اس میں اسکا کوئی حصہ نہیں رہا)

میں اس شاعر کے ساتھ ہوں جو اپنی موت کے بعد بھی محبت سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا ؎

أهيم بليلى ما حييت فان امت		أوكل من يهيم بها بعدى

(جب تک میں زندہ رہوں گا لیلی کے لئے دیوانہ وار پھروں گا، اور اگر میں مرگیا تو کسی شخص کو اپنا جانشین مقرر کرجاؤں گا جو میرے محبوب کے لئے اس آشفتہ سری اور صحرانوردی کو قائم رکھے)

بزرگو اور دوستو! اگر میں اسجگہ اور اس پوزیشن کے بجائے کسی اور پوزیشن میں ہوتا، میرے مخاطب میرے عرب دوست اور خاص طور پر اہل حرم نہ ہوتے تو معاملہ آسان تھا اور طویل گفتگو کا موقع تھا، مقرر کے لئے سب سے نازک پوزیشن وہ ہوتی ہے جب حیا اور الم جمع ہوگئے ہوں، حیا کہتی ہے کہ "ایاز قدر خود بشناس" اور الم کہتا ہے کہ زخم دل دکھانے کا ایک موقع ملا ہے اسکو ہاتھ سے نہ جانے دو، اب دل حیران ہے کہ کس کی

بات مانے کس کی نہ مانے۔

عرب دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ کا آپ پر صرف یہی احسان نہیں ہو کہ اس نے آپکو اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عزت بخشی اور یہیں آپ کا کام ختم نہیں ہوا اس نے اس دین کی حفاظت، اسکی بقا و ترقی کی کوشش اس کی دعوت کے ذریعہ بھی آپ کی عزت افزائی فرمائی اور یہ ذمہ داری بھی آپ ہی کے سر پہ ڈالی ہے اور آپکے شہر اور ملک کو ہدایت کا مرکز، تبلیغ دعوت اسلامی کا حصار اور قلعہ اور لوگوں کیلئے جائے امن اور جائے پناہ بھی بنایا ہے۔" ھو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین، من قبل وفی ھذا لیکون الرسول علیکم شھیدا وتکونوا شھداء علی النّاس"۔

اب شرافت، عقل، ذوق اور منطق ہر چیز کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ اس دین کے لئے سب سے زیادہ غیور ثابت ہوں آپ کے اندر اس دولت کی عظمت کا سب سے زیادہ شعور ہو اور آپ اس عزت اور سرفرازی کا کی صحیح قدر پہچانیں، اور پھر اسکے علاوہ جتنی بھی دعوتیں، تحریکیں، نظام اور اقدار ہیں آپ کو ان سے کوئی دلچسپی نہ ہو، آپ اس جاہلیت سے سخت بیزار اور متنفر ہوں جسکی آگ میں آپ عرصہ تک جل چکے ہیں اور اسکے لئے دنیا بھر میں بدنام بھی ہو چکے ہیں، اس دین کی عظمت اور اس دولت کی وسعت و اہمیت پر آپ کا ایمان بہ نسبت دوسروں کے زیادہ قوی ہو، اس دعوت کو روئے زمین کے ہر گوشہ میں پہونچانے کا اور اسکو عام کرنے کا آپ کے اندر سب سے زیادہ جذبہ ہو، نبی امی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپکو سب سے زیادہ محبت ہو جن سے نسب، زبان، وطن اور خون میں آپکا رشتہ بھی ہے اور جو آج بھی نئی زندگی کا واحد سرچشمہ ہیں، جن سے آپکی شاندار تاریخ بنی ہے، (وانہ لذکر لک ولقومک ولسوف تسئلون) آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت پر مکمل اعتقاد اور آپکے پیغام و دعوت کی لافانیت اور آفاقیت کا پورا یقین ہو،

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جسنے　　غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

اگر مجھ سے کہا جائے کہ فلاں اسلامی ملک یا اسلامی قوم نے غیر اسلامی قدروں اور نظریات کے سامنے سر جھکا دیا ہے اور اسمیں بعض وہ رجحانات پیدا ہو گئے ہیں جو اسلام کے ساتھ میل

نہیں کھاتے" (اور جنکو ختم کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں بھیجے گئے تھے) اور وہ پھر اپنی قدیم جاہلیت کی طرف لوٹنے یا مغرب کی جدید جاہلیت کے بعض افکار اور فلسفوں کو اپنانے کی فکر میں ہیں تو مجھے اس پر یقین کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا اس لئے کہ مسلمان اقوام میں دعوت اسلامی کی تاثیر و قوت کا معیار ہمیشہ مختلف رہا ہے، بعض قوموں میں اسلام واسطوں سے پہونچا ہے، کبھی اس نے بہت طویل راستہ اختیار کیا ہے کبھی مختصر، دوسری وجہ یہ کہ ان میں بہت سی قوموں کا تعلق عربی زبان سے بہت کم رہا جس میں قرآن مجید نازل ہوا اور جس میں اسلامی حقائق اور دعوت اسلامی کی ترجمانی کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے۔ مجھے یہ سب تسلیم کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوگی اور میں رنج و افسوس کے ساتھ اس بات کو مان لوں گا اس لئے کہ اسکی بکثرت مثالیں ہیں اور مذاہب و تحریکات کی تاریخ سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے، لیکن یہ تسلیم کرنے میں مجھے ضرور دشواری ہوگی کہ عرب بھی اب اس طرز فکر کو اختیار کر رہے ہیں اور زندگی کے ایسے طریقوں، قدروں، رشتوں اور نظاموں کو پسند کر رہے ہیں جنکا اسلام سے کوئی علاقہ نہیں اور اور نہ تاریخ اسلام میں انکے مقام و کردار سے ان کو کوئی نسبت ہے، وہ نظام جن کو دنیا کی بعض جاہلی اقوام نے اپنے روحانی و اخلاقی افلاس کی وجہ سے مجبوراً اختیار کر لیا تھا، اور آخر ان کے اوپر ان کے نقصانات بھی منکشف ہونا شروع ہو گئے اور اب وہ انہیں چھوڑ رہے ہیں اور اس سے بہتر کسی نظام کی جستجو میں ہیں۔ اگر بد قسمتی سے عالم عربی کے کسی حصہ میں یہ حادثہ پیش آ گیا تو اسلام کی فکر اور اسکی ہمہ گیری اور آفاقیت پر عقیدہ رکھنے والوں کے لئے سخت حیرت و تشویش کی بات ہوگی جو عربوں کو اپنا استاذ و مرشد سمجھتے ہیں اس دین کا پہلا نمائندہ اور داعی تصور کرتے ہیں اور انسے غیر متزلزل ایمان اور ہر دور اور ہر ملک میں اس پیغام کی ہدایت کا یقین حاصل کرتے رہے ہیں، یہ ایک ایسا امتحان اور آزمائش ہے کہ اچھے اچھے اہل بصیرت اور اصحاب دانش کے سامنے سوائے حیرت و پریشانی کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ یہاں بڑے سے بڑے خطیب کی زبان بند ہونے لگتی ہے ایک چھوٹا شاگرد اپنے استاد سے کیا کہہ سکتا ہے اگر

اس کا استاد خود ان مسلمات وحقائق اور اصول ومبادی میں شبہ کرنے لگے، جو اس نے کل اپنے شاگرد کو بتائے تھے، اور اپنے بنائے ہوئے کو خود بگاڑنے پر آمادہ ہو جائے۔
کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا (جیسے کسی عورت نے اپنے کاتے ہوئے سوت کو مضبوط کرنے کے بعد خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا) ـــــــ ایک جاہل مریض اس طبیب حاذق سے کیا کہہ سکتا ہے جو اصول طب کی خود خلاف ورزی کر رہا ہو اور دوا کے بجائے زہر پلا رہا ہو۔

کوئی شریف انسان شاہی خاندان کا کوئی لڑکا جو بہت نازپروردہ اور ماں باپ کا پیارا دلارا ہو، اسکو دنیا کی ہر نعمت حاصل ہو، عیش وراحت کے علاوہ اس نے کبھی تکلیف کا منہ نہ دیکھا ہو اور ہمیشہ اپنے ماں باپ، بھائی اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا عادی رہا ہو، اس وسیع مملکت کی ساری نعمتیں، لذتیں، مسرتیں اسکی دسترس میں ہوں، اگر یہ نازپروردہ لڑکا اس شاہی دسترخوان اور شاہی خاندان سے بیزار ہو جائے اور اسکو لذیذ کھانوں اور پھلوں سے گھن آنے لگے اور اسکی خوشبو سے بھی نفرت ہو جائے اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ وہ نوکروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے اور اسکو بھک منگوں کے ان کھانوں میں زیادہ مزہ آنے لگے جو سڑکوں اور گلیوں میں ان کے سامنے ڈال دیا جاتا ہے، اس کے اندر مہتروں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور ان کی مجلسوں میں شریک ہونے کا شوق پیدا ہو جائے تو اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہو گی، اس پر ہر شخص کو رحم آئے گا۔ بڑے بڑے حکما اور عقلا اور بڑے بڑے خطیب اور مقرر اسکو سمجھانے کی ممکن کوشش کرینگے اور اسکے اس طرز عمل کو صرف فساد ذوق، طبیعت کی کجی، اور اس مملکت کے فرماں روا کے لئے ایک عظیم ابتلا کہا جائے گا نیز اس ملک اور قوم کے لئے بڑی آزمائش جو اسکو اپنا آئیڈیل، اپنا محبوب رہنما اور ہر دلعزیز قائد سمجھتی رہی ہے۔

جب میں عرب دنیا کے بعض حصوں میں "عرب قومیت" اور "ہم عرب ہیں" "نحن ابناء الفراعنۃ والعرب" (ہم فرعونوں اور عرب کی اولاد ہیں) "العزۃ للعرب" (عزت عربوں کو حاصل ہے) اس قسم کے جاہلانہ نعرے سنتا ہوں تو مجھے انتہائی اذیت اور

شدید ناگواری کا احساس ہوتا ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ یہ احساس آپ سب کو ان باتوں کے سننے سے حاصل ہو، یہ باتیں سُن کر میرے اندر بالکل ایسا ہی جذبۂ بغاوت پیدا ہوتا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ہوا تھا جب اُن سے بنی اسرائیل نے بحر احمر کے کنارے ایک جاہلی قوم کے گاؤں سے گذرتے ہوئے ان کے بتوں کو دیکھ کر انہی جیسے بت بنا کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی اس عجیب غریب فرمائش کو کتنی کراہت اور ناگواری کے ساتھ سُنا تھا۔

قرآن کریم نے اس عبرتناک منظر کی جس میں ایک طرف انسانی پستی اور دوسری طرف غیرت نبوت نمایاں ہے کتنی واضح تصویر کھینچی ہے۔

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فأتوا	اور پار اُتارا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے تو
علیٰ قوم یعکفون علیٰ اصنام لهم،	پہونچے ایک قوم پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے
قالوا یاموسیٰ اجعل لنا إلٰهاً کما لهم	اپنے بتوں کے کہنے لگے اے موسیٰ بنا دے
آلهة قال انکم قوم تجهلون ان	ہماری بھی عبادت کے لئے ایک بُت جیسے ان
هؤلاء متبر ماهم فیه وباطل ما	کے بت ہیں، ـــ کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو،
کانوا یعملون قال أغیر الله أبغیکم	یہ لوگ تباہ ہونے والی ہے وہ چیز جس میں یہ
إلٰهاً وهو فضلکم علی العالمین۔	لگے ہوئے ہیں اور غلط ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قوم کے ساتھ بالکل اسی تجربے سے گذرے جس کی تصدیق قرآن کریم نے ان الفاظ میں کی ہے "ما یقال لك الا ما قد قیل للرسل من قبلك" (آپ سے وہی کہا جا رہا ہے جو آپ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا تھا) "خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (لتتبعن سنن من کان قبلکم شبراً بشبر وذراعاً بذراع) تم لوگ ضرور اپنے متقدمین کے طریقوں کی پیروی کرو گے قدم بقدم چلو گے"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ کسی غزوہ یا سفر میں تشریف لیجا رہے تھے آپ کے ساتھ کچھ ایسے صحابہ بھی تھے جو نئے نئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ جب آپ کا گذر اس درخت سے ہوا جس کی عہد جاہلیت میں بعض لوگ عبادت و تقدیس کیا کرتے تھے۔

اور اس پر کپڑے لٹکاتے وغیرہ لٹکاتے تھے تو اُن لوگوں نے آپ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی اس طرح کے درخت بنا دیجئے جیسے ان لوگوں کے پاس ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن کر یہی مذکورہ بالا آیتیں ان کو سنائیں اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کا پورا قصہ سنایا۔

آج بھی زمانہ بالکل اسی منزل پر پہونچ چکا ہے اور تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے ہمارے عرب بھائی اور بڑے لوگ ان جاہلی بتوں کی طرف دیکھنے لگے ہیں، اور مختلف جاہلی رسم ورواج کی دہائی دے رہے ہیں جن میں جاہلیت کا وہ درخت بھی ہے جو ہر وقت جاہلیت کے برگ و بار پیدا کرتا ہے۔ آج بھی انسانی فطرت وہی انسانی فطرت ہے جو ہر موجود خوشگوار کو ناپسند کرتی ہے اور ہر نایاب کی متقاضی ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی کثیف اور ناخوشگوار کیوں نہ ہو، جو لذیذ اور عمدہ چیزوں سے گھن کھاتی ہے اور گھٹیا اور بے قیمت چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔

اسلام سے یہ روگردانی جس کو ہم آج بعض اسلامی عرب طبقوں میں محسوس کر رہے ہیں اور اسکی اعلیٰ اور لازوال قدروں اور اسکے بلند تصورات سے سرتابی جس سے آجکی انسانیت قاصر ہے۔ ان طبقوں کا اسلام اور اسکے بلند تخیل کو چھوڑ کر انتہائی شوق اور گرمجوشی کے ساتھ ان آثار کی تقدیس و تعظیم کرنا اور ان پر ہمہ تن متوجہ ہونا جن کا آفتاب اب غروب ہو چکا ہے۔ اور گہوارۂ مقبرہ میں اب دم توڑ رہے ہیں اور رجعیت کی علامت سمجھے جانے لگے ہیں۔ اسی عہد طفولیت کے مشابہ ہے جس میں بچہ ماں کے تیار کئے ہوئے لذیذ اور عمدہ کھانوں کو چھوڑ کر نوکروں اور نوکرانیوں کے کھانے کی طرف بڑھتا ہے۔ اور اسکو للچائی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ زہریلی غذا اور نقصان رساں چیزوں کے کھانے پر ضد کرتا ہے۔

سب سے افسوسناک بات یہ کہ ہم کسی قائد اور امام کو اپنے جاہل متبعین کے پیچھے دوڑتا ہوا دیکھیں اور اسکو ان کی تقلید و پیروی کا حریص پائیں۔ پھر وہ منصب قیادت کو چھوڑ کر تقلید میں اپنے لئے فخر و عزت تصور کرتا ہو جس امام و قائد کا یہ منصب تھا کہ

وہ کسی کے سامنے جھکنے سے پرہیز کرتا اور جس کی غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ ہلاک کر دینے والی پیاس کو احسان جتانے والی سیرابی پر ترجیح دینا۔ اور عربی شاعر ابن سنا کا یہ شعر پڑھتا۔

واظمأ ان ابدی لی الماء منۃ وان کان لی نھر المجرۃ موردا

اگر پانی سیرابی کا احسان جتلائے تو میں پیاسا رہنا پسند کرتا ہوں خواہ دریائے مجرہ میرے سامنے چشمۂ شیریں بن کر کیوں نہ آ جائے۔

لیکن اب حال یہ ہے کہ شریف و کریم اور مالدار و غنی ہر چشمہ پہ ٹوٹتا ہے بلکہ ہر سراب کو وہ پانی سمجھ کر اس کی طرف لپکتا ہے۔ جس طرح پیاسا پانی پہ اور پروانہ شمع پہ گرے۔ اور بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانی اور روشنی دو نوں ہی سے محروم ہے۔

حضرات! ہم لوگ اپنے ملک میں جو اسلام اور عربیت کے گہوارے سے بہت دور ہے ہر بڑے سے بڑے شخص کی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان کا طفیلی نہ ہو پوری تنقید کرتے ہیں خواہ وہ کوئی بڑا مفکر اور علم و فلسفہ کا امام ہو، یا اپنے عہد کا بڑا جینس اور اپنے وطن و قوم کا سب سے بڑا لیڈر ہو، ہمارے نزدیک اسکی عظمت و عبقریت کی اس رشتہ کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے، اور نہ اسکی فکری آزادی کا ہمارے نزدیک کوئی جواز ہے، ہم اسکی تمام کمزوریوں اور ناکامیوں کا واحد سبب چشمۂ نبوت سے اس کی اس بے نیازی کو سمجھتے ہیں جس کا باعث جہالت، قومی تکبر یا جاہلی حمیت اور قومی و وطنی عصبیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا،

فارسی شاعر نے بالکل صحیح کہا ہے

محمد عربی کا بروئے ہر دو سرا است
ہر کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانیت اور قوموں کی تاریخ میں وہ حدِ فاصل ہے جو ماضی و حاضر کو صاف صاف دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے حال کو ماضی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ لوگ جو بعثت کے بعد پیدا ہوئے اور زندگی بسر کی انکو بعثت سے پہلے پیدا ہونے والوں کی زندگی سے کوئی نسبت نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہر شخص کو اختیار تھا کہ وہ جیسے چاہے زندگی بسر کرے جو چاہے زندگی کا نظام

بنائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد یہ اختیار بالکل ختم ہوگیا اور یہ آزادی باقی نہیں رہی، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ہر شخص پر یہ بات حرام قرار دے دی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ کا دامن تھامے اور آپ کے رکاب میں چلے بغیر کامیاب و بامراد ہوجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخی ارشاد آجتک حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے جس میں آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں کسی قدیم آسمانی صحیفہ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ "اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو اُن کو میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا" یہ تاریخی کلمہ کوئی محدود مفہوم رکھنے والا قول نہیں ہے جو صرف فقہی احکام یا دینی عقائد پر مشتمل ہو بلکہ یہ کلمہ پوری انسانی زندگی اور قوموں اور نسلوں کے لئے عام ہے۔ جب موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پانے پر آپ کی اتباع کے بغیر چارہ کار نہ ہوتا تو موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی اُمت اور خود مسلمانوں اور خاصکر ان عربوں کا کیا حال ہو سکتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی برحق مبعوث فرمایا جو انھیں کی قوم و نسل کا تھا اور جن کو اسکی پہلی دعوت اور اس عظیم امانت کا اہل سمجھا گیا،

یہ ایک مختصر سی بات ہے جسکو میں نے خصوصیت سے محض اخلاص و محبت کے جذبہ اور اس عظیم مرکز کی برکت سے آپ کے سامنے پیش کیا ہے جس میں قیام کرنے کی عزت آپ کو حاصل ہے اور جس کی وجہ سے آپ عالم اسلام اور تاریخ اسلام میں اپنے فضل و بلندی کا شہرہ رکھتے ہیں، اور ہر مسلمان آپ کے جہاد اور ان کوششوں کا معترف ہے جو آپ سے اسلام کے پھیلانے اور اسکو عام کرنے میں صادر ہوتی ہیں اور وہ آپکے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے اپنا قرب ڈھونڈھتا ہے۔

آخر میں میں آپکا شکر گزار ہوں کہ آپنے میری یہ عزت افزائی فرمائی جسکا میں مستحق نہیں تھا اور جو آپکے نسلی کرم و مروت اور کشادہ دلی کی دلیل ہے۔

تعبیر کی غلطی

مولانا مودودی کے خیالات کا جائزہ

جناب وحید الدین خاں صاحب اعظم گڈھ
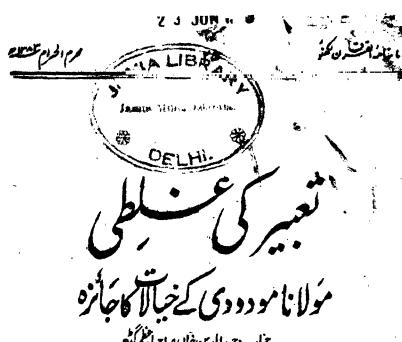
مولانا مودودی کا فکر عرصہ سے ہندوستان کے علماء کے درمیان موضوع بحث رہا ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے بھی غور وفکر کیا ہے اور مولانا مودودی اور اس حلقۂ فکر کے دوسرے اکابر سے طویل خط وکتابت کے بعد ایک نتیجہ پر پہونچا ہوں۔ یہ خط وکتابت اور اس سلسلے میں اپنا حاصل مطالعہ میں نے ایک ضخیم کتاب میں مرتب کر دیا ہے جو "تعبیر کی غلطی" کے نام سے عنقریب شائع ہو جائے گی۔ یہاں جو تحریر دی جا رہی ہے، وہ اس زیر طبع کتاب کا ایک باب ہے جس میں مختصر طور پر اصل کتاب کا ایک ابتدائی تعارف دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

وحید الدین خاں

اسلام کی تشریح وتوجیہ کے لئے جو علوم پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک علم وہ ہے جس کو حکمتِ دین یا اسرار شریعت کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب دینی تعلیمات کی حکمتوں کو جاننا اور اس کے اندر چھپی ہوئی مصلحتوں کو معلوم کرنا ہے۔ مثلاً جب آپ حج کے فرائض وارکان کا تعین کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ حج کیسے کرنا چاہیئے، تو یہ فقہ ہوتی ہے۔ مگر جب آپ حج کے فائدے بتائیں۔ مثلاً یہ کہیں کہ:۔

"حج "خدا پرستی کے محور پر اہل ایمان کی ایک عالم گیر برادری بناتا ہے"

تو اسی کا نام حکمتِ دین ہے۔

جس طرح دوسرے تمام علوم کا آغاز دورِ اوّل سے ہوا اور بعد کو ان میں فنّی تفصیلات پیدا ہوئیں۔ اسی طرح حکمتِ دین بھی شروع سے اُمّت کے افراد کا موضوع بحث رہا ہے۔ اس سلسلے میں بہت کافی معلومات ہمارے وسیع لٹریچر کے اندر بکھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس موضوع پر مستقل تصنیفات بہت کم ہیں۔ دیگر اسلامی علوم کا حال تو یہ ہے کہ ایک ایک فن پر درجنوں بلکہ سیکڑوں مستقل تصنیفات کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مگر حکمت دین پر مستقل کتابیں چند ہی لکھی گئی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور اور نمایاں شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ ہے۔

یہ بات حکمت دین کے ایک پہلو کے بارے میں ہے۔ دوسرے اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس موضوع پر مستقل کام اور بھی کم ہوا ہے۔ حکمت دین کا ایک مطلب یہ ہے کہ مختلف اجزائے دین کے الگ الگ مصالح معلوم کئے جائیں۔ مثلاً نماز کی حکمت، روزے کی حکمت، جہاد کی حکمت، وغیرہ۔ حکمتِ دین کے موضوع پر اب تک جو کام ہوا ہے، وہ زیادہ تر اسی پہلو سے متعلق ہے۔ ان میں دین کے مختلف پہلوؤں کو علٰحدہ علٰحدہ عنوانات کے تحت لے کر اُن کی منفرد حکمتوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تمام اجزائے دین کی مجموعی حکمت معلوم کی جائے، دین کے مختلف پہلوؤں کو باہم مربوط کر کے پیش کیا جائے، دین کی ایسی تشریح کی جائے جس میں وہ مجموعی حکمت نظر آئے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے اس کے مختلف اجزاء کو یکجا کیا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے کام کی بہترین تعبیر میرے نزدیک یہی ہے کہ انھوں نے حکمت دین کے اس دوسرے پہلو پر کام کرنے کی کوشش کی اور اپنی حد تک ایک ایسی تشریح بھی ڈھونڈ نکالی جس میں دین ایک ہم آہنگ کل (INTER-RELATED WHOLE) کی شکل میں نظر آنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی کے کام کا یہی نیا پن ہے جس نے موجودہ دور کے بہت سے لوگوں کے لئے ان کے خیالات میں کشش پیدا کر دی اور انھوں نے لپک کر اسے قبول کر لیا۔

مگر آپ جانتے ہیں کہ ہر مجموعہ لازماً حقیقت نہیں ہوتا۔ متفرق اجزاء کا کسی با معنی

مجموعہ میں مرتب ہو جانا بے شک اس بات کا ایک قرینہ ہے کہ یہ اجزاء اسی کلی حقیقت کے متفرق حصے تھے۔ مگر عین اسی کے ساتھ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ جو ترتیب قائم کی گئی ہے وہ حقیقی نہ ہو۔ اجزاء بجائے خود تو سب کے سب حقیقی ہوں۔ مگر جس مجموعی شکل میں انھیں اکٹھا کیا گیا ہو وہ ایک شخص کی محض قوت تخیل کا کرشمہ ہو۔

اگر کسی علاقے میں قدیم جانوروں کی پتھرائی ہوئی ہڈیاں (FOSSIL BONES) برآمد ہوں تو یہ بالکل ممکن ہے کہ آپ اس ڈھیر سے کچھ ہڈیوں کو لیں اور ایک مخصوص جاندار کی شکل میں انھیں جوڑ کر کھڑا کر دیں۔ اس طرح بظاہر ایک مجموعی ترتیب واقع ہو گئی۔ جن لوگوں نے حیاتیاتی ارتقاء کے نظریہ کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی فرضی ترتیبوں سے دھوکا کھا کر بہت سے ارتقا پسند علماء نے اس نظریہ کو مفروضہ کے مقام سے اٹھا کر حقیقت کا درجہ دیدیا ہے۔ مگر بار بار کے تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس طرح کی تشکیل و ترتیب لازماً حقیقت نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی قوت واہمہ سے کام لے کر مختلف غیر متعلق ٹکڑوں کو ایک مخصوص شکل میں جوڑ دیتا ہے۔ مگر اس شکل کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی اجزاء کسی اور ہیئت و صورت کے ہوتے ہیں اور ان کو جوڑ کر کوئی اور ہیئت و صورت بنالی جاتی ہے (مثال کے طور پر پلٹ ڈاؤن مین۔ PILTDOWN MAN جس کے متعلق تقریباً آدھی صدی تک دنیا کے سائنسداں اس "یقین" میں مبتلا رہے کہ یہ ماقبل تاریخ کا سب سے قدیم انسانی ڈھانچہ ہے جس کا ہمیں علم ہوا ہے۔ مگر بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ محض ایک جعلی ڈھانچہ تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

زیر بحث فکر کی غلطی یہ ہے کہ اس نے دین کی جو تصویر بنائی اس میں اجزا تو سب دین کا استعمال کئے جو کسی نہ کسی اعتبار سے دین کے اجزاء تھے۔ مگر جس کلی تصور کے تحت انھیں ایک مجموعہ میں ترتیب دیا گیا، وہ تصور صحیح نہیں تھا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی مکان کو توڑ کر اسی کے اینٹ اور گارے سے دوسری وضع کا مکان بنا ڈالا جائے۔ نتیجہ یہ ہو کہ اس کی تصویر، اجزاء کے اعتبار سے دینی ہونے کے باوجود، اپنی مجموعی ہیئت میں دین کے مطابق نہیں رہی، بظاہر پورے دین کا حامل ہونے کے باوجود، وہ اپنی مخصوص ترتیب میں پورے

دین سے ٹکرا گئی۔

اس تعبیر نے دین کے مختلف اجزاء کے درمیان جو حکمتِ جامع تلاش کی اور جس کے تحت تمام دینی تعلیمات و احکام کو مربوط کرنے کی کوشش کی، وہ "نظام" کا تصور تھا۔ یعنی اسلام، زندگی کا ایک مکمل اور مفصل نظام ہے اور اسی لحاظ سے اس کے تمام اجزا باہم ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اس فکر کے ایک مبلغ کے الفاظ میں ـــــــ "اسلام ایک نظام حیات ہے جو زندگی کے سارے انفرادی و اجتماعی اور مابعد الطبیعی مسائل کو ایک وحدت میں پروتا اور سب کو عقل و فطرت کے مطابق حل کرتا ہے"

دین کا ایک نظام ہونا بذاتِ خود غلط نہیں ہے۔ مگر جب نظام کے تصور کو یہ حیثیت دیجائے کہ یہی وہ سبب جامع ہے جو اس کے متفرق اجزاء کو ایک کل میں سموتا ہے، تو یقیناً وہ غلط ہو جاتا ہے۔ اور یہی اس فکر کی اصل غلطی ہے۔ یہ فکر دین کا مطالعہ اس حیثیت سے کرتی ہے کہ وہ زندگی کا ایک "نظام" ہے۔ اس کے نزدیک وہ ایک مجموعی تخیل جس کے تحت پورے دین کو سمجھا جا سکتا ہے، وہ اس کا نظام ہونا ہے۔ حالانکہ دین کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عمل میں آنے کے بعد دین میں وہ ساری چیزیں شامل ہو جاتی ہیں جن کے مجموعے کو "نظام حیات" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر دین کا نظام ہونا، حقیقتِ دین کا ایک مظہر ہے، یہ اس کی اضافی حیثیت ہے نہ کہ اصل حیثیت۔

دین کا مطالعہ "نظام" کے عنوان کے تحت کرنے میں اسی قسم کی غلطی کی گئی ہے جو غلطی اُن لوگوں نے کی جنھوں نے "انسان" کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ نظریہ قائم کیا کہ :۔

MAN IS A SOCIAL ANIMAL

یعنی انسان ایک تمدنی ہستی ہے۔ بے شک عملی تفصیلات میں آنے کے بعد انسان، ایک اعتبار سے، تمدنی ہستی یا سماجی مخلوق بن جاتا ہے۔ مگر تمدنی اور سماجی حیثیت انسان کی اصل حیثیت نہیں ہے، وہ اسکی اصل حیثیت کا ایک مظہر ہے۔ انسان کی اصل حیثیت اس کا ذی روح صاحب اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ اور بقیہ تمام حیثیتیں، خواہ وہ تمدنی حیثیت ہو یا اور

کوئی حیثیت، اسی اصل سے مختلف نسبتوں کے تحت نکلتی ہیں۔

یہ کہنا کہ "انسان ایک تمدنی ہستی ہے" دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ انسان کی مختلف حیثیتوں کو جس جامع تخیل کے تحت ہم سمجھ سکتے ہیں، وہ اس کا متمدن ہونا ہے۔ اس تشریح کے بالکل قدرتی نتیجہ کے طور پر انسان کی تمام حیثیتیں اس کی تمدنی حیثیت سے متفرع ہوں گی اور اس کا جزو قرار پائیں گی۔ اس تشریح کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کی دوسری تمام حیثیتیں اس کے ساتھ اس لئے شامل ہیں کہ اسکی تمدنی حیثیت تقاضا کرتی ہے کہ وہ اسمیں شامل ہوں۔ مثلاً انسان کا تمدنی ہستی ہونا تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک جسم اور روح کی صورت میں ہو، اس لئے انسان جسم اور روح رکھتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان کی ایک سیاست ہو، اس لئے وہ اپنا ایک سیاسی ڈھانچہ رکھتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ وہ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کی توجیہہ کرے، اس لئے اس کا ایک فلسفہ وجود میں آیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اس تشریح میں بظاہر انسان کی پوری زندگی آگئی۔ اور اس لحاظ سے یہ انسان کی مکمل تشریح معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور کیجئے تو اسمیں متعدد غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ اس تشریح کے مطابق انسان کی اصل حیثیت اسکی تمدنی حیثیت قرار پاتی ہے۔ اور بقیہ چیزوں کو اسی اصل کے واسطے سے اس کے اندر جگہ ملتی ہے۔ جبکہ انسان کی اصل حیثیت اسکا ذی روح ہونا ہے۔ اور دوسری تمام حیثیتیں اسی روح کے مظاہر ہیں یا اس کے تقاضے اور نتیجے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ نسبت بدل جانے کی وجہ سے انسانیت کا مطلوب بدل گیا۔ اب وہ چیزیں مطلوب اصلی قرار پائیں جو تمدن کی نسبت سے مطلوب ہوں۔ جبکہ حقیقۃً مطلوب اصلی اس چیز کو بننا چاہیئے جو اس کے روحانی وجود کی نسبت سے مطلوب ہو۔

۳۔ یہی نہیں بلکہ عملی اعتبار سے دیکھئے تو اس میں سے سب کچھ غائب ہوگیا۔ انسان کی ساری سرگرمیوں اور اس کے تمام مظاہر کا اصل منبع اس کی روح ہے۔ اسلئے انسانی زندگی میں کوئی نتیجہ اسی وقت نکل سکتا ہے جبکہ اس کی جڑیں اسکی روح کے اندر پیوست ہوں جس تصور نے انسان کے کسی خارجی مظہر کو اس کا اصل وجود سمجھ کر وہاں اپنا بیج بویا ہو، اس سے کسی

بھی قسم کے حاصل کی امید نہیں کی جاسکتی۔

یہی تمام خرابیاں اسلام کی مذکورہ بالا تشریح میں بھی پیدا ہوگئیں "نظام" کے تصور کو دین کی حکمت جامع قرار دینے کی وجہ سے یہی حیثیت اسلام کی وہ مرکزی حیثیت قرار پائی جس سے اسکی دوسری حیثیات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جامع توجیہہ میں دین کے تمام اجزاء موجود ہونے کے باوجود اپنے صحیح مقام سے ہٹ گئے۔

اب دین کی ساری چیزیں بس نظام کے اجزاء ہونے کی حیثیت سے مطلوب قرار پائیں۔ عقائد و ایمانیات اس لحاظ سے اس کا جزء بنے کہ وہ اس نظام حیات کی فکری بنیادیں" ہیں۔ عبادات اس لحاظ سے اسکا جزء نظر آئے کہ وہ اس نظام کے کارکن یا مطلوب افراد تیار کرنے کیلئے "ٹریننگ کورس" ہیں۔ باہمی سلوک سے متعلق تعلیمات اس لحاظ سے اسکا جزء معلوم ہوئے کہ وہ اس نظام سے وابستہ اشخاص کا "اخلاقی ضابطہ" ہیں۔ حدود و قوانین اس لحاظ سے اس کا جزء ثابت ہوئے کہ وہ اس نظام کی "تمدنی بنیاد" ہیں۔ خلافت و امارت اس لحاظ سے اس کا جزء دکھائی دئے کہ اس کے ذریعہ سے یہ نظام ایک قاہرانہ ادارہ کی صورت اختیار کرتا ہے اور اپنے آپکو بزورنافذ کرتا ہے۔ وغیرہ۔

اس تشریح کا بالکل قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مطلوب اصلی بدل گیا۔ اس تعبیر کے خانے میں اگر دین بحیثیت "نظام" تو بہت ابھر آیا۔ مگر اسکا تعبدی پہلو کمزور پڑ گیا۔ دین کی داخلی حیثیت دب گئی اور دین کی خارجی حیثیت اس کے اوپر چھاگئی۔ جس طرح "انسان" کی مندرجہ بالا تشریح میں سماجی حالات کی تبدیلی اصل انسانی کام قرار پاتی ہے نہ کہ اس کے ذہن اور روح کی تبدیلی۔ اسی طرح دین کی اس تشریح میں دینی جد وجہد کا نشانہ انقلاب نظام قرار پایا۔ حالانکہ دنیا میں بندۂ مومن کا نشانہ یا اس کے عمل کا آخری مقصود اپنے رب سے وہ قلبی اور روحانی تعلق پیدا کرنا ہے جس کو قرآن میں ذکر و شکر، خشیت و تضرع، خشوع و خضوع، اخبات و انابت وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

پھر فطرت اور واقعہ[1] میں عدم مطابقت پیدا ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظریہ اپنے پہلے ہی تجربہ میں شدید ناکام ہوگیا۔ دین کے "مکمل تصور" نے صرف "ناقص" قسم کے

[1] یہاں لفظ واقعہ سے مراد زیر بحث نظام، فطرت سے مراد اصل دین ہے۔

دیندار پیدا کئے۔ بیج کو اس کی اصل جگہ پر نہ بونے کی وجہ سے درخت کا کوئی حصہ بھی صحیح شکل میں پیدا نہیں ہوا۔ خدا اور بندے کا تعلق، جو ایک نہایت اعلیٰ اور لطیف تعلق ہے، اس تعبیر کے خانے میں آکر وہ ایک قسم کا سیاسی تعلق بن گیا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ نظریہ نہ تو قرآن کی آیات پر چسپاں ہوتا ہے اور نہ صلحائے امت کی زندگیاں اسکے "معیار" پر پوری اترتی ہیں۔ دین کا وہ مخصوص نقشہ، جو اس فکر کے نزدیک دین کا صحیح ترین نقشہ ہے، اس کے حق میں سارے قرآن میں کوئی بھی صریح آیت موجود نہیں۔ اس نقشہ کے مطابق بات یہ بنتی ہے کہ دین انسانی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور اس پورے نظام کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کرنا وہ اسلامی مشن ہے جو اہل ایمان کے سپرد ہوا ہے۔ مگر کتاب الٰہی میں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے اس نقطۂ نظر کو واقعی طور پر اخذ کیا جا سکتا ہو۔ اس سلسلے میں جو آیتیں پیش کیجاتی ہیں، انکے بارے میں تفصیلی تجزیہ آگے آرہا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ یہ استدلال کتنا کمزور ہے۔

یہ اس استدلال کی نظریاتی خامی ہوئی۔ اسی طرح عملی اعتبار سے دیکھئے تو امت کی ساری تاریخ میں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس نے اس ڈھنگ پر "جامع انقلابی تحریک" چلائی ہو۔ دنیا کے بیشمار علاقوں میں مسلمان پھیلے اور ہر جگہ انھوں نے دعوت دین کا کام کیا۔ جن میں بہت سے مقامات پر بعد کو اسلام کی حکومتیں بھی قائم ہوئیں۔ مگر کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے "اسلامی انقلاب" برپا کرنے یا "حکومت الٰہیہ" قائم کرنے کی دعوت کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا ہو۔ اس سلسلے میں اگر کسی نے کوئی نظیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ محض تاریخ سازی ہے نہ کہ تاریخ نگاری۔ اب اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ ان تمام لوگوں کی دعوت ادھوری تھی یا ان کو پورے دین کا شعور نہیں تھا، تو ایسی ہر تاویل محض اپنی غلطی کا اعتراف ہوگی۔ کیونکہ اسلام کی پوری دعوتی تاریخ کو ناقص ماننے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم ایک شخص کے خیالات کو ناقص مان لیں۔

اس فکر کا یہ خلا جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ اتنا واضح ہے کہ کوئی بھی غیر جانبدار شخص، جسے قرآن و سنت سے براہ راست آشنا ہونے کا موقع ملا ہو، وہ

اسلام کے منصوص نقشہ کے ساتھ اس فکر کی بے گانگی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ خود اسکے اپنے حلقہ کے اہل علم کو بھی انھیں لوگوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو اس فکر سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ مولانا مودودی کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا مگر ہندوستان میں جو لوگ اس فکر کے وارث ہوئے ہیں، ان کے متعلق بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے متعلق اپنے اندر بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جب جماعت اسلامی ہند کی باگ ڈور ان حضرات کے ہاتھ میں آئی اسی وقت سے ان کا یہ احساس مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ لٹریچر پر نظر ثانی، دستور میں نصب العین کے نقشہ کی تبدیلی، پالیسی میں داخلی پہلو کو سب سے زیادہ جگہ دینا، تقریر اور تحریر میں تربیت کو اولیت کا مقام دینا وغیرہ، وہ واقعات ہیں جو میرے اس بیان کی تصدیق کر رہے ہیں۔

لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہندستان کی جماعت اسلامی کے یہ رہنما موجودہ فکر میں اختلال کو محسوس کرنے کے باوجود اسکا واضح اور متعین شعور نہیں رکھتے، وہ ابھی تک اس کا تجزیہ نہیں کر سکے۔ اسی لئے وہ ابتک اس کے حل کی صحیح تدبیر بھی سوچ نہیں سکے ہیں۔ اُن کے احساس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس فکر کے مجموعی نقشہ میں یہ جو بات ہوئی ہے کہ اسلام کا روحانی پہلو دب گیا ہے اور اس کا سیاسی پہلو اُبھر آیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض ایک اتفاقی واقعہ ہے جو خارجی حالات کے سبب سے پیش آگیا۔ یعنی اس فکر کے علمبرداروں نے جس مخصوص زمانے میں اپنے خیالات پیش کرنے شروع کئے، وہ چونکہ سیاسی ہنگاموں کا زمانہ تھا، ملک میں سیاسی تحریکیں زور شور سے چل رہی تھیں، اس لئے اسکی تحریروں میں سیاست کا غلبہ ہوگیا۔ اب اسکا حل ان کے نزدیک یہ ہے کہ تقریر و تحریر میں دبے ہوئے پہلو کو ابھارا جائے، دین کا متوازن تصور پیش کیا جائے تاکہ سیاست و حکومت کے ساتھ دین کے دوسرے پہلوؤں کو بھی ان کی جگہ حاصل ہو۔

مگر یہ صورت حال کا نہایت ناقص اندازہ ہے۔ یہ لوگ ایک ایسے فکر کو جو درحقیقت دین کی ایک تعبیر ہے محض حالات کا وقتی تاثر سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اس کے حل کے لئے بھی وقتی نوعیت کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ وہ کلی بگاڑ کو جزوی ترمیم کے ذریعہ درست

کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ٹکڑوں کے کھیل (JIGSAW PUZZLE) کا کوئی سٹ جو گھوڑے کے لئے بنایا گیا ہو، اسکو کوئی بچہ اونٹ سمجھ کر غلط شکل میں ترتیب دیدے۔ اب کوئی صاحب کہیں کہ اس تصویر میں بس گردن ذرا سی لمبی ہوگئی ہے۔ اگر اسکی گردن کچھ چھوٹی کر دیجائے تو وہ گھوڑا بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی تدبیر نہیں ہے، کیونکہ ٹکڑوں کے ایک ڈھیر کا گھوڑا یا اونٹ ہونا، اسکی مجموعی حکمت سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی سے گھوڑے کے ٹکڑوں کو اونٹ کے ٹکڑے سمجھے اور اپنے اس ذہن کے مطابق ایک ڈھانچہ بنا ڈالے، تو اس ڈھانچہ میں صرف اتنی سی غلطی نہیں ہوگی کہ اسکی گردن لمبی ہو کر اونٹ کے مانند ہو گئی ہے۔ بلکہ اسی مناسبت سے اسکا پورا وجود بنانے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ اس لئے محض گردن چھوٹی کر دینے سے تصویر حقیقت کے مطابق نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے پورے ڈھانچہ کو توڑ کر از سر نو واقعہ کے مطابق بنانا ہوگا اسکے ہر ہر جزء کو دوبارہ اپنے صحیح مقام پر رکھنا ہوگا۔

دین کا صحیح تصور، جس کے تحت اسکے مختلف اجزاء کو ہم زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور جو کسی خلا کے بغیر پوری اسلامی تاریخ کو ایک تسلسل میں جوڑ دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ دین کی اصل حقیقت خدا سے خوف و محبت اور ولایت و توکل کا تعلق پیدا کرنا ہے۔ اس تعلق کا لازمی مظہر وہ چیز ہے جسکو شریعت کی اصطلاح میں "عبادت" کہا جاتا ہے۔ پھر جب آدمی خدا کو اپنا معبود و مطلوب بنا لیتا ہے اور اس کا پرستار بن جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاملات میں خدا کی پسند کا لحاظ اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے لگتا ہے، وہ اپنے اختیار کو خدا کے اختیار کے تابع کر دیتا ہے۔ پھر خدا کا عابد اور مطیع ہو جانا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس بہترین کام میں لگانا چاہے جو خدا کا کام ہے۔ اور جس کے متعلق خدا چاہتا ہے کہ اس دنیا میں اسے انجام دیا جائے۔ اس لحاظ سے تبلیغ حق اور نصرت دین کے سارے پہلو اس کی زندگی میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گویا دین کی حکمت جامع تعلق باللہ ہے اور دوسری تمام چیزیں اسی اندرونی حقیقت کے مظہر یا اس کے تقاضے کی حیثیت سے اس کے ساتھ

جزئی ہیں۔ نہ کہ نظام، جس کو زیر بحث فکر نے علت جامع قرار دیا ہے اور اسی نسبت سے وہ دین کے تمام فکری اور عملی پہلوؤں کو اس سے مربوط کرتی ہے۔

گویا دینی تعلیمات کے مختلف اجزاء کسی یکساں نوعیت کی "فہرست" کا نام نہیں ہیں، جیسا کہ تصور نظام تقاضا کرتا ہے۔ بلکہ دین کی ایک حقیقت ہے اور بقیہ چیزیں اس کے وہ پہلو ہیں جو مختلف نسبتوں کے تحت اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دین کے کچھ اجزاء باعتبار حقیقت مطلوب ہیں اور کچھ باعتبار اضافت۔ حقیقی تقاضے سے مُراد ہے داخلی اور حسیاتی طور پر خدا کو پالینا اور بالکل اسکا عبد اور پرستار بن جانا۔ اضافی تقاضے سے مُراد وہ تمام احکام ہیں جو خارجی زندگی کے لئے دیئے گئے ہیں اور مختلف حالات و معاملات سے متعلق ہونے کی صورت میں ان کے بارے میں اہل ایمان کے رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقی تقاضا، ہر شخص سے، ہر حال میں لازماً مطلوب ہوتا ہے۔ زمانے یا حالات سے اس کے اوپر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہی وہ اصل اور اولین چیز ہے جس کو اس دنیا میں حاصل کر لینا انسان کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ اس کے برعکس اضافی تقاضا حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتا ہے اور دائرہ اختیار کے لحاظ سے اس کی "تکلیف" گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اگر اضافت موجود ہو تو اسوقت وہ بھی لازماً اسی طرح مطلوب ہوگا جیسے حقیقی تقاضا۔ اور اگر اضافت نہ پائی جا رہی ہو، تو اس حکم کی حد تک، اہل ایمان کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ گویا حقیقت اور اضافت کا یہ فرق دونوں قسم کے احکام کے محض نوعی فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی یہ فرق صرف اس اعتبار سے ہے کہ کون سا حکم کب مطلوب ہے۔ مطلوب و مفروض ہونے کے بعد، ادائگی کے پہلو سے، ان کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

یہ زیر بحث مسئلہ اور اس کے بارے میں میرے نقطۂ نظر کا مختصر تعارف ہے۔ اب اگلے[1] صفحات میں اسکی وضاحت اور اسکے متعلق تفصیلی دلائل کا مطالعہ فرمائیں۔

---

[1] اس سے مراد اصل کتاب "تعبیر کی غلطی" کے صفحات ہیں۔ الفرقان

حرمین شریفین کی حاضری

بعض واقعات و تاثرات

بلاشبہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات بے حد و بے شمار ہیں، بلکہ حق یہ ہے ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ میں بندہ اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں سے مستفید ہوتا ہے ان کا حساب و شمار بھی اس کے امکان سے باہر ہے ——— وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفّار۔ اور ان میں زیادہ نعمتیں وہ ہیں جنکو ہم عامی بندے اپنی نادانی اور غفلت سے محسوس بھی نہیں کرتے لیکن بعض دینی اور دنیوی نعمتیں وہ ہیں جنکو عام طور سے بہت زیادہ محسوس کیا جاتا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سمجھا جاتا ہے، انہی میں سے ایک حج و زیارت کے لئے حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت بھی ہے بشرطیکہ اپنی بداعمالیوں اور بدبختیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ رد نہ ہو۔

رب کریم نے محض اپنے فضل و کرم سے اس عاجز کو بھی اس سال وہاں کی حاضری نصیب فرمائی، یہ سفر ایک حج بدل کے سلسلہ میں تھا اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے قبول فرما کر اپنے اس مرحوم بندے کے لئے جسکی طرف سے یہ کیا گیا اور اُن کے ان متعلقین اور پسماندگان کے لئے جو اسکا ذریعہ بنے اور خود اس گنہگار کے لئے رحمت و مغفرت کا وسیلہ بنائے۔ اللھم اصنع بنا ما انت اھلہ ولا تصنع بنا ما نحن اھلہ انت اہل المغفرۃ واھل الجود واہل الکرم واھل الاحسان۔

یہاں اس سفر کی روداد لکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ بعض واقعات اور تاثرات جن کے تذکرہ میں افادیت یا دلچسپی کا کوئی خاص پہلو ہے یا جن کے ذکر سے ناظرین کے معلومات میں کوئی مفید اضافہ ہو سکتا ہو یا جن کا ذکر کرنا میرے نزدیک فریضۂ شکر و امتنان کا تقاضا ہے بس وہی چیزیں ان صفحات کے ذریعہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی نیت ہے۔

اس سفر مبارک میں شروع سے آخر تک میرے واحد رفیق حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی تھے یہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق کے حقیقی بھتیجے اور خویش ہیں لیکن تعلق غالباً طرفین سے باپ بیٹے کا سا ہے "صدق" کے گویا مینیجنگ اڈیٹر بھی ہیں۔ حکیم صاحب موصوف سے اچھا خاصا تعارف بلکہ تعلق برسوں سے ہے، لکھنؤ میں کچہری روڈ پر میری رہائش گاہ اور دفتر الفرقان کے قریب ہی صدق کا دفتر بھی ہے، لیکن یہ واقعہ ہو کہ حکیم صاحب کو اسی سفر میں جانا پہچانا ——— کسقدر مبنی بر حقیقت ہو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ ایک آدمی دوسرے کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں جان سکتا جب تک سفر یا حضر میں اسکے بالکل ساتھ رہنے کا اتفاق نہ ہو، اس عاجز نے حکیم صاحب کو اس سفر میں جانا کہ وہ گو چھوٹ ایک فاضل طبیب، حافظ قرآن اور اچھے خاصے صاحب علم ہونے کے باوجود کسقدر متواضع اور بے نفس آدمی ہیں ——— سفر میں اور خاص کر اس مبارک سفر میں ایسا رفیق اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے ——— ہم دونوں میں سے کسی کو دوسرے کے ارادہ اور پروگرام کی اطلاع پہلے سے نہیں تھی بس اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے جوڑ دیا۔

"صدق" وغیرہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اُن کے پاس بھی وقت میں گنجائش زیادہ نہ تھی اور مولوی عتیق الرحمان کی طبیعت کی مسلسل ناسازی کی وجہ سے چونکہ الفرقان کی ترتیب وغیرہ کی کچھ فکر اب مجھے بھی کرنی پڑ رہی ہے (جس سے میں بالکل فارغ سا ہو گیا تھا) اس لئے میں بھی زیادہ مدت کے لئے لکھنؤ سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے مجبوراً ہم دونوں نے ہوائی سفر کا پروگرام بنایا تھا۔ اور ۲۷ اپریل کو بمبئی سے جدہ جانے والے حاجیوں کے آخری جہاز میں ہماری سیٹیں رزرو ہوئی تھیں۔

بمبئی کے مخلص احباب بھائی احمد غریب اور بھائی اسمٰعیل ہاشم صاحب وغیرہ کے

خطوط سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس دفعہ حاجیوں کے لئے جو ہوائی جہاز استعمال ہوں گے وہ ایسے قسم کے ہوں گے جو بہت تیز اور بہت اونچے اڑتے ہیں اور صرف چار پانچ گھنٹے میں بمبئی سے جدہ پہونچا دیں گے، مجھے خیال ہوا کہ جب وہ بہت بلند فضا میں پرواز کریں گے تو وہاں کی سردی ہم پر ضرور اثر انداز ہو گی، اور میرا حال برسوں سے یہ ہے کہ اگر سرد فضا اور ہوا میں دس منٹ بھی میرا سر کھلا رہے تو فوراً نزلہ کا سخت حملہ ہو جاتا ہے اور میں بیمار پڑ جاتا ہوں اور کبھی کبھی یہ بیماری خاصی طویل ہو جاتی ہے، اور ہوائی جہاز سے حج کو جانے والے عام طور سے احرام بمبئی ہی سے باندھتے ہیں اور یہی ضروری سمجھا جاتا ہے اور احرام کی حالت میں سر کھلا رہنا ضروری ہے اس لئے میں سوچنے لگا کہ میں اُن بعض علماء کی رائے پر عمل کروں جو ہندوستان سے جانے والے حجاج کے لئے جدہ سے پہلے احرام باندھنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ جدہ پہنچکر احرام باندھنا بھی صحیح سمجھتے ہیں، ہمارے مولانا گیلانی مرحوم کی رائے بھی یہی تھی اور خود اس عاجز کا رجحان بھی یہی ہے، لیکن چونکہ میں نے اس مسئلہ کی اتنی تحقیق نہیں کی تھی کہ اسکی بنا پر عام تعامل کے خلاف عمل کرنا میں اپنے لئے صحیح سمجھتا اسلئے ضرورت اور خواہش کے باوجود میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا، حسن اتفاق کہ روانگی سے چند ہی روز پہلے مئو (ضلع اعظم گڑھ) کا ایک سفر پیش آگیا وہاں میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی[1] کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، مولانا نے فرمایا کہ میری رائے بھی یہی ہے کہ جدہ سے پہلے احرام باندھنا ضروری نہیں اور میں اس پر مطمئن ہوں — اس دور کے علماء اور اصحاب فتویٰ میں مولانا کا جو بلند مقام ہے چونکہ یہ ناچیز اس سے واقف ہے اس لئے آپکے اس فتوے کو کافی سمجھا اور طے کر لیا کہ میں اب جدہ پہونچکر ہی احرام باندھوں گا۔

---

[1] فن حدیث میں مولانا کا تخصص و امتیاز تو ان کی بعض تصانیف کی وجہ سے اب ہماری علمی دنیا میں معلوم بلکہ مشہور ہو چکا ہے لیکن یہ بات کم لوگ جانتے ہونگے کہ فقہ و فتویٰ میں بھی ممدوح کا مقام بہت بلند ہے، قریباً دس سال پہلے کی بات ہے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے دارالعلوم کے دارالافتاء کی صدارت کیلئے مولانا کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور انکو آمادہ کرنے کے دارالعلوم لانے کیلئے خود حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت مولانا طیب صاحب نے مئو کا مستقل سفر فرمایا تھا، اور ان بزرگوں کے احترام میں مولانا دیوبند آنے کے لئے آمادہ بھی ہو گئے تھے، لیکن مئو اور علاقہ کے مسلمانوں نے کسی طرح آنے نہیں دیا اور بعد میں مولانا کو معذرت کرنی پڑی۔ — منہ

۲۳ اور ۲۴ اپریل کی درمیانی شب میں لکھنؤ سے روانہ ہو کر یہ ناچیز اور حکیم عبدالقوی صاحب ۲۵ اپریل کی صبح بمبئی پہونچ گئے، وہاں میں نے بعض احباب سے اسکا تذکرہ بھی کر دیا کہ میرا ارادہ جدہ سے احرام باندھنے کا ہے، حکیم صاحب نے طے کر لیا تھا کہ جو رویہ میں اختیار کروں گا وہی وہ بھی اختیار کریں گے۔ لیکن جب ۲۷ کی صبح ہوئی اور ہوائی اڈہ جانے کا وقت قریب آنے لگا تو میرا ذہن یہ سوچنے لگا کہ جہاز پر حج کو جانے والے اکسو ساٹھ مسافر ہوں گے عام رواج اور تعامل کے مطابق وہ سب یہیں سے احرام باندھ لیں گے اور میں تنہا یا صرف ہم دونوں بغیر احرام کے اپنے عام لباس میں ہوں گے، اس پر ضرور لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوں گی اور ہر ایک اپنی سطح کے مطابق باتیں کرے گا اور خواہ مخواہ لوگوں میں بحث مباحثہ کا ایک سلسلہ چھڑ جائے گا اور ہماری وجہ سے ایک نیا اختلاف اور انتشار برپا ہو جائے گا۔ جب ذہن میں یہ بات آئی تو میں نے رائے بدلدی اور یہیں سے احرام باندھ کر ۱۰ بجے کے قریب ہم ہوائی اڈے روانہ ہو گئے ـــــ مگر یہ ارادہ کر لیا کہ حرمین شریفین میں جن اکابر علماء اور اصحاب فتویٰ سے ملاقات ہوگی ان سے اس مسئلہ کی مزید تحقیق کروں گا۔

پاسپورٹ اور صحت کے سارٹیفکٹ کی جانچ وغیرہ قانونی مراحل طے ہونے کے بعد قریب پونے بارہ بجے حجاج جہاز پر پہونچ گئے اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے ٹھیک ۱۲ بجے جہاز نے پرواز شروع کی جہاز کے عملے کے ایک صاحب نے لاوڈ اسپیکر سے اعلان کیا کہ ہمارے جہاز نے سفر شروع کر دیا، جدہ تک دو ہزار تین سو میل کی مسافت ہے ۵ گھنٹے ۵ منٹ میں یہ پوری مسافت جہاز طے کر کے جدہ کے ہوائی اڈہ پر پہونچے گا۔

جہاز ایر کنڈیشن تھا اسلئے بہت اونچی پرواز کے باوجود سردی بہت زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ تاہم مجھے کمبل اوڑھنا پڑا، ہر مسافر کے لئے ایک ایک کمبل جہاز میں موجود تھا۔ لیکن احرام کی مجبوری سے میں نے کمبل اس طرح اوڑھا کہ سر کھلا رکھا، الحمد للہ نزلہ وغیـــرہ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جہاز اعلان کے مطابق ٹھیک ۵ گھنٹے ۵ منٹ میں جدہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا ـــــ اس وقت ہماری گھڑیوں میں اگرچہ ۵ سے زیادہ بج چکے تھے اور ہندوستان میں عصر کا وقت آچکا تھا لیکن ہندوستان اور حجاز کے طلوع وغروب

کے اوقات میں چونکہ قریباً ڈھائی گھنٹہ کا فرق رہتا ہے اسلئے جدہ میں اسوقت سہ پہر کا وہ وقت تھا جو ہمارے یہاں قریباً تین بجے ہوتا ہے۔ اسلئے ہم نے ظہر کی نماز جدہ کے ہوائی اڈہ پر پڑھی۔ جو احباب میری وجہ سے اڈہ پر آئے ہوئے تھے ان میں سب سے پہلے مولوی فریدالوحیدی فیض آبادی ملے جو پہلے جدہ کے ہندوستانی سفارت خانہ ہی سے متعلق تھے اور اب جدہ ہی میں سعودی عربیہ کے ہوائی محکمہ کے کسی کالج میں انگریزی کے استاد ہیں۔ اسکے بعد مولانا عبداللہ عباس ندوی پر نظر پڑی جو میرے لینے ہی کے لئے مکہ معظمہ سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا علی میاں انھیں کے مکان پر مقیم ہیں اور یہ طے ہو چکا ہے کہ میرا قیام بھی انھیں کے ساتھ رہے گا (یہ مولانا عبداللہ عبداللہ عباس ندوی پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خاص اساتذہ میں سے تھے، اسکے بعد کچھ دنوں جدہ کے ریڈیو سے تعلق رہا گزشتہ سال سے رابطۂ اسلامی نے انکو مانگ لیا ہے، ہم لوگوں سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں، مکہ معظمہ کے محلہ جرول میں حکومت کی طرف یا رابطۂ اسلامیہ کی طرف سے ایک اچھی متوسط درجہ کی وسیع کوٹھی رہائش کے لئے ملی ہوئی ہے) مولانا عبداللہ عباس ندوی کے بعد ہمارے مخلص ترین دوست ارشد صاحب نظر آئے، یہ پہلے پاکستان میں محکمۂ تار و ٹیلیفون کے افسروں میں تھے اب غالباً دو سال سے سعودی عربیہ کی حکومت نے انکی خدمات حاصل کر لی ہیں اور اب سعودی عربیہ کے اس محکمہ کے افسروں میں ہیں، جدہ ہی میں قیام رہتا ہے، میں نے انکو کوئی اطلاع نہیں دی تھی غالباً مولانا علی میاں سے انکو میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا، یہ ہمارے ان خوش نصیب دوستوں میں سے ہیں جن پر بڑا ہی رشک آتا ہے، قریباً ۲۰ سال سے انسے تعلق ہے، تبلیغی کام سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں، جہانتک یاد آتا ہے ابسے تقریباً ۲۰ سال پہلے میوات کے ایک تبلیغی اجتماع ہی میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، جہاں رہتے ہیں اپنی منصبی خدمات مثالی طریقہ پر انجام دیتے ہیں لیکن انکی اصل فکر دین کی فکر ہوتی ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ انکے ذریعہ کتنے بندوں کا تعلق اپنے مالک سے جڑا ہے اب سے چند سال پہلے حکومت پاکستان کی طرف سے وہ جاپان بھیجے گئے تھے، انکی وجہ سے سیکڑوں جاپانی

مشرف با اسلام ہوئے، جن میں بعض بڑے فاضل اور بعض بدھ مذہب کے ممتاز راہب اور درویش بھی تھے۔ آج کل حبشہ میں بھی ایک جاپانی نومسلم فاضل اُن کے پاس مقیم ہیں یہ انکو انگریزی کے ذریعہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھاتے ہیں اور وہ اسکو جاپانی زبان میں منتقل کرتے ہیں قریباً دس پاروں کا ترجمہ مختصر وضاحتی نوٹوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

کسٹم وغیرہ کے مراحل سے فراغت کے بعد ارشد صاحب نے بتایا کہ ہماری سہولت اسمیں ہے کہ تنازل کی رقم (جدہ سے مکہ تک کا بس کا قانونی کرایہ اور فیس معلم وغیرہ) داخل کر کے ہم ورقہ تنازل حاصل کر لیں، پھر جس طرح چاہیں گے اور جب چاہیں گے ہم مکہ معظمہ جا سکیں گے۔ چنانچہ تنازل کی رقم (۸۵ ریال) داخل کر دیئے گئے اور مولانا عبداللہ عباس ندوی سے میں نے کہہ دیا کہ آپ مکہ معظمہ چلے جائیں اور مولانا علی میاں کو میری آمد کی اطلاع دے دیں وہ منتظر ہوں گے۔ ورقہ تنازل مل جانے کے بعد انشاء اللہ میں خود آجاؤں گا اور آپکے مکان پر پہونچ جاؤں گا۔

اس کے بعد ارشد صاحب ہم لوگوں کو اپنی کوٹھی پر لیگئے انکی کوٹھی ماشاءاللہ ہم جیسے انکے جاننے پہچاننے والے حجاج کا مسافر خانہ بنی ہوئی تھی۔ ارشد صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ ہمارا ورقہ تنازل آجائے تو رات کو تہجد کے وقت وہ اپنی کار میں ہمیں مکہ معظمہ پہونچا دیں، لیکن ہوا یہ کہ ورقہ تنازل جن صاحب کو لانا تھا وہ بعد عشاء مجھے دے گئے، مجھے یہ خیال رہا کہ ارشد صاحب کو بھی اسکا علم ہے لیکن انہیں بالکل اطلاع نہیں ہوئی، وہ بیچارے صبح تک بےچینی کے ساتھ منتظر رہے۔ صبح کو جب ناشتہ کے بعد میں نے دریافت کیا کہ کیا پروگرام ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ میں تو تہجد کے وقت آپکو مکہ معظمہ پہونچانے کا پروگرام بنائے ہوئے تھا لیکن ورقہ تنازل ابھی تک نہیں آیا اب میں اسکی فکر میں خود جا رہا ہوں، میں نے بتلایا کہ وہ تو رات ہی مجھے دے گئے تھے، ارشد صاحب کو بیحد افسوس اور قلق ہوا۔ اب چونکہ ارشد صاحب کے دفتر کا وقت قریب آچکا تھا اس لئے خود میں نے یہ طے کیا کہ وہ خود تو اپنے دفتر جائیں اور ہم لوگ ٹیکسی سے مکہ معظمہ چلے جائیں۔ ہندوستانی ٹائم کے لحاظ سے قریباً نو بجے ہم لوگ جدہ سے روانہ ہو سکے، جدہ سے مکہ معظمہ تک کا راستہ تو اب

ایک گھنٹہ کا بھی نہیں رہا ہے لیکن چونکہ درمیان میں متعدد چوکیوں پر پاسپورٹ وغیرہ کی جانچ ہوتی ہے اسلئے راستہ میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت صرف ہوا اور بارہ بجے کے قریب ہم لوگ مکہ معظمہ پہونچے ــ تیاری کر کے اسی وقت حرم شریف چلے گئے، نماز ظہر کے بعد عمرہ کا طواف کیا، اسکے بعد سعی کر کے عمرہ سے فراغت حاصل کی۔

خیال یہ تھا کہ حرم شریف میں خاص کر نمازوں کے اوقات میں کوئی نہ کوئی ایسے دوست مل ہی جائیں گے جن کے ذریعہ میں مولانا علی میاں کو اپنی آمد کی اطلاع دے دوں گا، یا انکی رہنمائی میں، مولانا عبداللہ عباس کے مکان پر پہونچ جاؤں گا لیکن ان دنوں وہاں اسقدر اژدہام تھا کہ تلاش کے باوجود ایسے کوئی صاحب نظر نہیں پڑے۔ نماز مغرب سے کچھ ہی پہلے حیدرآباد کے ایک مخلص دوست ماجد علی صاحب مل گئے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا بڑی محبت سے ملے اور انھوں نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ حرم شریف میں مولانا علی میاں کو تلاش کرینگے اور اگر وہ نہیں مل سکے تو عشاء کے بعد ان کی قیام گاہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مکان پر مجھے پہونچا دیں گے، وہ مکان اُن کا دیکھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ انکو بہتر سے بہتر جزا دے مغرب سے عشاء تک وہ برابر مولانا علی میاں کی تلاش میں حرم شریف میں چکر لگاتے رہے اور جب نہیں پا سکے تو نماز عشاء کے بعد میرے راہنما بن کر مولانا عبداللہ عباس کے مکان تک آئے۔ میں اُس وقت اسقدر خستہ اور تھکا ہوا بلکہ تھکن سے ایسا بے حال تھا کہ اپنے ٹھکانے یعنی مولانا عباس ندوی کے مکان پر پہونچنے کے لئے گویا مضطر تھا اس لئے ان حیدرآبادی دوست کی اس عنایت کے تشکر سے دل برابر لبریز رہا اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل خاص سے نوازے۔

میری غیر معمولی تھکن اور خستگی کی خاص وجہ یہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے معلم مولوی عبدالہادی سکندر صاحب کے کہنے کے باوجود اپنی سابقہ واقفیت اور تجربہ کاری کے اعتماد پر رہنمائی کے لئے اُن کا کوئی آدمی ساتھ نہیں لیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ حرم شریف اور اس کے آس پاس کے جغرافیہ سے میں پوری طرح واقف ہوں اس لئے کیوں کسی کو خواہ مخواہ زحمت دوں، لیکن حرم شریف کی توسیع اور جدید تعمیر نے وہاں کا جغرافیہ

بالکل بدل دیا ہے آس پاس کے بازار اور محلے حرم شریف میں شامل ہو گئے ہیں، اور انکی جگہ حرم شریف کی نئی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔

اس لئے پہلی واقفیت اور تجربہ کاری سے مجھے رہنمائی نہیں مل سکی، اور راستے نہ جاننے کی وجہ سے کافی چکر لگانے پڑے، گرمی کے وقت میں طواف اور سعی بجائے خود اچھا خاصا مجاہدہ تھا، مزید برآں ناواقفی کی وجہ سے جو چکر لگانے پڑ گئے انھوں نے بالکل چور چور کر دیا اس دن کھانا بالقصد اسلئے نہیں کھایا تھا کہ دن کو کھانے کے بعد فوراً کچھ دیر کیلئے لیٹنے کا میں عادی ہوں، میں نے طے کیا تھا کہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہی انشاء اللہ کچھ کھاؤں گا، لیکن عمرہ سے فراغت عصر کے وقت ہو سکی، اور عصر کے بعد مولانا علی میاں وغیرہ کی تلاش میں حرم شریف میں چکر لگاتا رہا، اس طرح بے کھائے پئے مسلسل چلتا پھرتا رہا —— بہرحال عشاء کے بعد جب ان حیدرآبادی دوست کی رہنمائی میں میں مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مکان پر پہونچا اور مولانا علی میاں وغیرہ سے ملاقات ہوئی تو الحمد للہ ساری تھکن اور خستگی کافور ہو گئی، اور گویا جسم میں نئی جان آگئی۔

مولانا موصوف صبح سے میرے منتظر تھے اور میرے نہ پہونچنے کی وجہ سے سخت تشویش میں مبتلا تھے، انھوں نے متعدد دوستوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے حرم شریف میں تلاش کریں، لیکن باوجودیکہ ظہر کی نماز میں نے حرم شریف میں پڑھی اسکے بعد وہیں طواف کیا پھر سعی کی، پھر وہیں عصر پڑھی اور عصر سے مغرب تک حرم شریف ہی میں چکر لگاتا رہا اور پھر مغرب سے عشاء تک بھی حرم شریف ہی میں رہا لیکن اللہ کی شان نہ اُن میں سے کوئی دوست مجھے دیکھ سکا اور نہ میں کسی کو پا سکا، اژدہام ہی اتنا غیر معمولی تھا کہ کسی کو تلاش کرنا اور پانا بہت ہی مشکل تھا ——

اب سے بارہ برس پہلے ۱۹۵۱ء میں اور اس سے دو سال پہلے ۱۹۴۹ء میں جب حاضری نصیب ہوئی تھی تب بھی حجاج کی تعداد پچھلے برسوں سے زیادہ بتلائی جاتی تھی لیکن اس سال میں نے اندازہ کیا کہ حرم شریف کا مجمع ان دونوں سالوں کے مقابلہ میں کم سے کم دوگنا ضرور تھا۔ ترکوں کے بنائے ہوئے قدیم حرم شریف میں بہ یک وقت زیادہ سے

زیادہ اسّی پچاسی ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے اور ۴۹ء اور ۵۱ء میں دیکھا تھا کہ نمازوں کے اوقات میں وہ بالکل بھرا رہتا تھا اور بعض دروازوں کے باہر بھی صفیں ہوتی تھیں، اب حرم شریف کی نئی تعمیر کا جتنا حصہ مکمل ہو چکا ہے اسمیں دو لاکھ سے زیادہ کی گنجائش ہوگی، اس سال وہ سب اسی طرح بھرا رہتا تھا جس طرح اب سے بارہ چودہ سال پہلے قدیم حرم شریف بھرا رہتا تھا۔

حج کا اجتماع اس لحاظ سے بھی دنیا کا عظیم ترین اور مبارک ترین بین الاقوامی اجتماع ہے کہ اسمیں صرف اللہ کے نام پر اور اسکے حضور میں اپنی بندگی اور فدویت ہی کے اظہار کے لئے ہر رنگ و نسل کے اور سیکڑوں زبانوں کے بولنے والے بندے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال سے لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں —— اس دنیا میں امت مسلمہ کی یہ عظیم ترین خصوصیت اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہو —— لیکن افسوس کہ ہماری دوسری چیزوں کی طرح حج بھی روح و حقیقت سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔

ایک قابل ذکر اور بہت اہم بات یہ ہو کہ اس سال حجاج میں سب سے بڑی تعداد ترکوں کی تھی۔ یعنی ساڑھے چوبیس ہزار سے بھی زیادہ، ان میں کچھ تو ہوائی جہازوں سے آئے تھے لیکن زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے ترکی سے مکہ معظمہ تک کا سفر بسوں میں کیا تھا۔ یہ بسیں ترکی کی تھیں، اتنی شاندار اور اعلیٰ قسم کی بسیں کبھی نہیں دیکھیں۔ ان بسوں میں ریل کے ڈبوں کی طرح پانی کی ٹنکی اور بیت الخلاء وغیرہ کا بھی پورا انتظام تھا۔ اسی لئے مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں اس سال ترکوں نے مکانات کرائے پر گویا بالکل نہیں لئے، یہ بسیں ہی انکی مستقل قیام گاہ تھیں۔ ہوائی جہاز کے طرز کی نہایت آرام دہ سیٹیں تھیں جن پر آدمی سو بھی سکتا تھا۔

یہ ترک ظاہری وضع اور صورت کے لحاظ سے بھی عموماً دین دار معلوم ہوتے تھے حیرت ہو کہ اس قوم کے دل میں دین و ایمان کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ کمال اتاترک کے دور سے لیکر اب تک قریباً چالیس سال ہو چکے ہیں اس پوری مدت میں اس قوم کے دینی جذبہ کو ختم کرنے اور اسکی بیدار روح کو فنا کرنے کی کوششیں اور تدبیریں حکومت کی

طرف سے قریباً مسلسل ہوتی رہتی ہیں، لیکن ابتک اس قوم میں دین کیساتھ اسدرجہ کا تعلق موجود ہے کہ شاید ہی کسی ملک کے مسلمان اس چیز میں انکے ہم پلہ ہوں، ان میں سے جس پڑھے لکھے سے بات کرنے کا اتفاق ہوا یہی اندازہ ہوا کہ کمال اتاترک سے وہ سخت بیزار ہیں اور اسکو دین و ایمان کا قاتل سمجھتے ہیں۔ دراصل تمام مسلمان ممالک کا یہی مسئلہ ہو کہ وہاں کے عوام صاحب ایمان ہیں لیکن دینی رہنماؤں کی وقت کے تقاضوں سے بیخبری اور سیاسی قیادت کی عدم صلاحیت کی وجہ سے مغربیت زدہ بے دین عناصر انکے سیاسی قائد اور حکمراں بن جاتے ہیں اور چونکہ وہ خود اسلام کے ساتھ نہیں چل سکتے اس لئے اپنی قیادت اور اقتدار حکومت کو محفوظ رکھنے کے لئے عوام کو اپنا ہم مشرب اور ہمنوا بنانا ضروری سمجھتے ہیں۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قریب قریب تمام ممالک اسلامیہ میں یہی ہو رہا ہے معلوم نہیں کب وہ دن آئے گا جب اہل دین اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کریں گے۔

پچھلے سالوں میں حج میں سب سے نمایاں عنصر مصریوں کا ہوتا تھا اس سال مصری گویا بالکل نہیں تھے۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ اس علاقہ کے یمنی بھی نہیں تھے جو عبداللہ سلال کے زیر اقتدار ہے اور وہی یمن کا بڑا اور اہم حصہ ہے۔ ان دونوں حکومتوں کا چونکہ سعودی حکومت سے اس وقت اختلاف چل رہا ہے، اور اس نے بہت افسوسناک شکل اختیار کر لی ہے اسلئے ان دونوں حکومتوں نے اس سال اپنے عوام کو حج کی اجازت نہیں دی، اور غالباً اپنے عوام کی تسلی ہی کے لئے قاہرہ ریڈیو حج کے چند دن پہلے سے مسلسل یہ پروپیگنڈہ کرتا رہا کہ "چونکہ سعودی عربیہ میں ہر وقت انقلاب کا خطرہ ہے اور حالات ٹھیک نہیں ہیں اس لئے اس سال حجاج بہت ہی کم آئے ہیں بس ہندوستان اور پاکستان سے چند ہزار آئے ہیں اور اکثر اسلامی ممالک نے سعودی عرب کی غلط روی کی وجہ سے بائیکاٹ کر دیا ہے۔ اور یہ کہ حرم شریف اس وقت فوجی چھاؤنی بنا ہوا ہے ہر طرف ٹینک لگے ہوئے ہیں اور گرانی بھی بیحد ہے ایک روٹی دو ریال یعنی دو روپے میں مل رہی ہے"۔ اگر میں اس موقع پر خود مکہ معظمہ میں حاضر نہ ہوتا تو یہی سمجھتا کہ ایمیں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہوگی، مصر کی موجودہ حکومت سے اصولی اور ذہنی شدید

اختلاف کے باوجود میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سیاسی مقاصد کے لئے ایسا سو فیصدی جھوٹ بھی ریڈیو سے نشر کیا جاتا ہے۔ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ حرم شریف اپنی عظیم وسعت کے باوجود حجاج سے کیسا بھرا رہتا تھا۔ اور ٹینک تو کیا ہم نے تو کوئی رائفل بردار فوجی دستہ بھی نہیں دیکھا اور گرانی کی حقیقت یہ ہے کہ جو روٹی اب سے بارہ چودہ سال پہلے تین قرش (تقریباً ڈھائی آنے) میں ہم خریدا کرتے تھے اس سال بھی وہ تین قرش ہی میں مل رہی تھی (یہ دراصل ایک قسم کی ڈبل روٹی ہوتی ہے جو متوسط خوراک والے کے لئے کافی ہوتی ہے اور میں تو اکثر اوقات صرف آدھی ہی کھا سکتا تھا۔) روٹی کے علاوہ پھلوں کی ارزانی تو حیرت انگیز تھی، اتنے بڑے بین الاقوامی اجتماع کے دنوں میں بہت اچھی موسمبی ایک روپیہ اُگہ (ایک اُگہ ہمارے یہاں کے سوا سیر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے) سیب دو ریال اُگہ، ہاں ترکاریاں ہمارے یہاں کے لحاظ سے خاصی گراں تھیں غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہاں وہ اتنی بڑی مقدار میں نہیں ہوتیں جو اتنے بڑے مجمع کی مانگ پوری کر سکیں۔

بہر حال اپنی عمر میں مجھے سب سے پہلے یہ تجربہ وہیں ہوا کہ کسی حکومت کے ریڈیو کے نشریات اتنے بے بنیاد اور ایسے سو فیصدی غلط بھی ہو سکتے ہیں۔

دوسرے ملکوں سے آنے والے حجاج کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ برسہا برس کے بعد اس سال ایرانی بہت بڑی تعداد میں آئے تھے یعنی گیارہ ہزار سے کچھ زیادہ ان میں غالب اکثریت شیعوں کی تھی جن میں علماء اور عربی داں حضرات بھی خاصے تھے۔ انکے طور طریقوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ شیعہ ہیں — پھر حج سے فارغ ہو کر جب میں ۱۲ ذی الحجہ کو مدینہ طیبہ پہونچا تو غالباً یہ سارا ایرانی عنصر وہاں پہونچ چکا تھا یہ لوگ مواجہہ شریف میں نہیں آتے تھے بلکہ سرہانے کی جانب یا خوخہ میں کھڑے ہو کر سلام پڑھتے تھے۔ بعض وقت بالکل شیعی مجلسوں کا سا سماں ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ اس سال بالکل نئی سی بات تھی اسی طرح یہ لوگ مسجد نبوی میں جماعت

کے بعد مختلف مقامات پر اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اس سال نئی بات تھی۔

میں شروع میں ذکر کر چکا ہوں کہ پہلے میرا خیال جدہ پہونچکر احرام باندھنے کا تھا لیکن بعد میں میں نے رائے بدلدی اور بمبئی سے روانہ ہونے کے وقت ہی عام رواج کے مطابق احرام باندھ لیا۔ مگر اس کے ساتھ ارادہ کر لیا کہ حرمین شریفین میں جن اکابر علماء اور اصحاب فتوی سے ملاقات ہوگی ان سے تبادلۂ خیالات کر کے اس مسئلہ میں مزید تحقیق اور اطمینان حاصل کر دوں گا ـــــ مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد ایسے حضرات میں سے سب سے پہلی ملاقات حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند سے ہوئی۔ میں نے جب انکے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت مولانا بشیر محمد صاحب سندھی مہاجر مدنی اس وقت میری نظر میں خاص کر مناسک کے باب میں اس عصر کے امام ہیں، انکی تحقیق یہی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے حجاج خواہ وہ بحری راستہ سے آئیں یا ہوائی راستہ سے جدہ سے پہلے ان کو احرام باندھنا ضروری نہیں۔ انہوں نے مناسک پر اپنی کتاب میں بھی بہت تفصیل سے اس پر مدلل بحث کی ہے انکی اس تحقیق سے مجھے پورا اتفاق ہے[1] آپ مدینہ طیبہ جائیں تو ان سے اس مسئلہ پر بالمشافہ گفتگو کریں۔ میں چونکہ حضرت مولانا بشیر محمد صاحب سے پہلے سے واقف ہوں اور یہ سنتا رہا ہوں کہ مناسک یعنی مسائل حج کے بارے میں وہ اس وقت مرجع ہیں، اور ان کی کتاب گویا آخری کتاب ہے، اسلئے مولانا محمد شفیع صاحب کی اس گفتگو کے بعد میں نے یہی طے کر لیا کہ اب مدینہ طیبہ جا کر حضرت مولانا بشیر محمد صاحب ہی سے اس مسئلہ پر بات کروں گا۔ چنانچہ ۲۱ ذالحجہ کو جب میں مدینہ طیبہ پہونچا تو اسی دن حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت مولانا کا سن غالباً سو سے متجاوز ہوگا، ہمارے اکابر کے اس طبقہ سے ہیں جو اب

---

[1] ان کی اس کتاب "قرۃ العینین" کا آخری مکمل اڈیشن کراچی سے شائع ہوا ہے لیکن اسقدر غلط بلکہ مسخ ہے کہ اس عاجز کے نزدیک بغیر تصحیح کے اسکی فروخت اور عام اشاعت شرعاً جائز نہیں ہے، میں نے خود دیکھا ہے جابجا جائز کی جگہ ناجائز اور ناجائز کی جگہ جائز چھپا ہوا ہے اسی طرح عربی عبارتوں میں بکثرت اور لاعلاج غلطیاں موجود ہیں۔ ـــ نعمانی

دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ اس عاجز کے نزدیک انکی بڑی اور اصل خصوصیت یہ ہو کہ وہ اس دور کے اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ متعنا اللہ بفیوضہم ——— ۱۲ر ذالحجہ کو جب میں انکی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے انتہائی ضعف کے باوجود جسکی وجہ سے ان کے لیے بات کرنا بھی مشکل ہے از خود اس مسئلہ پر بہت تفصیلی گفتگو فرمائی ایسی کہ اسکے بعد مسئلہ بالکل آئینہ ہوگیا، اور یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی کہ کتابوں میں جو عام طور سے یہ لکھا ہوا ہے کہ اہل ہند کا میقات یلملم ہے جسکے مطابق عمل ہو رہا ہے اسکی حقیقت کیا ہے۔ اور اب صورت حال میں کیا فرق پڑا ہے جسکی بنا پر تحقیقی بات یہ ہو کہ ہندستانی حجاج جدہ پہونچکر بھی احرام باندھ سکتے ہیں۔ انشاء اللہ اس مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ ایک مستقل مضمون قریبی فرصت میں لکھا جاسکے گا۔

ضروری اعلان:— الفرقان کے اڈیٹر مولانا عتیق الرحمان سنبھلی کی ناسازی طبع کی وجہ سے گزشتہ مہینہ مئی کا شمارہ ۱۸ر تاریخ کو شائع ہو سکا تھا، اس لئے پرچہ نہ پہونچنے کے بہت سے شکایتی خطوط دفتر میں آئے، جن حضرات کے خطوط ۲۰ر مئی تک آچکے تھے ان کو ہم نے یہ سمجھ کر پرچہ دوبارہ نہیں روانہ کیا کہ خط لکھنے کے بعد انشاء اللہ پرچہ اُن کو مل گیا ہوگا — اگر بالفرض کسی صاحب کو نہ ملا ہو تو وہ دوبارہ خط لکھنے کی زحمت فرمائیں پرچہ دفتر میں موجود ہے روانہ کر دیا جائے گا۔

منیجر الفرقان

حضرت رائے پوری (قدس سرہ) کی نعشِ مبارک کی منتقلی کا مسئلہ

ہندستان اور پاکستان کے اکابر علماء کا فتویٰ

نگاہ اولیں کے صفحات میں اس المناک مسئلہ سے متعلق جس فتوے کا ذکر کیا گیا تھا وہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے ـــــ استفتا کرنے والے حضرت قدس سرہ کے حقیقی بھتیجے مولانا عبد الجلیل صاحب ہیں، جو وطن لے جاکر حضرت کو دفن کرنے کے اصل ذمہ دار بتائے جاتے ہیں۔ اور اصل جواب لکھنے والے لائل پور کے مفتی مولانا زین العابدین صاحب ہیں۔ انہی کے جواب کی توثیق اور تصدیق دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور وغیرہ کے اکابر علماء، اور اصحاب فتویٰ اور اسی طرح پاکستان کے اکابر و مشاہیر علماء و اہل فتویٰ نے فرمائی ہے۔

فتوے میں کتب فقہ کی عبارتوں کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے جیسا کہ اصحاب فتویٰ کا عام دستور ہے۔ ناظرین الفرقان کے لیے فٹ نوٹ میں ان کا خلاصہ لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض اصطلاحی الفاظ کی وضاحت بھی فٹ نوٹ میں یا قوسین میں کر دی گئی ہے ـــــ

یہ فتوے لائل پور کے مشہور ہفتہ وار "المنبر" میں شائع ہوا ہے وہیں سے نقل کیا جارہا ہے۔

استفتاء

ہمارا گاؤں دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ جب دریا میں سیلاب آتا ہے تو گاؤں پانی سے بھر جاتا ہے تین سال قبل تو اکثر مکانات گر گئے۔ اسی بنا پر گاؤں کی مسجد کو بھی از سر نو پانچ فٹ اونچی کرسی رکھ کر بنایا گیا۔ ابھی اس کے صحن اور مسجد کے ساتھ والے حجروں کے صحن میں پانچ فٹ اونچی مٹی ڈال کر مسجد کی کرسی کے برابر کرنا باقی تھا کہ ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا اور اہل گاؤں نے طے کیا کہ حجروں کے سامنے والے خارج از مسجد ۲۰ فٹ لمبے صحن میں مرحوم کی قبر بنائی جائے۔ سیلابی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر لحد نہیں بن سکتی چند فٹ کھودنے پر گیلی مٹی اور کبھی کیچڑ نکلنے لگتا ہے۔ اس بنا پر ہم نے یہ خیال کیا کہ اس جگہ پر ۲۰ فٹ چوڑا اور ۳۰ فٹ لمبا اور پانچ فٹ اونچا چبوترہ بنانا تو پہلے سے ہی طے ہے اس وقت زمین کے اوپر اینٹوں سے پانچ فٹ اونچی شق بنا کر اس کے اندر تابوت رکھ دیا جائے اور صحن گرد و نواح قبر میں مٹی ڈال کر حسب پروگرام چبوترہ بنا دیا جائے۔ اسی وقت چند علماء سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اگر اس جگہ پر پہلے چبوترہ بنا ہوتا تو کھود کر بھی اسی طرح شق بنائی جاتی علاوہ سیلاب کا خطرہ بھی ہے۔ نیز اس وقت پکی اینٹیں گاؤں میں موجود نہ تھیں اس لیے نیچے اوپر کچی اینٹیں لگا دی گئیں اور اس کے بعد قبر کے ارد گرد ۳۰ فٹ لمبا اور ۲۰ فٹ چوڑا پانچ فٹ اونچی مٹی ڈال کر چبوترہ بنا دیا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تدفین محقق نہیں ہوئی اس لیے اس بزرگ کی نعش مبارک والے لکڑی کے تابوت کو یہاں سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے۔ کیا تدفین محقق ہو گئی یا نہ۔ اور اب اس تابوت کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے یا ناجائز۔

عبد الجلیل

الجواب

کبیری ص۵۹۱ پر ہے والشق ان یحفر حفیرۃ کالنھر ویبنی جانباھا

---

۱ کبیری کی اس عبارت کے جس حصے سے مفتی صاحب کے استدلال کا خاص تعلق ہے وہ اس کا بالکل آخری (باقی بر صفحہ آئندہ)

باللبن او غیرہ ویوضع المیت بینھا ویسقف علیہ باللبن او بالخشب ولا یمس السقف المیت واستحب بعض الصحابۃ ان یرمس فی التراب رمساً یروی ذالک عن عبداللہ بن عمرو بن العاص قال لیس احد جنبی اولی بالتراب من الآخر وقال صاحب المنافع اختار والشق فی دیارنا لرخاوۃ الارض فیتعذر اللحد فیھا حتی اجازوا الآجر ورفوف الخشب واتخاذ التابوت ولو کان من حدید ومثلہ فی المبسوط۔

البدائع والصنائع ص ۳۱۸ ج ۱ پر ہے وکان الشیخ ابوبکر محمد بن الفضل البخاری یقول لا بأس بالآجر فی دیارنا لرخاوۃ الارض وکان ایضاً یجوز رفوف الخشب واتخاذ التابوت للمیت حتی قال لو اتخذوا التابوت من حدید لم ارَ بہ بأساً فی ھذہ الدیار

شامی ص ۸۳۳ ج ۱ (وحفر قبرہ) فی غیر دار (مقدار نصف قامۃ) وھذا احد العمق والمقصود منہ المبالغۃ فی منع الرائحۃ ونبش السباع۔

طحطاوی ص ۳۶۶ پر ہے۔ واوصی کثیر من الصحابۃ ان یرمسوا فی التراب من غیر لحد ولا شق وقال لیس احد جنبی اولی بالتراب من الآخر ولو قی وجھہ التراب بلبنتین او ثلاث۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) خط کشیدہ حصہ کا حاصل یہ ہے کہ جس علاقہ میں زمین ایسی خام اور نرم ہو کہ بغلی قبر وہاں نہ بن سکے وہاں فقہائے دوسرے طرز کی قبر کو بہتر قرار دیا ہے جس کو "شق" کہتے ہیں (جس کا طریقہ یہ ہو کہ پہلے قبر کا عمق کھودا جاتا ہو، پھر میت کے طول اور عرض کے مطابق اس کے وسط میں کسی قدر گہرا گڑھا بنایا جاتا ہو اور اس میں میت کو رکھ کر تختوں وغیرہ سے اس کو پاٹ دیا جاتا ہے پھر جو مٹی سے بند کر کے قبر بنا دی جاتی ہے) کبیری کے اس آخری خط کشیدہ حصہ میں "مبسوط" وغیرہ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ زمین کے خام اور نرم ہونے کی صورت میں فقہائے قبر میں پکی اینٹوں اور لکڑی کے تختوں اور تابوت کے استعمال کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اگرچہ تابوت لوہے کا ہو۔

لہ "البدائع والصنائع" کی اس عبارت کا حاصل بھی وہی ہے جو کبیری کی عبارت کا اوپر لکھا گیا اور قریب قریب انہی الفاظ میں یہ عبارت کتاب المبسوط کے ص ۶۲ ج ۲ پر بھی ہے۔ لہ طحطاوی کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

فتاوی دارالعلوم ص ۱۲۲ سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید متوفی کا دوسرے موضع میں انتقال ہوا، وارث کے پہونچنے سے پہلے غسل دیا گیا۔ وارث نے ظاہر کر دیا کہ میں میت کو اپنے شہر لے جاؤں گا اس موضع میں ہم راضی نہیں ہیں۔ باشندگان موضع مذکور نے بغیر کندنی قبر کے ہموار زمین پر صندوقچہ میں میت کو رکھ کر جبراً بلا رضا وارث کے قبر کے گرد اینٹیں لگا دیں اور قبر کا نمونہ بنا دیا۔ اب دعویٰ فریقین عدالت میں ہے اور حکم طلب ہے کہ فیصلہ شریعت پر کیا جائے۔

الجواب:۔ شریعت کے موافق اب میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا درست نہیں اور یہ طریقہ اگرچہ خلاف سنت ہے کہ بغیر قبر کھودے صندوق میں میت کو رکھ کر قبر بنائی جائے، لیکن جب کہ قبر بنا دی گئی تو اب اس کو نہ کھولا جائے اور میت کو اس میں سے نہ نکالا جائے۔

(آگے حوالہ جات ہیں۔)

کتبہٗ عزیز الرحمن عفی عنہ

مذکورہ عبارات سے ظاہر ہے کہ اعذار کی بنا پر لحد کے بجائے شق اور رخاوۃ ارض زمین کے خام اور نرم ہونے) کی وجہ سے پختہ اینٹوں اور تابوت حدید (لوہے کے تابوت) تک کو تمام فقہا نے بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔ طحطاوی اور کبیری کی خط کشیدہ عبارت سے لحد و شق ہر دو جائز ہیں بنا بریں جب آپ کی زمین سیلابی ہے اور جہاں قبر بنائی وہ نیچی تھی اور وہاں تقریباً پانچ فٹ اونچی مٹی ڈال کر باقی زمین کے برابر کرنا پہلے سے طے تھا چنانچہ ۲۸ فٹ لمبی ۲۸ فٹ

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں سے بہت سوں نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ ان کے لیے نہ لحد (بغلی قبر) بنائی جائے اور نہ شق (جس کی صورت اوپر بتائی جا چکی) بلکہ گڑھا کھود کر اور اس میں ان کی نعش رکھ کر براہ راست اس پر مٹی ڈال دی جائے تاکہ ان کے نیچے کی طرح دائیں بائیں اور اوپر بھی مٹی ہی مٹی ہو صرف چہرہ کو دو تین کچی اینٹیں رکھ کر محفوظ کر دیا جائے۔ صحابۂ کرام کی اس وصیت سے معلوم ہوا کہ دفن کے صرف یہی دو طریقے نہیں ہیں جو معروف ہیں یعنی لحد اور شق۔ بلکہ اگر میت کو گڑھے میں رکھ کر اوپر سے براہ راست مٹی ڈال دی جائے تب بھی شرعی دفن متحقق ہو جائے گا۔ اور جیسا کہ معلوم ہوا۔ بعض صحابۂ کرام سے اپنے حق میں اس کی بھی وصیت منقول ہے۔ کبیری کی منقولہ بالا عبارت میں اس وصیت کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا متعین طور سے نام لیا گیا ہے۔

چوڑی اور پانچ فٹ اونچی مٹی اس پر بنائی ہوئی شق کے ارد گرد ڈال دی گئی۔ تو بصورت شق بلاشبہ تدفین محقق ہو گئی اور عزیز الفتادی کی عبارت سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بلا ضرورت اور بلا اجازت ولی جبراً بھی زمین پر صندوق رکھ کر ارد گرد اینٹیں لگا دی جائیں تو تدفین محقق ہو جاتی ہے، اگرچہ یہ صورت خلاف سنت ہے۔

۲ اور قبر بن جانے کے بعد کھولنا اور میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا بالاجماع حرام ہے۔
(الا لحق آدمی)

چاہے میت نے کسی اور جگہ دفن کرنے کی وصیت کی ہو۔ یہاں تک کہ اگر میت کو بلا غسل یا بلا کفن یا بلا جنازہ یا مستدبراً الی القبلہ دفن کر دیا گیا ہو تو غسل دینے جنازہ پڑھنے اور میت کو قبلہ رخ کرنے کی جیسی اہم ضرورتوں کے لیے بھی قبر کھولنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔

نور الایضاح ص۱۴۱۔ ولا یجوز نقلہ بعد دفنہ بالاجماع الا ان تکون الارض مغصوبۃ او اخذت بالشفعۃ

شامی ص۲۴۴/۱۔ ولذا ابطلنا الوصیۃ بان یکفن فی ثوب کذا او یدفن فی موضع

---

(۱) نور الایضاح۔ شامی۔ خلاصۃ الفتادی اور کبیری کی ان منقولہ عبارتوں میں مندرجہ ذیل امور کی صراحت کی گئی ہے:
(۱) کسی میت کو دفن کے بعد صرف ایسی ہی صورت میں منتقل کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کو غاصبانہ طور پر کسی دوسرے کی زمین میں دفن کر دیا گیا ہو۔ یا شفعہ کے ذریعہ اس زمین کا مالک کوئی دوسرا ہو گیا ہو۔ ان صورتوں کے سوا دفن کے بعد نعش کو دوسری جگہ منتقل کرنا بالاجماع ناجائز ہے۔
(۲) اگر کسی نے وصیت کی تھی کہ اس کو فلاں خاص کپڑے کا کفن دیا جائے یا فلاں جگہ دفن کیا جائے تو یہ وصیت باطل ہے یعنی واجب العمل نہیں ہے۔
(۳) اگر بالفرض کسی میت کو بغیر کفن کے یا بغیر غسل دیئے دفن کر دیا گیا ہو۔ یا اسی طرح اس کے جنازہ کی نماز پڑھے بغیر اس کو سپرد خاک کر دیا گیا ہو تب بھی کفن دینے یا غسل دینے یا نماز پڑھنے کے لیے میت کو دفن کے بعد قبر سے نکالنا جائز نہیں۔ (ہاں نماز جنازہ مقررہ مدت کے اندر اندر قبر ہی پر پڑھی جائے گی۔)

کذالکما عزاہ الی المحیط الا ان المذکور فی المنتقی ان ہذہ الوصیۃ باطلۃ

خلاصۃ الفتاوی ص۲۲۵ - اذا دفن بغیر کفن لا ینبش القبر ولو دفن قبل الغسل لا ینبش ایضاً وقبل الصلوٰۃ قد مر ایضاً

کبیری ص۵۵۵ - وکذا لو لم یغسل اصلاً ولم یکفن فانہ لا ینبش بعد ما اہیل علیہ التراب لان الغسل والکفن مامور والنبش حرام۔ والنہی راجح علی الامر ہذا ما ظہر لی والعلم عند اللہ الخبیر۔

زین العابدین غفرلہٗ

اس فتوے کی تصدیق و توثیق ہندوستان کے اکابر علماء و اصحاب فتویٰ میں سے مندرجہ ذیل حضرات نے فرمائی ہے۔

حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا جمیل الرحمٰن صاحب نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا مسعود احمد صاحب نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا فخرالحسن صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا مفتی سعید احمد صاحب مظاہری مفتی مظاہر علوم سہارنپور، مولانا یحییٰ صاحب نائب مفتی مظاہر علوم، مولانا عبدالعزیز صاحب نائب مفتی مظاہر علوم، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مظاہر علوم، حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب ناظم اعلیٰ مظاہر علوم، حضرت مولانا منظور احمد صاحب استاذ حدیث مظاہر علوم

اور پاکستان کے اکابر علماء و مشاہیر اہل فتویٰ میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے دستخط اس فتوے پر ثبت ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، کراچی، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، کراچی، حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی، حضرت مولانا عبدالصمد صاحب قاضی القضاۃ ریاست قلات، حضرت مولانا خیر محمد صاحب خیرالمدارس ملتان، حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب مفتی خیرالمدارس ملتان، مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب راسٹرپوری (میاں چنوں)، مولانا عبدالحق صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، مولانا مفتی محمد یوسف صاحب مفتی دارالعلوم حقانیہ

ان میں سے اکثر حضرات نے "الجواب صحیح" یا "اصاب من اجاب" جیسے معروف الفاظ لکھ کر فتوے کی صحت و توثیق و تصدیق کی ہے اور بعض حضرات نے تائید میں کچھ مضمون بھی لکھا ہے لیکن اختصار کے پیش نظر ان حضرات کے صرف اسمائے گرامی لکھ دیئے گئے ہیں۔

— الفرقان

راستہ کھل گیا ہے کہ وہ حکومت سے اس کی نعش کو اکھڑوا کر یہاں منگوانے کا مطالبہ کرنے اور اس طرح اس کے امنو کو صدمہ پہونچائے ــــ ہماری حد سے بڑھی ہوئی موجودہ گراوٹ اور بدبختی میں اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں یہ قطعاً ناممکن نہیں ہے بلکہ اب ہم کو اس طرح کے نئے نئے تکلیف دہ واقعات کے دیکھنے سننے اور اخباروں میں پڑھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

(۴) آخری بات دلی رنج اور دکھ کے ساتھ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ ہمارے حضرت قدس سرہٗ کی خانقاہ اس آخری دور میں صحیح تصوف کی ایسی نمائندہ خانقاہ سمجھی جاتی تھی اور بلاشبہ تھی کہ تصوف کے معترضین اور منکرین کے سامنے بلاتکلف مثال کے طور پر اس کا نام لے دیا جاتا تھا۔ لیکن اس قضیہ نے اور اس کے ساتھ اس شہرت نے کہ نعش مبارک کی منتقلی کی اس تحریک کے اٹھانے والے اور حکومت ہند سے یہ مطالبہ کرانے والے اس خانقاہ کے خواص متعلقین میں سے ہیں، خانقاہ کے اعتماد کو اور نفسِ تصوف کو اتنا مجروح کیا ہے کہ اگر کوئی مخالف ساری عمر زور لگاتا تو اس قدر مجروح نہیں کر سکتا تھا ـــــ کاش میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ جس طرح اب سے ۵-۶ مہینے پہلے شعبان میں پہلی دفعہ یہ بات سن کر اس کا یقین نہیں کیا تھا اب بھی میں اس کا یقین نہ کرتا اور ان سب باتوں کو افواہ یا خواہ مخواہ کے اوہام و وساوس قرار دے سکتا۔

"تعبیر کی غلطی"

اس اشاعت میں جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڈھ) کا ایک مضمون "تعبیر کی غلطی" شائع ہو رہا ہے، موصوف جماعتِ اسلامی ہند کے صفِ اول کے اصحابِ فکر اور اہلِ قلم میں رہے ہیں۔ ایک مدت تک اس کے شعبۂ تصنیف سے متعلق اور مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی رہے ہیں، اسی درمیان میں انھیں مولانا مودودی صاحب کے دینی فکر میں کچھ بنیادی غلطیاں محسوس ہوئیں، انھوں نے اس پر خود بھی غور و فکر جاری رکھا اور جماعت کے اکابر سے تبادلۂ خیالات اور خط و کتابت بھی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یقین کے ساتھ وہ ایک نتیجہ پر پہونچ گئے۔ انھوں نے اپنے اس غور و فکر کے سارے سفر کو اور اس کے نتیجہ کو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا ہے جو عنقریب چھپ کر مکمل ہو جانے والی ہے، جیسا کہ انھوں نے خود اپنے نوٹ میں لکھ دیا ہے یہ مضمون جو الفرقان کی اس اشاعت میں شائع ہو رہا ہے اس کتاب کا تعارفی باب ہے۔ اس میں مولانا مودودی کے دینی فکر کا جو اجمالی تجزیہ انھوں نے کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فکر بہت عمیق اور صحیح ہے، ان کے غور و فکر کے پورے نتائج اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے سامنے آسکیں گے۔

میرے سفرِ حجاز اور مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کی خرابیِ صحت کی وجہ سے الفرقان کا گزشتہ شمارہ دو ہفتے کی تاخیر سے شائع ہو سکا تھا اور یہ شمارہ بھی اتنی ہی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے ــ اسلیے یہ طے کیا ہے کہ جولائی اور اگست کا شمارہ ان شاء اللہ ۲۰ اگست کو مشترکہ شائع کیا جائے گا۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
کی تازہ پیش کش
تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ سوم)
— از —
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور
حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی سوانح حیات
ان کے صفات وکمالات، اصلاحی اور تجدیدی کام اور مقام اور ان کے تلامذہ، منتسبین اور مسترشدین کا تفصیلی تعارف — ابتداء میں اس ملک میں سلسلۂ چشتیہ کی آمد، تبلیغ اسلام اور خواجہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے جانشینوں کا تذکرہ —
قیمت مجلد مع گردپوش۔ چھ روپئے .... غیر مجلد — پانچ روپئے
اس سلسلے کی پہلی اور دوسری جلد
پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کے تاریخی جائزہ اور نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت وعزیمت کے مفصل تعارف پر مشتمل ہے۔
قیمت حصہ اول۔ چھ روپئے .... حصہ دوم۔ چھ روپئے پچاس نئے پیسے
ملنے کا پتہ:- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW

چندہ
(ہند و پاکستان سے)
سالانہ .... -/-/۶
ششماہی .... -/-/۳
فی کاپی .... -/۶۰/-

الفرقان لکھنؤ
ماہنامہ
(اس شمارہ کی قیمت ایک روپیہ)

چندہ
(دیگر ممالک سے)
سالانہ .... ۱۲ شلنگ
اعزازی چندہ
سالانہ .... -/۱۵

جلد ۳۱ | بابت ماہ صفر و ربیع الاول ۱۳۸۳ھ مطابق جولائی و اگست ۱۹۶۳ء | شمارہ ۲-۳

اگر اس دائرے میں ⭘ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔ **پاکستان کے خریدار:۔** اپنا چندہ "سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور" کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت و منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از محمد منظور نعمانی

قرآن مجید نے اس حقیقت کو جا بجا بیان کیا ہے، بلکہ یہ اس کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے امر و حکم سے ہوتا ہے۔ اگر کسی کے حالات بنتے سنورتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور بگڑتے ہیں تو اسی کے حکم سے، اگر کسی کو حاکمانہ اقتدار ملتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے اور کسی سے چھنتا ہے تو اسی کے حکم اور فیصلہ سے، اسی طرح عزت و سربلندی اور ذلت و خواری، خوش حالی و بدحالی، تندرستی اور بیماری یہاں تک کہ موت اور زندگی۔ الغرض ان میں سے ہر چیز اللہ ہی کے امر اور فیصلہ سے وقوع میں آتی ہے ـــ ایک جگہ دعائیہ انداز میں ارشاد ہے:-

قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ	اے اللہ، کائنات کی اس ساری سلطنت کے فرمانروا
مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ	تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے،
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ	جسکو چاہے عزت دے، اور جس کو چاہے ذلیل و خوار
بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ	کردے، ہر قسم کی خیر اور بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے،
قَدِيرٌ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ	ہر چیز پر تیری قدرت ہے، تو رات کو دن میں لاتا ہے اور
النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ	دن کو رات میں، تو بے جان چیزوں سے جاندار کو
الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ	پیدا کرتا ہے اور جاندار سے بے جان کو اور جسکو
مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ٥	چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

(آل عمران ع ۳)

یہ تعلیم و تلقین چونکہ عقیدۂ توحید کی بنیادی تشریح ہے اسلیے یہ اللہ کے تمام پیغمبروں کی مشترکہ اور متفقہ تعلیم ہے اور ان سب کا اور ان کے متبعین کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ جن چھوٹے یا بڑے مسائل کا ان کو سامنا کرنا پڑا ان کو حل کرنے اور ان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی نظر کرم اور اس کی نصرت و حمایت حاصل کرنا انھوں نے

سب سے زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا۔ اس لیے ایسے موقعوں پر زیادہ زور انھوں نے اس پر دیا کہ ان بداعمالیوں اور بداخلاقیوں سے بچا جائے جو بندوں کو خدا کی رحمت اور نصرت سے محروم کر دیتی ہیں اور اس قسم کی جو معصیتیں پچھلی زندگی میں ہو چکی ہوں سچے دل سے ان سے توبہ و استغفار کی جائے اور ان اعمال صالحہ کی طرف جو اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت کا وسیلہ بنتے اور اس کی نصرت و حمایت کا مستحق بناتے ہیں خاص توجہ دی جائے۔ اور پورے الحاح و ابتہال کے ساتھ اس سے دعا و التجا کی جائے اور اس سب کے ساتھ اُن تدبیروں اور کوششوں میں بھی اپنے امکان بھر کوئی کسر اٹھا کے نہ رکھی جائے جن کا دروازہ کھلا نظر آئے لیکن فیصلہ کن چیز اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم ہی کو سمجھا جائے ـــــ یہی طریقہ کار رہا ہے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے صادق متبعین کا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام کو جب کبھی سنگین اور خطرناک حالات کا سامنا کرنا پڑا تو ان کا طرز عمل یہی رہا۔ اور کسی صاحب ایمان خدا پرست گروہ کا اس کے سوا کوئی طرز عمل ہو بھی نہیں سکتا ـــــ لیکن خدا فراموش اور مادہ پرست مغربی اقوام کی ہمہ گیر سیاسی برتری کے نتیجہ میں (جو در اصل ہماری معصیتوں اور غفلتوں ہی کا نتیجہ ہے) مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کو جو فروغ پوری انسانی دنیا میں حاصل ہوا ہے اس کا اثر ہم مسلمانوں پر بھی یہ پڑا ہے کہ بالخصوص قومی و ملی مسائل میں ہمارا طرز فکر اور طرز عمل بھی وہی ہو گیا ہے جو دنیا کے مادہ پرست اور خدا فراموش طبقوں کا ہے۔ اپنے داخلی اور خارجی، قومی و ملی اہم مسائل کے بارے میں اب ہم بالکل اسی طرح سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں جس طرح دنیا کی دوسری مادہ پرست قومیں سوچا کرتی ہیں ـــــ آپ ہندوستان جیسے کسی ملک کی مسلم اقلیت کو سامنے رکھ لیجئے یا پاکستان اور مصر و شام جیسے کسی ملک کی مسلم اکثریت کو، ان کے لیڈروں، ان کی سیاسی جماعتوں اور قومی و ملی مسائل سے بحث کرنے والے ان کے اخباروں کا طرز فکر بالکل وہی نظر آئے گا جو دنیا کی اُن خدا فراموش قوموں اور انسانوں کے اُن گروہوں کا ہو گیا ہے جو اس قسم کے قومی و اجتماعی معاملات و مسائل میں خدا سے اور اس دنیا میں اس کی قدرت اور مشیت کی کارفرمائی سے بالکل صرف نظر کر کے خالص ظاہری اسباب و تدابیر کی لائنوں پر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ بہت بڑا زیغ اور انحراف ہے جو مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی زندگی میں آ گیا ہے۔ جو طبقے خدا کے منکر ہوں یا اس کائنات میں اس کی کارفرمائی کے قائل نہ ہوں ان کا طرز عمل تو یہی ہونا چاہیے لیکن جو قوم اور جو ملت دل سے اس حقیقت کو صحیح سمجھتی ہو اور اس کا اس پر ایمان ہو کہ اس دنیا کی باگیں اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے اور اللہ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ان کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید نے اس بارہ میں جو کچھ بتایا ہے وہ یقیناً حق ہے۔ ان کا اپنے قومی و ملی مسائل کے بارے میں (جو نجی اور انفرادی معاملات کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ اہم اور زیادہ مشکل ہوتے ہیں۔) خدا سے صرف نظر کر کے سوچنا اور صرف اپنی ذہنی و عملی طاقتوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کرنا پیغمبروں کے طریقہ سے انحراف کے علاوہ عقل و منطق کے بھی خلاف ہے ـــــ اور ہمارے نزدیک ہر جگہ کے مسلمانوں کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا بہت بڑا

سبب ان کا یہی گمراہانہ رویہ ہے ــــ قرآن مجید سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو قوم پیغمبرِ وقت کو مان لینے اور اس کی دینی دعوت کو قبول کر لینے کے بعد خدا فراموشی اور معصیت کوشی کا رویہ اختیار کرے گی وہ اس دنیا میں ٹھوکریں کھائے گی اور خدا کی نصرت اور رحمت سے محروم رکھی جائے گی۔ قرآن پاک کے صفحے کے صفحے بنی اسرائیل کے ذکر سے بھرے ہوئے ہیں ان کی جو سرگزشت جا بجا بیان کی گئی ہے اس کا حاصل یہی ہے کہ وہ پیغمبروں کی نسل سے تھے اور ان کے لائے ہوئے دین کے حامل و امین بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے نوازا تھا۔ اور عظمت و فضیلت کا تاج ان کے سر پر رکھا تھا۔ مگر جب انھوں نے پیغمبروں والا راستہ چھوڑ کے نفس پرستوں اور خدا فراموشوں کا راستہ اختیار کیا اور اس میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشی ہوئی نعمتیں ان سے چھین لیں، اور کبھی کبھی اُن کے ذلیل فطرت اور بیدرد دشمنوں کو ان پر مسلط کر کے اس نفس پرستی اور خدا فراموشی کی ان کو سزا بھی دلوائی ـــــ بنی اسرائیل کی یہ عبرتناک سرگزشت قرآن مجید میں اس لیے بار بار دہرائی گئی ہے کہ قرآن کی حامل آخری امت اس سے سبق حاصل کرے۔

ان سطروں میں ہمارا خاص مخاطب مسلمانوں کا وہ طبقہ ہے جس کو اُن کے قومی و ملی مسائل کا درد اور فکر ہے اور وہ اس دردمندی اور فکرمندی میں مخلص ہے، ہماری گزارش یہ ہے کہ ملت کی صلاح و فلاح کے لیے ظاہری اسباب و تدابیر کی لائن پر ہم آپ جو کوششیں صحیح اور مفید سمجھتے ہیں وہ آخری حد تک کریں اور قوم سے کرائیں۔ یہ ضروری بھی ہے اور ہمارا آپ کا فرض بھی ہے۔ لیکن اُن کے ساتھ یہ بھی لازم اور ضروری ہے کہ ہماری آپ کی اور قوم کی حالت بنی اسرائیل والی نہ ہو، ہماری زندگی میں اللہ کی بندگی اور وفاداری کا عنصر غالب ہو۔ وہ بداعمالیاں اور بداخلاقیاں ہمارے معاشرے میں کم از کم غالب نہ ہوں جن کے ہوتے ہوئے کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کی مستحق نہیں ہوسکتی، پھر جس طرح ہم اپنی انفرادی اور ذاتی مصیبتوں اور پریشانیوں میں اللہ تعالیٰ کو کارساز جانتے ہوئے اس سے دعا کرتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تڑپ اور الحاح کے ساتھ قومی و ملی مشکلات کے حل کے لیے اس سے مدد مانگیں اور دعائیں کریں ـــــ یہی طریقہ ہے انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کا اور اہلِ ایمان کے لیے صرف یہی راستہ ہے فلاح و کامیابی کا ـــــ

ایک مردِ مومن کی وفات :-

دنیا کے اس کارخانہ میں موت و حیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے جو یہاں پیدا ہوا اور جی رہا ہے، ایک دن یہاں سے اس کا کوچ کر جانا یقینی ہے، اس لیے کسی کی موت بجائے خود کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں، لیکن اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی علاقہ میں اپنی ذات سے

خیر اور بھلائی کا ایک ادارہ ہوتے ہیں اور ان کے اس دنیا سے جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ علاقہ خیر کے اس ادارہ اور سلسلہ سے محروم ہو گیا۔

امراؤتی (برار) میں ایک میمن تاجر حاجی عبداللہ احمد صاحب اسی قسم کے ایک مرد مومن تھے۔ دولت کے لحاظ سے کوئی بہت بڑے سیٹھ نہیں تھے لیکن اخلاقی بلندی اور نیکی اور خدمت کے کاموں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے پورے علاقہ میں ان کی ساکھ بہت اونچی تھی، بڑے سمجھدار اور بڑے پختہ دیندار تھے اور ان کی دینداری میں بڑا اعتدال اور توازن تھا، دین کی فکر اور مسلمانوں کا درد گویا زندگی کی روح تھی، عمر اب ۹۰ سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن ضعف پیری کے باوجود دینی اور ملی کاموں میں جوانوں کی طرح حصہ لیتے تھے۔ برار میں ہونے والے اکثر دینی و ملی تعلیمی و تبلیغی کاموں کا سلسلۂ نسب حاجی صاحب ہی سے ملتا ہے ــــ یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے ایک دینی و ملی انجمن اور تعلیمی، تبلیغی اور اشاعتی ادارہ تھے ــــ ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں امراؤتی میں اسی قسم کا ایک فساد برپا کیا گیا جس قسم کے فسادات ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندستان کے بہت سے شہروں میں ہوتے رہے ہیں اور جن کا نشانہ مسلمان بنتے رہے ہیں۔ کپڑا بازار امراؤتی کا بڑا بازار ہے اس میں مسلمان میمن تاجروں کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں انھیں میں حاجی صاحب کی بھی ایک دوکان تھی جس کی عمارت بھی انھیں کی ذاتی جائداد تھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا اس میں مال بھی تھا اور وہی ان کا سارا اثاثہ تھا۔ ان دوکانوں کو حسب معمول لوٹا اور جلایا گیا، حاجی صاحب اور ان کے اہل و عیال اس حال میں جان بچا کے کسی طرح نکل سکے کہ جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ گھر والوں نے امراؤتی چھوڑ کے پاکستان جا بسنے کے لیے اصرار کیا جہاں تعلقات اور اثرات کی بنا پر ان کو بہت اچھے مستقبل کی امید ہو سکتی تھی لیکن حاجی صاحب یہاں سے جانے پر صرف اس لیے آمادہ نہیں ہوئے کہ میرے جانے سے یہاں کے مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوگی اور جن دینی و ملی کاموں سے میرا تعلق ہے خدانخواستہ ان پر اثر پڑے گا ــــ فساد کی اس تباہی و بربادی کے بعد حاجی صاحب درحقیقت بالکل خالی ہاتھ رہ گئے تھے، لیکن ایمان کی طاقت نے ان کو سہارا دیا اور انھوں نے بالکل نئے سرے سے کسی طرح کاروباری زندگی پھر شروع کی اور بظاہر اسی طرح اور اسی توازن کے ساتھ رہے جس طرح اور جس شان سے وہ امراؤتی میں پہلے رہتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہ ۱۲-۱۳ سال بڑے ابتلا میں گزرے مگر دینی و ملی فکروں اور کوششوں میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، بلکہ راقم سطور کا اندازہ ہے کہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔

ــــ بعض دینی سفروں میں ان کے ساتھ رہنا ہوا میں نے ان کو راتوں میں اللہ کے حضور میں بلک بلک کے روتا ہوا دیکھا ــــ اپنی زندگی میں جن چند آدمیوں کو دیکھ کر مجھے ان پر رشک آیا ان میں سے ایک یہ حاجی عبداللہ احمد صاحب بھی تھے ــــ بیماری اور اس کی شدت و خطرناکی کی اطلاع تو کوئی دو ہفتہ پہلے ہو گئی تھی، اب ۲۰ جولائی کو ان کے صاحبزادہ عبدالقادر سلمہ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ یکم ربیع الاول کی صبح کو حاجی صاحب اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت کی طرف منتقل ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائے اور ان کے پسماندگان اور متعلقین کی وہ خاص مدد فرمائے ان کے دلوں کو وہ صبر اور سہارا دے جس کے وہ اس وقت خاص طور سے محتاج ہیں ــــ ناظرین کرام سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

نماز جنازہ اور اس کے قبل و بعد

(۲)

[اس باب کی پہلی قسط شوال و ذیقعدہ (مارچ و اپریل) کے مشترک شمارہ میں اسی عنوان کے تحت شائع ہوئی تھی، اس کے بعد ذی الحجہ کا شمارہ چونکہ عید اضحیٰ سے کچھ ہی پہلے شائع ہونے والا تھا اس لیے اس میں اس کے بقیہ حصہ کے بجائے عیدین اور قربانی وغیرہ کا باب شائع کرنا مناسب سمجھا گیا۔ (اگرچہ ایڈیٹر الفرقان کی علالت کی وجہ سے وہ شمارہ عید کے بعد شائع ہو سکا) باب جنازہ کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا وہ اب اس اشاعت میں پیش کیا جا رہا ہے۔]

میّت کا غسل و کفن:-

اللہ کا جو بندہ اس دنیا سے رخصت ہو کر موت کے راستے سے دار آخرت کی طرف جاتا ہے، اسلامی شریعت نے اس کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کرنے کا ایک خاص طریقہ مقرر کیا ہے جو نہایت ہی پاکیزہ، انتہائی خدا پرستانہ اور نہایت ہمدردانہ اور شریفانہ طریقہ ہے۔ حکم ہے کہ پہلے میت کو ٹھیک اس طرح غسل دیا جائے جس طرح کوئی زندہ آدمی پاکی اور پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے نہاتا ہے۔ اس غسل میں پاکی اور صفائی کے علاوہ غسل کے آداب کا بھی

پورا لحاظ رکھا جائے، غسل کے پانی میں وہ چیزیں شامل کی جائیں جو میل کچیل صاف کرنے کے لیے لوگ زندگی میں بھی نہانے میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ آخر میں کافور جیسی خوشبو بھی پانی میں شامل کی جائے تاکہ میت کا جسم پاک صاف ہونے کے علاوہ معطر بھی ہو جائے۔ پھر اچھے صاف ستھرے کپڑوں میں کفنایا جائے، لیکن اس سلسلے میں اسراف سے بھی کام نہ لیا جائے، اس کے بعد جماعت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی جائے جس میں میت کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا اہتمام اور خلوص سے کی جائے، پھر رخصت کرنے کے لیے قبرستان تک جایا جائے، پھر اکرام و احترام کے ساتھ بظاہر قبر کے حوالے اور فی الحقیقت اللہ کی رحمت کے سپرد کر دیا جائے، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی ہدایات ذیل میں پڑھیے:۔

عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَغْسِلُ اِبْنَتَهٗ فَقَالَ اِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا اَوْ خَمْسًا اَوْ اَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ اِنْ رَأَيْتُنَّ ذَالِكَ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَاجْعَلْنَ فِى الْاٰخِرَةِ كَافُوْرًا اَوْ شَيْئًا مِنْ كَافُوْرٍ فَاِذَا فَرَغْتُنَّ فَاٰذِنَّنِىْ فَلَمَّا فَرَغْنَا اٰذَنَّاهُ فَاَلْقٰى اِلَيْنَا حِقْوَهٗ فَقَالَ اَشْعِرْنَهَا اِيَّاهُ وَفِىْ رِوَايَةٍ اِغْسِلْنَهَا وِتْرًا ثَلَاثًا اَوْ خَمْسًا اَوْ سَبْعًا وَابْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا وَمَوَاضِعِ الْوُضُوْءِ مِنْهَا ـــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک فوت شدہ صاحبزادی کو ہم غسل دے رہے تھے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے اور ہم سے فرمایا کہ تم اس کو بیری کے پتوں کے ساتھ جوش دیئے ہوئے پانی سے تین دفعہ یا پانچ دفعہ اور اگر تم مناسب سمجھو تو اس سے بھی زیادہ دفعہ غسل دیجیو اور آخری دفعہ میں کافور بھی شامل کیجیو، پھر جب تم غسل دے چکو تو مجھے خبر کر دیجیو، (ام عطیہ کہتی ہیں کہ) جب ہم غسل دے کر فارغ ہو گئے تو ہم نے آپ کو اطلاع دے دی تو آپ نے اپنا تہبند ہماری طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ سب سے پہلے یہ اسے پہنا دو ـــــــ اور اس حدیث کی ایک دوسری

روایت میں اس طرح ہے کہ آپ نے فرمایا تم اس کو طاق دفعہ غسل دیجیو، تین دفعہ یا پانچ دفعہ یا سات دفعہ اور داہنے اعضاء سے اور وضو کے مقامات سے شروع کیجو۔
(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث کی صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی کو غسل دینے کا اس حدیث میں ذکر ہے وہ آپؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب تھیں جو ابوالعاص بن الربیع کے نکاح میں تھیں، ان کی وفات ۸ھ کے اوائل میں ہوئی تھی اور ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا جو اس حدیث کی راوی ہیں اور جو اس موقع پر غسل دینے والیوں میں تھیں ممتاز صحابیات میں سے ہیں، اس قسم کی خدمتوں میں یہ پیش پیش رہتی تھیں، خاص کر مرنے والی خواتین کو غسل دینا ان کو خوب آتا تھا۔ ابن سیرینؒ تابعی جیسے جلیل القدر امام کا بیان ہے کہ میں نے غسل میت انھیں سے سیکھا۔

اس حدیث میں بیری کے پتوں کے ساتھ اُبلے ہوئے پانی سے غسل دینے کا ذکر ہے۔ ایسا پانی جسم سے میل وغیرہ کو خوب صاف کرتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں جس مقصد کے لیے نہانے میں طرح طرح کے صابون استعمال کیے جاتے ہیں اس زمانہ میں اس مقصد کے لیے بیری کے پتوں کے ساتھ جوش دیا ہوا پانی استعمال کیا جاتا تھا، مقصد صرف یہ ہے کہ میت کے جسم سے ہر قسم کی میل کچیل کی صفائی کا پورا اہتمام کیا جائے ــــــ اسی لیے حکم فرمایا کہ غسل کم سے کم تین دفعہ دیا جائے اور اگر اس سے زیادہ مناسب سمجھا جائے تو چونکہ طاق عدد اللہ کو محبوب ہے اس لیے اس کا لحاظ بہر حال رکھا جائے یعنی تین دفعہ یا پانچ دفعہ، اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اس سے بھی زیادہ سات دفعہ غسل دیا جائے اور آخری دفعہ کافور بھی پانی میں ملا لیا جائے جو نہایت مہک دار اور دیرپا خوشبو ہے ــــــ یہ سب میت کا اعزاز و اکرام ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر صاحبزادی کے لیے جس اہتمام سے اپنا تہبند مبارک دیا (اور بعض روایات میں تصریح ہے کہ جب آپ کو غسل مکمل ہو جانے کی اطلاع دی گئی اس وقت آپ نے اپنے جسم اقدس سے نکال کر وہ تہبند دیا) اور تاکید فرمائی کہ اس کو شعار (یعنی سب سے اندر کا لباس) بنا دو، اس سے علماء کرام نے سمجھا ہے کہ اللہ کے نیک

اور مقبول بندوں کے لباس وغیرہ کا تبرک کے طور پر اس طرح کا استعمال درست ہو اور اس سے نفع کی امید ہے۔ ہاں ان چیزوں میں غلو اور ان کے بھروسہ پر عمل سے غافل ہو جانا یقیناً گمراہی ہے۔

اس روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان صاحبزادی کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا لیکن حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں جوزقی کی تخریج سے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے سلسلہ میں یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا "فَكَفَّنَّاهَا فِي خَمْسَةِ أَثْوَابٍ وَخَمَّرْنَاهَا كَمَا يُخَمَّرُ الْحَيُّ" (ہم نے ان صاحبزادی کو پانچ کپڑوں میں کفنایا اور خمار (اوڑھنی) بھی اڑھائی جس طرح زندہ کو اڑھائی جاتی ہے) اسی بناء پر عورتوں کے لیے کفن میں پانچ کپڑے ہی مسنون کہے گئے ہیں۔

کفن میں کیا کیا اور کیسے کپڑے ہونے چاہییں:۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُفِّنَ فِي ثَلٰثَةِ أَثْوَابٍ يَمَانِيَةٍ بِيضٍ سَحُولِيَّةٍ لَيْسَ فِيهَا قَمِيصٌ وَلَا عِمَامَةٌ ــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (وصال کے بعد) تین سفید یمنی کپڑوں میں کفنائے گئے، جو سحولی تھے۔ ان تین کپڑوں میں نہ کرتا تھا اور نہ عمامہ۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اکثر شارحین نے سحولی کی تشریح میں کہا ہے کہ یمن کے علاقہ میں سُحُول ایک بستی تھی جہاں کے کپڑے مشہور تھے۔ بعض حضرات نے اس کے دوسرے معنی بھی بیان کیے ہیں لیکن راجح یہی ہیں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات سے پہلے بھی یمنی چادریں استعمال فرماتے تھے، وصال کے بعد آپ کے کفن میں بھی وہی استعمال کی گئیں ـــــ اور آپ کو تین کپڑوں میں کفنایا گیا جن میں نہ کرتا تھا نہ عمامہ، اور مردوں کے لیے کفن میں تین ہی کپڑے مسنون ہیں۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَفَّنَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ ــــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے کسی مرنے والے بھائی کو کفن دے تو اچھا کفن دے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث کا اصل منشا بھی میت کا اعزاز و اکرام ہے اور مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص استطاعت کے باوجود اپنی میت کو اس خیال سے کہ اب تو اس کو قبر میں دفن ہونا اور مٹی میں ملنا ہے، پھٹے پرانے اور ردی کپڑے میں نہ کفنائے بلکہ اچھا اور مناسب کفن دے۔ یہ میت کے اعزاز و اکرام کا تقاضا اور حق ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلْبَسُوْا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيَاضَ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ ــــــــ رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ سفید کپڑے پہنا کرو وہ تمہارے لیے اچھے کپڑے ہیں۔ اور انہی میں اپنے مرنے والوں کو کفنایا کرو۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُغَالُوْا فِي الْكَفَنِ فَاِنَّهُ يُسْلَبُ سَرِيْعًا ــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زیادہ بیش قیمت کفن نہ استعمال کرو کیونکہ وہ جلدی ہی ختم ہو جاتا ہے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ استطاعت کے باوجود میت کو کفن ردی کپڑے کا دیا جائے اسی طرح یہ بھی درست نہیں ہے کہ بیش قیمت کپڑا کفن میں استعمال کیا جائے۔

واضح رہے کہ مردوں کو تین اور عورتوں کو پانچ کپڑوں میں کفنانے اور درمیانی حیثیت کے اچھے سفید کپڑے کا کفن دینے کے مذکورۂ بالا احکام کا تعلق اس صورت سے ہو جبکہ میت کے گھر والے سہولت سے اس کا انتظام کر سکتے ہوں اور اس کی استطاعت رکھتے ہوں، ورنہ مجبوری کی حالت میں صرف ایک اور پرانے کپڑے میں بھی کفن دیا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔ غزوۂ احد میں حضور کے حقیقی چچا سیدنا حمزہؓ اور اسی طرح حضرت مصعب بن عمیر کو صرف ایک پرانی اور اتنی چھوٹی سی چادر میں کفنایا گیا تھا کہ جب اس سے آپ کا سر ڈھکتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور جب پاؤں ڈھکتے تھے تو سر کھل جاتا تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس چادر سے سر ڈھک دیا گیا اور پاؤں کو اذخر گھاس سے چھپا دیا گیا اور اسی کفن کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ پڑھنے کا ثواب:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا وَکَانَ مَعَهٗ حَتّٰی یُصَلّٰی عَلَیْهَا وَیُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا فَاِنَّهٗ یَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِیْرَاطَیْنِ کُلُّ قِیْرَاطٍ مِثْلُ اُحُدٍ وَمَنْ صَلّٰی عَلَیْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّهٗ یَرْجِعُ بِقِیْرَاطٍ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو آدمی ایمان کی صفت کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ جائے اور اس وقت تک جنازہ کے ساتھ رہے جب تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اور اس کے دفن سے فراغت ہو تو وہ ثواب کے دو قیراط لے کر واپس ہوگا جن میں سے ہر قیراط گویا احد پہاڑ کے برابر ہوگا اور جو آدمی صرف نماز جنازہ پڑھ کے واپس آجائے (دفن ہونے تک ساتھ نہ رہے) تو وہ ثواب کا (ایسا ہی) ایک قیراط لے کر واپس ہوگا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ ظاہر ہے کہ حدیث کا مقصد جنازہ کے ساتھ جانے، اُس پر نماز پڑھنے اور دفن میں شرکت کرنے کی ترغیب دینا اور فضیلت بیان کرنا ہے ــــ حاصل یہ ہے کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ چلا اور صرف نماز میں شرکت کر کے واپس آگیا وہ بقدر ایک قیراط کے اجر کا مستحق ہوگا اور جو شخص دفن تک شریک رہا وہ دو قیراط کا مستحق ہوگا ــــ قیراط راجح قول کے مطابق درہم کا بارھواں حصہ ہوتا ہے ــــ قریباً دو پیسے ــــ چونکہ اس زمانے میں مزدوروں کو اُن کے کام کی اُجرت قیراط کے حساب سے دی جاتی تھی اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس موقع پر قیراط کا لفظ بولا اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس کو دنیا کا قیراط (درہم کا بارھواں حصہ آنہ آدھ آنہ) نہ سمجھ لیا جائے بلکہ یہ ثواب آخرت کا قیراط ہوگا جو دنیا کے قیراط کے مقابلہ میں اتنا بڑا ہوگا جتنا اُحد پہاڑ اس کے مقابلہ میں بڑا اور عظیم الشان ہے ــــ اسی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس عمل پر یہ عظیم ثواب تب ہی ملے گا جبکہ یہ عمل ایمان و یقین کی بنیاد پر اور ثواب ہی کی نیت سے کیا گیا ہو، یعنی اس عمل کا اصل محرک اللہ و رسول کی باتوں پر ایمان و یقین اور آخرت کے ثواب کی امید ہو۔ پس اگر کوئی شخص صرف تعلق اور رشتہ داری کے خیال سے یا میت کے گھر والوں کا جی خوش کرنے ہی کی نیت سے یا ایسے ہی کسی دوسرے مقصد سے جنازہ کے ساتھ گیا اور نماز جنازہ اور دفن میں شریک ہوا، اللہ و رسول کا حکم اور آخرت کا ثواب اس کے پیش نظر تھا ہی نہیں، تو وہ اس ثواب عظیم کا مستحق نہ ہوگا ــ حدیث کے الفاظ "ایماناً و احتساباً" کا مطلب یہی ہے ــــ اور سمجھنا چاہیے کہ اعمال کے اجر اخروی کے لیے یہ ایک عام شرط ہے ــــ اس سلسلہ "معارف الحدیث" کی پہلی جلد کے بالکل شروع میں حدیث "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کی تشریح میں اور دوسری جلد میں "اخلاص" کے زیر عنوان اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

جنازہ کے ساتھ تیز رفتاری اور جلدی کا حکم:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اِسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ فَاِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا اِلَيْهِ وَاِنْ تَكُ سِوٰى ذَالِكَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ۔

_____________ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنازہ کو تیز لے جایا کرو۔ اگر وہ نیک ہے تو (قبر اس کے لیے) خیر ہے (یعنی اچھی منزل ہے) جہاں تم (تیز چل کے) اس کو جلدی پہونچا دوگے، اور اگر اس کے سوا دوسری صورت ہے (یعنی جنازہ نیک کا نہیں ہے) تو ایک برا (بوجھ تمھارے کندھوں پر) ہے (تم تیز چل کے جلدی) اس کو اپنے کندھوں سے اتار دوگے۔ (صحیح بخاری ومسلم)

(تشریح) حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جنازہ کو جلدی اپنے ٹھکانے پہ پہونچانے کی کوشش کی جائے، تجہیز وتکفین کے انتظام میں بھی بے ضرورت تاخیر نہ کی جائے اور جب دفن کے لیے جنازہ لے جایا جائے تو خواہ مخواہ آہستہ آہستہ نہ چلا جائے بلکہ مناسب حد تک تیز چلا جائے، اگر میت نیک اور اللہ کی رحمت کی مستحق ہے تو پھر جلدی اس کو اس کے اچھے ٹھکانے پر پہونچا دیا جائے اور اگر خدانخواستہ اس کے برعکس معاملہ ہے تو پھر جلدی اس کے بارے میں سبکدوشی حاصل کی جائے۔

نماز جنازہ اور اس میں میت کے لیے دُعا:۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ۔

_____________ رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو پورے خلوص سے اسکے لیے دعا کرو۔ (سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) نماز جنازہ کا اصل مقصد میت کے لیے دعا ہی ہے، پہلی تکبیر کے بعد اللہ کی حمد تسبیح اور دوسری تکبیر کے بعد درود شریف گویا دعا ہی کی تمہید ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ میں جو دعائیں پڑھتے تھے (جو آگے درج کی جارہی ہیں) وہ سب اس موقع کے لیے بہترین دعائیں ہیں۔

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى جَنَازَةٍ فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهٖ وَاَهْلًا خَيْرًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِهٖ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ ــــ قَالَ حَتّٰى تَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَنَا ذٰلِكَ الْمَيِّتَ ــــــــ رواہ مسلم

حضرت عوف بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت کے جنازہ کی نماز پڑھی (اس میں آپ نے میت کے لیے جو دعا کی) اس دعا کے یہ الفاظ مجھے یاد ہیں۔ آپ اللہ کے حضور میں عرض کر رہے تھے "اے اللہ تو اس بندہ کی مغفرت فرما، اس پر رحمت فرما، اس کو عافیت دے، اس کو معاف فرما دے، اس کی باعزت مہمانی فرما، اس کی قبر کو اس کے لیے وسیع فرما دے (ہجنم کی آگ اور اس کی سوزش و جلن کے بجائے) پانی سے برف سے اور اولوں سے اس کو نہلا دے (اور ٹھنڈا اور پاک فرما دے) اور گناہوں کی گندگی سے اس کو صاف فرما دے جس طرح اُجلے سفید کپڑے کو تو نے میل سے صاف فرما دیا ہے۔ اور اس کو دنیا کے گھر کے بدلے میں آخرت کا اچھا گھر اور گھر والوں کے بدلہ میں اچھے گھر والے اور رفیق حیات کے بدلہ میں اچھا رفیق حیات عطا فرما دے، اور اس کو جنت میں پہونچا دے اور عذاب قبر اور عذاب دوزخ سے اس کو

پناہ دے (حدیث کے راوی عوف بن مالک صحابی) کہتے ہیں کہ حضور کی یہ دعا سن کر میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کاش یہ میت میں ہوتا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى عَلَى الْجَنَازَةِ قَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَكَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَاُنْثَانَا اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهٗ۔

——— رواه احمد وابو داؤد والترمذی وابن ماجه

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جنازہ پر نماز پڑھتے تھے تو اس میں یوں دعا کرتے تھے ——— اے اللہ ہمارے زندوں کی اور مردوں کی، حاضروں کی اور غائبوں کی، چھوٹوں کی اور بڑوں کی، مردوں کی اور عورتوں کی، سب کی مغفرت فرما، اے اللہ جس کو تو ہم میں سے زندہ رکھے اس کو اسلام پر قائم رکھتے ہوئے زندہ رکھ اور جس کو تو اس عالم سے اٹھائے اس کو ایمان کی حالت میں اٹھا ——— اے اللہ اس میت کی موت کے اجر سے ہمیں آخرت میں محروم نہ رکھ اور اس دنیا میں اس کے بعد تو ہمیں کسی فتنہ اور آزمائش میں نہ ڈال۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِیْ ذِمَّتِكَ وَحَبْلِ جِوَارِكَ فَقِهٖ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ وَاَنْتَ اَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

——— رواه ابو داؤد وابن ماجه

حضرت واثلہ بن الاسقع سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں سے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی، میں نے سُنا اس میں آپ یہ دعا کر رہے تھے اے اللہ تیرا یہ بندہ فلاں بن فلاں تیری امان میں اور تیری پناہ میں ہے، تو اس کو عذاب قبر اور عذاب نار سے بچا، تو وعدوں کا وفا کرنے والا اور خداوند حق ہے، اے اللہ تو اس بندہ کی مغفرت فرما دے، اس پر رحمت فرما، تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔　　　(سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

تشریح) جنازہ کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض اور دعائیں بھی ثابت ہیں۔ لیکن زیادہ مشہور یہی تین ہیں جو مندرجہ بالا حدیثوں میں مذکور ہوئیں، پڑھنے والے کو اختیار ہے جو دعا چاہے پڑھے اور چاہے تو ان میں سے متعدد دعائیں پڑھے۔

مندرجہ بالا حدیثوں سے خاص کر واثلہ ابن اسقع اور ابو ہریرہ کی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جنازہ کی نماز میں یہ دُعائیں اتنی آواز سے پڑھیں کہ ان صحابہ کرام نے سُن کر ان کو محفوظ کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات نماز میں بعض دعائیں وغیرہ اس لیے بالجہر اور آواز سے پڑھتے تھے کہ دوسرے لوگ سُن کر سیکھ لیں، جنازہ کی ان نمازوں میں دعاؤں کا با آواز پڑھنا بھی غالباً اسی مقصد سے تھا، ورنہ عام قانون دعا کے بارہ میں یہ ہے کہ اس کا آہستہ کرنا افضل ہے، قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً"۔

نماز جنازہ میں کثرت تعداد کی برکت اور اہمیت :-

عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مَيِّتٍ تُصَلِّي عَلَيْهِ أُمَّةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يَبْلُغُونَ مِائَةً كُلُّهُمْ يَشْفَعُونَ لَهُ إِلَّا شُفِّعُوا فِيهِ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس میت پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نماز پڑھے

جن کی تعداد سو تک پہونچ جائے اور وہ سب اللہ کے حضور میں اس میت کے لیے سفارش کریں (یعنی مغفرت و رحمت کی دعا کریں) تو اُن کی یہ سفارش اور دعا ضرور ہی قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم)

عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ مَاتَ لَهُ ابْنٌ بِقُدَيْدٍ اَوْ بِعُسْفَانَ فَقَالَ يَا كُرَيْبُ اُنْظُرْ مَا اجْتَمَعَ لَهُ مِنَ النَّاسِ قَالَ خَرَجْتُ فَاِذَا نَاسٌ قَدِ اجْتَمَعُوْا لَهُ فَاَخْبَرْتُهُ فَقَالَ تَقُوْلُ هُمْ اَرْبَعُوْنَ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَخْرِجُوْهُ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ فَيَقُوْمُ عَلٰى جَنَازَتِهٖ اَرْبَعُوْنَ رَجُلًا لَا يُشْرِكُوْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا شَفَّعَهُمُ اللّٰهُ فِيْهِ ــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام اور خادم خاص کُریب تابعی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کے ایک صاحبزادہ کا انتقال مقام قُدَیْد میں یا مقام عُسفان میں ہوگیا (جب کچھ لوگ جمع ہوگئے) تو حضرت ابن عباس نے مجھ سے فرمایا کہ جو لوگ جمع ہوگئے ہیں ذرا تم ان پر نظر ڈالو، کریب کہتے ہیں کہ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ کافی لوگ جمع ہو چکے ہیں، میں نے ان کو اس کی اطلاع دی۔ انھوں نے فرمایا تمہارا خیال ہے کہ وہ چالیس ہوں گے؟ کریب نے کہا ہاں (۴۰ ضرور ہوں گے) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب جنازہ باہر لے چلو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جس مسلمان آدمی کا انتقال ہو جائے اور اُس کے جنازہ کی نماز چالیس ایسے آدمی پڑھیں جن کی زندگی شرک سے بالکل پاک ہو (اور وہ نماز میں اس میت کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا اور سفارش کریں) تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش اس میت کے حق میں ضرور قبول فرماتا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) قُدَیْد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے راستہ میں رابغ کے قریب ایک قصبہ

تھا اور عُسفان مکہ معظمہ اور رابغ کے درمیان مکہ معظمہ سے قریباً ۳۵-۳۶ میل کے فاصلہ پر ایک بستی تھی۔ راوی کو شک ہوگیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحبزادہ کے انتقال کا یہ واقعہ ان دونوں مقامات میں سے کس مقام پر پیش آیا تھا

عَنْ مَالِكِ بْنِ هُبَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ فَيُصَلِّي عَلَيْهِ ثَلٰثَةُ صُفُوْفٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ إِلَّا أَوْجَبَ فَكَانَ مَالِكٌ إِذَا اسْتَقَلَّ أَهْلَ الْجَنَازَةِ جَزَّأَهُمْ ثَلٰثَةَ صُفُوْفٍ لِهٰذَا الْحَدِيْثِ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت مالک بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا یہ ارشاد سنا کہ جس مسلمان بندہ کا انتقال ہو جائے اور مسلمانوں کی تین صفیں اس کی نماز جنازہ پڑھیں (اور اس کے لیے مغفرت و جنت کی دعا کریں) تو ضرور ہی اللہ تعالیٰ اس بندہ کے واسطے (مغفرت اور جنت) واجب کر دیتا ہے ——— (مالک بن ہبیرہؓ سے اس حدیث کی روایت کرنے والے مرثد یزنی کہتے ہیں کہ) مالک بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ کا یہ دستور تھا کہ جب وہ جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کم محسوس کرتے تو اسی حدیث کی وجہ سے ان لوگوں کو تین صفوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ تین حدیثیں ہیں، سب سے پہلی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں سو مسلمانوں کے نماز جنازہ پڑھنے پر اور اس کے بعد والی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں چالیس مسلمانوں کے نماز پڑھنے پر اور آخری مالک بن ہبیرہ والی حدیث میں مسلمانوں کی تین صفوں کے نماز پڑھنے پر مغفرت و جنت کی سفارش اور دعا کے قبول ہونے کا اطمینان ظاہر فرمایا گیا ہے ... بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تینوں باتیں منکشف ہوئیں۔ غالباً پہلے آپ کو بتایا گیا کہ اگر کسی بندہ کی نماز جنازہ سو مسلمان بندے پڑھیں اور اس نماز میں اس بندے کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کریں تو اللہ تعالیٰ اس بندہ کے حق میں ضرور ہی ان کی یہ دعا قبول

فرمائے گا ـــــ اس کے بعد اور تخفیف کر دی گئی اور صرف ۴۰ مسلمانوں کے نماز پڑھنے پر یہی بشارت سنادی گئی ـــــ اس کے بعد اور مزید تخفیف کر دی گئی اور تین صفوں کے نماز پڑھنے پر بھی آپکو یہی اطمینان دلا دیا گیا اگرچہ تعداد ۴۰ سے بھی کم ہو۔ واللہ اعلم ـــــ بہر حال ان حدیثوں سے صاف ظاہر ہے کہ نماز جنازہ میں کثرت مطلوب اور باعث برکت و رحمت ہے اس لیے مناسب حد تک اس کا اہتمام اور اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

دفن کا طریقہ اور اس کے آداب :-

عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّ سَعْدَ بْنَ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ فِیْ مَرَضِہِ الَّذِیْ هَلَكَ فِیْهِ اَلْحِدُوْا لِیْ لَحْدًا وَّانْصِبُوْا عَلَیَّ اللَّبِنَ نَصْبًا كَمَا صُنِعَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

ـــــــــــــــ رواہ مسلم

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ عامر بیان کرتے ہیں کہ (والد ماجد) سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے مرض وفات میں وصیت فرمائی تھی کہ میرے واسطے بغلی قبر بنائی جائے اور اس کو بند کرنے کے لیے کچی اینٹیں کھڑی کر دی جائیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا گیا تھا۔ (صحیح مسلم)

تشریح) اس سے معلوم ہوا کہ قبر کا افضل اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ وہ بغلی بنائی جائے اور کچی اینٹوں سے اس کو بند کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک بھی اسی طرح بنائی گئی تھی ـــــ لیکن اگر زمین ایسی کچی ہو کہ بغلی قبر نہ بن سکتی ہو تو پھر دوسرے طریقہ کی قبر بنائی جائے جس کو "شق" کہتے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حسب موقع دونوں طرح کی قبریں بنائی جاتی تھیں۔ لیکن افضل لحد یعنی بغلی قبر ہی کا طریقہ ہے۔

عَنْ هِشَامِ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

يَوْمَ أُحُدٍ إِحْفِرُوْا وَأَوْسِعُوْا وَأَعْمِقُوْا وَأَحْسِنُوْا وَادْفِنُوْا الْإِثْنَيْنِ وَالثَّلٰثَةَ فِي قَبْرٍ وَاحِدٍ وَقَدِّمُوْا أَكْثَرَهُمْ قُرْاٰنًا ـ

______ رواه احمد والترمذی وابو داؤد والنسائی

ہشام بن عامر انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے دن فرمایا کہ (شہداء کے لیے) قبریں کھودو اور ان کو وسیع اور گہرا کرو اور اچھی طرح بناؤ اور دو دو تین تین کو ایک ایک قبر میں دفن کرو۔ اور ان میں سے جس کے پاس قرآن زیادہ ہو اس کو آگے کرو اور مقدم رکھو۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) غزوۂ اُحد میں قریب ستّر کے صحابۂ کرام شہید ہوئے تھے ان سب کے لیے اس وقت الگ الگ قبریں کھودنا بہت مشکل بھی تھا، اور ایسے خاص موقعوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نظیر بھی قائم کرنی تھی اس لیے آپ نے حکم دیا کہ ایک ایک قبر میں دو دو تین تین دفن کیے جائیں۔ لیکن اس کی تاکید فرمائی کہ قبریں باقاعدہ کھودی جائیں، گہری بھی ہوں اور وسیع بھی ہوں۔ اور ایک ہدایت یہ بھی دی کہ ایک قبر میں جب متعدد شہید دفن کیے جائیں تو ترتیب میں مقدم یعنی پہلے اور قبلہ کی جانب اس کو رکھا جائے جس کے پاس قرآن زیادہ ہو، گویا وہ امام ہے اور اس کے ساتھ والے مقتدی ____ اس حدیث کی بنا پر ____ جنگ کے جیسے غیر معمولی حالات میں جائز ہے کہ ایک ایک قبر میں کئی کئی مردوں کو دفن کیا جائے۔

عَنْ إِبْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ____ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ـ

______ رواه احمد والترمذی وابن ماجۃ وابو داؤد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی میت کو قبر میں اتارتے (یا کوئی میت قبر میں اتاری جاتی) تو فرماتے تھے بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ" (ہم اس بندہ کو اللہ کے نام پاک کے

ساتھ اور اس کی مدد سے اور اس کے نبی کے طریقہ پر سپرد خاک کرتے ہیں) اور اسی حدیث کی بعض روایتوں میں "عَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰه" کے بجائے "عَلٰی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰه" کا لفظ بھی روایت کیا گیا ہے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد)

عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ مُرْسَلًا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَثٰى عَلَى الْمَيِّتِ ثَلٰثَ حَثَيَاتٍ بِيَدَيْهِ جَمِيْعًا وَاَنَّهٗ رَشَّ عَلٰى قَبْرِ ابْنِهٖ اِبْرَاهِيْمَ وَوَضَعَ عَلَيْهِ حَصْبَاءَ ———— رواہ البغوی فی شرح السنۃ

امام جعفر صادق اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت پر (یعنی دفن کے وقت اسکی قبر پر) دونوں ہاتھ ایک ساتھ بھر کے تین دفعہ مٹی ڈالی ———— اور اپنے صاحبزادہ ابراہیم کی قبر پر پانی چھڑکا یا چھڑکوایا اور اس کے اوپر سنگ ریزے ڈلوائے۔

(شرح السنۃ)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا مَاتَ اَحَدُكُمْ فَلَا تَحْبِسُوْهُ وَاَسْرِعُوْا بِهٖ اِلٰى قَبْرِهٖ وَ يُقْرَءُ عِنْدَ رَاْسِهٖ فَاتِحَةُ الْبَقَرَةِ وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ بِخَاتِمَةِ الْبَقَرَةِ ———— رواہ البیہقی فی شعب الایمان وقال والصحیح انہ موقوف علیہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ فرماتے تھے کہ جب تمہارا کوئی آدمی انتقال کر جائے تو اسکو دیر تک گھر میں مت روکو اور قبر تک پہونچانے اور دفن کرنے میں سرعت سے کام لو اور (دفن کے بعد) سر کی جانب سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (تا مفلحون) اور پاؤں کی جانب اس کی اختتامی آیات (آمَنَ الرَّسُوْلُ سے ختم سورہ تک) پڑھی جائیں ———— (یہ حدیث امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے)

اور ساتھ ہی کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ کا قول ہے بروایت میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے سند کے لحاظ سے یہ ثابت نہیں ہے۔)

(تشریح) میت کو دیر تک گھر میں نہ رکھنے اور کفن دفن میں جلدی کرنے کی ہدایت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد حدیثوں میں وارد ہوئی ہے، اور سورہ بقرہ کی ابتدائی اور اختتامی آیات کے قبر پر پڑھنے کا حکم ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمر اپنی طرف سے نہیں دے سکتے تھے، یقیناً یہ بات بھی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سیکھی ہوگی اس لیے سند کے لحاظ سے اگرچہ یہ حدیث مرفوعاً ثابت نہ ہو لیکن محدثین اور فقہا کے اصول پر یہ حکم میں مرفوع ہی کے ہے۔

قبور کے متعلق ہدایات :-

عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ ـــــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے کہ قبر کو گچھ سے پختہ کیا جائے یا اس پر عمارت بنائی جائے، یا اس پر بیٹھا جائے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) قبر کے بارہ میں شریعت کا اصولی نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک طرف تو میت کے تعلق سے اس کا احترام کیا جائے، کسی قسم کی بے حرمتی نہ کی جائے، اسی بنا پر اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کوئی اس پر بیٹھے نہیں یہ اس کے احترام کے خلاف ہوگا ـــــ اور دوسری طرف یہ کہ وہ دیکھنے میں ایسی سادہ ہو کہ اس کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا احساس اور آخرت کی یاد اور فکر دل میں پیدا ہو۔ اسی واسطے اس کو گچھ وغیرہ سے پختہ اور شاندار بنانے کی اور اس کے اوپر قبہ یا گنبد وغیرہ کی عمارت کھڑی کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے ـــــ دوسری حکمت اس حکم میں یہ بھی ہے کہ قبر جب بالکل سادہ اور کچی ہوگی اور اس پر کوئی شاندار عمارت بھی نہ کھڑی ہوگی

تو شرک پسند طبیعتیں اس کو پرستش گاہ بھی نہ بنائیں گی۔ جن صحابہ یا تابعین یا اولیا امت کی قبریں شریعت کے اس حکم کے مطابق بالکل سادہ اور کچی ہیں وہاں کوئی خرافات نہیں ہوتی اور جن بزرگوں کے مزارات پر شاندار مقبرے بنے ہوئے ہیں وہاں جو کچھ ہو رہا ہے آنکھوں کے سامنے ہے، اور اس کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف ان بزرگوں کی پاک روحوں کو ہی ہوتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ مَرْثَدٍ الْغَنَوِیْ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَجْلِسُوْا عَلَی الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا اِلَیْھَا ۔ رواہ مسلم

حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ تو قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ ان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ ابھی اوپر کہا گیا قبر پر بیٹھنے میں اس کی بے حرمتی ہے اور آگے درج ہونے والی حدیث سے معلوم ہوگا کہ اس سے صاحب قبر کو اذیت بھی ہوتی ہے۔ اور قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کا خاص مقصد امت کو شرک کے شبہ اور شائبہ سے بھی بچانا ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ قَالَ رَاٰنِی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّمَ مُتَّکِئًا عَلٰی قَبْرٍ فَقَالَ لَا تُؤْذِ صَاحِبَ ھٰذَا الْقَبْرِ اَوْ لَا تُؤْذِہٖ ۔

رواہ احمد

حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میں ایک قبر سے تکیہ لگائے بیٹھا ہوں تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اس قبر والے کو تکلیف نہ دو۔ (مسند احمد)

زیارت قبور:-

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ ــــــــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کر دیا تھا، اب اجازت دیتا ہوں کہ تم قبروں کی زیارت کر لیا کرو، کیونکہ (اس کا یہ فائدہ ہے کہ) اس سے دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر پیدا ہوتی ہے۔

(سنن ابن ماجہ)

(تشریح) شروع شروع میں جب تک کہ توحید پوری طرح عام مسلمانوں کے دلوں میں راسخ نہیں ہوئی تھی اور ان کو شرک اور جاہلیت سے نکلے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے سے منع فرما دیا تھا، کیونکہ اس سے ان لوگوں کے شرک اور قبر پرستی میں ملوث ہو جانے کا خطرہ تھا۔ــ پھر جب اُمت کا توحیدی مزاج پختہ ہو گیا، اور ہر قسم کے جلی اور خفی شرک سے دلوں میں نفرت بھر گئی اور قبروں پر جانے سے شرک کے جراثیم پھر پیدا ہو جانے کا اندیشہ نہیں رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعلان کے ذریعہ قبروں پر جانے کی اجازت دے دی اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ اجازت اس لیے دی جا رہی ہے کہ وہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر دلوں میں پیدا ہونے کا ذریعہ ہے ــــ اس حدیث سے شریعت کا یہ بنیادی اصول معلوم ہوا کہ اگر کسی کام میں خیر اور نفع کا کوئی پہلو ہو اور اسی کے ساتھ کسی بڑے ضرر کا بھی اندیشہ ہے تو اس اندیشہ کی وجہ سے خیر کے پہلو سے صرف نظر کر کے اس کی ممانعت کر دی جائے گی، لیکن اگر کسی وقت حالات میں ایسی تبدیلی ہو کہ ضرر کا وہ اندیشہ باقی نہ رہے تو پھر اس کی اجازت دے دی جائے گی۔

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى الْمَقَابِرِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ ــــــــــ رواہ مسلم

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو تعلیم فرماتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو اہل قبور پر اس طرح سلام پڑھیں اور ان کے لیے دعا کریں "السلام علیکم اهل الديار ..... الخ (سلام ہو تم پر ان گھروں والو! مومنوں میں سے اور مسلموں میں سے اور انشاء اللہ ہم تم سے آملنے والے ہیں۔ ہم اللہ سے دعا اور سوال کرتے ہیں اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت (یعنی چین اور سکون کا) (صحیح مسلم)

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقُبُوْرٍ بِالْمَدِيْنَةِ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ۔

رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر مدینہ ہی میں چند قبروں پر ہوا آپ نے ان کی طرف رُخ کیا اور فرمایا" السلام علیکم یا اَهلَ القُبورِ ...... الخ (سلام ہو تم پر اے قبر والو اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے، تم ہم سے آگے جانے والے ہو اور ہم پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) ان دونوں حدیثوں میں قبر والوں پر سلام و دعا کے جو کلمات وارد ہوئے ہیں۔ جن میں صرف الفاظ کا معمولی سا فرق ہے۔ ان میں ان کے واسطے بس سلام اور دعائے مغفرت ہے اور ساتھ ہی اپنی موت کی یاد ہے۔ معلوم ہوا کہ یہی دو چیزیں کسی کی قبر پر جانے کا اصل مقصد ہونی چاہئیں اور صحابہ کرام اور ان کے تابعین بالاحسان کا طریقہ یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انہی کے طریقہ پر قائم رکھے اور اسی پر اٹھائے۔

تجلیات مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— از ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۹۶) خواجہ ابوالحسن بدخشی الکشمی کے نام (حدیث قرطاس کے بیان میں)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ———

سوال کیا گیا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں فرمایا تھا "ائتونی بقرطاس اکتب لکم کتاباً لن تضلوا بعدی" (یعنی مجھے کاغذ لاؤ میں تمھیں ایسی تحریر لکھوا دوں کہ تم میرے بعد ہرگز راہ راست سے نہ ہٹ سکو) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ چند اور صحابہؓ نے کاغذ لانے کو منع کیا اور کہا "حسبنا کتاب اللہ" (ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے) اور یہ بھی کہا "اھجر استفھموہ" (یعنی کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلبہ مرض کی بنا پر یہ بے قصد کلام فرما رہے ہیں، معلوم کرو؟) ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو جو کچھ فرماتے تھے وہ از روئے وحی فرماتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" ——— اور وحی کو رد کرنا کفر ہے جیسا کہ آیہ کریمہ "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون" ——— سے ظاہر ہے ——— نیز کلام بے قصد و بے اختیار کا پیغمبر کے لئے جائز رکھنا گویا اسکے احکام شرعیہ سے اعتماد اٹھا دینا ہے اور یہ بھی کفر، الحاد و زندقہ ہے ——— آخر اس شبہے

کا جواب کیا ہے ؟

اللہ تعالیٰ تم کو رشد و ہدایت عطا کرے اور صراطِ مستقیم پر چلائے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ اس قسم کے شبہات ایک جماعت کے لوگ حضرات خلفا ثلٰثہ پر اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر وارد کیا کرتے ہیں اور ان تشکیکات کے ذریعے اُن اکابر ملت کو مجروح کرنا چاہتے ہیں۔ کاش یہ لوگ انصاف پر آجائیں اور صحبتِ خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ذہن نشین کرلیں کہ صحابۂ کرام کے نفوس، صحبتِ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم میں رہ کر ہوا و ہوس سے پاک اور اُن کے سینے عداوت و کینہ سے صاف ہوگئے تھے اور یہ بھی جان لیں کہ یہ صحابہؓ وہ اکابرِ دین اور پیشوایانِ اسلام ہیں جنھوں نے اپنی طاقتوں کو کلمۂ اسلام کے بلند کرنے میں اور آنحضرتؐ کی نصرت میں اور اپنے اموال کو بھی اسی مقصد کے پیش نظر، رات دن، خفیہ اور علانیہ صرف کیا ہے ـــــ انھوں نے محبتِ رسولؐ کی خاطر اپنے قبیلوں کو اپنی اولاد و ازواج کو اپنے وطنوں اور مکانوں کو اپنے چشموں اور کھیتوں کو اپنے باغات اور نہروں کو چھوڑا ہے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو اپنے نفسوں پر ترجیح دی، انھوں نے اپنی ذات اور اپنی ذریات و اموال کی محبت کے مقابلے میں محبّتِ رسولؐ کو اختیار کیا۔ یہی وہ صحابہ ہیں جن کے سامنے وحی آتی تھی، جنھوں نے معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھے، یہاں تک کہ ان کا غیب، حضوری بن گیا اور ان کا علم، مشاہدہ ہوگیا۔ یہی وہ حضرات ہیں جن کی تعریف قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے (چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے) " رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ " (یعنی اللہ ان سے راضی ہوگیا یہ اللہ سے راضی ہوگئے) (دوسری جگہ توریت و انجیل کا حوالہ دیکر فرمایا) مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ـــــ جب کہ تمام اصحابِ کرامؓ ان فضیلتوں میں شریک ہیں تو پھر سمجھنا چاہیے کہ کیا مقام ہے خلفاء راشدین کا جو اکابر صحابہ میں سے ہیں ـــــ عمر فاروقؓ وہی عمر فاروقؓ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ـــــ (اے نبی آپ کے لئے اللہ کافی ہے اور مومنین میں سے وہ بھی

جنھوں نے آپ کی اتباع کی) ___ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اس آیت کریمہ کا سبب نزول، حضرت فاروق اعظم کا اسلام ہے ___ نظرِ انصاف حاصل ہو اور شرفِ صحبت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کر کے اُن تمام فضائل و درجات کو جو صحابہ کرامؓ کے تھے جان لیا جائے تو اِس قسم کے شبہات کو خود معترضین مغالطہ و ملمع کاری تصور کریں اور قابلِ اعتبار نہ سمجھیں چاہے وہ غلطی کے اصل مادے کی تشخیص و تعیین نہ کر سکیں مگر اس قدر ضرور جان لیں گے کہ ان شبہات کی کوئی حقیقت اور ان میں کوئی افادیت نہیں ہے بلکہ یہ شبہات ضروریات اسلامیہ سے ٹکراتے ہیں اور کتاب و حدیث کی رو سے مردود ہیں ___ پھر بھی سوال (مندرجہ) کے جواب اور مادہ غلطی کی تعیین میں چند مقدمات، اللہ کی مدد سے لکھے جاتے ہیں خوب اچھی طرح سن لیں، (در اصل) اس اشکال کا جواب چند مقدمات پر موقوف ہے جن میں سے ہر ہر مقدمہ بھی ایک مستقل جواب ہے۔

مقدمۂ اوّل ___ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات، وحی نہیں ہوتے تھے ___ آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ___ نطق قرآنی کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ اہل تفسیر نے کہا ہے (مطلب یہ کہ قرآن کل کا کل کلام الٰہی ہے) ___ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع اقوال موجب وحی ہوتے تو آپ کے بعض اقوال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ اور عتاب نہ ہوتا اور نہ اس سے معافی کا ہونا کچھ گنجائش رکھتا (حالانکہ قرآن مجید میں) اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مخاطب فرما کر ارشاد فرماتا ہے۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (سورۂ توبہ) (اے نبی اللہ نے تمھیں معاف کیا، تم نے ان منافقوں کی باتوں میں آ کر کیوں انھیں اجازت دی۔)

مقدمۂ دوم ___ احکام اجتہادیہ اور اُمور عقلیہ میں..... بموجب آیۂ کریمہ " وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ " (اے نبی تم معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ لیا کرو) اصحاب کرامؓ کو اظہار رائے اور بحث مباحثہ کی گنجائش ہے کیونکہ اسکے بغیر مشورے کا حکم بالکل بے معنی ہے ___ بدر کے قیدیوں کے قتل کرنے یا اُن سے فدیہ لے کر چھوڑ دینے میں اختلاف رائے واقع ہوا تھا۔ حضرت فاروقؓ نے قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا

پھر وحی فاروقؓ اعظم ہی کی رائے کے موافق آئی.........

مقدمۂ سوم ــــــ سہو و نسیان پیغمبر کے لئے جائز ہے بلکہ واقع ہوا ہے چنانچہ ذوالیدینؓ کی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ چار رکعت والی ایک نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ ذوالیدینؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا نماز میں قصر ہو گیا یا آپ کو سہو ہوا؟ ــــ قول ذوالیدین کی سچائی کا ثبوت ملنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں اور پڑھیں اور سجدۂ سہو کیا ــــ جب سہو و نسیان، حالت صحت و فراغت میں بمقتضائے بشریت جائز ہے تو حالت مرض الموت میں غلبۂ مرض کے وقت کلام بے قصد و بے اختیار کا صادر ہونا کیوں ممکن نہ ہوگا؟ ــــ اور اس چیز سے احکام شرعیہ کا اعتماد کیوں اٹھنے لگا جب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سہو و نسیاں پر مطلع اور صحیح و خطا کو جدا فرما دیتا تھا ــــ ہاں یہ مسلم ہے کہ نبی کا خطا پر برقرار رہنا ہرگز جائز نہیں ہے اسلئے کہ برقرار رہنے سے احکام شرعیہ سے اعتماد اٹھتا ہے ــــ پس ثابت ہوا کہ سہو و نسیان اعتماد کو اٹھا دینے والی چیز نہیں ہے بلکہ سہو و نسیان پر نبی کا قائم رہ جانا اور اسکی تصحیح نہ ہونا احکام شرعیہ سے اعتماد کو زائل کرنے والا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ نبی سہو و نسیان پر قائم نہیں رہ سکتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی تصحیح ہو ہی جاتی ہے۔

مقدمۂ چہارم ــــــ حضرت فاروق بلکہ خلفاء ثلٰثہ رضی اللہ عنہم کو کتاب و سنت کی رو سے جنت کی بشارت مل چکی ہے اور ان کے حق میں جنت کی بشارت والی احادیث اپنے راویوں کی کثرت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حدّ شہرت اور حدّ تواتر معنوی کو پہونچ گئی ہیں ان کا انکار کرنا جہالت کی وجہ سے ہو سکتا ہے یا دشمنی کے سبب سے ــــ .... اگر بعض مخالف فرقوں کی کتب احادیث میں ان بشارات کو ذکر نہ کیا گیا ہو تو اس کا کوئی اثر ان کے ثبوت پر نہیں پڑتا کسی کتاب میں عدم روایت سے عدم بشارت لازم نہیں آتی ــــ ان اکابر صحابہ کے لئے بشارت کا ثبوت قرآن مجید ہی میں بہت سی آیات کے اندر موجود ہے ان میں سے بعض آیات یہ ہیں ــــ "وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ

وَرَضُوْا عَنْہُ وَاَعَدَّ لَہُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ"۔ یعنی مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین اور وہ لوگ جنھوں نے نیکو کاری میں ان کی پیروی کی راضی ہوا اللہ تعالیٰ ان سب سے اور یہ راضی ہوئے اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے بہشتی باغات تیار کئے ہیں کہ اُن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں ۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔

دوسری جگہ فرماتا ہے ۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی۔

یعنی برابر نہیں تم میں سے وہ لوگ جنھوں نے (دین کی راہ میں) فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور قتال کیا ۔ یہ لوگ ان لوگوں سے مرتبے میں بہت بڑے ہیں جنھوں نے بعد فتح مکہ خرچ اور قتال کیا اور ان میں سے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے بہتری کا۔

پس جب تمام ان صحابہؓ کو جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے اور فتح مکہ کے بعد انفاق و مقاتلہ کیا ہے (یعنی دین کی راہ میں جان و مال کی قربانی کی ہے) بہشت کی بشارت دی گئی ہے تو اُن اکابر صحابہؓ کے بارے میں کیا کلام ہوسکتا ہے جو انفاق فی سبیل اللہ، مقاتلہ اور ہجرت میں سابق تر ہیں اور ان کی عظمتِ شان کا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ آیت لَا یَسْتَوِیْ حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ انفاق و مقاتلہ میں تمام سابقین میں سابق تر ہیں۔

تیسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔

یعنی یقیناً خدا راضی ہوا مومنین سے جب کہ وہ آپ کے ہاتھ پر (ببول کے) درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے ——— امام محی السنۃ بغویؒ نے معالم التنزیل میں حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" دوزخ میں نہ جائے گا اُن میں سے ایک بھی جنھوں نے (وادی حدیبیہ میں) ببول کے درخت کے نیچے بیعت کی ہو"

اس بیعت کو بیعت الرضوان کہتے ہیں اسلئے کہ حضرت حق جل مجدہٗ اس بیعت کرنے والی جماعت سے راضی و خوش ہو گئے ـــــ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ اللہ کے کسی ایسے بندہ کی تکفیر کرنا بدترین بُرائی اور کفر ہے جو کتاب و سنت کی رو سے بشارت یافتہ ہو۔

مقدمۂ پنجم ـــــ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ کا کاغذ لانے میں توقف و تامل کرنا نعوذ باللہ رد و انکار کی رو سے نہ تھا اس قسم کی گستاخی خلق عظیم والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمنشینوں سے کیسے ہو سکتی تھی؟ ایک ادنیٰ صحابی سے بھی جو محض ایک یا دو بار شرف صحبت خیر البشرؐ سے مشرف ہوا ہو ایسی گستاخی کی توقع نہیں کی جا سکتی ـــــ بلکہ عام امتیوں کے بارہ میں بھی جو دولت اسلام سے سرفراز ہو چکے ہیں اس قسم کے رد و انکار کا وہم نہیں ہو سکتا، پھر بھلا اس شخص سے کیونکر اس گستاخی کی توقع ہو جو اکابر صحابہؓ اور اعاظم مہاجرین و انصار میں سے ہو؟ ـــــ اللہ تعالےٰ انصاف کا مادہ نصیب کرے تاکہ اکابر دین کے ساتھ اس طرح کی بدگمانی اور بغیر سمجھے ہر کلمہ و کلام پر گرفت نہ کریں ـــــ مقصد حضرت فاروقؓ تو استفہام و استفسار تھا چنانچہ انھوں نے فرمایا "اِسْتَفْهِمُوْهُ" مطلب یہ ہو کہ دریافت کر لو اگر قرطاس کو اہتمام کے ساتھ طلب فرماتے ہیں تو لے آیا جائے اور اگر اس بارے میں کوئی خاص اہتمام، مقصود نہیں ہے تو پھر اس نازک وقت میں آپ کو تکلیف نہ دینی چاہیے ـــــ اگر کسی وحی کی بنا پر آپنے قرطاس طلب فرمایا ہے تو تاکید کے ساتھ طلب فرمائیں گے اور جس بات کے لکھنے کا حکم آپ کو ہوا ہے ضرور لکھوائیں گے اسلئے کہ وحی کا پہونچانا نبی پر واجب و لازم ہے اور اگر یہ قلم کاغذ کی طلب، وحی سے نہیں ہے بلکہ اپنی رائے اور خیال سے یہ بات آپنے فرمائی ہے تو وقت کی نزاکت، مساعدت نہیں کرتی۔ آپ کی وفات کے بعد بھی سلسلہ اجتہاد باقی ہے۔ آپ کی امت کے مجتہد کتاب اللہ سے جو دین کا اصل اُصول ہے ـــــ احکام اجتہادیہ کو نکال لیں گے ـــــ جب کہ نزول وحی کے زمانے میں ہی اجتہاد کی گنجائش تھی تو وفات کے بعد جو کہ انقطاع وحی کا زمانہ ہوگا بطریقہٗ اُولیٰ اہل علم کا استنباط و اجتہاد، مقبول ہوگا ـــــ اور چونکہ اس بارے میں پھر آنحضرتؐ

نے کوئی اہتمام نہیں فرمایا بلکہ اس بات سے اعراض کیا تو معلوم ہو گیا کہ یہ بات از روئے وحی نہ تھی ——— اور وہ تامل و توقف جو استفسار کے لئے ہو ہرگز مذموم نہیں ہے ——— (دیکھو) ملائکہ نے استفسار کی غرض سے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا "اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ" (کیا آپ زمین میں ایسے شخص کو خلیفہ بنائیں گے جس کی نسل میں (کچھ لوگ) فساد فی الارض کریں گے اور خون بہائیں گے) ——— اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے لڑکے حضرت یحییٰؑ کی بشارتِ ولادت پاکر کہا تھا "اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ" (میرے یہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا جب کہ میں بوڑھا ہوں اور میری زوجہ بانجھ ہے) اور اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام نے (ولادتِ عیسیٰؑ کی خبر پاکر) کہا تھا ——— "اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا" (مجھ سے بچہ کیسے پیدا ہوگا درآنحالیکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار ہوں ——— پس اگر حضرت فاروقؓ نے بھی استفہام و استفسار کی غرض سے قرطاس لانے میں توقف کیا تو اس میں کیا مضائقہ ہے اور اس پر اتنا کیوں شور و شر ہے؟

مقدمہ ششم ——— صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ آنحضرت سے حسنِ ظن رکھنا ضروری ہے اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ بہترین زمانہ، زمانہ سرورِ کائنات ہے اور آپ کے اصحاب، انبیاء کے بعد بہترین اولادِ آدم تھے، اور اس کے نتیجہ میں یہ یقین کرنا بھی لازم ہے کہ بہترین زمانے میں، بہترین بنی آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ہرگز امرِ باطل پر اجتماع و اتفاق نہ کریں گے اور ایسے لوگوں کو ہرگز جانشینِ پیغمبرؐ نہ بنائیں گے جو (نعوذ باللہ) کافر یا فاسق ہوں ——— اور یہ جو ہم نے کہا کہ اصحاب کرامؓ بہترین اولادِ آدمؑ تھے اس بنا پر کہا کہ یہ اُمت، نصِ قرآنی کی رو سے خیر الامم ہے اور اس اُمت کے بہترین افراد یہ صحابہؓ ہیں، کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا، پس تھوڑا سا انصاف کرنا اور سمجھنا چاہیئے کہ حضرت فاروقؓ کا قرطاس کے لانے سے منع کرنا معاذ اللہ کفر تھا تو پھر حضرت صدیقؓ جو بنصِ قرآنی اس بہترین اُمت میں سب سے زیادہ متقی تھے ——— حضرت فاروقؓ کو تصریح و تعیین کے ساتھ اپنا خلیفہ مقرر نہ کرتے اور وہ مہاجرین و انصار جن کی تعریف

للہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمائی ہے اور جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اور جن سے اُس نے جنت کا وعدہ کیا ہے وہ مہاجرین و انصار، حضرت فاروقؓ سے بیعت نہ کرتے اور ان کو جانشین پیغمبرؐ نہ بناتے ــــــ جب حسنِ ظن جو کہ مقدمۂ محبت ہو صحبت آنسرورؐ اور اصحاب آنسرورؐ سے حاصل ہو گیا تو اس قسم کے اعتراضات کی مزاحمت سے نجات میسر ہو گئی اور ان اعتراضوں کا ظاہری طور پر باطل ہونا ظاہر ہو گیا اور اگر نعوذ باللہ حسنِ ظن صحبت خیر البشرؐ اور اصحاب خیر البشر سے حاصل نہ ہوا اور بدگمانی کی نوبت آئی تو یہ بدگمانی صحابہؓ سے آگے بڑھے گی اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمانی ہوگی بلکہ مولائے حقیقی تک بدگمانی کا سلسلہ پہونچے گا ــ اس بات کی خرابی کو خوب سمجھ لیا جائے ــــ جس نے توقیر اصحاب کرامؓ نہیں کی وہ گویا رسولؐ ہی پر ایمان نہ لایا ــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کی شان میں یوں فرمایا ہے کہ جس نے اُن سے محبت کی اُس نے میری محبت کی وجہ سے اُن سے محبت کی اور جس نے اُن سے بغض رکھا اُس نے مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے بغض رکھا ــ پس محبتِ رسول کے لئے محبتِ صحابہؓ لازم ہے اور بغضِ اصحابؓ مستلزم بغض نبیؐ ہے ــــ

جب یہ مقدمات واضح ہو گئے تو بے تکلف اس شبہے اور اس قسم کے دوسرے شبہات کا جواب حاصل ہو گیا بلکہ بہت سے جوابات حاصل ہو گئے اس لئے کہ ان مقدمات میں سے ہر مقدمہ ایک مستقل جواب ہے .... اس قسم کے شبہات فقیر کے نزدیک ایسے ہیں جیسا کہ ایک چالاک و مکار شخص ناواقفوں کی ایک جماعت کے پاس آئے اور اپنے پُرفریب دلائل سے ایک پتھر کو جو کھلا ہوا پتھر ہے سونا بتائے اور یہ بیچارے جب اُس شخص کے ظاہری ملمع شدہ دلائل کے دفع کرنے سے عاجز ہو جائیں اور اُن دلائل کی غلطی کے مواقع کی تشخیص نہ کر سکیں تو ناچار شک و شبہ میں پڑ جائیں بلکہ یقین کر لیں کہ ہاں وہ پتھر سونا ہی ہے اور اپنے حسّ و ادراک کو فراموش کر دیں ــ ایک ہوشیار اور ذی فہم آدمی کو چاہیئے کہ جس کی بداہت پر اعتماد کرے اور ان دلائل کو جو ٹیپ ٹاپ کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں ـ ناقابلِ اعتبار و سادس قرار دیدے ـ ہم جو گفتگو کر رہے ہیں اس میں بھی خلفاءِ ثلثہ کی بزرگی و عظمت بلکہ تمام اصحاب کرام کی بزرگی کتاب و حدیث کی رو سے محسوس و مشاہد ہے ــــ لہٰذا وہ شخص جو ملمع کاری کے ساتھ

دل میں الزام کرکے ان پر عیب لگاتا اور طعن کرتا ہے اس شخص کی مانند ہے جو محسوس چیز کو کچھ کا کچھ بتا کر لوگوں کو بہکاتا ہے ــــ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب ــــ

کاش میں سمجھ سکتا کہ اکابر دین اور پیشوایان اسلام کو برا کہنے پر ان لوگوں کو کس چیز نے آمادہ کیا ہے؟ حالانکہ کسی فاسق و کافر کو بھی سب و شتم کرنا، شریعت میں، عبادت، کرامت، فضیلت اور نجات کا ذریعہ نہیں شمار کیا گیا ــ پھر ہادیان دین اور رہنمایان اسلام پر سب و طعن کیسے عبادت و کرامت بن جائے گا؟ ...... قرآن مجید میں اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان کی گئی ہے ــ رحماء بینھم (آپس میں رحمدل ہیں) پس ان بزرگوں کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ آپس میں عداوت و کینہ رکھتے تھے نص قرآنی کے خلاف ہے ــ ان بزرگوں کے اندر (خواہ مخواہ) عداوت و کینہ ثابت کرنا طرفین کے لئے باعث طعن اور قابل اعتراض ہے دونوں گروہوں سے اعتماد و عقیدت اٹھ جاتی ہے اور اس سے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے ہر دو فریق مطعون ہو جائیں گے ــ نعوذ باللہ من ذالک ــــ نیز اس طریقے سے انبیاء کے بعد جو بہترین اولاد آدم ہیں وہ بدترین مردم قرار پا جائیں گے اور بہترین زمانہ، بدترین زمانہ قرار پائے گا .... یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کونسی بزرگی ہوئی کہ خلفاء ثلاثہ ان سے عداوت کرنے والے بتائے جائیں اور خود ان کو پوشیدہ قلبی عداوت رکھنے والا ظاہر کیا جائے؟ ــــ یہ تو طرفین پر طعن ہوا ــــ یہ حضرات کیوں نہ باہم شیر و شکر اور ایک دوسرے پر جان فدا کرنے والے قرار دیئے جائیں ــــ امر خلافت ان بزرگوں کے نزدیک مرغوب و مطبوع نہیں تھا کہ سبب عداوت و کینہ ہو جاتا ...... ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رءوف رحیم ــــ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانام وعلیٰ اٰلہ واصحابہ الکرام الیٰ یوم القیام ــــ

حضرت رائے پوری قدس سرہ

کی کتاب زندگی کا ایک ورق

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

رفیق گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی جو سوانح حیات لکھی ہے جو اس وقت زیر طبع ہے اسکا ایک باب "رائے پور کے روز و شب" الفرقان میں پہلے شائع کیا گیا تھا۔ آج اسکا ایک دوسرا باب "سلوک و معرفت" ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے ــــــ کتاب کی ترتیب کے لحاظ سے یہ چوتھا باب ہے۔ امید ہے انشاء اللہ آخر ستمبر تک کتاب تیار ہو جائے گی۔

سلوک و معرفت

مرد دیں ما را خبر او را نظر — او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش — او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش

سلسلۂ طریقت حضرت چاروں سلسلوں (قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ) میں بیعت فرماتے تھے اور چاروں سلسلوں کی نسبتیں "عطر مجموعہ" کی طرح اس سلسلہ میں بسی ہوئی تھیں جو آپکو اپنے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب[1] رائے پوری قدس سرہ سے پہونچا تھا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ کے پہلے شیخ آپ ہی کے ہم نام حضرت میاں صاحب

---

[1] حضرت کے حالات طیبہ اور کمالات عالیہ کے تذکرہ کے لئے مستقل تصنیف درکار ہے ضرور لکھنا چاہیے اس جگہ اسکیلئے
(بقیہ حاشیہ پر صفحہ آئندہ)

شاہ عبدالرحیم صاحب بہارنپوری[1] تھے جو سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ میں اپنے وقت کے نامور شیخ طریقت حضرت حاجی عبدالغفور صاحبؒ (جو اخوند صاحبؒ صوات کے نام سے مشہور ہیں) کے خلیفہ تھے، میاں صاحب نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کو سلسلہ قادریہ نقشبندیہ میں اجازت دی تھی[2] اور وہ اس سلسلہ میں لوگوں کو بیعت فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس راہ کی ترقیات و کمالات، مرجعیت و مقبولیت جو نہایت عالی استعداد اور قوی النسبت بزرگوں کو حاصل ہوتی ہے عطا فرما رکھی تھی، میاں صاحب کی وفات کے بعد جب قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا آفتاب رشد و ارشاد نصف النہار پر پہونچا اور ان کی ذات گرامی سے وہ تجدیدی شان اتباع سنت کا کمال اور عقائد و اعمال میں اُن کے تعلق اور نسبت کے اثرات ہویدا اور عشق و محبت کی وہ خصوصیات ظاہر ہوئیں جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کی خصوصیت ہیں تو آپ نے شیخ کامل و مکمل ہونے کے باوجود حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کی طرف اس طرح رجوع کیا جیسے ایک مرید رشید کرتا ہے، حضرت نے آپکو اجازت و خلافت دی، آپ کی بقیہ زندگی حضرت کے رنگ و مسلک اور حضرت کی محبت و عقیدت میں ڈوبی رہتی تھی اور اس طرح ان دونوں سلسلوں کے اثرات و برکات اور انکی نسبتیں آپ میں جمع ہو گئیں۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) جستہ جستہ واقعات جو حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ نے اپنی زبان مبارک سے کبھی ارشاد فرمائے وہ اس کتاب میں اپنے موقع پر آگئے ہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل میں نہایت اختصار اور اجمال کے ساتھ کچھ حالات لکھے ہیں اُن کو ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے، ناچیز مؤلف نے اس مختصر کتاب میں ضمناً بطور تذکرہ لکھنے کی جرأت کی ہے کہ درحقیقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے حالات و کمالات اور انکی زندگی حضرت ہی کی کتاب زندگی اور تذکرہ کا ایک زریں ورق اور آپ کے کمالات اور مقالات کا ایک نمونہ اور نتیجہ تھا۔

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

[1] حضرت میاں صاحب سرسارہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے اگر یہ (خاندانی) روایت صحیح ہو کہ ۸۹ سال کی عمر میں وفات ہوئی تو ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہوگی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب کے نہایت دلآویز اور پُرلطف واقعات و حالات سناتے تھے ان کی مدد سے ان کا ایک مختصر سا تذکرہ اور تعارف مرتب ہو سکتا ہے،

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مقام تحقیق و اجتہاد

حضرت کے طریقۂ سلوک و تربیت، تصوف و طریقت، ذکر و صحبت معرفت و محبت کے بارے میں بجائے اس کے کہ خود کوئی چیز پیش کی جائے اور اس پر علمی اور فنی طریقہ پر روشنی ڈالی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کے بارے میں حضرت کے خود اپنے خیالات و تحقیقات پیش کی جائیں جن کا وقتاً فوقتاً اصلاح و تربیت کے لئے کسی مجلس میں اظہار فرمایا اور جن کا بہت تھوڑا حصہ (نہ ہونے کے برابر) قید تحریر میں آسکا ہو انھیں منتشر و متفرق ملفوظات پر نظر ڈالنے سے حضرت کے اصلی خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کا بھی کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ حضرت کو اس فن میں کیسی مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی اور آپ کی نظر رسوم و آداب، جزئیات و تفصیلات کے بجائے اصل مقاصد اور لُبِّ لباب پر کس قدر تھی، ان مقاصد کے حصول کے لئے آپ طبائع، اختلاف مزاج اور زمانہ کی تبدیلیوں کی کس قدر رعایت فرماتے تھے اور آپ کی نظر کس قدر عمیق، دقیقہ رس اور حقیقت بیں تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فرماتے تھے کہ میاں صاحب حضرت حاجی آخوند صاحب سوات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی، حاجی صاحب نے بیعت فرمالیا اور شرط کی کہ انگریزوں کی نوکری نہیں کروگے ورنہ بیعت شکست ہو جائے گی، وہ بیعت کر کے چلے آئے لیکن بعض حالات ایسے پیش آئے کہ انھوں نے نوکری کر لی، پھر جب سیدو شریف حاضر ہوئے آخوند صاحب نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ جاؤ ہمارے کام کا نہیں رہا، آپ پندرہ روز تک وہاں روتے رہے، آخوند صاحب نے بلوا کر دوبارہ اسی شرط پر بیعت لی اور دن میں کے چھوڑ ہے، وہاں سیدو شریف ایک غار میں معمولات پورے فرماتے تھے، ایک روز اس غار کے اوپر اس چٹان پر شیر ببر آکر بولنے لگا، اسکی آواز سے پہاڑ کی چوٹی سے پتھر گرنے لگے مگر ملتفت تھے ذرا سکون میں فرق آیا پھر اپنا ذکر اسی قوت سے شروع کر دیا، بڑے قوی النسبت اور صاحب کشف و تصرف بزرگ تھے، فیل پا تھا اور اسکی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا اس کے باوجود روزانہ سو رکعتیں نفل پڑھا کرتے تھے خادم کھڑا کر دیتے تھے آپ نفل پڑھنے لگتے اور اٹھنے بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، کشف کا یہ حال تھا کہ مرزا صاحب کی شہرت اور دعوے سے بہت دن پہلے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مقصود کار فرماتے تھے کہ اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے، جب کبھی کوئی سالک اپنی کیفیات کا ذکر کرتا تو یہی فرماتے کہ اصل کیفیت یقین ہے، ایک دفعہ فرمایا، کمرہ میں اندھیرے میں شیر ہے نظر نہیں آتا، ایک آدمی وہاں ہو وہ بے خبری میں بے فکر بیٹھا ہے، اچانک روشنی ہوئی، شیر اس کو نظر آگیا اس پر خوف طاری ہو جائے گا، اسی طرح یقین نصیب ہونے کے بعد خوف خدا آجاتا ہے اور یہ خوف خدا بنیاد ہے تمام اعمال حسنہ کے کرنے کی اور تمام اعمال بد سے بچنے کی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ اجرائے لطائف سلطان الاذکار انوار حتیٰ کہ فنائیت کی کیفیت کو بھی کچھ اتنا بڑا مرتبہ نہیں دیتے تھے، حضرتؒ کے نزدیک استدلالی یقین کا وجدانی اور ذوقی میں تبدیل ہو جانا اصل چیز تھی اس کا نتیجہ پھر یہ ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا بھی خدا کی ہستی کا انکار کرے تو یہ وجدانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حکیم نور الدین صاحب مہاراجہ جموں کی صحت کے لئے دعا کرانے کے لئے آئے فرمایا تمہارا نام نور الدین ہے؟ حکیم صاحب نے کہا ہاں، فرمایا علاقہ قادیان میں ایک غلام احمد پیدا ہوا ہے جو کچھ عرصہ کے بعد ایسے دعوے کریگا جو نہ اٹھائے جائیں گے نہ رکھے جائیں گے، تم اسکے مصاحب بنے ہوئے ہو، حکیم صاحب نے استعجاب کا اظہار کیا تو فرمایا تم میں الجھنے کی عادت ہے اور مناظرہ کا شوق ہے یہی عادت تم کو وہاں لے جائیگی باوجود کشف [illegible] ج میں بہت تواضع اور مسکنت تھی، فرماتے تھے کہ جب میں بازار سے گذرتا ہوں اور لوگ سلام کرتے ہیں تو گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے، ندامت میں ڈوب جاتا ہوں، انتقال بھی عجیب طریقہ سے ہوا، ایک دن گھر سے خوشدامن صاحبہ نے آواز دی کہ میاں صاحب رقیہ (چھوٹی بچی) روٹھی ہوئی ہے اسکو مناؤ فرمایا کیسی رقیہ اور کس کی رقیہ، ہم نے اپنے روٹھے کو منالیا، یہ کہہ کر ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا کروٹ لی اور سفر آخرت پر روانہ ہو گئے،

حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ مظاہر العلوم میں تعلیم حاصل کرتے تھے ابتداء سے بزرگوں سے عقیدت اور انکی صحبت میں بیٹھنے کا شوق تھا، میاں صاحب کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے،

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

یقین والا شخص کبھی بھی انکار نہیں کرتا ہے[۱]" حضرتؒ راستہ کی کیفیات مثلاً وجد، انوار، اجرائے لطائف، سلطان الاذکار، حتیٰ کہ فنائیت کی کیفیت کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے، حضرتؒ کے یہاں کیفیت قابل حصول صرف ایک تھی، یقین، کامل یقین اور اسکے نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات، مثلاً خوف، خشیت، محبت الٰہی، تعلق مع اللہ کا دوام، کامل اخلاص، اتباع شریعت، اخلاق عالیہ مثلاً توکل، رضا و تسلیم، صبر و شکر وغیرہ، لوگ بڑے بڑے اونچے حالات حضرتؒ کو سناتے تھے لیکن حضرت یہی فرماتے تھے کہ اصل مقصود یقین کا پیدا ہو جانا ہے، حضرتؒ کے ہاں تصوف کا مقصود صرف یہی تھا کہ استدلالی یقین، وجدانی، ذوقی اور کشفی یقین میں تبدیل ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہو تعلق مع اللہ کو دوام و استقلال حاصل ہو[۱]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میاں صاحب کو بھی بڑی نظر عنایت تھی، ایک روز فرمایا آ میرے چاند تجھے بیعت ہی کر لوں، کچھ عرصہ کے بعد اجازت بھی مرحمت فرمائی، حضرت کی ان کے ساتھ اخیر تک عقیدت قائم رہی، ذکر، طریقۂ قادریہ کا انہیں سے اخذ کیا تھا، اور رائے پور کے سلسلہ میں وہی رد نہج ہوا،

مولانا عبداللہ شاہ صاحب کرنالی "تعلیمات رحیمی" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت پیر و مرشد (حضرت میاں صاحب سہارنپوری) بدرجہ غایت متبع سنت اور محترز از بدعت تھے، کسی عرس اور محفل رقص و سرود و شعر خوانی میں شریک نہیں ہوتے تھے اور اپنے خادمان کو اتباع شرع کا تقید فرماتے تھے اور بدعات سے منع فرماتے تھے (ص ۵۲-۵۳)

۱۳ ربیع الاول ۱۳۰۳ھ روز دو شنبہ وقت شب میاں صاحب کی وفات ہوئی خلفاء میں مولوی محمود نیاز خاں صاحب جانشین، مولانا عبداللہ شاہ صاحب کرنالی، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب[۱] پدر ممتاز و مشہور ہیں

(حاشیہ ۱۶۲ صفحہ ۲) یہ سلسلہ حضرت سید آدم بنوری، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ سکندر کیتھلی، حضرت شاہ کمال کیتھلی اور اُن کے مشائخؒ کے توسط سے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی تک پہونچتا ہے، حضرت اخوند صاحب کو حضرت شاہ شیر سے خلافت تھی اُن کو حضرت محمد حافظ صاحب مجددی سے (بقیہ آئندہ)

کسی نے کسی لطیفہ کے جاری نہ ہونے کی شکایت کی۔ آپ نے اس سے یقین کے بارے میں پوچھا اس نے کہا کہ وہ تو ہے فرمایا کہ پھر لطیفہ کے پیچھے نہ پڑو، مقصود حاصل ہے۔[1]

ذکر و سلوک کی ضرورت سلوک و تصوف کی ضرورت اور اس کی تاریخ و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا:-

اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اُس کی رضا کا دھیان و فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں، اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا،

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دین کی تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان صحبت سے صحابہ کرامؓ کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی لیکن بعد میں طبیعتوں کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کیلئے صحبت کے ساتھ "ذکر و فکر کی کثرت" کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے اُن کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں مناسبت پیدا کرنے کیلئے انکے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔

اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان کو حضرت صدیق بشر اکبرعلی سے اُن کو حضرت شاہ مومن لکرکانے انکو حضرت حبیب شاہ بازسے اُن کو حضرت سید آدم بنوری سے الی آخرہ (تعلیمات رحیمی)

[1] تحریر مولوی عبدالجلیل صاحب۔

کیلئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہو تو ان میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور یہ سمجھا نہیں جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی لئے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہو کہ آئمہ طریق اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں ردو بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لئے ان کے خاص حالات اور اُن کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کر دیتا ہے اور بعضے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنھیں اس طرح کا کوئی ذکر و شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ اُن کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہو، اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہو کہ اُن سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کیا کرایا جاتا ہو۔[1]

ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا:۔

کسی کونہ میں بیٹھ کر کسی کا نام لیا جائے تو مسمیٰ سے محبت ہو جائے گی جب انسان کثرت سے اللہ کا نام لیتا ہو تو اللہ کی محبت ہو جاتی ہو جو کہ نیکیوں کی جڑ ہو، اصلاح کا انحصار کثرت ذکر اور صحبت پر ہو، فرمایا کہ صحبت ضروری ہو محبت کے ساتھ، اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود عرب میں نہ آتے بلکہ قرآن شریف لکھا ہوا آجاتا تو اس طرح سے اصلاح نہ ہوتی، فرمایا کہ بُعد زمانہ کی وجہ سے صحبت کمزور ہو گئی ہو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اہل اللہ نے ذکر اور اذکار اور مراقبہ جاری کیا جو کہ بالہام الٰہی اولیاء پر منکشف ہوئے۔[1]

ایک موقع پر مولانا منظور صاحب نعمانی سے فرمایا:۔

"خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہو اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہو

---

[1] منقول از تصوف کیا ہو؟ از مولانا محمد منظور نعمانی۔ [2] تحریر مولوی عبد الجلیل صاحب۔

وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی راستہ معلوم ہو جائے، تو مبارک ہے وہ اسی راستہ سے حاصل کرے اور ہم کو بھی بتلا دے، ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سیکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں سیکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔[1]

صحبت و محبت کی تاثیر

فرمایا کہ صحبت کا اثر ایک مسلمہ چیز ہے، جس طرح ہر چیز میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک خصوصیت رکھی ہے اسی طرح صحبت اور محبت کا بھی ایک خاصہ ہے، صحبت کا اثر تو اتنی بدیہی چیز ہے کہ عام لوگ بھی جانتے ہیں حتیٰ کہ اپنے بچوں کو کہا کرتے ہیں کہ دیکھو! بُرے لوگوں کے پاس نہ بیٹھنا اور ہمیشہ اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کی تلقین کیا کرتے ہیں، یہ اسلئے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ محبوب کے سینہ کی چیز محب کے سینہ میں لے آتی ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک نور و معرفت و یقین کا گنجینہ تھا، صحابہ نے آپ کی صحبت، محبت کے ساتھ کی اس محبت کی خاصیت ظاہر ہوئی اور جتنی جتنی کسی کی محبت تھی اسی قدر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سینہ مبارک کی دولت اس محب کے سینہ میں آگئی، پھر صحابہ کی صحبت تابعین نے اٹھائی اور تابعین کی تبع تابعین نے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی نور یقین و معرفت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا، پھر اس سے آگے مشائخ کے سلسلے چلے چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، ان سب کے ہاں سلوک کا دار و مدار صحبت شیخ پر ہے، جتنی شیخ سے محبت ہوتی ہے اتنا ہی عرفان و عشق نصیب ہوتا ہے، اگر صحبت کی ضرورت نہ ہوتی تو انبیاء کو نہ بھیجا جاتا اور کتابیں براہ راست آسمانوں سے نازل کر دیجاتیں۔[2]

---

[1] منقول از تصوف کیا ہے؟ [2] مسودہ صوفی محمد حسین صاحب۔

فرمایا کہ محبت سے اخلاق رذیلہ کٹ جاتے ہیں اور محب محبوب کے آثار جذب کرتا ہے[1]

حضرت کے ایک مسترشد لکھتے ہیں:۔

حضرت کے ہاں تمام امراض کا علاج اکٹھا ہوتا تھا اور دوا جو بالخاصہ نافع تھی وہ ذکر اللہ کی کثرت اور صحبت شیخ تھی، صحبت شیخ تو اکیلی بھی نافع ہو سکتی ہے، لیکن ذکر کا اکیلا بغیر صحبت شیخ کے نتائج پیدا کرنا شاذ و نادر ہی ہے، قلب کی چیز قلب کھینچتا ہے، باطن کی چیز باطن کھینچتا ہے اور یہ بات بغیر صحبت کے ناممکن ہے[2]

حقیقت ذکر

فرمایا کہ ذکر لسانی صرف ایک ذریعہ ہے، مقصود نہیں ہے، مقصود محض یاد ہے، اگر یاد نصیب ہو جائے تو ذکر لسانی چھوڑا دیا جاتا ہے، مگر بقاء کے بعد بھی ترقی عبادات ہی سے ہے، یعنی قرآن پاک کا پڑھنا، ذکر الٰہی کرنا اس سے ہی ترقی ہے، خاموش بیٹھنے اور محض تدبر سے نہیں، فرمایا، تصوف ایک مشق ہے، ایک طریقہ ہے جو کہ الہام الٰہی سے اولیاء اللہ پر اپنے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق منکشف ہوتا ہے، اس طریق پر چلنے سے انسان کو یقین نصیب ہو جاتا ہے، اور خداوند تعالیٰ کی دائمی یاد نصیب ہو جاتی ہے، راستہ میں بہت سی کیفیات اور بہت سے اسٹیشن آتے ہیں، لیکن اصل مقصد یہی یاد ہے، یہی تعلق مع اللہ ہے، جس کو آپ نسبت کہہ دیں یا کچھ اور نام دے دیں، درحقیقت یہی یاد ہے جو کہ مقصود ہے اور تمام تصوف کا خلاصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ کرامات کو اتنا وقیع اور اہم نہیں سمجھتے جتنا کہ تعلق مع اللہ اور اہتمام شریعت کو، اصل چیز تعلق مع اللہ کا دوام ہے اس کے ساتھ اتباع شریعت از خود آجاتی ہے، شریعت پر چلنے میں آسانی ہو جاتی ہے کیونکہ شریعت پر چلنے کے محرکات پیدا ہو چکے ہوتے ہیں، تعلق مع اللہ کے بعد یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ انسان اللہ کی نافرمانی کرے، حضرت کے ہاں صرف تعلق مع اللہ کے دوام پر زور دیا جاتا تھا کیونکہ جب یہ تعلق نصیب ہو جاتا ہے تو اتباع شریعت اور اخلاق عالیہ خود بخود آجاتے ہیں اور اسی کے

---

[1] تحریر مولوی عبد الجلیل صاحب [2] مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب

حصول کے لئے ذکر و شغل اور مراقبہ کرایا جاتا ہے،[1]

ایک مرتبہ ذکر کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

نہ معلوم لوگ کیا سمجھتے ہیں، اثرات ذکر تو یہ ہیں کہ دنیا سے بے رغبتی ہو آخرت کا خیال ہو اور دنیا اتنی جاذب نظر نہ رہے[2]،

تربیت و تعلیم میں اجتہاد حضرتؒ طالبین و سالکین کی تربیت میں ان کی طبیعت، ذوق، مشغلہ، ضرورت صحت و تحمل اور استعداد و ترقی کی صلاحیت کا لحاظ کر کے مناسب تغیر و اصلاح فرماتے، اور ہر ایک کے حالات کے مطابق اُس کو ذکر کی تلقین کرتے،

ایک مسترشد لکھتے ہیں:۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ تربیت بھی بہت جداگانہ اور نرالا تھا، بعض لوگوں کو تو صرف درود شریف اور تیسرا کلمہ ہی تبلایا اور اُن کو ذکر کی اجازت مانگنے پر بھی ذکر کی اجازت نہیں دی بلکہ اسی کو بڑھانے کو فرمایا، اور بعض حضرات کو ذکر اور مراقبہ اور بعض کو کئی کئی چلے بھی کرائے، اور بعض کو صرف تلاوت قرآن پاک ہی کیلئے فرمایا کہ یہی تمھارا وظیفہ ہے، اور بعض کو فرمایا کہ اب نوافل ہی پڑھنا تمھارا وظیفہ ہے، حضرتؒ کے ہاں یہ نہیں تھا کہ ہر ذاکر کو ایک ہی مراقبہ یا ایک ہی شغل بتایا جائے، بلکہ کسی کو کچھ مراقبہ اور کسی کو کچھ مراقبہ تبلایا[3]،

ایک دوسرے صاحب لکھتے ہیں۔

"حضرت مختلف طبائع کی وجہ سے مختلف اوراد و اشغال بھی تعلیم فرماتے تھے، اس میں ہر ایک سائل کے حالات و کیفیات کو مدنظر رکھتے تھے جیسے کہ مختلف سائلین کے حالات و ضروریات کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف نصائح و وصایا فرمائے ہیں، اگر کوئی ملازمت پر تھا اور اس نے ذکر شروع کیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کو ضوابط میں پابند نہیں کیا بلکہ اُس کو دین

---

[1] مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب ایم۔ اے [2] تحریر مولوی عبد الجلیل صاحب [3] تحریر مولوی عبد الجلیل صاحب

رہنے دیا ہے اور اس کی اصلاح فرمائی ہے کہ وہ اپنی منزل طے کر گیا ہے حتیٰ کہ بعض اونچے عہدہ دار اور کثیر الاشتغال بھی فائز المرام ہو گئے[1]

ماسٹر منظور محمد صاحب لکھتے ہیں کہ

"پہلی مرتبہ خانقاہ میں چند روز رہنے کے بعد عرض کیا کہ حضرت اگر ذکر اس طریقے کرتا ہوں جس طریق سے سکھایا گیا ہے تو اثر محسوس نہیں کرتا، لیکن اگر ذکر جلدی جلدی ضربات کے ساتھ کرتا ہوں تو ایک قسم کی بے خودی سی محسوس ہوتی ہے اور بہت ذوق محسوس ہوتا ہے، حضرت نے فرمایا کہ یہ بے خودی ہی مقصود ہے، جس طریق سے چاہو کرو کوئی پابندی نہیں ہے، جس طرح مقصود حاصل ہو اسی طرح ذکر کرو، چنانچہ یہی کرتا رہا، اس کے بعد گھر آگیا، ذکر کا اثر جسم میں محسوس ہونے لگا، وجد کی کیفیت عام ہو گئی دنیا سے بھاگنے کو جی چاہنے لگا، عروج کے خواب اور دیگر کیفیات ناقابل بیان ظاہر ہونا شروع ہو گئیں، اس دوران میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ بار بار مجھے تاکید کرتے رہے کہ اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے جب کبھی میں حاضر ہوتا اور ایسی کیفیات کا ذکر کرتا حضرت یہی فرماتے کہ اصل کیفیت یقین ہے۔[2]

صحت و طاقت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے جو لوگ کمزور اور ضعیف الدماغ ہوتے تھے اُن کو زیادہ آواز کے ساتھ اور شدت و قوت کے ساتھ ذکر جہر کرنے سے منع فرما دیا کرتے تھے، اور جس کے لئے جس طرح کا سلوک مناسب ہوتا تھا اُس کے لئے وہی تجویز فرماتے تھے، ایک موقع پر فرمایا۔

"اگر قوت ہو تو پھر ذکر بالجہر کرنا چاہیئے اثر جلدی ہوتا ہے، لیکن اگر طبیعت کمزور ہو تو ہرگز زیادہ جہر سے نہیں کرنا چاہیئے ورنہ طبیعت مختل ہو جائے گی اور دماغ خراب ہو جائے گا، پوچھا گیا کہ سیر اجمالی اور سیر تفصیلی سب سے کرایا جاتا ہے یا بعض سے اجمالی اور بعض سے تفصیلی فرمایا طبائع مختلف ہوتی ہیں، بعض طبائع کے مناسب سیر اجمالی ہوتا ہے اُن کو اجمالی کرایا جاتا ہے بعض کے مناسب تفصیلی اُن سے سیر تفصیلی کرایا جاتا ہے، لیکن مرید کو چاہیئے کہ ان چیزوں میں پڑے اور خود اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہ کرے، سیدھا سادا اللہ اللہ کرتا رہے اللہ تعالیٰ جس کے لئے

---

[1] مکتوب محمد حسین صاحب بھاول نگری۔ [2] مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب

جو حالت اختیار فرمائیں وہی اس کے لئے بہتر ہو۔[۱]

اہل ذکر کے لئے نیند آنے کا اہتمام رکھنے اور مقوی دماغ چیزیں استعمال کرنے کی ہدایت فرماتے تھے مولوی محمد یحییٰ صاحب لکھتے ہیں کہ "میں نے ایک اسم جو حضرت نے کچھ پیشتر فرمایا تھا اخلاق کی درستی کے لئے پڑھنا شروع کر دیا اس کے نتیجہ میں بے نیازی کا غلبہ، رقت و وجد اور انکساری میں بہت شدت پیدا ہو گئی اور لوگوں کو جنون کا شبہ ہونے لگا، میں نے یہ ساری کیفیت حضرت کی خدمت میں لکھی، حضرت نے اس کا حسب ذیل جواب دیا۔

"برخوردار مولوی محمد یحییٰ صاحب سلمہٗ از احقر عبد القادر بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ تمھارا خط ملا، کیفیت معلوم ہوئی، برخوردار تم ذکر اذکار اتنا کرو جس سے دماغ میں خشکی نہ پیدا ہو جائے اور "یا جبار" کا چلہ تم نے کیوں شروع کر دیا، اپنے اخلاق کو ویسے ہی درست کرنے کی سعی کرو، اللہ تبارک و تعالیٰ سے امید عنایت ہی رکھنی چاہیے کچھ مقوی دماغ اور مرطب دماغ ضرور استعمال کرتے رہو ایسا نہ ہو کہ خدا نخواستہ دماغ میں ضعف آجائے اور سارا کام ہی خراب ہو جائے، باقی احقر عبد القادر[۲]

ماسٹر منظور محمد صاحب حضرت کی شان اجتہاد اور طریق تربیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں نے اپنے فن میں ماہر ایسا پیر طریقت کہیں نہیں دیکھا، کوئی کیفیت کوئی شخص بیان کرے، حضرت رہنمائی فرماتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ حضرت سب مقامات تفصیلی طور پر طے ہوئے ہیں۔[۳]

جو حضرات کسی دوسرے سلسلہ میں پہلے بیعت ہوتے تھے اور اسی طریق کا ذکر اُن کا رواں ہو چکا ہوتا تھا جب حضرت کے ہاتھ پر تجدید کرتے اور تلقین ذکر اور تربیت کی درخواست کرتے تو حضرت اُن کا ذکر تبدیل نہیں فرماتے تھے، ارشاد ہوتا تھا، تمھارا یہ ذکر رواں ہو چکا ہے، اب نئے ذکر میں رکاوٹ اور الجھن ہوگی، تم وہی ذکر کرتے رہو۔ خود راقم کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ جس کے اندر کسی خاص دینی مشغلہ کا رجحان اور ذوق غالب دیکھتے اور اس سے دین کا مفاد اور لوگوں کا نفع بھی وابستہ ہوتا اس کو بجائے اس سے روکنے کے اس کے جاری رکھنے کی ہدایت فرماتے اور اپنی نسبت قوی طور

[۱] مکتوب مولانا سعید احمد صاحب ڈونگوی [۲] تحریر مولوی محمد یحییٰ صاحب [۳] مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب۔

سرپرستی سے اسی کو اس کا ذکر و سلوک بتا دیتے، راقم نے ایک دو بار اپنی بے استعدادی اور باطنی کیفیات کا تذکرہ کیا سب سن کر فرمایا ٹھیک ہے، آپ تاریخ دعوت و عزیمت کا سلسلہ مکمل کر دیجئے، جو لوگ تعلیم و تعلم یا تبلیغ و دعوت، یا تصنیف و تالیف میں مشغول ہوتے اور ہمہ تن ذکر و شغل میں مشغول نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ذکر کے انوار و آثار اور باطنی ترقیات محسوس نہ کرتے اور حضرتؒ سے اس کا شکوہ کرتے تو حضرت فرماتے تمہارا کام سویا ہوا شیر ہے جب (آخرت میں) وہ بیدار ہوگا (یعنی اس کا اجر ملنے لگے گا اور اس کا مقام معلوم ہوگا) تو تم کو اس کی قدر آئے گی، البتہ اہل استعداد اور جن کے پاس وقت ہے اُن کے لئے بہتر سمجھتے تھے کہ کچھ عرصہ ہمہ تن ذکر میں مشغول رہ کر اپنے اندر استقامت اور نورانیت پیدا کرلیں،

انوار و کیفیات کی عدم اہمیت سلوک و طریقت کی ایک بڑی گھاٹی انوار و کیفیات کا شوق اُن کے حصول کی کوشش، اور ان کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہے، بزرگان دین کے سوانح حیات لکھنے والوں نے ان کے حالات اس طرح سے لکھے ہیں کہ خواہ مخواہ ان چیزوں کو اُن کے حالات و کمالات میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا ہے اور ذہن ان کی عظمت اور اُن حالات کے (جو غیر اختیاری بھی ہیں) مطلوب اور مہتم بالشان ہونے کے خیال اور عقیدہ سے کسی طرح آزاد نہیں ہونے پاتا۔

حضرت کے ہاں ان انوار و مشاہدات و مکشوفات کی بڑی نفی تھی ان کو بجائے سالک کے علوئے استعداد و کمال پر محمول کرنے کے اس کے ضعف پر محمول فرماتے تھے، کئی بار فرمایا کہ سب سے ابتدائی درجہ یہ ہے کہ آدمی آوازیں سنے اس سے اونچا درجہ ہے کہ انوار نظر آئیں، اس سے اونچا درجہ ہے کہ خواب کثرت سے نظر آئیں اور ان کو بیان کرتے وہ نہ تھکے، سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اُن میں سے کچھ بھی نہ ہو، فرماتے تھے طبیعتیں دو طرح کی ہیں، ملکوتیؔ، جبروتیؔ، ملکوتی طبیعت والے کو اس طرح کی چیزیں بہت نظر آتی ہیں، جبروتی طبیعت والے کو کچھ نظر نہیں آتا اور وہ افضل ہے۔

انوار و مشاہدات محنت و ریاضت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں اسلام و ایمان کی بھی شرط نہیں ہے ان میں لغزش اور غلط فہمی کے بھی بڑے خطرے ہیں، مولوی علی احمد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں حضرت کا ایک ملفوظ نقل کیا ہے جس میں اس بات کی صراحت ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"خان محمد یوسف خاں صاحب نے دریافت کیا کہ سلطان الاذکار کسے کہتے ہیں؟ فرمایا

دو قسم کا ہوتا ہے، ایک حقیقی، دوسرا غیر حقیقی، حقیقی یہ کہ قلب مشاہدۂ حق میں مستغرق رہے اور غیر حقیقی یہ کہ اللہ اللہ کرے اور قلب میں کچھ گرمی پیدا ہو جائے،

فرمایا! انوار کا نظر آنا کوئی ضروری نہیں، یہ تو محنت و ریاضت سے غیر مسلموں کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں، وہ چیز کس طرح معیار فضیلت ہو سکتی ہے جو غیر مسلموں میں بھی پائی جاتی ہو پھر ہمارا ان سے امتیاز کیا ہوگا، بہت خوش قسمت ہیں وہ طبائع جن کو کچھ نظر نہیں آتا اور مقصود تک رسائی ہو جاتی ہے کیوں کہ بہکنے کا اندیشہ نہیں بخلاف اُنکے جن کو انوار نظر آتے ہیں کیونکہ اُن کے بہک جانے اور گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔[۱]

ایک مرتبہ فرمایا:

"طبائع چار قسم کے ہیں، اوّل وہ جنھیں اللہ سے محبت اور اس کے غیر و خلاف سے بُعد دائم رہتا ہے، دوسری وہ جنھیں یہ جذبات جب کوئی ایسا موقع آئے جو ان جذبات کو اُبھارنے والا ہو تب زیادہ نمایاں معلوم ہوتے ہیں، تیسری وہ جنھیں اکثر خوابوں میں حالات دکھائی دیتے ہیں، چوتھی وہ جنھیں بیداری میں کشف ہوتا ہے، ان طبائع کا مرتبہ بھی اسی ترتیب سے ہے، آخری ناقص شمار ہوتی ہے اور زیادہ ترقی نہیں کر سکتی،[۲]

سالک کی ترقی اور محمود و اطمینان بخش کیفیت

حضرت کے نزدیک ان آثار و کیفیات و مقامات کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی جن کو عام طور پر سالک کی ترقی باطن، علو مرتبت اور وصول کی علامت سمجھا جاتا ہے اور بظاہر وہ نہایت محمود اور قابل ستائش و مبارکباد سمجھے جاتے ہیں، حضرت کے نزدیک اپنی نااہلی کا احساس اور اپنے کو سب سے ادنیٰ اور کسی قابل نہ سمجھنا اس راہ کی سب سے اونچی بات ہے اور اسی میں سالک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا راز ہے،

ایک بلند استعداد خادم اپنے آثار و کیفیات کی برابر اطلاع دیتے رہتے تھے اُن کو ایسے حالات پیش آتے جو سالکین متقدمین کو پیش آتے تھے حضرت اُن کے جواب میں اکثر یہی مضمون لکھواتے تھے، ایک خط کے جواب میں جس میں بڑے رفیع حالات لکھے تھے، ارشاد ہوتا ہے "باقی اپنے آپ کو جب تک کسی قابل نہ سمجھتے رہیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ ترقی ہوتی رہے گی"[۳] ایک ایسے ہی دوسرے خط کے جواب میں فرماتے ہیں:

۱؎ بیاض مولوی علی احمد صاحب مرحوم مجلد سجادہ نشین ۲؎ لاہور کوٹھی صوفی عبد الحمید صاحب ۳؎ مسودہ صوفی محمد حسین صاحب ۴؎ مکتوب نمبر

"جناب والا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جب تک آپ اپنے آپکو لاشئ اور سب سے کم اور حقیر اور اپنی تمام مساعی کو عدم کمال سمجھتے رہیں گے تب ہی تک معاملہ ٹھیک رہے گا اور انشاء اللہ ترقی ہوتی رہے گی اور جب انسان یہ سمجھنے لگ جائے گا کہ بس اب میں بہت کچھ ہو چکا تو سمجھئے کہ کھو یا گیا ترقی سے رُک گیا اور تکبر میں پھنس گیا"[1]

ایک اور مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

یہ بات ضرور یاد رکھئے کہ جب تک انسان اپنے کو بالکل نااہل اور نکما سمجھتا رہتا ہے تب تک ہی اُس کی طرف رحمت الٰہیہ متوجہ رہتی ہے ورنہ پھر وہ ترقی کرنے سے رُک جاتا ہے[2]

دوامِ ذکر وسعیِ مسلسل حضرت کے نزدیک سلوک کی کوئی انتہا نہیں تھی، اس سلسلہ میں کوشش کرتے رہنے اور ذکر کی مداومت کی تاکید فرماتے، ایک دفعہ فرمایا "میں بھی ابھی چل رہا ہوں تم کو ایسی جلدی ہے، مولوی عبد اللہ فاروقی کو دیکھو کہ کہاں حضرت شیخ الہند سے محبت اور بیعت تھی اب میرے پاس ہیں ابھی چل ہی رہے ہیں" بعض دفعہ اس مضمون پر تقریر فرمائی اور یہ پڑھا ۔ پڑے پڑے بڑے مرے پھر دے در بار

مولوی محمد یحییٰ صاحب لکھتے ہیں :۔

" مجھ سے ایک روز فرمایا کہ تمھارے دادا بزرگوار (مولانا اللہ بخش بھاولنگری) بھی آخر عمر تک ذکر و فکر میں مرمٹے تھے تم بھی اسی راہ میں جان دے دینا، فرمایا دیکھو ذکر اذکار مرتے دم تک نہ چھوڑنا، تمھارے دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہر وقت چلتے پھرتے بھی مراقب رہتے تھے، اور بڑی ہمت کے ساتھ ذکر اذکار کرتے رہنا، یہ نعمت اور نسبت اللہ کے نام کی برکت سے حاصل ہوئی اس لئے اللہ کے نام کو نہ چھوڑنا"

اپنی سعی و محنت کی ضرورت تصوف کے بعض حلقوں اور عوام میں بزرگان دین کے بعض خصوصی واقعات کیفیات کی بنا پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اہل قلوب جس وقت جس کو دولت باطنی عطا فرمانا چاہیں بلا استعداد و ذاتی سعی و محنت عطا فرما سکتے ہیں۔ ایسے واقعات کی صحت اور امکان

[1] مکتوب مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۵۲ء [2] مکتوب مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۵۱ء

میں شبہ نہیں جب کسی صاحب باطن نے اپنی یا طالب کی کسی خاص کیفیت پر جو بعض اوقات سعی و محنت کی قائم مقام بن جاتی ہے، باذن خداوندی اس پر نسبت باطنی، یا کسی خاص حال کا افاضہ فرمایا، لیکن یہ کوئی عمومی ضابطہ اور اختیاری چیز نہیں ہے، عمومی طور پر اپنی ذاتی سعی و محنت ہی کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی میں دوام و استقلال ہے، حضرت اسی پر بہت زور دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم نے حضرت مخدوم شیخ علی صابر پیران کلیری کے مزار پر مراقبہ کیا۔ ہمارے دل میں تو یہی آواز آئی کہ " اپنا کرنا، اپنا بھرنا"[۱]

مولانا عبد اللہ صاحب دھرم کوٹی مشرقی پنجاب کے ایک دورہ کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"چلتے چلتے فیضیاب ہونے والوں کے سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ رمضان شریف کا غالباً آخری ہفتہ رائے پور میں ہوا، اسی موقع پر ایک صاحب تونسہ شریف کے رہنے والے جو کچہری میں اہل مد یا پیا نویس تھے، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے پہلے وہ کسی اور بزرگ کی خدمت میں گئے ہوئے تھے، ان بزرگ نے فرمایا تھا کہ تمھارا حصہ رائے پور ہے، وہاں جاؤ، رائے پور کا نقشہ آپ کے سامنے ہی ہے، خاص طور پر رمضان شریف میں سب حضرات مہمان اکثر اوقات ذکر، نماز، تلاوت، مراقبہ بالخصوص ذکر بالجہر میں مشغول رہتے تھے، یہ منظر دیکھ کر وہ صاحب کہنے لگے کہ ہم سے تو یہ چکی نہ پیسی جائیگی۔ غالباً کسی نے حضرت سے ذکر کر دیا ہوگا، شام کے کھانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ دوست آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حصہ کی پڑیا بنی بنائی رکھی ہے مل جائے گی، جیب میں ڈال کر لے آئیں گے، مگر یہاں بغیر محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس راستہ میں محنت لازمی ہے۔ غالباً اس کے بعد آیت والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا پڑھ کر مزید اس پر روشنی ڈالی، مگر چند دنوں بعد حضرت کے کانوں میں پھر یہی الفاظ ڈالے گئے کہ فلاں بزرگ دوستوں کی یہاں شب و روز محنت دیکھ کر گھبراتے اور کہتے ہیں کہ اتنی محنت یہاں کون کرے، دوبارہ بڑے جوش سے فرمایا کہ اگر کوئی

---

[۱] بتحریر مولوی عبد الجلیل صاحب

مگر آپ لوگوں کو ایسا معلوم ہو جہاں دو روٹیاں پکی پکائی مل جاتی ہوں تو میں بھی نوکری پکڑ کر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تاکہ کچھ حاصل کر سکوں، اگر دوست مفت جگی ہی پسنے کی شکایت کرتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ چکی پسنے کا ہنر تو بہت روز میں آتا ہو پہلے تو زمین کو جوتنا ہو اچھا بھلا بیج گھر سے نکال کر کھیت میں بکھیرنا ہو پھر سینچنا ہے .... تاکہ کھیتی بڑھ کر پکنے کی حد تک پہونچے اور پک جائے تو پھر کاٹنا اور گاھنا اور غلہ کو بھوسے سے علٰحدہ کرنا ہو پھر چکی پیسنا ہو آٹا بن جانے کے بعد پھر اسے مشقت سے گوندھنا بھی ہو اور آگ جلانا پکانے کا سامان مہیا کرنا ہو، پھر جیٹھ کی گرمی کو برداشت کرنا ہو، پک کر تیار ہو جانے کے بعد مشقت سے توڑ کر منھ کے زور سے نگلنا ہو، ان ساری کوششوں کے بعد اگر ہضم ہو جائے تو بس میرے مولیٰ کا فضل سمجھنا چاہیئے وگرنہ وہ قے ہو کر باہر بھی نکل سکتا ہو۔

کسی دوست نے عرض کر دیا کہ حضرت ماں اپنے بچہ پر کتنی شفیق ہوتی ہو کہ سوئے ہوئے بچہ کو اٹھا کر دودھ پلاتی ہو اگر بچہ بھوکا ہو تو اس کی چھاتیوں میں ایک قسم کی تحریک سی پیدا ہو کر اسے معلوم ہو جاتا ہو کہ بچہ بھوکا ہو، مگر بزرگ لوگ ماؤں سے زیادہ شفیق ہوتے ہیں اس لئے ان سے ایسی امیدیں باندھی جا سکتی ہیں، اس پر حضرت نے فرمایا کہ بھئی ماں کا کام تو اتنا ہی ہوتا ہو کہ چھاتی بچہ کے منھ میں دیدے مگر اگر بچہ ہی مُردہ ہو اور ہونٹ ہلا کر دودھ کو نہ چوس سکے اور اپنے پیٹ میں نہ پہونچا سکے تو اس میں ماں کا کیا قصور ہو اور اس کی شفقت میں کیا فرق آ سکتا ہو[1]

سالک کی ترقی اور احساس نسبت کا فقدان حضرتؒ ان آثار و کیفیات پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے جو سالک کو پیش آتی ہیں، اس راہ میں جو گھاٹیاں آتی ہیں اور جو تغیرات اور ترقیات ہوتی ہیں حضرت اُن پر گہری نظر رکھتے تھے، بعض مرتبہ سالک کو ایک عرصہ تک ذکر کرنے اور کیفیات کے حصول کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہو کہ وہ ان کیفیات سے بالکل خالی ہو گیا وہ اس کو اکثر تنزل اور حرمان اور کسی گناہ کی سزا سمجھنے لگتا ہو، حضرتؒ اس کی حقیقت سمجھتے تھے اور اکثر ان مشکلات کے

[1] مکتوب مولانا عبداللہ صاحب مرحوم کوٹی بنام مؤلف

موقع پر تسلی تشفی فرماتے تھے اور حقیقت حال کی وضاحت فرماتے، مولانا محمد صاحب انوری لکھتے ہیں۔

"ایک بار عرض کیا کہ شروع شروع میں تو آثار ذکر سے سینہ میں گرمی محسوس ہوتی تھی بلکہ دل سے ذکر کی آواز سنائی دیتی تھی، پھر یہ حالت نہیں رہی اور رقت بہت ہوتی تھی اور بعد میں یہ کیفیت بالکل زائل ہوگئی، فرمایا کہ زائل نہیں ہوگئی جزو بدن بن گئی، احساس ختم ہوگیا یہ مبارک ہو، جب تک کھانا ہضم نہیں ہوتا پیٹ میں گرانی سی رہتی ہو جب ہضم ہو جاتا ہو اور بدن کا جزو بن جاتا ہو تو گرانی کچھ بھی محسوس نہیں ہوتی"[1]

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

"نسبت ایک دُکھن جیسی حرارت کا نام ہو جو کہ سالک کے قلب میں ذکر و شغل کے بعد پیدا ہوتی ہو، اس سے یاد میں دوام پیدا ہوتا ہو، فرمایا کہ آخر میں آکر یہ کیفیت بھی بدن سے بالکل نکل جاتی ہو اور آدمی ویسے ہی رہ جاتا ہو جیسا کہ پہلے تھا"[2]

تصوف دینی کاموں کی حیات و قوت کا ذریعہ

عرصہ دراز سے کچھ تو تصوف کی غلط نمائندگی و ترجمانی کی وجہ سے اور کچھ تصوف کے بعض علم برداروں کی بے عملی، تعطل اور جمود کی وجہ سے تصوف کو بطالت بے کاری کا مشغلہ اور دعوت فرار کا مرادف سمجھا جانے لگا، حضرت کو اس بات کا بڑا یقین اور اصرار تھا کہ تصوف بجائے تعطل اور بے عملی کے دینی کاموں کی زندگی اور طاقت کا سرچشمہ ہو، آپ کا خود جس سلسلہ سے تعلق تھا اس کے متعدد شیوخ و اکابر سرفروش مجاہد اور جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ گزرے ہیں، ایک روز مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہو بلکہ اس سے تو دین کے کاموں قوت آتی ہو اور جان پڑتی ہو، لیکن کیا عرض کیا جائے، اللہ کی مشیت ہو جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہو وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ وہ ادھر دیدیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں

---

[1] تحریر مولانا محمد صاحب انوری لائل پوری [2] تحریر مولوی عبدالجلیل صاحب

کتنی قوت آتی ہے، حضرت خواجہ صاحبؒ نے، باداصاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ نے، حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمات انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جس کا سواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سک رہی ہیں نعمانی) اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی۔

لیکن اصل صورت یہ ہے کہ اس طرف وہی بیچارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں، ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا[۱]

صحبت کی تاثیر اور قوت نسبت اور اشراف علی الخواطر

مقبولین بارگاہ الٰہی اور شیوخ کاملین کی زندگی میں اگر اللہ کو منظور ہوتا ہے تو خوارق عادات اور کشوف و کرامات کا بکثرت ظہور ہوتا ہے۔ واقفین اور اہل علم کو اس کے ثبوت کے لئے کسی علمی دلیل اور بحث و استدلال کی ضرورت نہیں، کشوف و کرامات نصوص صحیحہ سے ثابت اور تاریخ میں تواتر کے ساتھ منقول ہیں، اہل سنت کے عقائد کی کتابوں میں تصریح ہے کہ کرامات الاولیاء حق، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ جیسے محقق اور نقاد نے بھی لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے کرامات کے واقعات حد تواتر کو پہونچ گئے ہیں، لیکن چونکہ زمانہ کا ذوق بہت بدل چکا ہے، تذکرہ نگاروں نے بزرگوں کی سوانح حیات میں اس بارے میں اتنی فیاضی اور افراط سے کام لیا ہے کہ اہل علم کا مذاق اب اُن سے اُکتا چکا ہے، اس لئے قصداً اس کتاب میں ان واقعات کے تذکرہ سے احتراز کیا گیا ہے اور ان کمالات کا ذکر کیا گیا ہے جو ناچیز مصنف کتاب کے نزدیک کرامات سے بھی بلند مقام رکھتے ہیں، لیکن حضرت کے حالات کے اس ذخیرہ میں جو مصنف کے سامنے دوستوں کے خطوط اور تحریری مواد کی شکل میں موجود ہے بہت سے ایسے واقعات درج ہیں جن سے حضرتؒ کے علاوہ مقام مقبولیت عند اللہ، قوت نسبت، صحبت کی برقی تاثیر، اور قلب کی اس کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جو خاصان خدا

---

[۱] منقول از تصوف کیا ہے؟

اور واصلین بارگاہ کو حاصل ہوتی ہے، یہاں پر صرف چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جو بعض صاحب علم اور پختہ کار ثقہ راویوں نے بیان کئے ہیں اور خود انکے ذاتی تجربات اور مشاہدات ہیں مولانا سعید احمد ڈونگوی بیان فرماتے ہیں :-

لائل پور خالصہ کالج ۔ مدرسہ والی مسجد میں حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں عصر کے بعد حضرت پیران پیر کے وعظ پڑھے جاتے تھے، دو تین دن متواتر بیان آیا کہ مرشد کے سامنے جب مرید جاتا ہے اُس کے حالات مرشد پر کھل جاتے ہیں منکشف ہو جاتے ہیں، اس وقت مجھے بڑا خطرہ ہوا کہ میرے حالات تو بہت گندے ہیں ان حالات کا ملاحظہ فرما کر حضرت مجھے ضرور اپنے دربار سے نکال دیں گے بس یہ کیف ایسا غالب ہوا کہ گندم جو اس وقت کٹنے کے قریب تھی اس میں جا کر چھپ کر رونے لگا، تمام داڑھی اور قمیص بھی بھیگ گئی روتا روتا بیہوش ہو گیا، جب سورج غروب ہونے لگا فوراً ایک ندی سے جو پانی سے بھری تھی وضو کر کے مسجد میں آگیا جماعت سے فراغت کے بعد متصل ہی مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ مولوی صاحب سنت پڑھ کر فوراً اندر آجانا حضرت اقدس نے آپ کو بلوایا ہے، بس پھر تو میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور یقین آگیا کہ اب کے تو حضرت مجھ کو ضرور نکالیں گے، کانپتا ہوا جب حاضر ہوا تو حضرتؒ نے ہنس کر فرمایا آئیے مولانا تشریف لائیے، بندہ سامنے بیٹھ گیا، فرمایا آگے آؤ، بندہ ذرا آگے کھسکا پھر فرمایا آگے قریب ہو جاؤ بندہ پھر قریب ہوا، اسی طرح کئی دفعہ آگے بڑھا اور کئی دفعہ حضرت اقدسؒ نے فرمایا حتیٰ کہ حضرت اقدس نے بالکل اپنی جھولی میں گود میں لے لیا اس وقت جو میرا کیف تھا احاطہ تحریر سے باہر ہے اور جو حضرت اقدس کے الطاف و پیار تھے بس وہ بھی احاطہ تحریر سے باہر ہیں، اپنی چھاتی سے لگا کر محبت بھرے انداز میں فرمایا، مولوی صاحب آپ فکر نہ کریں اور آئندہ مت روئیں مجھے کچھ معلوم نہیں ہوتا، میں نے بے تکلفی سے عرض کیا کہ پھر حضرت کو کیسے معلوم ہو گیا کہ میں روتا ہوں، فرمایا یہ تو آپ سے تعلق کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے، پھر فرمایا آپ تو ماشاء اللہ فائز المرام ہیں اس کے بعد عشاء تک برابر راز و نیاز کی باتیں تنہائی میں ہوتی رہیں، مولانا عبدالمنان اور مخدوم زادے دونوں حیران

نگراں تھے۔

مولانا ایک دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

ایک دفعہ ڈھڈیاں کے قیام میں جب صبح حضرت سیر کو تشریف لے گئے تو مسجد میں بیٹھ کر، دو پر کپڑا ڈال کر میں بہت رویا کہ اٹھارہ سال ذکر کرتے ہو گئے مگر تاہنوز کچھ بھی نہیں ہوا حضرت کے تمام متوسلین کے پیچھے رہا اور نالائق کسی کام کا آدمی نہیں،

مرا اے کاش کہ مادر نزادے

ایک گھنٹہ سے زیادہ بس روتا ہی رہا کہ حضرت تشریف لائے اور مجلس لگی، میں نے اپنا منھ دھویا اور وضو کر کے حضرت کی مجلس میں جا بیٹھا، حضرت نے فرمایا کہ بعض ذاکرین یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں ہوئے اور بہت روتے ہیں، بھلا اللہ کے بندو اور کیا آسمان پر چڑھو گے، اللہ نے اپنے نام لینے کی توفیق بخشی اور ٹوٹا ہوا دل مرحمت فرمایا، اس پر حضرت نے ایک گھنٹہ تقریر فرمائی اور پھر مجھے فرمایا کہ مولوی صاحب کچھ سمجھ گئے ہو، مجھے اس وقت اتنا بسط ہوا کہ معلوم ہوا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت مل گئی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ مولوی عبد الجلیل صاحب بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"مولوی احمد علی صاحب ہوشیار پوری کے بھائی حافظ محمد دین رائے پور حاضر ہوئے جبکہ پنجابی مجمع حضرت سے مصافحہ کر چکا تھا، مگر حضرت نے فرمایا تھا کہ کھانا کھا کر جانا حضرت لیٹ چکے تھے، حافظ محمد دین اس وقت پہونچے اور حضرت سے بات کر کے اسی وقت واپس ہونا تھا، ہر ایک سے خوشامد کی کہ مجھے ملا دو، سب نے انکار کر دیا کہ حضرت چادر اوڑھے لیٹ چکے ہیں، بالآخر انھوں نے وضو کیا اور حضرت کے کمرہ کے سامنے کمرہ میں دعا مانگنی شروع کی کہ یا اللہ تیرے حبیب محمد مصطفیٰ کا واسطہ ہے کہ میری ملاقات اسی وقت کرا دے، یہ دعا دل میں مانگ ہی رہے تھے کہ حضرت نے کروٹ لی اور فرمایا باہر کون ہے! وہ خاموش رہے، پھر دوبارہ پوچھا تو یہ چلے گئے فرمایا کہ بھلے مانس! میں آدمی ہی تو ہوں، کوئی ہوا نہیں ہوں، ایسی ہی ضرورت تھی تو خود آکر اٹھا لیتے، توبہ توبہ، اتنی بڑی ذات کا واسطہ دیا، پھر شفقت فرما کر پاس بٹھایا اور سب بات سنی اور

فرمایا کہ خوب کر لو جب کر چکے تو مصافحہ کر کے اُن کو رخصت کر دیا"

مولانا سعید احمد صاحب ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں :-

ایک دفعہ لاہور میں کھانسی، نزلہ زکام بخار سے میں بہت بیمار ہو گیا تھا تمام رات نیند نہیں آتی تھی، دن بھی بے چینی سے گزرتا، ڈاکٹروں نے کہا کہ سخت ترین انفلوئنزا ہے اور بہت خطرناک ہے میں نے اس مرض کی حضرت اقدس کو شکایت بھجوائی کہ دعا فرمادیں، رات کو عشا کے بعد ایک آدمی میری چارپائی پر معلوم ہوا اور آواز آئی کہ میں سکینہ ہوں ڈر کے مارے میں پہلو نہیں بدلتا تھا کہ کھانسی آوے گی اور تکلیف ہوگی مگر وہ آدمی میرے پہلو بدلتا تھا اور کہتا تھا کہ بے فکر رہو، تم تندرست ہو، جب رات کے تین بجے تو مجھ سے کہا گیا کہ اٹھو اور شکر کے نفل پڑھو جب میں اٹھا تو ایسا تندرست تھا کہ گویا بیمار ہوا ہی نہیں تھا، یہ حضرت کی دعا یا توجہ تھی،

ایک دفعہ مجھے خارش کا مرض شدید ہو گیا ڈاکٹروں اور حکیموں سے بڑے بڑے علاج کروائے مگر افاقہ نہیں ہوا، حضرت نے مجھے علاج کرانے کے لئے رائے پور بلوالیا، دیا، بہت علاج ہوا اور حکیم صاحب نے بڑی کڑوی دوائیں پلائیں مگر کچھ بھی افاقہ نہ ہوا، رات کو نیند نہیں آتی تھی اور کھجلا رہا تھا، حضرتؒ پیشاب کرنے کو جارہے تھے، مولوی عبدالمنان صاحب سے دریافت فرمایا کہ یہ کون جاگ رہا ہے، بتایا گیا کہ سعید احمد کھجلا رہا ہے، اس کو نیند نہیں آتی تمام رات جاگتا ہی رہتا ہے، حضرت اقدسؒ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے اسی طرح درجات بلند فرماتے ہیں، ہمارے مولوی صاحب کے درجات بلند ہو رہے ہیں، مولوی عبدالمنان صاحب سے میں نے پوچھا کہ حضرت کیسے فرما رہے تھے، انھوں نے جب مجھے بتایا تو حضرتؒ کے کلمات میں مجھے بجلی کی کرنٹ کی طرح اثر معلوم ہوا[1]"

نسبت کی قوت، برقی تاثیر اور انقلاب حال کے واقعات متعدد اہل تعلق نے سُنائے ہیں، ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے یہاں پر صرف ایک دو واقعے نقل کئے جاتے ہیں جن کے راوی حضرت کے خادم خاص مولانا

[1] مکتوب مولانا سعید احمد صاحب، ڈونگوی۔

عبدالمنان صاحب ہیں۔

مولانا موصوف بیان فرماتے ہیں :۔

"غالباً ۳۶-۱۹۳۵ء کا واقعہ ہو شبیر صاحب نومسلم بھاولپوری مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھتے تھے، میرے ہم سبق تھے، ہندو خاندان کے تھے، اب جہاں دارالطلبہ جدید ہو وہاں پہلے خام کمرے تھے وہیں ہم لوگ رہتے تھے وہاں سے حاجی شاہ کمال کے قبرستان کو جو سڑک پر جاتی ہو اس پر ایک مندر بھی ہو، اسی طرف سیر کرتے ہوئے مولوی صاحب ایک مرتبہ نکلے وہاں ایک ہندو فقیر کی اُن پر نظر پڑ گئی جس سے ان کے دل میں اسلام کے خلاف انحراف کے جذبات پیدا ہونے لگے، یہ بات آکر انہوں نے مجھ سے کہی، میں نے ان کو حضرت شیخ[1] کے پاس جانے کا مشورہ دیا بلکہ اُن کو ساتھ لے کر گیا، حضرت شیخ اس وقت اوپر اپنے کمرے میں تھے، فرمایا کیسے آئے ہو؟ حالات عرض کئے، حضرت شیخ نے حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی خدمت اقدس میں لے جانے اور حالات عرض کرنے کی ہدایت فرمائی، احقر ان کو لے کر رائے پور حاضر ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے حالات عرض کئے، فرمایا کہ اب آرام کرو صبح جب حضرت اقدس سیر کو تشریف لے گئے تو احقر اس وقت سو رہا تھا، سیر سے واپسی پر خانقاہ کے باہر لوہے کے پھاٹک سے کچھ اوپر کھڑے ہو کر احقر کو یاد فرمایا کہ مولوی عبدالمنان کہاں ہیں، کسی نے عرض کیا کہ حضرت سو رہے ہیں، بُلائے گئے، فرمایا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو جس کام کے واسطے آئے تھے وہ تمھیں یاد نہیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت اب کرتے ہیں ـــــ غالباً مولوی شبیر صاحب سیر میں ساتھ ہی تھے، حضرتؒ نے اُن کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ احقر کچھ بھی نہیں بعضے اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ یوں اشارہ کریں (اُن کے دل کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) تو اس کا قلب جاری ہو جاتا ہو ـــــ بس اتنا فرمایا کہ تم ایسی جگہوں میں نہ جایا کرو ان ہندو فقیروں کے پاس۔

مولوی صاحب کا بیان ہو کہ اس اشارے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قلب میں ایمان پھر عود کر آیا ہے اور بحمد اللہ سارے شبہات خدشات وساوس زائل ہو گئے اور

---

[1] یعنی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ

اس کے بعد اس کیفیت نے پھر کبھی عود نہیں کیا ـــــ مولانا موصوف بھاولپور میں بیکانیر گیٹ میں مقیم ہیں۔

مولانا عبد المنان صاحب خود اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ:۔

"مجھ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ ہند دہونے کو جی چاہتا تھا، سبق پڑھتے پڑھتے بیچ میں اٹھ کر چلا جاتا تھا، میں نے یہ کیفیت اپنے مشفق استاذ حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب (ناظم مدرسہ مظاہر علوم) سے عرض کی، حضرت نے حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کی خدمت میں بھیجا، شیخ نے فرمایا کہ تم حضرت کی خدمت میں جاؤ، حضرت تم پر بہت مہربان ہیں، میں نے عرض کیا کہ میں تو نہیں جاتا مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے آپ خط لکھ دیں۔ حضرت نے ازراہ کرم والا نامہ تحریر فرما دیا، احقر اس کو لے کر رائے پور کے ارادے سے چلا، معلوم ہوا کہ حضرت کا قیام بہٹ میں ہے، یہ میری بہٹ کی پہلی حاضری تھی، حضرت کا قیام شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم کے مکان پر تھا، گرمی کا موسم تھا، ۱۱ بجے کے قریب دن میں پہونچا، حضرت آرام فرما رہے تھے، ظہر سے کچھ پہلے دروازہ کھلا تو حاضر ہوا۔ فرمایا مولوی صاحب کیسے آئے، میں خاموش رہا فرمایا کچھ بولو تو سہی! میں نے وہ پرچہ سامنے کر دیا، فرمایا اس میں کیا لکھا ہے، میں نے کہا آپ پڑھ لیجئے آپ ہی کے نام پرچہ ہے، فرمایا کچھ تو بتاؤ، عرض کیا حضرت کسی کی چیز بھی لیکر دینے کو جی نہیں چاہتا۔ اس پر بہت ہنسے، پرچہ لے کر رکھ لیا، ظہر عصر کی نماز حضرت کے ساتھ پڑھی عصر میں اتفاق سے حضرت کے بائیں جانب تھا، حضرت نے دعا کے بعد میری طرف دیکھا، بہ مجرد اس کے مجھ پر رقت طاری ہو گئی، حضرت یہ دیکھ کر تشریف لے گئے، میں وہیں بیٹھا روتا رہا تھوڑی دیر کے بعد جب سکون ہوا تو حاضر خدمت ہوا تو فرمایا صوفی صاحب کیا حال ہے، عرض کیا حضرت اب بالکل ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ـــــ اس کے بعد سے یہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔

ایک مرتبہ حضرت سہارنپور میں حاجی یعقوب علی خاں صاحب کے ہاں مقیم تھے، عصر کے وقت حاضر ہوا حضرت نے فرمایا مولوی صاحب کیا حال ہے، میں نے کہا

حضرت رونا نہیں آتا! حضرت نے وضو کرتے ہوئے مجھ پر نظر ڈالی پتہ نہیں اس نظر میں کیا چیز تھی فوراً بے اختیار گریہ طاری ہو گیا، پاس بیٹھنے والوں نے کہا کہ یہ تو کہتا تھا مجھے رونا نہیں آتا یہ اسقدر رو کیوں رہا ہے،

ان خاص اور اہم واقعات کے علاوہ بارہا اسکا تجربہ ہوا کہ جو لوگ قلب میں سختی اور قساوت محسوس کرتے حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر اُن پر رقت کا ایک دم سے غلبہ ہوا، طبیعت دعا اور انابت کی طرف متوجہ ہو گئی، آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو گئیں، کبھی قبض تھا بسط ہو گیا اور کبھی بسط اور جوش تھا سکون پیدا ہو گیا، اہلِ تعلق اور حاضر باش افراد کو ایسے تجربے بکثرت اور عام طور پر ہوتے رہتے تھے۔

اہلِ دل کے ہاں اشراف علی الخواطر (خیالات اور قلبی کیفیات کا کشف) بکثرت ہوتا ہے اور کم و بیش اکثر خدام کو اس کا تجربہ ہے، حضرت کے ایک خادم لکھتے ہیں میں نے بیسیوں مرتبہ تجربہ کیا کہ ادھر میرے دل میں کوئی خاص خیال ہوا اور ادھر حضرتؒ کو اس کا انکشاف ہو گیا، انھوں نے اس سلسلہ میں متعدد واقعات بھی لکھے ہیں۔

خود راقم کو اس کا کئی بار تجربہ ہوا جب کسی کیفیت یا احساس کا غلبہ ہوا حضرت نے بڑی شفقت اور دلداری کے ساتھ اس کا ازالہ فرمایا، ایک مرتبہ بہٹ ہاؤس کے زمانۂ قیام میں (غالباً عید کے دن) عشا کی نماز میں نے شدید توحش اور انقباض کی حالت میں پڑھی، اس خیال کا غلبہ تھا کہ حضرت کی اس رمضان کے اخیر عشرہ میں وہ شفقت اور توجہ نہیں رہی جو رہا کرتی تھی، اپنے نفس کی حقارت اور زندگی کی لاحاصلی کا استیلا تھا، سلام پھیرتے ہی میرا نام لے کر طلب فرمایا گیا، حاضر ہوا تو قریب بلایا اور فرمایا، حضرت! اس آیت کی کیا تفسیر ہے، حتّٰی اِذَا استیئس الرسل وظنوا انہم قد کذبوا جاءہم نصرنا مجھے اپنی کیفیت سے بالکل ذہول ہو گیا اور میں سمجھا کہ محض ایک علمی استفسار ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں مفسرین کے جو اقوال مستحضر تھے عرض کرنے شروع کئے، لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت جواب کی طرف متوجہ نہیں اور اس سلسلہ میں کوئی علمی بات مطلوب نہیں ہے، وہاں سے نکل کر باہر آیا تو کیفیت متبدل ہو چکی تھی قلب سکون اور بشاشت محسوس کرتا تھا اس وقت احساس ہوا کہ یہ طلبی اور یہ استفسار محض اس کیفیت کے ازالہ کے لئے تھی جس کا

غلبہ تھا، اور محض تعلق و شفقت کا اظہار تھا اور اس آیت کے معنی کے ذریعہ یاس اور قلق کی اس کیفیت کا علاج بھی۔

اس طرح کے واقعات جو حضرتؒ کی قوت روحانی و اشراقی پر دلالت کرتے ہیں اور اسی طرح کے خواب اور اشارات جو آپ کی مقبولیت عند اللہ کی دلیل ہیں اور جن میں طالبین صادق کی آپ کی طرف رہبری کی گئی بکثرت بیان کئے گئے، ان کا تذکرہ موجب تطویل ہے اور اس کتاب میں آپ کے اخلاص، تعلق مع اللہ، زہد و توکل، استقامت علی الشریعت، عشق و محبت الٰہی، علوم صحیحہ اور تحقیقات عالیہ اور آپ کی تاثیر صحبت اور اصلاح و ارشاد کے ایسے بلند نمونے اور واقعات سامنے آچکے ہیں جو ان کشوف و کرامات اور واقعات عجیبہ سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم — چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

تعبیر کی غلطی

جماعت اسلامی کا جائزہ

از جناب وحید الدین خانصاحب اعظم گڑھ

الفرقان کے گزشتہ شمارے میں آپ میری ایک مختصر تحریر ملاحظہ فرما چکے ہیں یہ میری اس کتاب کا ابتدائی تعارف تھا جو "تعبیر کی غلطی" (جماعت اسلامی کا جائزہ) کے نام سے اس وقت زیر طبع ہے۔ اس میں میں نے زیر بحث مسئلہ کے ہر پہلو پر مفصل بحث کی ہے۔ اس میں وہ خط و کتابت بھی تفصیل کے ساتھ شامل ہے جو اس سلسلہ میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی ہند کے اکابر اہل علم سے میری ہوئی۔ یہ کتاب قریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ گزشتہ شائع شدہ مضمون اس کتاب کے تیسرے باب کا ایک حصہ تھا، آج اس کے پانچویں اور چھٹے باب کا کچھ حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو اگست میں یہ کتاب تیار ہو جائے گی ——— وحید الدین خاں

اسلامی مشن کی تعبیر

پچھلی نصف صدی کے دوران میں جن سماجی نظریات کو قبولیت اور برتری کا مقام حاصل ہوا ہے وہ وہی نظریات ہیں جو زندگی کے مادی نظام کو درست کرنے اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے ہیں، حتی کہ اب وہی تحریک زندہ تحریک سمجھی جاتی ہے جو اس نہج پر کام کر رہی ہو۔ اس سے متاثر ہو کر قدیم مکاتب خیال کے لوگ بھی اپنے نظریات کی تشریح اسی مخصوص انداز میں کرنے لگے ہیں

ہندوازم اور عیسائیت کا جدید لٹریچر اس کی نمایاں مثال ہے۔ یہ لے اتنی بڑھی ہے کہ اب مذہب تعمیر آخرت کے بجائے تعمیر دنیا کا عنوان بن گیا ہے۔

اگر آپ اس چھائی ہوئی فضا سے متاثر ہوں اور اس کے بعد اسلام کا مطالعہ کریں تو یہ عین ممکن ہے کہ اسلامی تحریک کا نقشہ آپ کے ذہن میں ٹھیک اسی طرز پر بننا شروع ہو جائے جو باہر کی دنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں، آپ کا ذہن جو نسلی تعلق کی بنا پر پہلے سے اسلام کے ساتھ ایک طرح کی عقیدت رکھتا تھا قدرتی طور پر وہ اسلام کو فکر کی اُس سطح پر دیکھنا چاہے گا جو لوگوں کے نزدیک بلند اور مستند سطح ہے اور جس کی اس حیثیت کو آپ بھی غیر شعوری طور پر تسلیم کر رہے ہیں، اس کے بعد جب آپ دیکھیں گے کہ اسلام میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکام ہیں، اسلام کی تاریخ میں برسر اقتدار طبقہ سے لڑائیاں بھی ہوئی ہیں، اسلام نے سیاسی قوت بھی حاصل کی ہے ——— تو ان سب کا مجموعہ آپ کے ذہنی سانچہ میں اسلام کی اس تعبیر کی صورت میں ڈھل جائے گا کہ:-

> اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے، اور انبیاء علیہم السلام اس لیے آئے تھے کہ حکومت الٰہیہ قائم کر کے اس صحیح ترین نظام کو عملاً زمین پر نافذ کریں۔

اس تعبیر میں بظاہر کوئی ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام کا اپنا ایک نظام زندگی ہے، نبی نے حکومت بھی قائم کی ہے، اس نے خدا کے دیئے ہوئے قوانین کو زمین پر نافذ بھی کیا ہے، مگر ان اجزاء کو جوڑ کر جو مجموعہ تیار کیا گیا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسے مختلف جانوروں کی ہڈیاں ملا کر ایک نیا ڈھانچہ بنانا اور دعویٰ کرنا کہ یہ ایک تاریخی جانور ہے جو اب سے پانچ کروڑ سال پہلے زمین پر چلتا پھرتا تھا۔

اسلام کے اس تصور کے مطابق دنیا میں اہل ایمان کا جو "نصب العین" قرار پاتا ہے اس کو جماعت اسلامی کی ابتدائی تاسیس کے وقت مندرجہ ذیل فقرے میں بیان کیا گیا تھا۔

> "جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔"

دستور میں نصب العین کے اس فقرے کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ۔ اس سے

راد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جس کا تعلق انسان کی زندگی کے اُس حصے سے ہے جس میں اللہ نے
نسان کو اختیار عطا کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور سیاست
وغیرہ سے متعلق جو مفصل قانون خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجا ہے، اس کو تسلیم کیا جائے۔ جو
لوگ ایسا نہیں کرتے وہ دراصل خدا کے مقابلے میں بغاوت کا ارتکاب کرتے ہیں اور:

"مومن کا کام اس بغاوت کو دنیا سے مٹانا اور خدا کی زمین پر خدا کے سوا ہر ایک کی خداوندی ختم کر دینا ہے۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانون تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے، اسی طرح خدا کا قانون شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو، مومن کی تمام مساعی کا مرتب مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے۔ یہ کام فی الاصل تو نصیحت، فہمائش، ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے، لیکن جو لوگ ملک خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جایا کرتے اس لیے مومن کو مجبوراً جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سدِّ راہ ہو اُسے راستے سے ہٹائے"۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان کی علیحدہ جماعت قائم ہوئی تو یہاں کے رہنماؤں نے نصب العین کے فقرے میں کچھ تبدیلی کر دی اور اسی کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا۔

"جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں اقامتِ دین (اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنا) اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے"۔

اس تبدیلی کا مطلب نصب العین کی تبدیلی نہیں تھی۔ بلکہ یہ محض ایک لفظی تبدیلی تھی چنانچہ دستور میں تبدیل شدہ فقرے کے نیچے حسب ذیل نوٹ درج کیا گیا:

"دستور جماعت میں اس سے پہلے اقامت دین کے بجائے حکومت الٰہیہ کا لفظ تھا جو دراصل اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا تھا جو اقامت دین کا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت الٰہیہ کے لفظ کے سمجھنے میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور کرائی جاتی ہیں، اس لیے ضرورت سمجھی گئی کہ اپنے نصب العین کے اظہار کے لیے ایسا لفظ اختیار کیا جائے جو قرآن کا ایک اصطلاحی

لفظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام مفہوموں پر حاوی بھی ہو اور کسی غلط فہمی کا باعث بھی نہ ہو۔"

اب یہی نصب العین جماعت اسلامی ہند کے موجودہ دستور میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"جماعت اسلامی کا نصب العین اقامت دین ہے جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے ...... یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت، اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرہ سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظام زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے

اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ ـــــ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔"

یہی بات اس فکر کے تحت پیدا شدہ لٹریچر میں بار بار . . . . دہرائی گئی ہے۔ ایک مضمون کے چند فقرے یہ ہیں:۔

" اسلام (عام معنوں میں) کسی مذہب کا اور مسلمان کسی قوم کا نام نہیں ہے، بلکہ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے منظم کرتا ہے۔ اور جہاد اس انقلابی جدوجہد کا، اس انتہائی صرف طاقت کا نام ہے جو

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عمل میں لائی جائے۔"

"یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کرلیں وہ .... اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے جسے قرآن حزب اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے ..... یہ پارٹی وجود میں آتے ہی اپنے مقصد وجود کی تحصیل کے لیے جہاد شروع کردیتی ہے۔ اس کے عین وجود کا اقتضا یہی ہے کہ یہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو مٹانے کی کوشش کرے اور اس کے مقابلے میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطے کی حکومت قائم کرے جسے قرآن ایک جامع نام کلمۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔"

"یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ، فساد، بداخلاقی، طغیان، اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے ارباب من دون اللہ کی خداوندی کو ختم کردے اور بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔ لہذا اس پارٹی کے لیے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ مفسدانہ نظام تمدن ایک فاسد حکومت کے بل پر ہی قائم ہوتا ہے۔ اور ایک صالح نظام تمدن اس وقت تک کسی طرح قائم ہی نہیں ہوسکتا جب تک حکومت مفسدین سے مغلوب ہوکر مصلحین کے ہاتھ میں نہ آجائے۔"

تفہیمات حصہ اول — "جہاد فی سبیل اللہ"

اوپر کے اقتباسات میں جو بات کہی گئی ہے وہ اصلاً کوئی غلط بات نہیں ہے لیکن جب اسی کو علی الاطلاق اہل ایمان کا نصب العین قرار دیا جائے تو یقیناً وہ غلط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مومن کی زندگی کا اصل مقصد خدا سے تعلق پیدا کرنا ہے، خدا سے انتہائی طور پر لپٹ جانا، اس سے ہمہ تن متعلق ہو کر زندگی گزارنا، یہی وہ اصل مقصود ہے جس کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو پانے کے لیے مومن کو اپنی ساری توجہ صرف کرنی چاہیے۔ دنیا میں مومنانہ عمل کا اصل نشانہ خدا سے جڑنا ہے نہ کہ کسی مخصوص اسٹیٹ کا نظام قائم کرنا۔

اجتماعی انقلاب برپا کرنا یا زندگی کے نظام کو قسط و عدل پر قائم کرنا ایمان کا ایک خارجی تقاضا ہے جو مختلف حالات میں مختلف شکل اختیار کرتا ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ جب میں سڑک پر چلتا ہوں اور لاؤڈ اسپیکر پر بجتے ہوئے فلمی گانوں کی آواز میرے کان میں آتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ کاش میرے پاس وہ طاقت ہوتی جس سے میں اس خرافات کو بالکل بند کر دیتا۔ جب میں روزانہ اخبار پڑھتا ہوں اور اس میں دیکھتا ہوں کہ شیاطین انس نے لیڈر اور رہنما بن کر زمین کو فساد سے بھر دیا ہے تو دماغ جیسے کھولنے لگتا ہے اور یہ تمنا ابھر آتی ہے کہ کوئی ایسی شکل ہوتی کہ ان مفسدین سے زمین کو پاک کیا جا سکتا۔ جب میں عوام الناس کو دیکھتا ہوں کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے احمقانہ قوانین کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور غلط معاشی نظام کے نیچے پس رہے ہیں تو سارے بدن میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔ اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس جال کو توڑ ڈالوں اور اس نظام کو تہس نہس کر دوں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ وقت کا با اقتدار طبقہ، اقتدار پا کر فرعون بن گیا ہے اور ملکی اور بین الاقوامی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ میں ان تمام مجرمین کو جیل بھیج دیتا اور انسانیت کو ان کی تاخت و تاراج سے رہائی دلا دیتا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ اشرار کی قیادت نے دنیا کا یہ حال کر دیا ہے کہ زمین کے بہترین ذرائع و وسائل صرف جنگی تیاریوں میں برباد کیے جا رہے ہیں اور سیاست صرف اس کا نام رہ گئی ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائے تو جی چاہتا ہے کہ ایسے حکمرانوں کو خود انھیں کے تیار کیے ہوئے ان آتش گڑھوں میں ڈھکیل دوں جو انھوں نے اپنے فرضی دشمنوں اور سیاسی مخالفوں کے لیے بنا رکھے ہیں۔

ممکن ہو میرے ان جذبات میں کچھ انتہا پسندی ہو، مگر میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ اگر کسی کے دل میں ایمان پیدا ہوا ہے تو وہ خارجی حالات کے بارے میں اس قسم کے احساسات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مومن کی لازمی صفت ہے کہ وہ دنیا کے بگاڑ کو دیکھ کر کڑھے، اس کی اصلاح کی تدبیریں سوچے، اس کو دور کرنے کے لیے اپنے بس بھر کوشش کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص کہے کہ یہی اہل ایمان کا اصل مشن ہے اور یہی وہ اصل کام ہے

جس کے لیے تمام انبیاء بھیجے گئے تھے، تو میں کہوں گا کہ یہ بات اتنی ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا کہ نماز کا مسلمان سے کوئی تعلق نہیں، اس کے بارے میں اسے کچھ سوچنا نہیں چاہیے۔ اگر آپ ایک ایسے مکان میں داخل ہوں جس میں ہر طرف غلاظت اور کوڑا کرکٹ بھرا ہوا ہو تو بے شک نظافت ایمانی کا تقاضا ہے کہ آپ اس کو شدت کے ساتھ محسوس کریں اور اس کو نکال پھینکنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ لیکن اگر آپ یہ کہنے لگیں کہ ——— "ایمان کا اصل مقصود یہ ہے کہ گھروں کی صفائی کی جائے۔" تو یہ بات بجائے خود بالکل لغو ہوگی اور اس قابل ہوگی کہ اس کی تردید کی جائے؛

یہی وجہ ہے کہ اجتماعی اصلاح اور تمدنی انقلاب کی بات ایک معلوم و معروف بات ہونے کے باوجود "اسلامی مشن" کی حیثیت سے ثابت نہیں ہوتی۔ اسلامی مشن کا یہ تصور کہ وہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی تحریک ہے یا یہ کہ اسلام ایک بہترین نظام حیات ہے اور اس نظام کو جاری و نافذ کرنا وہ کام ہے جو خدا کی طرف سے ہمارے سپرد ہوا ہے۔ یہ اسلامی مشن کا ایک ایسا تصور ہے جس سے قرآن کے صفحات ناآشنا ہیں۔ مجھے کتاب الٰہی میں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ملا جس سے اس نقطۂ نظر کو واقعی طور پر اخذ کیا جا سکتا ہو۔ اس سلسلہ میں جن آیتوں کے حوالے دیئے جاتے ہیں ان پر زیرِ طبع کتاب میں ایک ایک کرکے مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہاں میں صرف ایک آیت سے متعلق بحث کو کسی قدر اختصار کے ساتھ نقل کرتا ہوں۔

یہ آیت حسب ذیل ہے؛

شرع لکم من الدین ما وصّٰی	خدا نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا
بہ نوحا والذی اوحینا الیک	ہے جس کا اس نے نوح کو اور ابراہیم کو
وما وصینا بہ ابراھیم وموسٰی	اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا اور اے
وعیسٰی ان اقیموا الدین ولا	محمد تمہاری طرف ہم نے اسی کی وحی کی
تتفرقوا فیہ۔	ہے، یہ کہ اس دین پر قائم رہو اور اس
شوریٰ - ۱۳	میں متفرق نہ ہو۔

اس آیت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس میں "الدین" سے مراد وہ سارے انفرادی

(اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی احکام ہیں جو اسلامی شریعت میں موجود ہیں اور اقامت کا مطلب ہے ان کو قائم کرنا۔ اس طرح یہ آیت پورے شرعی نظام کو مکمل طور پر انسانی زندگی میں غالب و نافذ کرنے کا حکم دے رہی ہے۔

مگر یہ اس آیت کی ایسی تفسیر ہے جو میرے علم کی حد تک، کسی قابل ذکر مفسر نے اب تک نہیں کی۔ تمام علمائے تفسیر اس آیت میں الدین سے مراد اصل دین یا دین کی بنیادی تعلیمات لیتے ہیں نہ کہ کل دین۔ ان کے نزدیک یہاں اقامت دین سے مراد سارے شرعی نظام کو لوگوں کے اوپر قائم کرنا نہیں ہے بلکہ دین کے اس بنیادی حصہ کو پوری طرح اختیار کرنا ہے جو ہر شخص سے اور ہر حال میں لازمی طور پر مطلوب ہے اور جس کو اپنی زندگی میں پوری طرح شامل کر لینے کے بعد کوئی شخص خدا کی نظر میں مسلمان بنتا ہے۔ (... صار بها يكون المرء باقامته مسلما۔ مدارک التنزیل وغیرہ)

زیر بحث تعبیر کے حلقہ میں اس آیت کا ترجمہ "دین قائم کرو" کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ غلط تو نہیں ہے مگر وہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ ترجمہ کے یہ الفاظ خاص طور پر زیر بحث تعبیر کے پیدا کردہ فکر کے پس منظر میں یہ مفہوم اختیار کر لیتے ہیں کہ "دین کو غالب اور نافذ کرو" یا یہ کہ "اپنی ذات سے لے کر ساری دنیا تک اسے زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرو" حالانکہ اقیموا الدین کے فقرے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ اصل مفہوم کے اعتبار سے اردو میں اس کا زیادہ بہتر ترجمہ یہ ہوگا — "دین پر قائم رہو" چنانچہ اردو مترجمین میں سے کسی ایک نے بھی اس کا ترجمہ "دین قائم کرو" نہیں کیا ہے بلکہ بلا استثناء سب کا ترجمہ وہی ہے جو ہم نے اپنے ترجمہ میں اختیار کیا ہے۔ چند مشہور علماء کے ترجمے یہاں نقل کیے جاتے ہیں: [۱]

شاہ عبدالقادر	یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو
شاہ رفیع الدین	یہ کہ قائم رکھو دین کو اور مت متفرق ہو بیچ اس کے۔

---

[۱] اقامت کا اصل مفہوم ہے — کسی کام کا حق ادا کرنا، اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دینا۔ (اقامة الشئ توفية حقه، مفردات امام راغب) خارجی حکم کے نفاذ کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مگر اس کا اصل مفہوم متعلقہ فرد کی

(باقی بر صفحہ آئندہ)

عبدالحق حقانی	اسی دین پر قائم رہنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا
اشرف علی تھانوی	اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا
ڈپٹی نذیر احمد	اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا
شیخ الہند محمود الحسن	قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں

اس رائے کی بنیاد آیت کے الفاظ ہیں، کیونکہ پوری آیت کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک ایسے دین کی اقامت کا حکم دیا جا رہا ہے جو حضرت نوح سے لے کر آخری رسول تک تمام انبیاء پر اترا تھا۔ اب چونکہ مختلف انبیاء پر نازل کی جانے والی تعلیمات اپنی پوری شکل میں یکساں نہیں تھیں۔ عقائد اور بنیادی اصولوں کی حد تک تو ان سب کا دین بالکل ایک تھا، مگر تفصیلی شریعت اور عملی احکام میں ان کے درمیان کافی فرق تھا۔ اس لیے حکم کے الفاظ کے مطابق اس سے دین کا وہی حصہ مراد ہو سکتا ہے جو سب میں مشترک رہا ہو۔ امام رازی لکھتے ہیں:۔

انه عطف عليه سائر الانبياء	شرع لكم من الدين ۔۔۔ کے فقرے پر تمام
وذلك يدل على ان المراد هو	انبیاء کا عطف ہو اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس حکم
الاخذ بالشريعة المتفق عليها	کا مطلب شریعت کے اس حصہ پر پوری طرح
بين الكل. تفسیر کبیر، جلد ہفتم صفحہ ۳۰۲	عامل ہونا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان متفق علیہ ہو۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) مکمل انجام دہی ہو نہ کہ اس کا لفاظ۔ حدیث میں آتا ہو کہ سورۂ مومنون کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپ نے فرمایا

لَقَدْ اُنْزِلَ عَلَيَّ عَشْرُ آيَاتٍ مَنْ اَقَامَهُنَّ	مجھ پر دس آیتیں اتری ہیں جو ان کی اقامت
دَخَلَ الْجَنَّةَ	کرے وہ جنت میں جائے گا۔

ان دس آیتوں میں جو احکام دیئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں ۔ نماز میں خشوع اختیار کرنا، لغو سے پرہیز کرنا، زکوٰۃ پر عامل ہونا، شرم گاہ کی حفاظت کرنا، امانت اور عہد کو پورا کرنا، نمازوں کی نگہبانی کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام انفرادی زندگی کے احکام ہیں اس لیے ان کو غالب اور نافذ کرنے کا کوئی سوال نہیں۔ یہاں اقامت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پوری طرح اختیار کر لیا جائے۔ ان کو اپنی زندگی میں مکمل طور پر شامل کر لیا جائے۔

چنانچہ امام رازی نے آیت کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

واقول یجب ان یکون المراد من	ضروری ہے کہ اس الدین سے کوئی ایسی
هذا الدين شيئا مغايراً للتكاليف	شے مراد ہو جو احکام اور عملی ذمہ داریوں
والاحكام وذالك لانها مختلفة	کے علاوہ ہے کیونکہ یہ چیزیں قرآن کی
متفاوتة قال الله تعالى لكل	تصریح کے مطابق، مختلف انبیاء کے درمیان
جعلنا منكم شرعة ومنهاجا فيجب	مختلف رہی ہیں۔ پس لازم ہے کہ یہاں
ان يكون المراد منه الامور التى	الدین سے مراد ایسے امور ہوں جن میں
لا تختلف باختلاف الشرائع وهى	شریعتوں کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں آیا
الايمان بالله وملائكته وكتبه	اور وہ ہے ایمان ۔ خدا پر، اس کے
ورسله واليوم الآخر، والايمان	فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے
يوجب الاعراض عن الدنيا و	رسولوں پر اور یوم آخرت پر۔ اور ایمان
الاقبال على الآخرة والسعى فى	سے پھر اور چیزیں پیدا ہوتی ہیں ــــ
مكارم الاخلاق والاحتراز عن	دنیا سے اعراض، آخرت کی طرف لپک،
رذائل الاحوال۔	اچھے اخلاق کو اختیار کرنا اور برے
تفسیر کبیر، جلد ہفتم، صفحہ ۲۸۲	اخلاق سے بچنا۔

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

"مراد اس دین سے اصولِ دین ہیں جو مشترک ہیں تمام شرائع میں مثل توحید و رسالت و بعث وغیرہ۔ اور قائم رکھنا یہ کہ اس کو تبدیل مت کرنا، اس کو ترک مت کرنا۔"

(بیان القرآن)

یہی رائے تمام مفسرین نے دی ہے۔ کسی بھی قابل ذکر تفسیر میں مجھے آیت کا یہ مفہوم نہیں ملا کہ ــــ "دین کے تمام انفرادی و اجتماعی اور قومی و بین الاقوامی احکام کو روئے زمین پر نافذ کرو۔" یہاں میں چند رائیں نقل کرتا ہوں:۔

ابو العالیہ:

الاخلاص للہ وعبادتہ
(البحر المحیط)

یعنی اس آیت میں اقامت دین کا مطلب
خدا کے لیے اخلاص اور اس کی عبادت ہے۔

مجاہد:

لم یبعث نبی الا امر باقامۃ
الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والاقرار
باللہ تعالیٰ وطاعتہ سبحانہ
وذلک اقامۃ الدین (روح المعانی)

اللہ نے ہر نبی کو حکم دیا تھا کہ وہ نماز
قائم کرے، زکوٰۃ دے، اللہ کا اقرار
کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اسی کا
نام اقامت دین ہے۔

ابو حیان:

ھو ما شرع لھم من العقائد
المتفق علیھا من توحید اللہ
وطاعتہ والایمان برسلہ و
بکتبہ وبالیوم الآخر والجزاء
فیہ۔ (البحر المحیط)

یہ ان متفقہ عقائد کا نام ہے جو توحید،
خدا کی اطاعت، رسولوں پر ایمان، اس کی
کتابوں پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان،
اور جزائے اعمال سے متعلق ہیں۔

خازن:

المراد باقامۃ الدین ھو توحید
اللہ والایمان بہ وبکتبہ و
رسلہ والیوم الآخر وطاعۃ اللہ
فی اوامرہ ونواھیہ وسائر
ما یکون الرجل بہ مسلما ولم
یرد الشرائع التی ھی مصالح الامم
علی حسب احوالھا فانھا مختلفۃ
متفاوتۃ قال اللہ تعالیٰ لکل
جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا

یہاں اقامت دین سے مراد توحید خدا
اور اس کی کتابوں اور رسولوں اور یوم
آخرت پر ایمان لانا ہے اور احکام و
ممنوعات میں اس کی اطاعت کرنا ہے اور
ان سب چیزوں پر عمل کرنا ہے جن پر عمل
کرنے سے کوئی شخص مسلمان کہلاتا ہے۔ یہاں
دین سے مراد شریعتیں نہیں ہیں جو امتوں
کے حالات کے تحت ان کی مصلحت کے
پیش نظر نازل ہوتی ہیں۔ کیونکہ قرآن کی

تصریح کے مطابق وہ مختلف ہیں۔ (لباب التاویل)

آلوسی بغدادی:

ای دین الاسلام الذی هو توحید الله تعالیٰ وطاعته والایمان بکتبه ورسله ویوم الجزاء وسائر ما یکون العبد به مومناً والمراد باقامته تعدیل ارکانه وحفظه من ان یقع فیه زیغ والمواظبة علیه (روح المعانی)

یعنی دین اسلام جو کہ توحید، خدا کی اطاعت اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یوم جزا پر ایمان کا نام ہے اور وہ سب کچھ جس سے کوئی شخص مومن بنتا ہے۔ اور اقامت دین سے مراد اس کے ارکان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا، اس کی نگہداشت اور اس پر دوام۔

قمی نیساپوری

یعنی اقامة اصوله من التوحید والنبوة والمعاد ونحو ذلک دون الفروع التی تختلف بحسب الاوقات بقوله لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا (غرائب القرآن برحاشیہ ابن جریر)

یعنی توحید، نبوت، آخرت پر قائم ہونا اور اس قسم کی دوسری اصولی تعلیمات کو اپنانا جو ان فروعات کے علاوہ ہیں جن میں مختلف شریعتوں کے درمیان اختلاف رہا ہے۔

قرطبی:

هو توحید الله وطاعته والایمان برسله وکتبه وبیوم الجزاء وبسائر ما یکون الرجل باقامته مسلماً، ولم یرد الشرائع التی هی مصالح الامم علی حسب احوالها فانها مختلفة متفاوتة (الجامع لاحکام القرآن)

اس کا مطلب ہے خدا کی توحید کا اقرار اور اس کی اطاعت۔ اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر اور روز آخرت پر ایمان لانا اور وہ سب کچھ جس کی اقامت سے آدمی مسلمان بنتا ہے۔ یہاں شریعتیں مراد نہیں ہیں جو اقوام کے حالات کے تحت ان کی مصلحت کے مطابق دی جاتی ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ مختلف رہی ہیں۔

ابن کثیر:

ای القدر المشترک بینھم، ھو عبادة اللہ وحدہ لا شریک لہ وان اختلفت شرائعھم ومناھجھم

یعنی انبیاء کی تعلیمات کا قدر مشترک جو بالاشتراک ایک خدا کی عبادت کرنا ہے اگرچہ اس کے سوا ان کی شریعت اور طریقے باہم مختلف ہیں۔

حافظ الدین نسفی:

ای شرع لکم من الدین دین نوح ومحمد وما بینھما من الانبیاء علیھم السلام، ثم فسر المشروع الذی اشترک ھؤلاء الاعلام من رسلہ فیہ بقولہ (ان اقیموا الدین) والمراد اقامة دین الاسلام ھو توحید اللہ وطاعتہ والایمان برسلہ وکتبہ وبیوم الجزاء وسائر ما یکون المرء باقامتہ مسلما، ولم یرد بہ الشرائع فانھا مختلفة۔ ومحل ان اقیموا النصب بدل من مفعول شرع والمعطوفین علیہ اور فع علی الاستئناف کانہ قیل وماذلک المشروع، فقیل ھو اقامة الدین۔ مدارک التنزیل

یعنی تمھارے لیے دین میں سے دین نوح، دین محمد اور ان کے درمیان آنے والے نبیوں کے دین کو مشروع بتایا جس میں یہ انبیائے عظام مشترک رہے ہیں۔ فرمایا ان اقیموا الدین یہاں دین اسلام کی اقامت سے مراد ہے: توحید، خدا کی اطاعت، رسولوں اور کتابوں اور یوم جزا پر ایمان اور وہ سب چیزیں جن کو اختیار کر لینے سے کوئی شخص مسلمان بنتا ہے۔ اس حکم میں انبیاء کی شریعتیں مراد نہیں ہیں، کیونکہ وہ مختلف انبیاء کے درمیان مختلف رہی ہیں۔ نحوی ترکیب کے لحاظ سے ان اقیموا الدین یا تو محل نصب میں ہے کیونکہ وہ شرع کے مفعول کا بدل ہے۔ یا وہ علیحدہ جملہ ہے اور محل رفع میں ہے۔ گویا سوال تھا وہ کیا چیز ہے جو مشروع کی گئی ہے فرمایا، وہ ہے اس (متفق علیہ) دین پر قائم ہو جانا۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ آیت کے مخصوص الفاظ کی بنا پر یہاں مفسرین نے

دین کی بنیادی تعلیمات کو پوری طرح اختیار کرنا مراد لیا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا یہ مطلب لینا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ دین کے تمام انفرادی و اجتماعی قومی و بین الاقوامی احکام کو روئے زمین پر نافذ کرو۔

میری اس بحث کی تردید کرتے ہوئے ایک بزرگ نے چند دلائل دیے ہیں اور اُن کا کہنا ہو کہ ان دلائل کی صحت پر وہ مطمئن ہیں، ان میں سے دو خاص دلائل کا میں یہاں ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ امام راغب نے اقامۃ الشیئ کے معنی توفیۃ حقہ لکھے ہیں۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اس کے مطابق اقیموا الدین کا مطلب ـــــ "دین کا توفیہ کرو"۔ اب ظاہر ہے کہ دین کا توفیہ (حق ادا کرنا) اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ پورے دین کو اختیار کیا جائے! اس لیے اقیموا الدین کا مطلب یہی ہوگا کہ پورے دین کو قائم و جاری کرو۔

میں کہوں گا کہ امام راغب کا یہ حوالہ صرف لفظ "اقامت" کی لغوی تشریح کو بتاتا ہے وہ سورۂ شوریٰ میں "الدین" کے حدود متعین نہیں کرتا۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اقامت کا لفظ جب کسی چیز کے لیے بولا جائے تو اس کا مطلب ہوگا اس چیز کا توفیہ کرنا۔ اس کو خوب اچھی طرح انجام دینا۔ مثلاً اقام الصلوٰۃ کا مفہوم یہ ہوگا کہ نماز خوب اچھی طرح ادا کی، اقام السوق، بازار خوب لگایا۔ اسی طرح زیر بحث آیت میں اقیموا الدین کا مطلب یہ ہوگا کہ یہاں الدین کا لفظ جس چیز کے لیے آیا ہے اس کو بہترین طور پر اختیار کرو۔ اب چونکہ دیگر قرائن سے یہ متعین ہو رہا ہے کہ اس آیت میں الدین کے معنی اصل دین ہیں، اس لیے یہاں اقیموا الدین کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل دین کا توفیہ کرو، اس کو پوری طرح اختیار کر لو۔ مگر موصوف چونکہ اپنے ذہن میں الدین کا مفہوم لازمی طور پر "کل شریعت" لیے ہوئے ہیں، اس لیے انھوں نے الدین کے اپنے اس ذاتی مفہوم کو لفظ اقامت کے متعلق امام راغب کی تشریح کے ساتھ ملا کر یہ سمجھ لیا کہ آیت کا مطلب ہے "کل دین کا توفیہ کرو"۔ جیسے کوئی شخص "صلوٰۃ" کے معنی "انقلاب" سمجھ لے تو وہ کہے گا کہ اقیموا الصلوٰۃ کا مطلب ہے ـــــ "انقلاب برپا کرو"۔

۲۔ زیربحث آیت کے ضمن میں میں نے علمائے تفسیر کے جو حوالے اوپر نقل کیے ہیں، ان کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"مفسرین کرام کا یہ خیال اگرچہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ آیت کا اصل مدعا یہی ہے، مگر اس کے باوجود آیت کے منشا سے یہ مسئلہ بالکل خارج بھی نہیں ہے کہ اصل دین کے بعد تفصیلی پیروی کس شریعت کی کی جائے گی، بلکہ الذی اسم موصول خاص لاکر اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے۔ چنانچہ جن علماء کی نظر اس طرف جاسکی ہے انھوں نے ساتھ کے ساتھ اس حقیقت کی بھی وضاحت کردی ہے کہ اقامت دین کے اس حکم میں شریعت کے تفصیلی احکام بھی داخل ہیں اور پورے کے پورے داخل ہیں۔"

اس کے بعد محذوف فقروں کے ساتھ دو کٹی ہوئی عبارتیں نقل کی گئی ہیں اور ان کے مصنفین کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک اس آیت میں جس "دین" کی اقامت کا حکم ہے اس سے مراد صرف اصل دین نہیں بلکہ پوری کی پوری شریعت کی اقامت اور اس کا تفصیلی نفاذ ہے۔ مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ دو مفسرین کے بارے میں یہ انکشاف کہ ان کے نزدیک اقیموا الدین کے اس حکم میں شریعت کے تمام احکام اپنی پوری تفصیل کے ساتھ داخل ہیں، وہ ان کی اصل عبارتوں میں لکھا ہوا موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ماخذ دوسرا ہے، اور وہ ہے —— عبارت کے کچھ حصوں کو حذف کرکے مفسر کی ایک بات کو غلط رنگ میں پیش کرنا۔

جن دو مفسروں کے حوالے دیے گئے ہیں، وہ علامہ صاوی اور شیخ سلیمان ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے جلالین کی شرح لکھی ہے۔ جلالین میں ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی تھی:

ھذا ھو المشروع الموصیٰ بہ والموحیٰ الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وھو التوحید۔	یہی (الدین) وہ چیز ہے جس کی شروعیت کا آیت میں ذکر ہے، جس کی وصیت کی گئی ہے، جس کا بذریعہ وحی نزول ہوا ہے، اور وہ ہے —— توحید۔

دونوں شارحین نے اس تفسیر سے اتفاق کیا ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہو کہ اقیموا الدین کے مخصوص حکم میں تو توحید ہی کی اقامت مراد ہے، مگر آیت میں اس سے پہلے الذی اوحینا الیک کا جو فقرہ ہے، وہ اس سے عام ہے اور اس فقرے کے مفہوم میں ساری وحی محمدی شامل ہے۔ یعنی انھوں نے جو وسعت دی ہے اس کا تعلق اقیموا الدین سے نہیں ہے بلکہ ایک اور فقرے سے ہے۔ مفسرین کی اسی بات میں غلط مبحث پیدا کر کے پہلے فقرے سے متعلق بات کو دوسرے فقرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ یہاں میں دونوں کی متعلقہ عبارتیں پوری کی پوری نقل کرتا ہوں۔ شیخ سلیمان لکھتے ہیں:

ثم فسر المشروع الذی اشترك	پھر اس مشروع کو بیان کیا جس میں تمام
فیہ هولاء الاعلام من رسله	انبیاء اعلام مشترک رہے ہیں۔ فرمایا۔
بقوله (ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا	"الدین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو"
فیه) والمراد من اقامة الدین	یہ الدین جس کی اقامت کا یہاں حکم ہے
هو توحید الله والایمان به و	اس سے مراد ہے توحید، اللہ پر ایمان، کتب
بکتبه ورسله والیوم الاخر و	الٰہی پر ایمان، رسولوں پر ایمان، یوم
طاعة الله فی اوامره ونواهیه	آخرت پر ایمان اور اوامر و نواہی میں
وسائر ما یکون الرجل به مسلما	خدا کی اطاعت اور ان سب چیزوں کو
ولم یرد الشرائع التی هی مصالح	اختیار کرنا جن کے اختیار کرنے سے
الامم علی حسب احوالها فانها	آدمی مسلمان بنتا ہے۔ یہاں شریعتیں مراد
مختلفة متفاوتة (قوله ان	نہیں ہیں جو امتوں کے مصالح کے تحت
اقیموا الدین) المراد باقامته	ان کے حسب احوال دی گئی ہیں کیونکہ وہ
تعدیل ارکانه وحفظه من ان	مختلف اور متفاوت ہیں۔ اس دین
یقع فیه زیغ والمواظبة علیه	(مشترک) کی اقامت سے مراد اس کے
(ولا تتفرقوا فیه) ای لا تتفرقوا	ارکان کی تعدیل، اس کی حفاظت اور اس
فی الدین الذی هو عبارة عما ذکر	پر دوام ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔

من الاصول و من الفروع المختلفة	"اس میں متفرق مت ہو" یعنی اس دین
حسب اختلاف الامم باختلاف	میں متفرق نہ ہو جو اصولوں سے عبارت ہو
الاعصار کما ینطق به قوله تعالیٰ	اور ان فروع کے علاوہ ہو جن میں مختلف
لکل جعلنا منکم شرعة ومنھاجا	امتیں مختلف رہی ہیں، جیسا کہ قرآن میں
(قوله وھو التوحید[1]) ھذا ھو	ارشاد ہوا ہے لکل جعلنا منکم شرعة
المراد بالدین الذی اشترك	ومنھاجا (ہر ایک کے لیے ہم نے ایک
فیه ھولاء الرسل..... واما	شریعت اور ایک منہاج دیا) جلالین میں
الذی فی قوله (والذی اوحینا	اقیموا الدین کی تفسیر اقیموا التوحید سے
الیك) فھو اعم من ذلك لان	کی گئی ہے، یہی توحید وہ دین ہے جو تمام
المراد به جمیع الشریعة المحمدیة	انبیاء کے درمیان مشترک رہا ہو۔ ورنہ
اصولا وفروعا۔	جہاں تک آیت کے دوسرے فقرے
	الذی اوحینا الیك کا تعلق ہو وہ
	اس سے زیادہ عام ہے کیونکہ اس اس
	موحیٰ الیہ سے تمام شریعت محمدی اصول
	و فروع سمیت مراد ہے۔

علامہ صاوی کی عبارت کا ضروری حصہ حسب ذیل ہے:

قوله (شرع لکم) الخطاب لامة	شرع لکم میں امت محمد سے خطاب ہو
محمد صلی الله علیه وسلم والمعنیٰ	مطلب یہ ہو کہ تمھارے لیے ایسا قوی اور
بین لکم وجعل لکم دینا قویا	واضح دین مقرر کیا ہے جس کی صحت پر
واضحا تطابقت علی صحته	پچھلے انبیاء و رسل متفق ہیں اور اس دین
الانبیاء والرسل من قبل...	کی اقامت سے مراد اس کے ارکان کی

[1] یہ جلالین کا فقرہ ہے — جلالین میں ان اقیموا الدین کی تشریح میں وھو التوحید کے الفاظ لکھے ہیں شیخ سلیمان یہاں اسی کو نقل کر کے اس کی وضاحت کر رہے ہیں۔

Arabic	Urdu
والمراد باقامة الدين تعديل	تعدیل، اس کی حفاظت اور اس پر دوام
اركانه وحفظه والمواظبة عليه	ہے۔ جلالین کا فقرہ وھو التوحید انبیاء
(قوله وهو التوحيد) بيان للمراد	کے درمیان اسی مشترک دین کو بتاتا ہے
من الدين الذى اشترك فيه	مگر جہاں تک آیت کے دوسرے فقرے
هولاء الرسل واما قوله (والذى	الذی اوحینا الیک کا تعلق ہے وہ اس
اوحينا اليك) فهو اعم من ذلك	فقرے (اقیموا الدین) سے زیادہ عام ہے
فان المراد به جميع الشريعة	کیونکہ اس میں ساری شریعت اصول و فروع
اصولا وفروعا وانما اقتصر	سمیت مراد ہے (اقیموا الدین کے حکم میں)
على التوحيد لانه رأس الدين	توحید پر اقتصار اس لیے کیا کہ وہ دین کا
واساسه۔	سرا اور اس کی بنیاد ہے۔

مندرجۂ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ میرے ناقد محترم نے علامہ صاوی اور شیخ سلیمان کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر دی ہے جو انھوں نے خود نہیں کہی تھی۔ دونوں شارحین نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ اقیموا الدین کے فقرے میں تو صرف توحید اور اس کے بنیادی تقاضوں کی اقامت کا حکم ہے جیسا کہ اصل تفسیر (جلالین) میں مذکور ہے نہ کہ تفصیلی شریعت کا، مگر دوسرے فقرے الذی اوحینا الیک کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس کے مفہوم میں ساری وحی محمدی شامل ہے۔ مگر علامہ صاوی اور شیخ سلیمان نے جو بات الذی اوحینا الیک کے بارے میں کہی تھی، اس کو غلط طور پر اقیموا الدین کے فقرے کے ساتھ جوڑ کر یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ دونوں بزرگوں کے نزدیک ـــــــــ "اقامت دین کے اس حکم میں شریعت کے تفصیلی احکام بھی داخل ہیں اور پورے کے پورے داخل ہیں۔"

غلط تعبیر کے نتائج

[کتاب کے چھٹے باب میں اس فکر کے نظری اور عملی نتائج کی تفصیل ہے۔ یہاں میں عملی نتائج کی بحث سے کچھ حصہ نقل کرتا ہوں۔]

ا۔ تعبیر کی اس غلطی کا ایک کھلا ہوا نقصان یہ ہو کہ اسکی وجہ سے ذہنوں میں دین کا تصور بدل گیا۔ ہر چیز میں کچھ جزوی پہلو ہوتے ہیں اور ایک اسکی مجموعی حقیقت ہوتی ہے جزوی پہلوؤں میں سے کسی کے بارے میں مشاہدہ غلطی کر جائے تو یہ غلطی اپنے مقام پر رکی رہتی ہے لیکن مجموعی حقیقت کے بارے میں تصور کا بدل جانا پورے وجود کے بارے میں نقطۂ نظر کو بدل دیتا ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ عورتوں کے منھ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔ یہ اگرچہ ایک غلطی تھی۔ مگر جزوی اور مقامی غلطی تھی۔ اس لئے اس کی وجہ سے زندگی میں کوئی حقیقی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بجائے جن مفکرین نے عورت کے بارے میں مساوات کا نظریہ پیش کیا اور یہ سمجھا کہ عورت اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ویسی ہی ہے جیسے مرد۔ انھوں نے عورت کے پورے وجود کے متعلق غلط رائے قائم کی۔ اس کی وجہ سے عورت کی پوری ہستی کے بارے میں ان کی رائے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ جس کے نتیجہ میں خاندان اور سماج کے اندر ایسی ایسی خرابیاں پیدا ہوئیں جن کا اس فکر کے ابتدائی موجدین نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

زیر بحث تعبیر کی غلطی کا تعلق بھی مجموعی فکر سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جن ذہنوں میں جگہ بنائی وہ پورے مجموعۂ دین کو ایک مختلف نظر سے دیکھنے لگے۔ اور جب مجموعہ کے بارے میں نقطۂ نظر بدل جائے تو پھر اسی نسبت سے سارے متعلق اجزاء کی حیثیت میں فرق آجاتا ہے۔ اس فکر نے دین کی جو تصویر بنائی ہے، اس میں بظاہر سارے اجزائے دین موجود ہیں۔ مگر سب کے سب اپنے اصل مقام سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس میں اجزائے دین کی ترتیب کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھتا ہے تو اس میں اسلام بحیثیت "نظام" تو بہت ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر اس کا تعبدی پہلو کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس تصویر میں ایمان، اسلام، تقویٰ، احسان، سب کچھ موجود ہے، مگر یہ الفاظ اصلاً تعلق باللہ کے مراحل کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ وہ "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" ہیں، وہ تعلق باللہ کے ان مخصوص مظاہر کے پیمانے ہیں جو "امامت صالحہ" اور "نظام حق کے قیام" کی شکل

میں ظاہر ہوتا ہے جو اس تعبیر کے نزدیک "دین کا حقیقی مقصود" اور دنیا میں "مسلمان کی سعی کا منتہا" ہے۔ یہ حقیقت ایمانی کے ظہور کے وہ مراتب ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ آدمی مذکورہ بالا انقلابی جد و جہد کے اعتبار سے کس مقام پر ہے۔

جب دین کا تصور یہ ہو جائے تو پھر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہیے اگر ایسے افراد کا دینی تعلق ایک مخصوص سیاسی ڈھانچہ کے نفاذ کے بارے میں تو خوب ظاہر ہوتا ہو۔ مگر ذکر و شکر اور اخبات و انابت کی حقیقتیں ان کے یہاں غائب ہو گئی ہوں۔

۲۔ جو لوگ دین کی کسی غلط تعبیر سے متاثر ہوں، ان کو خدا کی کتاب سے اتنی دلچسپی نہیں ہو سکتی جتنی اس مخصوص تشریح سے ہوگی جس کو انھوں نے حق سمجھ کر قبول کیا ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ قرآن میں دین کی تشریح اپنے تصورِ دین کے مطابق ہے نہ کہ کسی اور تصور کے مطابق۔ جب کوئی شخص دوسرا تصور لے کر قرآن کو پڑھتا ہے تو اس میں اسے اپنے جذبات کی تسکین نہیں ملتی۔ قرآن میں اس کو دین ٹھیک اس شکل میں نظر نہیں آتا جس شکل میں وہ اپنے ذہن کے اندر لیے محسوس کرتا ہے۔ اس بنا پر اس کے اندر کچھ اس قسم کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جس کو قرآن میں اشمئزاز کہا گیا ہے۔ (زمر۔ ۴۵) اس کے برعکس اپنی پسندیدہ تشریح کے تحت پیدا شدہ لٹریچر سے اسے بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں اس کے جذبات کو پوری طرح تسکین ملتی ہے۔ وہاں دین اسے عین اس تصور کے مطابق نظر آتا ہے جو اس نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے۔ آپ کو ایسے افراد ملیں گے جن کو سیرۃ النبی اور اسوۂ صحابہ جیسی کتابیں پڑھنے کے لیے دی جائیں تو وہ ان کو ختم کیے بغیر واپس کر دیں گے۔ اس کے برعکس عبد الحلیم شرر کے "اسلامی ناولوں" کو وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ جب تک ختم نہیں کر لیتے انھیں چین نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلامی تاریخ کو جس رنگین صورت میں وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ خالص تاریخی کتابوں میں انھیں نہیں ملتی۔ ان کو اسلام کی واقعی تاریخ سے زیادہ اپنے مخصوص ذوق سے دلچسپی ہے، اس لیے وہ تاریخ سے زیادہ تاریخی ناول پسند کرتے ہیں۔

۳۔ اس تعبیر سے جو لوگ متاثر ہوتے ہیں ان کے ذہن میں اسلام ایک طرح کے سیاسی اور سماجی نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کو ٹھیک

اسی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جس نظر سے دنیا کی عام سیاسی اور سماجی تحریکیں اپنے مخاطبین کو دیکھتی ہیں۔ ان کو ہدایت خلق سے زیادہ "رائے عامہ ہموار کرنے" کی فکر ہو جاتی ہے تاکہ موجودہ جمہوری دور میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ووٹ مل سکیں۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کی حیثیت ان کی نظر میں بدل جاتی ہے۔ یہاں میں جماعت اسلامی ہند کی پالیسی (مطبوعہ ۱۹۵۹ء) کا ایک فقرہ نقل کروں گا۔

"دعوت قرآنی کے ایک عالمگیر دعوت ہونے کے باعث اس کا مخاطب بلا امتیاز قوم و ملت ہر شخص ہے۔ اس لئے جبکہ ہمارے ملک میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی قسم کی ملتیں پائی جاتی ہیں، ہماری تحریک دونوں ہی قسم کے لوگوں کو اپنا مخاطب قرار دے گی۔ مفاد تحریک کے لحاظ سے بھی دونوں میں سے ہر ایک کی ایک مخصوص اہمیت ہے جو دوسری کو حاصل نہیں ہے۔

مسلم گروہ کی اہمیت یہ ہے کہ قیاساً تحریک کو اسی گروہ میں سے کارکن مل سکتے ہیں اور تجربتہً مل رہے ہیں۔ اس لئے عملاً ہمارا میدان کار یہی گروہ ہے غیر مسلم گروہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس وقت ملک میں نہ صرف وہ بہت بڑی اکثریت میں ہے بلکہ علمی، سماجی اور معاشی حیثیت سے کہیں فائق تر اور سیاسی حیثیت سے صاحب اقتدار ہے۔ اس لئے کسی تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ملک کے ایسی اکثریت والے گروہ سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔"

اس اقتباس پر غور کیجئے۔ اس کی پہلی کھلی ہوئی غلطی یہ ہے کہ اس کو مسلم اور غیر مسلم دونوں ایک سطح پر نظر آتے ہیں۔ اس کے ذہن میں امت مسلمہ کی مخصوص حیثیت باقی نہیں رہی۔ وہ مسلمانوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتی ہے جیسے دنیا کے دوسرے لوگوں کو۔ مسلم گروہ کی مزید کوئی اہمیت اگر اس کے ذہن میں آتی ہے تو وہ کسی دینی اور شرعی حیثیت کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے کہ "مفاد تحریک کے لحاظ سے بھی" اس کی ایک "مخصوص اہمیت" ہے۔ اور وہ یہ کہ "قیاساً تحریک کو اسی گروہ میں سے کارکن مل سکتے ہیں اور تجربتہً" مل رہے ہیں۔"

دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے ساتھ اس فکر کو اگر کوئی خاص دلچسپی ہے تو یہ بالکل ویسی ہی ہے جیسے کسی ملک کی وزارت دفاع کو اپنے بھرتی کے علاقے (RECRUITING AREA) سے ہوتی ہے۔ ملت اسلامی کا وجود ان کے ذہن میں کسی ذمہ داری کا تصور پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ ان کے لئے ایک طرح کا کچا مال ہے جس سے آدمی لے لے کر وہ اس کو اپنی مخصوص تحریک کے کارکن بنا سکتے ہیں۔

یہی حال غیر مسلموں کا ہوا۔ جو لوگ ایمان نہیں لائے اور ابھی تک کفر و شرک کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں، ان سے ہمارے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان حق کے گواہ ہیں۔ آخرت کی جن حقیقتوں سے غافل ہو کر وہ ہلاکت کی طرف جا رہے ہیں، اس سے ان کو ہمیں آگاہ کرنا ہے۔ قیامت کے آنے والے خطرے سے ہوشیار کرنے کے لئے ہمیں ان کے سامنے "نذیر عریان" بن جانا ہے۔ مگر غلبہ حاصل کرنے کو اصل اسلامی نصب العین قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بارے میں آپ کو یہ بے چینی نہیں ہوتی کہ ان کو آنے والے خوفناک دن سے بچائیں۔ بلکہ ان کا خیال آپ کے ذہن میں آیا تو اس پہلو سے آیا کہ —— "اپنی تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ملک کی اکثریت والے گروہ سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا" اسی کا نتیجہ ہے کہ غیر مسلموں کی اصل حیثیت اس تعبیر کے ذہن میں مدھم پڑ گئی۔ اس کو یہ فکر نہیں ہوئی کہ انھیں آگ کے خطرے سے نکالیں۔ اس کے بجائے یہ ذہن انھیں اس نظر سے دیکھنے لگا کہ کس طرح ان کی "رائے" کو اپنے حق میں "ہموار" کر لے تاکہ ان کا ووٹ کسی اور کو ملنے کے بجائے ہم کو مل جائے۔ اس سلسلے میں دستور کی دفعہ ۵ کا یہ فقرہ نہایت عبرت انگیز ہے۔

"جماعت اسلامی ہند اپنے نصب العین کے حصول کے لئے تعمیری اور پرامن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعت افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لئے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔"

دیکھئے، غیر مسلم جو اصلاً ہمارے لئے انذار یوم التلاق کا موضوع ہیں، وہ اس تعبیر کے خانے میں بس رائے عامہ ہموار کرنے کا موضوع بن کر رہ گئے۔ گویا اگر وہ بیلٹ بکس کی حد تک

ہماری موافقت میں ہو جائیں تو ان کے بارے میں اسکے آگے ہیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ "اجتماعی زندگی" میں "صالح انقلاب لانے کے لئے" اتنا ہی کافی ہے۔

۴۔ پنڈت نہرو نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ جب وہ کیمبرج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، انھیں خیال ہوا کہ یہاں سے فارغ ہو کر انڈین سول سروس میں جانے کی کوشش کرینگے، کیونکہ اس زمانے میں ایک ہندستانی کے لئے یہ بڑی چیز تھی، مگر کچھ دنوں بعد جب ان کے آزاد رجحانات کافی بڑھ چکے تھے، انھیں اپنے اس خیال پر کراہت ہونے لگی۔ کیونکہ ان کے الفاظ میں انڈین سول سروس میں شرکت دراصل برطانوی حکومت کی انتظامی مشین کا ایک پرزہ (COG) بننے کے ہم معنی تھا۔ اور جس شخص نے اپنی زندگی کا مشن یہ قرار دیا ہو کہ انگریزی حکومت کو اپنے ملک سے ختم کرنا ہے، وہ اسی حکومت کا کارندہ کیسے بن سکتا ہے، دی آٹو بیاگریفی (لندن ۱۹۳۶) صفحہ ۲۴-۲۵)۔

سیاسی فکر کے نزدیک ہمیشہ یہ سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے اور اس قسم کے تمام نظریات میں اس کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ زیر بحث تعبیر میں بھی یہ چیز شدت سے اُبھر آئی۔ اس تعبیر کے مطابق اسلامی مشن کا جو تصور سامنے آتا ہے وہ ہے "نظام بدلنا"۔ میں مانتا ہوں کہ اسلامی جد و جہد کے مراحل میں سے ایک مرحلہ یہ بھی ہے۔ مگر اس تعبیر نے اس کو اس کے واقعی مقام سے ہٹا دیا۔ اور اس طرح دوسری شکل میں وہی خرابیاں پیدا ہوگئیں جو دنیا سے بے رغبتی (زہد) کی اسلامی قدر کو اس کے واقعی مقام سے ہٹانے کی وجہ سے مختلف مذاہب میں پیدا ہوئیں۔ رہبانیت کے فلسفہ نے روحانی انتہا پسندی میں پڑ کر خدا کے بندوں کو بہت سی غیر ضروری مشقتوں میں ڈال دیا تھا۔ اسی طرح اس جدید انقلابی نظریے نے سیاسی انتہا پسندی میں پڑ کر خدا کے بندوں کو ایسی مشکلات میں گرفتار کر دیا جس کے لئے دراصل خدا نے انھیں مکلف نہیں کیا تھا۔

اسکی واضح مثال موجودہ غیر الٰہی نظام کے تحت قائم شدہ اداروں کی ملازمت کا مسئلہ ہے جس کو اس تعبیر نے "کسب حرام" قرار دیا ہے، حتیٰ کہ اسکے نزدیک اس "نظام اطاعت کے ایک جزء اور دوسرے جزء میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے جو اجزاء بظاہر بالکل

معصوم نظر آتے ہیں، وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جس قدر دوسرے غیر معصوم اجزاء" "نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہے، وہ بھی اپنے تمام اجزا سمیت اسی حکم میں ہے کہ مسلمانوں کی خداوندی اس کو ہرگز سند طہارت عطا نہیں کرتی"

جس طرح رہبانیت کے فلسفہ سے متاثر ہو کر بے شمار لوگوں نے اپنے آپ کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرلیا، اسی طرح اس جدید نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتنے لوگوں نے حرام سمجھ کر سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں۔ حتیٰ کہ اسکول کے ماسٹروں اور ریل اور ڈاک خانہ کے کلرکوں نے استعفا دیدیا۔ اور اس طرح اپنے آپ کو اور اپنے اہل خاندان کو خوا مخواہ ایسی مشکلات میں مبتلا کردیا جس کا خدا نے انھیں مکلف نہیں کیا تھا۔ اس واقعہ کا اس سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ غیر فطری عمل کی وجہ سے بیشتر لوگ آخر وقت تک اس پر قائم نہ رہ سکے اور بالآخر حالات سے مجبور ہو کر یا تو کسی تاویل کے ذریعہ اسی طرف لوٹ گئے جس کو انھوں نے حرام سمجھ کر چھوڑا تھا۔ یا پھر حالات نے انھیں ایسے ذریعہ معاش تک پہنچا دیا جو سرکاری ملازمت سے بھی بدتر تھا۔

۵۔ عام مسلمانوں میں دین جس محدود اور بے روح شکل میں پایا جاتا ہے، اس کو یہ فکر رسمی دینداری کہتا ہے۔ مجھے اس تنقید سے اتفاق ہے۔ مگر خود اس تعبیر نے جو ذہن پیدا کیا وہ بھی صحیح اسلامی ذہن نہیں ہے۔ اس کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ اس نے رسمی دینداری کی جگہ ایک قسم کی نظریاتی دینداری پیدا کر دی۔ حالانکہ دین سے تعلق کی اصل روح دلسوزی اور گھلاوٹ ہے، مگر یہ چیز نہ یہاں موجود ہے اور نہ وہاں موجود۔

اس تعبیر نے اسلام کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ "اسلام ایک ہمہ گیر انقلابی نظریہ ہے جو ساری دنیا کے نظریات کو بدل کر اپنے نظریہ کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے"۔ یہ بات کلیۃً غلط نہیں ہے، مگر اس تعبیر نے اسی چیز کو اسلام کی اصل حیثیت قرار دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام بس ایک طرح کا نظریاتی تصور بن کر رہ گیا۔ اور اس کے اندر وہی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو اس طرح کے دوسرے نظریات میں ہم دیکھتے ہیں۔ دنیا کے تمام انقلابی نظریات محض کچھ الفاظ کے مجموعے ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی نفسیاتی بنیاد موجود نہیں۔ اس لئے وہ کاغذ پر تو خوب زیر بحث

آتے ہیں اور زبانوں پر بھی ان کا بڑا چرچا رہتا ہے۔ مگر وہ آدمی کی روح کو نہیں چھوتے، وہ اس کی فطرت کا جزو نہیں بنتے۔ وہ اس کے اندرونی وجود کو متاثر نہیں کرتے۔ اسی طرح اسلام کو جب دوسرے نظریات کے مقابلے میں ایک نظریہ کی حیثیت دی گئی تو وہ بھی اپنے حریفوں کی مانند بس ایک قسم کا "نظریہ" بن کر رہ گیا۔ جو اپنے افراد کو نظریاتی بحثیں تو دیتا ہے مگر ان کے اندرون کو نہیں جگاتا، ان کے اندر نفسیاتی وابستگی پیدا نہیں کرتا، وہ ان کو قربت الٰہی کی حقیقت سے آشنا نہیں کرتا، جو اس دنیا میں کسی بندۂ خدا کا سب سے بڑا حاصل ہو۔

اس تشریح کا نقصان یہیں نہیں رکتا، بلکہ اور آگے بڑھ کر وہ ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے جہاں نہ حقیقت باقی رہتی ہے اور نہ نظریہ۔ حقیقت سے ہٹ کر کسی چیز کی جو تشریح کی جائے وہ صرف ایک لفظی مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ کبھی انسان کی فطرت میں جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دین کی زیر بحث تشریح کو جو لوگ اپناتے ہیں وہ ابتداءً تو ان کی زندگی میں کچھ جوش وخروش دکھاتی ہے۔ مگر وہ کسی گہرے عمل کا محرک نہیں بنتی۔ اور بالآخر ایک بے جان نظریے کی طرح اس کی ذہنی سطح پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ آدمی اس کے بعد بھی دیندار رہتا ہے، مگر اب اسکی دینداری اسکے فکری سرچشمہ سے نکلی ہوئی دینداری نہیں ہوتی، بلکہ محض ان پیدائشی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جو اتفاق سے اسکے اندر پہلے سے موجود تھے اور فکری تعلق ٹوٹنے کے بعد اس کا سہارا بن گئے۔ اس دینداری کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی پتی اپنی جڑ چھوٹنے کے بعد نیچے کی شاخوں میں اٹک کر رہ گئی ہو۔ بظاہر وہ درخت پر ہے، مگر حقیقۃً وہ اس سے الگ ہو چکی ہے۔ اب اس کا کوئی وجود نہیں۔ حقیقت سے انحراف آدمی کو صرف حقیقت سے محروم نہیں کرتا۔ بلکہ اس دوسری چیز سے بھی محروم کر دیتا ہے جس کے لئے اس نے حقیقت کو چھوڑا تھا۔ کیونکہ اس کائنات میں ایک ہی سرچشمہ ہے جس سے تمام چیزیں نکلتی ہیں۔ اس سے تعلق ٹوٹنے کے بعد کسی بھی چیز کا کوئی وجود نہیں۔

۶۔ آج کل جماعت اسلامی ہند کے رہنما بظاہر ملی معاملات میں کافی پیش پیش نظر آ رہے ہیں۔ تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت، مسلم کنونشن کی تجاویز، فسادات کے موقع پر ریلیف کا کام، مسلمانوں کا انگریزی اخبار نکالنے کی کوشش، ملکی اور عالمی مسائل پر بیانات وغیرہ۔

مگر یہ حقیقتہً کسی فکری سرچشمہ سے نکلی ہوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سرگرمیوں میں وہ حقیقی روح نہیں پائی جاتی جو خدمت دین کے کاموں میں فی الواقع ہونی چاہیئے۔

• جماعت اسلامی کی تاریخ میں یہ نیا رجحان پیدا ہونے کی پہلی اور خاص وجہ یہ ہے کہ جماعت کا جو فکر ہے اسکے مطابق اس کا ذہن قدرتی طور پر "سیاسی" قسم کے کام تلاش کرتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے مخصوص حالات کی بنا پر وہاں کی جماعت کو ایسے کام مل گئے اور وہ اسکے سہارے کھڑی ہوگئی۔ مگر ہندستان کے حالات مختلف تھے۔ اس لئے یہاں ایسا کوئی کام نکل نہ سکا۔ یہ چیز ہندستان میں تحریک کے افراد کو جمود اور سرد مہری میں مبتلا کر رہی تھی۔ پہلے اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے "تعمیر ذہن اور تزکیہ قلب" کی مہم شروع کی گئی اور جماعت کی پالیسی میں طے کیا گیا کہ داخلی تربیت کے محاذ پر "ہماری سب سے زیادہ قوت اصولاً تو صرف ہونی ہی چاہیئے، لیکن جماعت کے موجودہ حالات نے اسکی اہمیت اور زیادہ بڑھا دی ہے" چنانچہ "تحریک اور جماعت سے تعلق رکھنے والے مسائل" کی تین تقسیموں میں سے داخلی مسائل پر سب سے زیادہ یعنی "عام حالات میں بحیثیت مجموعی کم از کم نصف قوت" صرف کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور سارے ملک میں ایک مقررہ پروگرام کے مطابق تربیت و تزکیہ کا کام شروع ہوگیا، مگر تھوڑے ہی دنوں کے تجربہ کے بعد محسوس ہونے لگا کہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ افراد جماعت کے جس داخلی زوال کو روکنے کے لئے اسے شروع کیا گیا تھا، اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اس دوران میں جماعت کے اندر بہت سے لوگ شدت سے یہ بات پیش کر رہے تھے کہ جماعت نے تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ خانقاہی تربیت کا طریقہ ہے۔ اس سے جماعت کے اندر کوئی زندگی پیدا ہونے والی نہیں ہے۔ یہ شیر کو گھاس کھلا کر موٹا کرنے کی کوشش ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جماعت کے اندر زندگی پیدا کرنے کی صحیح صورت یہ ہے کہ انقلابی انداز میں کوئی عملی پروگرام بنایا جائے۔ یہ ایک انقلابی جماعت ہے اس لئے انقلابی پروگرام ہی سے اسے غذا مل سکتی ہے۔ پہلے فکری ناکامی کے اندر سے یہ دوسرا فکر وعیہ کر

دھیرے ابھر رہا تھا۔ جماعت کے بعض رہنما جو اس فکر سے کچھ زیادہ متفق نہیں ہیں۔ مگر حالات نے انھیں جس "رعیت" کا راعی بنایا ہے، اسکے مخصوص ذہن کے پیش نظر انھیں بھی کوئی دوسری تدبیر نظر نہیں آئی۔ بالآخر اس چیز نے جماعت کو عملی اور ہنگامی کاموں کی طرف موڑ دیا۔ ملک کی عمومی سیاست میں تو اسکے لئے اس طرح کے کام کا موقع نہیں تھا۔ البتہ مسلم سیاست کے میدان میں جماعت نے کچھ ایسے "عملی کام" ڈھونڈ لئے ہیں جن کے سہارے تحریک کے افراد کو زندہ رکھا جا سکے۔

چنانچہ جو کام سابق تربیتی پروگراموں سے نہ ہوسکا تھا وہ اب کچھ ہوتا ہوا نظر آنے لگا ہے، جب سے اس قسم کے مخصوص "عملی کام" شروع ہوئے ہیں، جماعت کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے، اسکے رہنماؤں میں بھی ایک نیا اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اس نئی زندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جماعت کے افراد کے تعلق باللہ میں اضافہ ہو رہا ہے ان کی نمازیں پہلے کے مقابلے میں بہتر ہونے لگی ہیں، وہ اپنے رب کی طرف زیادہ راغب ہو گئے ہیں، بلکہ یہ صرف ایک تحریکی زندگی ہے اور اسی لئے لازمی طور پر وقتی بھی ــــ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس سستے نسخہ کو پاکر جو رہنما آج خوش ہو رہے ہیں، ان کو زیادہ دیر تک خوشی منانے کا موقع نہیں ملے گا۔ حالات کا ایک ذرا سا پلٹا اس سارے گھروندے کو الٹ کر رکھ دے گا اور اس وقت وہ دیکھیں گے کہ جس داخلی زوال کو انھوں نے عارضی پردوں میں چھپا دیا تھا، وہ پہلے سے زیادہ بھیانک شکل میں اسکے پیچھے موجود ہے۔

ایک شبہ

بعض لوگ کہیں گے کہ ہمارا مقصد تو پورے کے پورے دین کو قائم کرنا ہے، پھر ہم پر یہ اعتراض کیسے وارد ہو سکتا ہے کہ ہماری تشریح میں دین کا کوئی پہلو مجروح ہو گیا ہے۔ مگر بہت سی چیزوں کا درج فہرست ہونا بجائے خود اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے، کیونکہ بہت سی چیزوں کے درج فہرست ہونے کے اور بھی اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی آدمی محض استدلال کے طور پر ایسا کرتا ہے، کبھی تاریخی اور روایتی اثرات کے تحت بہت سی چیزیں اسکی فہرست میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے محض اس قسم کی فہرست کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دیکھنا ہوگا کہ کسی چیز کو جو اہمیت ملنی چاہیئے، اسکی فکر نے اس کو وہ اہمیت دی ہے یا نہیں۔[1]

زیر بحث تعبیر کو دیکھئے تو بظاہر اس میں انقلاب عالم سے لے کر انقلاب نفس تک سب کچھ لکھا ہوا ملے گا۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ "انقلاب عالم" کے مسئلہ پر تو پورا زور صرف ہو رہا ہے اور انقلاب نفس کا مسئلہ صرف واجبی فرائض کی حد تک قابل توجہ بنا ہے تو اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مکمل نہیت کی حقیقت کیا ہے۔

اس سلسلے میں چند مثالیں لیجئے :-

۱۔ ایک شخص جب "اسلامی انقلاب" کے عنوان پر بولتا ہے تو نہایت آسانی سے اسکی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اس کام کی انجام دہی کے لئے محض قانونی تعمیل کافی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "آپکے اوپر خدا کے جو حقوق ہیں ان کی کم سے کم حد تو خدا اور رسول نے مقرر کر دی ہے مگر زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔" آپ کو چاہیئے کہ آگے بڑھنے کی اسپرٹ کے ساتھ اس کام میں حصہ لیں۔ یہ ایک عظیم مقصد ہے جس کے لئے آپ کو "فرض اور مطالبے سے زائد" کام کرنا ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ "خدا کے کام کو اپنے ذاتی کاموں پر ترجیح دیں۔" اور "مالی اور جسمانی قربانی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں۔" وہ کہتا ہے کہ اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے "اپنے ان سب شاغل اور دلچسپیوں کو ختم کر دیجئے جن کے اندر آپ کے وقت اور فکر کا کوئی حصہ اس کام سے ہٹ کر صرف ہوتا ہو اور ناگزیر معاشی ضروریات کے سوا اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اس کام کے لئے وقف کر دیجئے۔"

لیکن اگلے روز جب ایک شخص داعی کے لئے سادہ زندگی کی ضرورت پر زور دیتا ہے تو وہ اس گزارش کو "نمائش فقر کا مطالبہ" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے :-

"میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ صحابۂ کرام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی زندگی میں مصنوعی درویشی پیدا کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، اور نہ محض اس غرض سے اپنے لباس، مکان اور خوراک کا معیار کمتر رکھا کہ دیکھنے والے ان کی فقیرانہ شان دیکھ کر داد دیں۔ وہ سب بالکل ایک فطری سادہ اور معتدل زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جس اصول کے پابند تھے وہ صرف یہ تھا کہ شریعت کے ممنوعات سے پرہیز کریں، مباحات کے دائرے میں زندگی کو محدود

رکھیں، رزق حلال حاصل کریں، اور راہِ خدا کی جدوجہد میں بہرحال ثابت قدم رہیں۔ خواہ اس میں فقر و فاقہ پیش آئے یا اللہ کسی وقت اپنی نعمتوں سے نواز دے۔ جان بوجھ کر بُرا پہننا جب کہ اچھا پہننے کو جائز طریق سے مل سکے، اور جان بوجھ کر برا کھانا، جب کہ اچھی غذا حلال طریقے سے بہم پہنچ سکے۔ ان کا مسلک تھا ان میں جن بزرگوں کو راہِ خدا میں جدوجہد کرنے کے ساتھ حلال روزی فراخی کے ساتھ مل جاتی تھی، وہ اچھا کھاتے بھی تھے، اچھا پہنتے بھی تھے۔ اور پختہ مکانوں میں رہتے بھی تھے، خوش حال آدمیوں کا ..... بدحال بن کر رہنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ آپ نے خود ان کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کا اثر تمہارے لباس اور کھانے اور سواری میں دیکھنا پسند فرماتا ہے"

دیکھئے، "جہادِ اصغر" میں اپنا پورا حصّہ ادا کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس ہوئی تھی اسکی ضرورت "جہادِ اکبر" کے وقت یاد نہ رہی۔ راہِ خدا کی وہ جہد و جہد جو سیاست کے میدان میں ہوتی ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوا تھا کہ آدمی ممنوعات و مباحات کے قانونی دائرے سے نکل کر قربانی کی روش اختیار کرے۔ مگر راہِ خدا کی وہ جدوجہد جو نفس کے میدان میں ہوتی ہے وہاں صرف ممنوعات سے پرہیز کافی نظر آیا۔ اصلاحِ زمین کی مہم میں جو چیز اتنی ضروری تھی وہ اصلاحِ ذات کی مہم میں غیر ضروری ہو گئی۔ پہلی صورت میں ناگزیر معاشی ضرورتوں کے سوا کچھ اور ملنے کی امید نظر نہیں آتی تھی مگر دوسری صورت میں دنیا کی خوشحالی بھی پوری فراخی کے ساتھ حاصل ہو گئی۔ حتیٰ کہ اس نقطۂ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بالکل غلط طور پر آپ نے خدا کے رسول کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسولِ خدا نے "جان بوجھ کر" اپنے لئے سادہ اور خشک زندگی کو پسند فرمایا۔ یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ اس پر دلیل پیش کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم میں ایک مختصر سا حوالہ ذیل پر نقل کرتا ہوں۔

کان صلی اللہ علیہ وسلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم قدرت رکھنے کے

ازهد الناس فی الدنیا مع القدرة علیها	باوجود تمام لوگوں میں سب سے زیادہ دنیا کی چیزوں سے پرہیز کرنے والے تھے۔

(ابن کثیر تفسیر سورۂ نساء ص۳۵۱)

۲۔ مکی زندگی میں صحابۂ کرام کو جن بے پناہ مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ایک شخص کہتا ہے کہ "ان کا آنا ضروری تھا" کیونکہ اسکے بغیر مقصد سے وہ تعلق پیدا نہیں ہو سکتا تھا جو ایک سچے مومن کے اندر ہونا چاہیئے۔ اسلام کے لئے تکلیفیں سہنے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ" ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لئے اٹھتا ہے اور اسکی راہ میں کش مکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار و قید فاقہ و جلاوطنی، وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اسکی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

مگر انھیں بزرگ سے جب یہ کہا جائے کہ دنیا کی زندگی میں مومن کو آرام نہیں ڈھونڈنا چاہئیے، کیونکہ اس سے آخرت کا احساس کمزور پڑ جاتا ہے، تو وہ فرمائیں گے :-

"شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا کی نعمتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو خدا کا کام کرنے کے بجائے اپنا کام کرتے رہیں۔ رہے خدا کا کام کرنے والے تو وہ خدا کی کسی نعمت کے مستحق نہیں ہیں۔ یا پھر تمھارے دماغ پر راہبوں اور سنیاسیوں کی زندگی کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اور تم دینداری کے ساتھ رہبانیت کو لازم و ملزوم سمجھتے ہو اس لئے کھاتا پیتا دیندار تم کو ایک اعجوبہ نظر آتا ہے۔"

دیکھیے، یہ بات کہ کسی چیز کی تڑپ کسی ایسے ہی شخص کے دل میں جگہ پا سکتی ہے جس نے اسکے لئے تکلیفیں سہی ہوں۔ یہ سیاسی اور انقلابی پہلو سے تو آپ کی سمجھ میں آ گئی، مگر یہی بات اس پہلو سے آپ کی سمجھ میں نہیں آئی کہ آخرت کی تڑپ سے وہی دل آشنا ہو سکتا ہے جس نے

آخرت کے لئے دنیا کی لذتوں کو قربان کیا ہو۔ انقلابی فکر کو اپنے اوپر طاری کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انقلاب کے لئے سختیاں برداشت کی جائیں، مگر طلب آخرت کو اپنے اوپر طاری کرنے کے لئے اسکی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ آخرت کی خاطر آدمی ایسے مرحلوں سے گزرے جبکہ اسکے لئے اس نے مشقتیں اٹھائی ہوں۔ دنیوی مقصود کے متعلق جو چیز اتنی اہم تھی، اخروی مقصود کے سلسلے میں وہی چیز آپکے لئے مضحکہ کا موضوع بن کر رہ گئی۔

۳۔ ایک شخص کی سیاسی قوت شامہ تو اتنی تیز ہے کہ وہ "غیر الٰہی نظام حکومت" کے تحت کوئی بھی ملازمت حاصل کرنے کو "حرام" قرار دیتا ہے اور یہاں تک فتویٰ دیتا ہے کہ "غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جزو اور دوسرے جزو میں کوئی فرق نہیں۔ اسکے جو اجزا، بظاہر معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جس قدر دوسرے غیر معصوم اجزاء"

مگر دنیوی ساز و سامان برتنے کے بارے میں وہ اپنی حیات کا حسب ذیل مظاہرہ کرتا ہے:-

"میرے نزدیک ہر وہ جائز سہولت جو آدمی کو دین کا کام بہتر اور زیادہ مقدار میں انجام دینے کے قابل بنائے، نہ صرف جائز ہے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا افضل ہے۔ آپ خود غور کریں کہ ایک شخص اگر سکنڈ کلاس میں آرام سے سفر کرکے دوسرے دن اپنی منزل مقصود پر پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر سکتا ہو تو وہ کیوں تھرڈ کلاس میں رات بھر کی بے آرامی مول لے اور دوسرا دن کام میں صرف کرنے کے بجائے تکان دور کرنے میں صرف کرے۔ اگر وہ گرمی میں بجلی کا پنکھا استعمال کرکے زیادہ دماغی کام کر سکتا ہو تو وہ کیوں پسینے میں شرابور ہو کر اپنی قوت کار کا بڑا حصہ ضائع کرے۔ کیا ان سہولتوں کو وہ اسی لئے چھوڑ دے کہ خدا کی یہ نعمتیں صرف شیطان کا کام کرنے والوں کے لئے ہیں، خدا کا کام کرنے والوں کے لئے نہیں ہیں۔"

دیکھئے، وہی شخص جس کو مخالف سیاسی نظام میں سہولتیں حاصل کرنا اس قدر شدت سے کھٹک رہا تھا، دنیا کے اندر سہولتیں ڈھونڈنے کے سلسلے میں اسکی حس کند ہو گئی، حالانکہ غیر اسلامی نظام حکومت میں ملازمت اگر باطل سیاست کے ساتھ تعاون ہے، تو دنیا کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا اپنے نفس کے ساتھ تعاون ہے۔ وہ دلیل دیتا ہے کہ یہ سہولتیں

آدمی کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ دین کا کام زیادہ مقدار میں اور زیادہ بہتر طور پر کر سکے، حالانکہ خدا کے دین کا کام بہتر اور زیادہ مقدار میں انجام دینے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ دل کی تڑپ ہے اور دل کی تڑپ اسی وقت رخصت ہونے لگتی ہے جب اس کو سہولتوں کے غلاف میں لپیٹ دیا جائے۔ دنیا کی نعمتیں بے شک جائز ہیں مگر ان سے بے دریغ فائدہ اٹھانا اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈالنا ہے کہ آدمی کے نازک احساسات مردہ ہو جائیں اور آخرت طلبی کی اعلیٰ کیفیات سے خالی ہو کر وہ محض اسلام کا ایک ریکارڈ بن جائے، جو خارج سے ملی ہوئی کچھ آوازوں کو فضا میں نشر کر دیتا ہے۔ بظاہر وہ اسلامی علوم پر کام کرے مگر اس کا یہ کام بس ایک قسم کا ذہنی موضوع ہو جس طرح بہت سے مستشرق کسی قلبی وابستگی کے بغیر بیرونی موضوعات پر اپنا زور قلم صرف کرتے رہتے ہیں۔

اس طرح کی کتنی ہی مثالیں ہیں جو ہمارے گرد و پیش بکھری ہوئی ہیں۔ اگر آدمی نظر رکھتا ہو تو وہ دیکھے گا کہ پانے والوں نے کیا پایا ہے اور وہ کیا چیز ہے جس سے وہ ابھی تک محروم ہیں۔ ان صریح واقعات کے باوجود اگر آپ یقین دلائیں کہ میں نے دین میں کوئی کمی بیشی نہیں کی ہے میں تو اس کو اعلیٰ ترین شکل میں پورا کا پورا قائم کرنا چاہتا ہوں، تو میرے نزدیک اس یقین دہانی کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک مسلمان جو من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ کا مطلب یہ سمجھ لے کہ کلمہ گو کے لئے جنت لازمی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اسلام کے احکام کا انکار کرے، مگر یہ یقینی ہے کہ اس کے ذہن میں ان احکام پر عمل کی بنیاد کمزور پڑ جائے گی۔

حرمین شریفین کی حاضری

بعض واقعات و تأثرات

[اس سلسلہ کے شروع ہی میں لکھا جا چکا ہے کہ اس کا مقصد رو داد سفر کا بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس سفر کے صرف ان واقعات و تأثرات کا ذکر کرنا مقصود ہے جن میں کوئی خاص افادیت کا پہلو ہے اسی لئے ذکر و بیان میں ترتیب کا لحاظ و اہتمام بھی ضروری نہیں سمجھا گیا ہے۔]

(۲)

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے ہم لوگ ۲۰ اپریل اتوار کے دن بارہ بجے کے قریب مکہ معظمہ پہنچے تھے۔ اس دن وہاں جنتری کے حساب سے ذی الحجہ کی ۵ تاریخ تھی یعنی جنتری میں ذیقعدہ کو ۲۹ کا مہینہ قرار دیکر یکم ذی الحجہ ۲۴ اپریل چہار شنبہ کو مانی گئی تھی اور اس حساب سے حج یعنی وقوف عرفہ جمعرات کو ہونے والا تھا ـــــــــ ۳۰ اپریل سہ شنبہ کے دن افواہا سنا کہ حکومت کے محکمۂ شرعیہ کے نزدیک ۲۹ کی رؤیت ثابت نہیں ہوئی اس لئے ذی الحجہ کی پہلی تاریخ جمعرات (۲۵ اپریل) کو قرار دی گئی اور اس حساب سے یوم العرفہ یعنی حج جمعہ کو ہوگا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا یہ بات اُس دن صرف افواہاً سنی تھی لیکن بعد نماز مغرب حرم شریف میں حکومت سعودیہ کے مفتی اعظم کے اس فیصلہ کا لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا گیا کہ ۲۹ کی رؤیت ثابت نہیں ہوئی اس لئے یکم ذی الحجہ جمعرات کی قرار پائی ہے اور اس بنا پر وقوف عرفہ جمعہ کو ہوگا ـــــــ حج اگر اتفاق سے جمعہ کے دن پڑ جائے تو نورٌ علی نور، حج کی خاص برکات کے ساتھ جمعہ کی

رکعتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں ۱۰ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج مبارک بھی جو حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے جمعہ ہی کو ہوا تھا، عوام ایسے حج کو "حج اکبر" کہتے ہیں اور قدرتی طور پر اس کی بڑی خوشی ہوتی ہے، چنانچہ حرم شریف میں جب بعد مغرب لاؤڈ اسپیکر سے یہ اعلان سنایا گیا تو تمام حجاج میں خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بعض ملکوں کے حاجیوں نے جو غالباً خوشی کے ایسے موقعوں پر تالیاں بجانے کے عادی ہوں گے۔ اس اعلان پر حرم شریف ہی میں جوش و خروش سے تالیاں بجائیں جس پر اعلان کرنے والے صاحب کو تنبیہ کرنی پڑی کہ یہ طریقہ غلط ہے اور یہ بات حرم شریف کے ادب کے خلاف ہے۔

ہم لوگ حج سے صرف چار پانچ ہی دن پہلے مکہ معظمہ پہنچے تھے، یہ دن وہاں سخت اژدحام کے ہوتے ہیں بیرونی حجاج کی تو پوری تعداد آ چکی ہوتی ہے اور ملکی حجاج بھی خاصی تعداد میں آ جاتے ہیں۔ اس سال صرف بیرونی ممالک کے حجاج کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی۔ مقامی یعنی نجد و حجاز کے حجاج ان کے علاوہ تھے اس لئے ان دنوں حرم شریف ہر وقت بھرا رہتا تھا، عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ نماز ظہر سے تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اور اسی طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد چونکہ سخت گرمی اور آفتاب کی تمازت کا خاص وقت ہوتا ہے اور ایسے ہی آدھی رات کے قریب جب آدمی عام طور سے آرام ہی کرنا چاہتے ہیں۔ ان دو وقتوں میں طواف کرنے والوں کا مجمع ہمیشہ نسبتہً ہلکا ہو جاتا ہے اور حجر اسود تک پہنچنا بھی کسی درجہ میں ممکن ہوتا ہے، لیکن اس سال حجاج کی تعداد کی غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے ان دونوں وقتوں میں بھی طواف کرنے والوں کا مجمع کبھی ہلکا نہیں دیکھا گیا، بلکہ حج کے تقریباً ایک ہفتہ بعد تک جب تک کہ ہم لوگوں کا قیام مکہ معظمہ میں رہا قریب قریب یہی حال رہا اور ہم حجر اسود تک پہنچکر استلام کی سعادت حاصل نہیں کر سکے، بلکہ اگر کسی وقت نماز کے لئے کافی وقت پہلے پہنچنا نہیں ہو سکا تو باہر کی صفوں میں کہیں دور دراز کھڑے ہو کر نماز ادا کرنی پڑی۔ حالانکہ حرم شریف میں جو توسیع اب تک ہو چکی ہے اسکی وجہ سے بیک وقت دو لاکھ سے زیادہ نمازی اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں ــــــ مادیت اور نفسانفسی و خود فراموشی کے اس دور میں بحری، بری اور فضائی راستوں سے آنے والے حجاج کی اتنی بڑی تعداد کا

مکہ معظمہ پہنچا بس اللہ کی قدرت کی نشانی اور بیت اللہ شریف کی کشش ہے۔

اگرچہ دین اور اعمال دین کی حقیقت اور روح سے امت بہت خالی اور محروم ہو چکی ہے بلکہ اسکی اکثریت کے پاس اب دین کا ظاہری ڈھانچہ بھی بہت ہی ٹوٹا پھوٹا بلکہ برائے نام ہی رہ گیا ہے اور مختلف ممالک سے حج کو آنیوالوں کی اکثریت کا حال عموماً یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسکے باوجود حرم شریف میں نماز و طواف، ذکر و تسبیح، دعا و استغفار اور اللہ کے حضور میں گریہ وزاری کی ایسی اجتماعی فضا قائم ہو جاتی جس کو دیکھ کر اللہ کی بے شمار رحمتوں اور برکتوں کے نزول کا یقین ہوتا ہے خاص کر نمازوں کے اوقات میں اور بالخصوص مغرب، عشاء اور فجر کے اوقات میں جب مُطاف اور حرم شریف کا کھلا صحن بھی نمازیوں سے بھرپور ہوتا ہے اس وقت کا منظر بس دیدنی ہوتا ہے، پہلے اس منظر کو صرف چند خوش نصیب دیکھ سکتے تھے جن کو مصلائے حنفی پر (جو اب ختم ہو چکا ہے) یا زمزم شریف کے اوپر مصلائے شافعی پر جگہ مل جاتی تھی، لیکن اب حرم شریف کی نئی عمارت کی دوسری اور تیسری منزل پر نماز پڑھنے والے ہزاروں آدمی بیک وقت اس روح پرور نظارہ کو دیکھ سکتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔

اس اجتماعی نظارہ میں جتنا خیر نظر آتا ہے اور اس سے ...... روح ایمانی کو جتنی مسرت ہوتی ہے افسوس ہے کہ افراد کے انفرادی تجربوں سے اتنی ہی کوفت بھی ہوتی ہے ان تجربوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لاکھوں آنے والوں میں بہت بڑی تعداد بلکہ انکی غالب اکثریت دین کی ابتدائی درجہ کی تربیت سے بھی محروم ہے، سب سے زیادہ تکلیف دہ منظر حجر اسود پر کشمکش کا ہوتا ہے۔ بلاشبہ حجاج میں بڑی تعداد تو انھیں بندگان خدا کی ہوتی ہے جو ادب و احترام کے پیش نظر یا اپنے طبعی اور جسمانی ضعف کی وجہ سے اس کشمکش سے اپنے کو دور رکھتے ہیں بلکہ اس حالت میں وہ حجر اسود تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور حسرت کے ساتھ دور ہی سے استلام پر قناعت کرتے ہیں لیکن بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوتی ہے جو ادب و احترام اور اخلاق کے تقاضوں کو بالکل پس پشت ڈال کر حجر اسود کو چومنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس حالت میں اللہ کے بندے

کو ایذا پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں اور اس کے حضور میں یہ انکی بہت ہی بڑی بے ادبی ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسے لوگ حج کر کے ثواب زیادہ کماتے ہیں یا اس بے ادبی کی وجہ سے اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ زیادہ کرتے ہیں ــــــ کاش ہر ملک میں دینی فکر رکھنے والے مسلمان اس کا کوئی اہتمام اور بندوبست کریں کہ حج کو جانے والوں کی کم از کم اتنی دینی تربیت ہو جایا کرے کہ وہاں پہنچکر وہ ایسی حرکتیں تو نہ کریں جو غضب الٰہی کو بھڑکانے والی ہوں ــــــ بس اللہ تعالیٰ کا حلم ہے اور اسکی رحمت و رافت ہے کہ عین اس کے دربار میں اور ٹھیک اس حجر اسود پر جس کو حدیث میں "یمین اللہ" (گویا اللہ تعالیٰ کا مقدس ہاتھ) کہا گیا ہے لوگ ایسی بے ادبی کی حرکتیں کرتے ہیں اور اُن پر آسمان پھٹ نہیں پڑتا۔

افسوس ہے کہ معلّم حضرات جن کی یہ سب سے بڑی ذمہ داری تھی کہ حج کے بارہ میں لوگوں کی صحیح رہنمائی کریں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ــــــ ہمارے نزدیک سعودی حکومت کی وزارت حج کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اس نقطۂ نظر سے معلمین کے لئے ایک چند روزہ تعلیمی اور تربیتی کورس لازم کر کے اس کا بندوبست کرے اور جہالت و ناتربیتی کی وجہ سے حجاج سے جو موٹی موٹی غلطیاں ہوتی ہیں ان کے متعلق ایک واضح ہدایت نامہ معلمین کو دیا جائے اور ان کے ذمہ کیا جائے کہ وہ اپنے ہر حاجی کو وہ باتیں برابر بتاتے رہیں، یہ انتظام اگرچہ اصلاحِ حال کے لئے کافی تو قطعاً نہیں ہوگا لیکن امید ہے کہ اس قبیل کی برائیوں میں اس سے بہت کچھ کمی انشاء اللہ ہو جائے گی۔

ہمیں معلوم ہے کہ وزارتِ حج خود بھی اس کے لئے فکر مند ہے کہ طواف میں حجر اسود پہ اور منیٰ میں رمیٔ جمرات کے موقع پر جو کشمکش ہوتی ہے اور جو بے عنوانیاں لوگوں سے سرزد ہوتی ہیں اس پر کسی طرح قابو پایا جائے، نیز اس سلسلہ میں جو مختلف تجاویز اس کے سامنے ہیں وہ بھی کچھ ہمارے علم میں ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس نقطۂ نظر سے معلمین کی تعلیم و تربیت اور ان کے ذریعہ اس برائی کو روکنے کی کوشش کرنا بہر حال ضروری ہے ــــــ سعودی حکومت حجاج کے آرام و آسائش وغیرہ کے جو انتظامات کر رہی ہے بلاشبہ وہ اس کی

بڑی نیکی ہے لیکن ان کی کم از کم اتنی دینی تربیت کا بندوبست کہ وہ حرم شریف کی عظمت اور اس کے ادب و احترام کے تقاضوں کو سمجھیں اور جہالت اور اُجڈ پن سے اللہ کے قہر و غضب کو بھڑکانی والی حرکتیں نہ کریں ان سب سے مقدم اور اہم ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حجاج سے جو بے عنوانیاں ہوتی ہیں جن میں سے بعض بہت ہی سنگین بلکہ حج کی روح کے لئے زہر ہلاہل بھی ہوتی ہیں ان کا اصل سبب دینی تعلیم و تربیت سے انکی محرومی ہے اس لئے ان کا اصل علاج یہی ہے کہ انکی دینی تعلیم و تربیت کا کوئی بند و بست ہو۔ ہندوستان میں "تبلیغ" کے نام سے جو جدوجہد جاری ہے اس کا ایک خاص شعبہ عازمین حج پر دینی محنت بھی ہے۔ جب حج کا زمانہ قریب آتا ہے تو چلتی پھرتی "تبلیغی جماعتیں" اس کی کوشش کرتی ہیں کہ جن خوش نصیبوں کا اس سال حج کو جانے کا ارادہ ہو ان سے ان کا رابطہ قائم ہو اور وہ کچھ وقت دینی تربیت حاصل کرنے کے لئے صرف کریں۔ لیکن اول تو عازمین حج کی بہت تھوڑی تعداد سے ان کا رابطہ قائم ہو سکتا ہے اور ان میں سے بھی مشکل سے دس پانچ فی صدی انکی بات کچھ ماننے پر آمادہ ہوتے ہیں ...... پھر کچھ جماعتیں اسی مقصد کے لئے حج کے زمانہ میں بمبئی بھی قیام کرتی ہیں اور ان کا کام وہاں یہی ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بمبئی آنے والے عازمین حج کے ذہنوں کو دین آشنا بنائیں۔ لیکن وہاں بھی بہت کم حجاج ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اپنے معمولی معمولی انتظامات کی فکر سب پر سوار ہوتی ہے لیکن اپنے کو دین آشنا اور حج کے قابل بنانے کی فکر سے اکثر و بیشتر بالکل خالی ہوتے ہیں، پھر یہ جماعتیں اپنے امکان کی حد تک اس کا بھی انتظام کرتی ہیں کہ ہر جہاز میں اس دینی محنت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہے۔ پھر مکہ معظمہ کا تبلیغی مرکز ہندوستان و پاکستان سے آنے والے تبلیغی رفقاء کے تعاون سے وہاں بھی اس کام کا سلسلہ جاری رکھتا ہے، حجاج کی قیام گاہوں پر گشت ہوتے ہیں، روزانہ حرم شریف میں حجاج کے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تبلیغی اور تعلیمی و تربیتی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ منیٰ اور عرفات میں بھی جماعتیں گشت کر کے تعلیمی اور تربیتی حلقے قائم کرتی ہیں اور حجاج کو ذکر و دعا کی طرف توجہ دلاتی ہیں اسکے علاوہ مختلف ممالک سے

آنے والے حجاج کے عام و خاص اجتماعات بھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اس مقصد سے کئے جاتے ہیں۔ اس سال اس سلسلہ کے بعض اجتماعات میں شرکت اور کچھ کہنے سننے کی سعادت بھی نصیب ہوئی جس سے خود اپنے کو بھی الحمدللہ نفع ہوا اور دوسروں پر بھی بہت مبارک اثرات دیکھے۔

تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ نا تربیت یافتہ عوام میں سے بھی جو لوگ اس دینی محنت اور اس تعلیمی و تربیتی نظام سے وہاں کچھ جڑتے ہیں اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق ان کو ضرور نفع ہوتا ہے، ان کے اوقات وہاں اچھے گزرتے ہیں اور ان کا عام رویہ ادب و احترام اور تواضع و خشیت کا رہتا ہے، اگر یہی کام تمام ملکوں میں وسیع پیمانہ پر اور نظم و سلیقہ کے ساتھ ہونے لگے تو نہ صرف حجاج بلکہ پوری امت مسلمہ کی دینی اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے وما ھو علی اللّٰہ بعزیز۔

۴ رمئی (پنجشنبہ) کو ۸ ذی الحجہ تھی۔ دستور کے مطابق صبح اشراق کے بعد ہم لوگوں نے حج کا احرام باندھا اور منیٰ کے لئے روانہ ہو گئے، اس سے پہلے ۱۳۴۹ھ اور ۱۳۸۲ھ میں جب حاضری نصیب ہوئی تھی تو مکہ سے منیٰ تک دونوں دفعہ پیدل جانا ہوا تھا لیکن اللہ کی مشیت کہ اس دفعہ ایک دن پہلے ۷ ذی الحجہ کو طبیعت کچھ خراب ہو گئی اور مولانا علی میاں کی رفاقت کی وجہ سے کار کی خاص سہولت بھی میسر تھی اس لئے اس مرتبہ کار ہی سے منیٰ تک جانا ہوا۔ میرے قانونی معلم تو ہمارے لکھنؤ ہی کے مولوی عبدالهادی سکندر صاحب تھے اور اس لئے رواج کے مطابق منیٰ اور عرفات میں مجھے ان ہی کے ساتھ قیام کرنا چاہئے تھا لیکن چونکہ مولانا علی میاں نے ایک دوسرے معروف معلم سید مکی مرزوقی صاحب کے ساتھ (جو مکہ کے اعیان میں سے ہیں اور حکومت سعودیہ کے عہدہ دار غالباً رجسٹرار ہیں) قیام کا فیصلہ کیا تھا اور مولانا عبداللہ عباس ندوی اور مکہ معظمہ کے شیخ تبلیغ مولانا سعید احمد خاں صاحب اور دارشد صاحب وغیرہ اکثر تبلیغی احباب کا قیام بھی سید مکی مرزوقی صاحب کے ساتھ ہی طے تھا اس لئے اس عاجز نے بھی ان ہی حضرات کے ساتھ قیام کا فیصلہ کیا۔

منیٰ مکہ معظمہ سے تقریباً ساڑھے تین میل ہے، ۸ ذی الحجہ کی صبح کو تمام حجاج کو وہاں جانا ہوتا ہے، پیدل جانے والے بھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر کاروں، اور لاریوں، اور بسوں ہی سے جاتے ہیں اس لئے ان لاکھوں حاجیوں کو منیٰ لے جانے والی ہزاروں ہزار کاریں اور بسیں ہوتی ہیں حج کے انھیں ۴،۵ دنوں کے لئے حکومت نے منیٰ تک ۸-۱۰ سڑکیں بنائی ہیں جن میں سے بعض پہاڑ توڑ کر بنانی پڑی ہیں۔ ٹریفک کے کنٹرول کا انتظام بھی معقول ہے، اسکے باوجود کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مکہ معظمہ سے منیٰ تک موٹروں کی مسلسل قطاریں ہوتی ہیں اسلئے یہ تھوڑا سا راستہ گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔

منیٰ پہنچ کر ہم لوگ اس احاطہ میں پہنچ گئے جہاں سید مکی مرزوقی صاحب کے حجاج کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ موصوف نے رفیق محترم مولانا علی میاں اور انکے ساتھیوں کے لئے ایک مستقل خیمہ کا انتظام فرمایا تھا۔

منیٰ میں مسجد خیف بہت طویل و عریض قدیم مسجد ہے، اسکے دیکھا تو وہ بالکل نئی بنی ہوئی ہے اور سایہ کا انتظام بھی پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا ہے لیکن آج یعنی ۸ ذی الحجہ کو حکومت کی طرف سے مسجد خیف میں اذان و نماز کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے وہاں متفرق جماعتیں ہو رہی تھیں اور ایک بدنما انتشار کی سی کیفیت تھی۔

میری طبیعت چونکہ کچھ خراب تھی اور گرمی اور تکان کی وجہ سے اس دن حرارت زیادہ ہو گئی تھی اور مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ خیمے بعد مغرب اکھاڑ کے آج ہی رات میں عرفات بھیج دئے جائیں گے اور آج کی رات بغیر خیمہ کے آسمان کے نیچے گزرے گی اس لئے میں نے مسجد خیف ہی میں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور مغرب کے بعد وہیں رہ گیا۔ الحمد للہ وہ رات ہر حیثیت سے اچھی گزری۔ لیکن صبح کو جب وہاں سے اپنے خیمہ کی طرف آنے لگا تو راستہ بھول گیا، کافی دیر تک سڑکوں کا چکر کاٹنے کے بعد پہنچ سکا، اب منیٰ میں بالکل یکساں صورت کی سڑکوں کا ایسا جال بچھا دیا گیا ہے کہ اگر سڑک کا نمبر معلوم نہ ہو تو راستہ

بھولنے کا بہت امکان ہے۔

میرا خیال تھا کہ مولانا علی میاں وغیرہ عرفات روانہ ہونے کے لئے میرے منتظر ہوں گے اور میری وجہ سے تاخیر ہو رہی ہو گی لیکن خیمہ پر پہنچ کے معلوم ہوا کہ ابھی ہمارا ڈرائیور ہی نہیں آیا ہے، کچھ دیر کے بعد جب وہ کار لے کے آیا تو ہم لوگ عرفات روانہ ہوئے، منیٰ سے عرفات قریباً چھ میل ہے کثرت ازدحام کی وجہ سے یہ راستہ بھی کافی دیر میں طے ہوا اور ہم لوگ ہندوستانی ٹائم سے قریباً دس بجے عرفات پہنچ سکے۔

وقوف عرفہ حج کا رکن اعظم ہے اور آج کا دن حج کا خاص الخاص دن ہے اور قسمت سے جمعہ بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں کسے دخل، طبیعت جو دو دن سے خراب چل رہی تھی آج اور زیادہ خراب ہو گئی، اسکے باوجود طے کیا کہ نماز جماعت سے مسجد نمرہ ہی میں پڑھیں گے اس لئے خیمہ پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مسجد نمرہ چل دیئے، یہ مسجد عرفات کے ایک کنارہ پر ہے پہلے یہ کسی اور حال میں تھی اب بالکل نئی اور خوبصورت مسجد بنی کھڑی ہے قبلہ کی جانب وسیع مسقف حصہ کے علاوہ دائیں بائیں اچھے خاصے وسیع وعریض دالان بھی بنا دیئے گئے ہیں، اگرچہ ہم لوگ نماز کے وقت سے گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے پہنچے تھے لیکن مسجد کا مسقف حصہ اور دالان بھر چکے تھے اور اللہ کے بہت سے بندے دھوپ میں بیٹھے تھے، اپنی طبیعت کی خرابی اور اس حالت کو دیکھ کے بہت فکر ہوئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ بائیں جانب کے دالان میں ہم سب کو جگہ مل گئی۔ زوال آفتاب کے بعد متصلاً اذان ہوئی، اسکے بعد خطبہ ہوا لیکن یہ خطبۂ حج تھا جمعہ کا خطبہ نہیں تھا اسی لئے خطیب نے صرف ایک خطبہ پڑھا، خطبہ دینے والے اور نماز پڑھانے والے شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن الحسن آل الشیخ تھے خطبہ بڑا موثر اور مصلحانہ تھا خطبہ کے بعد نماز جمعہ ہوئی اور اسی کے ساتھ بلا فصل نماز عصر ہوئی، اسکے بعد ہم لوگ اپنے خیمہ میں آگئے، آج کے دن طبیعت کی خرابی کا دل کو بڑا صدمہ رہا، لیکن بیماری کو حدیث پاک میں "طہور" (گناہوں کی گندگی اور میل کچیل سے صاف کرنے والی) بھی کہا گیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گنہگار بندہ کی تطہیر اور صفائی ہی کے لئے آج اسے مبتلا کیا تھا تو یہ بھی بلاشبہ اُس ارحم الرحمین کی رحمت و عنایت ہی تھی

نویں ذی الحجہ کو صرف غروب آفتاب تک حاجیوں کو عرفات میں ٹھیرنا ہوتا ہے، اسی کا نام "وقوف عرفہ" ہے جو حج کا رکن اعظم ہے، حکومت حجاز کے سرکاری بیان کے مطابق اس سال قریباً دس لاکھ آدمیوں نے عرفات میں وقوف کیا جن میں دو لاکھ کے قریب دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے حجاج تھے اور باقی آٹھ لاکھ کے قریب خود سعودی عرب یعنی نجد و حجاز کے باشندے تھے، گویا عرفات کا میلوں لمبا چوڑا میدان آج کے دن صرف چند گھنٹوں کے لئے خیموں کا ایک شہر بن جاتا ہے اور غروب آفتاب کے بعد یہ سارے تنبو خیمے اکھاڑ کے منیٰ روانہ کر دئے جاتے ہیں جہاں دسویں سے بارھویں یا تیرھویں تک حجاج کا قیام رہتا ہے۔

آج عرفات میں بھی تبلیغی کام کرنے والے اللہ کے باتوفیق بندوں نے ظہر سے پہلے پہلے کچھ خیموں کا گشت کیا، جو لوگ اُردو ہی بول سکتے تھے وہ صرف ہندوستان و پاکستان کے حاجیوں سے ملے اور ان کو آج کے دن کی خاص اہمیت بتا کر توجہ الی اللہ اور دعا کی طرف متوجہ کیا اور جن جماعتوں میں عربی بولنے والے حضرات بھی تھے انھوں نے عربوں میں پھر پھر کر یہی کام کیا ——— لیکن دس لاکھ کے اس مجمع میں یہ کام کرنے والے ہزاروں کیا معنی سیکڑوں کی تعداد میں بھی نہیں تھے اس لئے اندازہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ بس ایک دو فیصدی حجاج میں یہ کام ہو سکا ہوگا۔ اگر تمام ممالک کا دین کی فکر اور اس کا درد رکھنے والا طبقہ اس سیدھے سادے کام کو اپنا لے اور ایام حج میں خصوصاً منیٰ اور عرفات کے دنوں میں وسیع پیمانہ پر یہ کام ہو سکے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالم اسلامی پر اس کے کتنے مبارک اور کیسے انقلاب انگیز اثرات پڑ سکتے ہیں! بلاشبہ اس امت میں ایمان کی روح تازہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسکے رابطہ عبدیت کو مضبوط و استوار کرنے کا اس دور کا یہی آسان اور ممکن العمل طریقہ ہے، لیکن شاید اسکی سادگی اور سہولت ہی اس کا بڑا عیب ہے۔

حجاج کے لئے آج کے دن شریعت کا حکم یہ ہے کہ وہ غروب آفتاب تک عرفات میں رہیں، جب آفتاب غروب ہو جائے تو مغرب کی نماز پڑھے بغیر مزدلفہ روانہ ہو جائیں

اور وہاں پہنچکر مغرب وعشاء دونوں نمازیں ساتھ پڑھیں ــــــ مزدلفہ عرفات سے قریباً ۳ میل ہے، گویا عرفات اور منیٰ کے وسط میں ہے۔ یہاں حاجیوں کو صرف اس رات میں قیام کرنا ہوتا ہے علی الصبح وہاں سے منیٰ روانہ ہوجاتے ہیں اس لئے مزدلفہ میں خیمہ وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں ہوتا ــــــ

آج کے دن کی گرمی اور تکان کی وجہ سے شام تک بخار کافی بڑھ گیا تھا، اس لئے غروب آفتاب کے بعد کارہی سے مزدلفہ کو روانہ ہوئے، کثرت اژدحام کی وجہ سے کافی دیر میں پہنچ سکے، وہاں پہنچ کے پہلے مغرب وعشا کی نمازیں پڑھیں، بخار کی زیادتی کی وجہ سے میں نے کارہی کے اندر پڑ کے رات گزارنے کا فیصلہ کیا، اسی میں کچھ دیر سو بھی لیا۔ ایام حج میں رحمت و قبولیت کے لحاظ سے عرفات کے دن کے بعد مزدلفہ کی اس رات ہی کا درجہ ہے ــــ خوش نصیب ساتھیوں نے آرام بھی کیا اور حسب توفیق نوافل اور دعا وغیرہ میں بھی مشغول رہے اور یہ عاجز بخار کی وجہ سے رات بھر کارہی میں پڑا رہا، آج کی رات بھی اپنی اس مجبوری اور محرومی کا بڑا قلق رہا ــــــ اور اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے وہ حدیث یاد کرتا جس میں فرمایا گیا ہے کہ " بیماری جیسی کسی مجبوری کی وجہ سے اگر کوئی بندہ اپنا کوئی عمل نہ کرسکے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ازراہ رحمت و کرم وہ عمل بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے "ــــ اس ارحم الراحمین سے یہی امید ہے کہ یہ گنہگار بندہ بھی اس رحم و کرم سے محروم نہیں رکھا گیا ہوگا ــــ اَللّٰھُمَّ اِنَّ رَحْمَتَكَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ ۔

رات مزدلفہ میں گزار کے صبح کو ہم لوگ قاعدہ کے مطابق منیٰ روانہ ہوگئے، آج دسویں ذی الحجہ کو منیٰ پہنچکر صرف ایک جمرہ کی رمی کرنی تھی اسکے بعد قربانی اور پھر حلق یا قصر کرا کے طواف زیارت کے لئے مکہ جانا اور پھر وہاں سے منیٰ ہی واپس آنا تھا ــــ ابھی تک میں نے دوا علاج کے سلسلہ میں اسکے سوا کچھ نہیں کیا تھا کہ محب مکرم ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی اور مخلص محترم ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی نے جو چند ہومیوپیتھک دوائیں ایک مختصر رہنما یادداشت کے ساتھ دیدی تھیں بس اس یادداشت کی رہنمائی میں ۸، ۹ ذی الحجہ

تک انہی میں سے بعض دوائیں استعمال کرتا رہا، اور شروع میں اس سے فائدہ بھی محسوس ہوتا رہا، بلکہ جن دوسرے رفقانے بھی وہ دوائیں اس یادداشت کی رہنمائی میں استعمال کیں الحمدللہ سب کو نفع ہوا، لیکن عرفات پہنچکر جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو میں نے ان دواؤں کا استعمال ترک کر دینا مناسب سمجھا —— دس کی صبح کو جب ہم لوگ منیٰ پہنچ کر اپنے خیمہ میں مقیم ہوئے تو اتفاق سے پاکستانی شفاخانہ ہمارے خیمہ کے بالکل سامنے تھا، ایک دوست کو ساتھ لے کر وہاں گیا، مریضوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی، باری آنے پر وہاں کے متعین ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اور دوا تجویز کر دی جس میں ایک انجکشن بھی تھا، انجکشن وہیں لگا دیا گیا اور دوا بھی شفاخانہ ہی سے مل گئی —— اس دوا نے بہت جلدی اثر کیا اور چند گھنٹوں کے بعد حالت میں کچھ بہتری محسوس ہونے لگی۔

آج زوال سے پہلے ہی رمی بھی کرنی تھی اور اچھے خاصے تندرست آدمیوں کے لئے بھی یہ سخت ترین مرحلہ ہوتا ہے ایک ستون پر اور محدود وقت میں سات سات کنکریاں لاکھوں آدمیوں کو مارنی ہوتی ہیں، جن میں غالب اکثریت ناتربیت یافتہ عوام کی ہوتی ہے جن پر کوئی کنٹرول نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے وہاں بڑی سخت کشمکش کی بلکہ سخت خطرہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات آدمی بھیڑ میں ہر طرف سے دب کر ایسا بے قابو اور بے بس ہو جاتا ہے کہ اپنے کو سنبھال بھی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں اگر آدمی گر جائے تو پھر اسکے زندہ رہنے اور اُٹھ سکنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں، پھر ان رمی کرنے والوں میں بہت سے بوڑھے اور کمزور بھی ہوتے ہیں، عام قیاس کے مطابق تو رمی کے اس قیامت خیز طوفان میں موت کے ۱۰-۲۰ حادثے ضرور ہی ہونے چاہئیں لیکن ایک حادثہ کی خبر بھی کبھی نہیں سنی، اس کو قدرت کے معجزہ کے سوا کچھ نہیں جا سکتا —— بہرحال آج یہ مرحلہ بھی سامنے تھا، اپنی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے قدرتی طور پر اسکی بڑی فکر تھی، پھر قیام گاہ سے جمرۃ العقبہ کافی دور بھی تھا اور وقت گرمی اور دھوپ کی تیزی کا تھا، ساتھیوں کے ساتھ بنام خدا اسی حال میں میں بھی چلدیا جب ہم لوگ قریب پہنچے تو اندازہ اور قیاس سے بھی بہت زیادہ آدمیوں کا ایک طوفانی سمندر

نظر آیا جسے دیکھ کر یہ طے کر لینا پڑا کہ ہم سب ساتھی اس میں گھسنے کے بعد ساتھ نہیں رہ سکیں گے اس لئے ایک جگہ مقرر کر لی کہ ہر شخص رمی سے فارغ ہونے کے بعد یہاں آ جائے،
چنانچہ اس مجمع میں داخل ہونے کے بعد ہم سب ایک دوسرے سے الگ اور بے خبر ہو گئے، میں دو تین دفعہ اس بھیڑ میں اس طرح دبا کہ اپنے جسم پر میرا قابو نہیں رہا لیکن الحمد للہ رمی کے مقام تک پہنچ گیا اور فارغ ہو گئے، زندہ و سلامت واپس بھی آ گیا۔
۹ھ اور ۱۵ھ میں بھی اگرچہ رمی میں بھیڑ دیکھی تھی لیکن یہ خطرناک حالت بالکل نہیں تھی جو اس دفعہ دیکھی، یہ صورت حجاج کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اب پیدا ہو گئی ہے ـــــ معلوم ہوا کہ سعودی حکومت کے ذمہ دار خود اس بارہ میں غور و فکر کر رہے ہیں کہ اس مشکل پر کس طرح قابو پایا جائے، حکومت کے وزیر حج و اوقاف نے خود ہی ایک ملاقات میں اس کا ذکر کیا کہ طواف میں اور جمرات کی رمی میں حجاج کی کثرت کی وجہ سے جو خطرناک کشمکش ہونے لگی ہے ہم لوگ فکرمندی کے ساتھ اس پر قابو پانے کی صورتوں پر غور کر رہے ہیں اور ہمارے سامنے اس سلسلہ میں یہ یہ تجویزیں ہیں ـــ خدا کرے کہ اگلے حج سے پہلے اس کا کوئی بندوبست ہو جائے ـــــ اگرچہ ان سب چیزوں کا اصل علاج آنے والے حجاج کی دینی اور اخلاقی تربیت ہے جو ہم سب ہی کی ذمہ داری ہے، تاہم امکانی حد تک انتظامی بندوبست حکومت کا فریضہ ہے۔

رمی سے فارغ ہو کر ہم لوگ اپنے خیمہ کی طرف واپس آئے ـــــ اب قربانی کا مرحلہ تھا مولانا عبد اللہ عباس، اور مدینہ یونیورسٹی کے عزیز ندوی طلبہ مولوی سراج الرحمٰن اندوری وغیرہ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا، ہم سب نے ان کو اپنا وکیل بنا دیا اور منی جا کر وہ اپنی اور ہم سب کی قربانیاں کر آئے۔ ان کی واپسی کے بعد ہم لوگوں نے حلق یا قصر کرایا اور احرام کی بیشتر پابندیوں سے آزاد ہو گئے اور طواف زیارت کے لئے مغرب کے قریب مکہ معظمہ آئے، پہلے اپنی قیام گاہ مولانا عبد اللہ عباس کے مکان پہنچ کے احرام کی چادریں اتاریں اور کپڑے پہنے، اسکے بعد حرم شریف پہنچ کے طواف کیا، پھر سعی کی اور

عشا کے بعد پھر منیٰ واپس آگئے ــــــ اگلے دن ۱۱ر ذی الحجہ کو اور ۱۲ر کو بھی شام تک منیٰ ہی میں قیام رہا، البتہ دونوں دنوں میں سہ پہر کے وقت تینوں جمروں کی رمی کی بھیڑ اور کشاکش میں پہلے دن کی بہ نسبت کسی قدر کمی تھی ــــــ

چونکہ تبلیغی کام سے خاص تعلق رکھنے والے حضرات مولانا سعید احمد خاں صاحب مولانا غلام رسول صاحب، فضل کریم صاحب اور ارشد صاحب وغیرہ کا قیام سید مکی مرزوقی صاحب کے خیمہ میں تھا اس لئے ان کا یہ خیمہ تبلیغی مرکز بنا رہا۔ مختلف اوقات میں مختلف حلقوں میں اجتماعات اور تقریروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ مرزوقی صاحب نے ہم لوگوں کا بڑا خیال رکھا۔ ۱۲ر ذی الحجہ کی رمی سے فارغ ہو کر شام کو ہم لوگ مکہ معظمہ آگئے، ۱۰ر ذی الحجہ کو منیٰ پہنچکر میں نے جو دوا شروع کی تھی وہ برابر جاری رہی، انجکشن بھی لگتے رہے، اس علاج سے افاقہ تو پہلے ہی دن سے محسوس ہونے لگا تھا لیکن کمزوری کا اثر کئی دن تک رہا۔

رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حج سے پہلے ہی مدینہ طیبہ ہو آئے تھے، بلکہ ان کا یہ سفر ہی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (مدینہ یونیورسٹی) کی دعوت پر ہوا تھا، یونیورسٹی نے اپنے طلبہ کے سامنے خطبات دینے کے لئے ان کو مدعو کیا تھا، انھوں نے ذیقعدہ کا قریباً پورا مہینہ مدینہ طیبہ میں گزارا اس کے بعد وہ حج کے لئے مکہ معظمہ آئے، اس لئے ان کو اب مدینہ طیبہ جانا نہیں تھا، مگر ہم لوگوں کو جانا تھا اور ہم نے یہ بہتر سمجھا کہ جلدی یعنی ۱۵۔۱۶ ذی الحجہ تک چلے جائیں تاکہ وہاں سے واپس آکر پھر کچھ وقت مکہ معظمہ گزارنے کا موقع مل جائے۔ لیکن ورقۂ تنازل حاصل ہونے میں کچھ دیر لگی اور ہم ۲۰ر ذی الحجہ کی شام کو مدینہ طیبہ روانہ ہو سکے ــــــ ۱۳ر ذی الحجہ سے ۲۰ر ذی الحجہ تک کے ۸ دن مکہ معظمہ میں الحمد للہ صحت کے ساتھ اور بڑے اچھے گزرے ــــــ

اس دفعہ مکہ معظمہ میں رفیق محترم مولانا علی میاں کی رفاقت اور مولانا عبداللہ عباس ندوی کے مکان پر قیام اور ہر قسم کی راحتیں اور حرم شریف کے مرکزی دروازہ باب السعود کے بالکل متصل مدرسہ صولتیہ کے دفتر کی سہولتیں اور وہاں کے مقیم حضرات کی مخلصانہ عنایتیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں تھیں جن سے اس عاجز کو مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں بڑی ہی

سہولت اور عافیت نصیب رہی ـــــ اللہ تعالیٰ شکر اور شکریہ کی توفیق دے۔

مدرسہ صولتیہ کے دفتر کے انچارج ان دنوں میں مولانا حکیم محمد یامین صاحب تھے اس سفر سے پہلے ان سے نیاز حاصل ہونا مجھے یاد نہیں اللہ تعالیٰ نے موصوف کو غالباً وہ ساری خوبیاں عطا فرمائی ہیں جو ایسی جگہ کے کسی ذمہ دار میں ہونی چاہئیں ـــــ ایک خاص تبلیغی دوست مولانا قاری سلیمان صاحب بھی اس دفتر کے ایک حصہ میں مقیم تھے یہ اصل رہنے والے تو گجرات کے تھے، لیکن اب کراچی میں قیام ہے، افریقہ اور حجاز میں بھی خاص تعلقات ہیں، عجیب وغریب خصوصیات کے آدمی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کو راحت پہنچانا اور کھلانا پلانا اُن کی خاص غذا ہے اور انہیں بس اسی میں لذت آتی ہے، ان کے ساتھ ایک دوسرے تبلیغی دوست ملک الٰہی بخش بھی بالکل اسی مزاج کے تھے یہ کراچی کے کسی سرکاری دفتر میں اچھے عہدہ پر ہیں ـــــ حجاز میں تبلیغی کام اور نظام کے ذمہ دار مولانا سعید احمد خاں صاحب اور مولانا غلام رسول کا بھی قریباً روزانہ ہی کچھ وقت اس دفتر میں گزرتا تھا ـــــ ان سب کی اس عاجز پر بڑی ہی عنایتیں رہیں اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

یہ دفتر ہندوستان و پاکستان اور افریقہ کے دیوبندی سلسلہ کے اعیان وعلماء اور تبلیغی کام سے خاص تعلق رکھنے والوں کا مرکز بنا ہوا تھا، ہم لوگوں کے لئے یہ حرم شریف کے بالکل قریب بوقت ضرورت ویٹنگ روم بھی تھا اور مجلسِ احباب بھی اور تبلیغی اجتماعات اور مشوروں کا مرکز بھی اور مختلف علاقوں اور ملکوں سے آنے والے دینی اخوان واحباب کا ملتقی اور سنگم بھی ـــــ

واضح رہے کہ یہ مدرسہ صولتیہ کا صرف دفتر ہے، اصل مدرسہ جس کی الحمد للہ بہت وسیع عمارت ہے حرم شریف سے ۲ ـ ۳ فرلانگ کے فاصلہ پر محلہ حارۃ الباب میں ہے، وہ بھی ہمیشہ سے حج کے زمانہ میں حجاج کا ایک بھرا ہوا مسافر خانہ بنا رہتا ہے اور دیکھا کہ مدیر مدرسہ جناب مولانا محمد سلیم صاحب اور اُن صاحبزادہ مولوی محمد شمیم صاحب ان ایام میں صبح سے شام تک حجاج ہی کے کاموں میں لگے رہتے ہیں اور مدرسہ کا دفتر ان دنوں میں گویا حجاج کا دفتر ہو جاتا ہے ـــــ یہ بھی بلاشبہ بڑی خدمت ہے اور بڑا خیر ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

ہمارے رفیق حکیم عبدالقوی صاحب نے مدرسہ صولتیہ ہی میں قیام فرمایا تھا، برادرم محمد شمیم سلمہ کے اصرار پر ان کی تطییب خاطر کے لئے مدینہ طیبہ سے واپس آنے کے بعد ایک رات اس عاجز نے بھی وہیں قیام کیا۔ یہ علمی اور دینی خانوادہ ہمارے ہندوستان بلکہ خاص ہمارے صوبہ یوپی کے ضلع مظفر نگر (کیرانہ) کا ہے لیکن مہمان نوازی کا معیار اب بالکل عربوں الا ہو۔

مدینہ طیبہ جانے کے لئے ورقہ تنازل (گویا اجازت نامہ) ہمیں ۱۹ ذی الحجہ (مطابق ۱۳ مئی) کو مل سکا، ۲۰ ذی الحجہ کو ہم نے جانے کا پروگرام بنایا، (ہماری راحت اور سہولت کے لئے ہمارے عنایت فرما یا مولانا قاری سلیمان صاحب اور ملک الٰہی بخش صاحب نے بھی ہمارے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا، مغرب سے قریباً سوا گھنٹہ پہلے ہم ایک ٹیکسی کار کے ذریعہ جدہ کے لئے روانہ ہوئے، اور صرف ایک گھنٹہ میں جدہ پہنچ گئے، وہاں سے مدینہ منورہ کے لئے دوسری ٹیکسی کی اور مغرب کی نماز جدہ ہی کی ایک مسجد میں پڑھ کے روانہ ہو گئے۔

— قریباً دو ڈھائی گھنٹہ چل کر منزل مسطورہ آگئی، یہاں چونکہ مچھلی بہت اچھی ملتی ہو اس لئے ڈرائیوں کا عام دستور یہ ہے کہ وہ یہاں ٹھیر کے اور کچھ کھا پی کے آگے چلتے ہیں، ہمارے ڈرائیور نے بھی یہاں آکر کار روکی، ہم لوگوں نے بھی اتر کے نماز عشاء پڑھی، کچھ کھایا پیا اور تھوڑا سا آرام کر کے آگے چل دیئے۔ ہماری خواہش یہ تھی کہ رات کو تھکے ہارے مدینہ منورہ پہنچنے کے بجائے راستہ میں کسی منزل پہ آرام کریں اور صبح ایسے حال میں مدینہ طیبہ میں داخل ہوں کہ طبیعت خستہ اور کسلمند نہ ہو، لیکن ہم نے ڈرائیور سے اس بارہ میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، مگر اللہ کا کرم، تھوڑی دیر کے بعد جب بدر کی منزل آئی تو ڈرائیور نے از خود کار روک دی اور کہا کہ اب یہاں آرام کر کے صبح فجر پڑھ کے چلیں گے۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا، چند گھنٹے سب سو لئے اور اول وقت فجر کی نماز ادا کر کے روانہ ہو گئے اور اشراق کے وقت آخری منزل بیر علی سے آگے بڑھ کر مدینہ طیبہ کے دروازہ "باب العنبریہ" میں داخل ہو گئے — پہلے بیر علی سے کچھ ہی آگے بڑھ کے گنبد مبارک نظر آنے لگتا لیکن اب چونکہ مسجد نبوی کی مختلف سمتوں میں اونچی اونچی کئی کئی منزل کی عمارتیں بن گئی ہیں اس لئے شہر میں داخلہ کے بعد بھی دیر تک آنکھیں تلاش ہی کرتی رہیں، اور بالکل قریب پہنچ کر اس نظارہ کی لذت و مسرت حاصل کر سکیں

(باقی)

.... درگہِ بے نیاز میں

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر مطبوعہ نظم آپ کے مسترشد خاص مولانا محمد اشرف خاں صاحب ایم۔ اے کی بیاض سے، جو امسال سفر حجاز میں حاصل ہوئی "نعمانی"

دیدہ و دل اگر ہوں باز راز رہے نہ راز میں
جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

ان کے کرم کے ہم نثار ان کی عطا کا کیا شمار
دے دیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں

حبش و تتار و ہند و شام سُرخ رخ و سیاہ فام
عشق نواز ہر مقام آئے ہیں سب حجاز میں

عرش کے بام تک کہاں وسعتِ دستِ انس و جاں
شان کرم ہوئی عیاں ہو کے نہاں مجاز میں

سنگ سیاہ در جو تھا دست مصافحہ بنا
اب نہ رہا وہ راز میں وہ جو چھپا تھا راز میں

روز نیا نیا مقام، صبح کہیں کہیں ہے شام
عشق کی منزلیں تمام راہ خم و دراز میں

دل کو نصیب ہو گداز جاں کو عطا ہو سوز و ساز
ہے یہ دُعا بصد نیاز درگہِ بے نیاز میں

دل جو ملا سیاہ کار آنکھیں عطا ہوں اشکبار
دھوئیں جو دل کو بار بار خلوت خاص راز میں

ندوۃ المصنفین و مکتبہ برہان دہلی کی مطبوعات

قصص القرآن کامل (۴ جلد) مجلد ۲۹/۵۰ غیر مجلد ۲۶/۵۰
لغات القرآن کامل (۶ جلد) مجلد ۳۶/۔ غیر مجلد ۳۱/۔
صدیق اکبر مجلد ۹/۔ غیر مجلد ۸/۔
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات مجلد ۹/۔ غیر مجلد ۸/۔
اسوہ حسنہ ۳/۰
خلفائے راشدین اور اہلبیت کے باہمی تعلقات ۱/۷۵
ترجمان السنہ کامل مجلد ۳۵/۔ غیر مجلد ۲۹/۔
۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ مجلد ۳/۵۰ غیر مجلد ۲/۵۰
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مجلد ۷/۔ غیر مجلد ۶/۔
اسلام کا نظام حکومت مجلد ۷/۔ غیر مجلد ۶/۔
اسلام کا اقتصادی نظام مجلد ۷/۔ غیر مجلد ۶/۔
اسلام کا نظام مساجد مجلد ۵/۔ غیر مجلد ۴/۔
اسلام کا نظام عفت و عصمت مجلد ۶/۔ غیر مجلد ۵/۔
اسلام کا زرعی نظام مجلد ۵/۔ غیر مجلد ۴/۔
اسلام میں غلامی کی حقیقت مجلد ۶/۔ غیر مجلد ۵/۔
فہم قرآن مجلد ۳/۲۵ غیر مجلد ۲/۲۵
وحی الہی مجلد ۴/۔ غیر مجلد ۳/۔
اخلاق و فلسفہ اخلاق مجلد ۷/۵۰ غیر مجلد ۶/۵۰
اخلاق اور تعمیر سیرت مجلد ۶/۵۰ غیر مجلد ۵/۵۰
قرآن اور تصوف مجلد ۳/۔ غیر مجلد ۲/۔
وحی کیا ہے مجلد ۲/۔
المعلم و المتعلم مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/۵۰
تاریخ مشائخ چشت مجلد ۱۳/۔ غیر مجلد ۱۲/۔
حیات شیخ عبدالحق مجلد ۷/۔ غیر مجلد ۶/۔
غلامان اسلام مجلد ۶/۵۰ غیر مجلد ۵/۵۰

مسلمانوں کا عروج و زوال مجلد ۶/۵۰ غیر مجلد ۵/۵۰
مسلمانوں کا نظم مملکت مجلد ۶/۵۰ غیر مجلد ۵/۵۰
سفرنامہ ابن بطوطہ ۳/۔
قرون وسطی کے مسلمانوں کی علمی خدمات مجلد ۶/۲۵ غیر مجلد ۵/۲۵
تاریخ اسلام پر ایک نظر مجلد ۶/۵۰ غیر مجلد ۶/۔
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط مجلد ۱۲/۔ غیر مجلد ۱۱/۔
حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط مجلد ۵/۔ غیر مجلد ۴/۔
مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۱/۵۰
تذکرہ علامہ شیخ محمد طاہرؒ ۱/۵۰
عروج و زوال کا الہی نظام ۳/۔
مصباح اللغات مجلد ۱۶/۔ غیر مجلد ۱۴/۔
الفوز الکبیر (اردو) ۱/۔
رہنمائے قرآن مجلد ۲/۲۵ غیر مجلد ۱/۔
تدوین قرآن ۱/۵۰
کتابت حدیث ۱/۲۵
تاریخ علم فقہ ۲/۲۵
اشاعت اسلام مجلد ۷/۔ غیر مجلد ۶/۔
سیرت النعمان ۳/۔
انقلاب روس ۷/۔
اسلام ۶/۔
تاریخ ملت کامل (۱۱ جلدیں) مجلد ۳۲/۔ غیر مجلد ۲۴/۰
اصلاح الرسوم ۱/۷۵
تعلیم الدین ۱/۷۵
حیات المسلمین ۱/۷۵

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW

الفرقان

لکھنؤ

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول
محمد منظور نعمانی

چندہ (دیگر ممالک سے) سالانہ .... ۱۲ شلنگ اعزازی چندہ سالانہ ۱۵/-/-	ماہنامہ الفرقان لکھنؤ	چندہ (ہند و پاک سے) سالانہ .... ۶/-/- ششماہی .... ۳/-/- فی کاپی .... -/۱۰/-

جلد (۳۱) بابتہ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۳ء شمارہ (۴)

اگر اس دائرہ میں ⃝ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا — **پاکستان کے خریدار:** ۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

نمبر خریداری: ۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کریں۔

تاریخ اشاعت: ۔ الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آ جانی چاہیے۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

یہ ایک واقعہ ہے کہ زمانے کے نئے حالات اور سائنس کی نئی ایجادات نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت سے ایسے مسائل پیدا کر دئے ہیں جن کا واضح حکم ہماری فقہ میں موجود نہیں ہے نیز ان نئے حالات ہی نے ہمارے اس دور میں اللہ کے ان بندوں کے لئے جو اس زمانہ میں بھی شریعت کے پابند رہ کر زندگی گذارنا چاہتے ہیں بہت سے معاملات اور مسائل میں ناقابل عبور دشواریاں پیدا کر دی ہیں، ـــــ اس صورت حال کی وجہ سے بعض وقت لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسے پیدا ہونے لگتے ہیں کہ کیا اس زمانہ میں اسلام قابل عمل نہیں ہے اور کیا اسلامی شریعت ابدی شریعت نہیں ہے ـــــ ان حالات میں یقیناً علماء امت کا یہ اجتماعی فریضہ ہے کہ وہ کتاب وسنت اور اصول شریعت کی روشنی میں ان مسائل پر غور و فکر کر کے ان کے بارے میں امت کی واضح رہنمائی کریں جیسا کہ ہر دور میں فقہائے امت اور علماء راسخین کرتے رہے ہیں۔

پھر ہمارے اس دور میں جبکہ بدقسمتی سے امت میں انتشار و افتراق کی بیماری مزمن مرض کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اس میں اس مرض کے اشتداد اور ترقی کی صلاحیت شاید ہمیشہ سے زیادہ ہو گئی ہے یہ بھی ضروری ہے کہ ان مسائل پر غور و فکر اور فیصلہ کے بارہ میں ممکن حد تک اجتماعیت کی بھی کوشش کی جائے ـــــ

اس ضرورت کا احساس تو عرصہ دراز سے تھا لیکن جوہانسبرگ (افریقہ) سے اللہ کے ایک مخلص باتوفیق بندے، مرحوم مولانا الحاج محمد بن موسیٰ میاں سملکی نے (جو گزشتہ اپریل میں اللہ کے جوار رحمت میں پہونچ چکے) پچھلے ۳۔۴ برسوں میں کئی دفعہ لکھا کہ اگر یہ ناچیز راقم سطور

اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس کام کی ذمہ داری لیں اور اس کے لئے علماء کی کوئی مجلس قائم کریں تو اس کے سارے مصارف کا تحمل وہ کریں گے، لیکن کسی ایسے صاحب کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے جو اس کام کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت بھی دے سکیں اور علم و مطالعہ کے لحاظ سے اسکے اہل بھی ہوں یہ کام شروع نہیں کیا جا سکا ـ لیکن ابھی حال میں اللہ تعالیٰ نے یہ رکاوٹ دور فرما دی اور ہمیں اس کام کے لئے ایک اہل رفیق کی خدمات حاصل ہو گئیں اس لئے گزشتہ مہینے ربیع الاول میں بنام خدا اس کے شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور ابتدائی مشاورت کے لئے یکم ستمبر کی تاریخ مقرر کرکے رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی طرف سے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ان علماء کرام کو دعوت دیدی گئی جنکا مشورہ اس ابتدائی مرحلہ میں ضروری اور ناگزیر سمجھا گیا۔

یکم ستمبر کو وہ مجلس منعقد ہوئی مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ۱۴ علماء کرام اسمیں شریک ہوئے اور اس کام کے لئے "مجلس تحقیقات شرعیہ" کے نام سے ایک مجلس کی تاسیس و تشکیل عمل میں آئی ـــــ طریق کار وغیرہ کے بارہ میں تمام فیصلے الحمدللہ اتفاق رائے سے ہوئے۔

فی الحال اس مجلس کے ممبران وہی ۱۴ حضرات ہیں جو اس ابتدائی مشاورتی جلسہ میں شریک ہوئے تھے لیکن ان کو اختیار دیا گیا ہو کہ وہ ملک کے صاحب بصیرت اُن اکابر علماء کا اضافہ کر لیں جنکی شرکت مقصد کے لحاظ سے ضروری سمجھی جائے۔ مجلس کے لئے کسی صدر کا انتخاب مناسب نہیں سمجھا گیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اس کا ناظم منتخب کیا گیا ہو، مجلس کے مصارف کی ذمہ داری مولانا موصوف کی تحریک پر فی الحال مجلس ندوۃ العلماء نے لی ہو۔

یہ حسن اتفاق ہو یا لطیفۂ غیبی کہ انہی دنوں میں اس کام کی تحریک پاکستان میں بھی شروع ہوئی ہے، دینی ماہنامہ بینات کراچی کے ربیع الاوّل کے شمارہ میں پاکستان کے جلیل القدر عالم دین ہمارے محترم مولانا محمد یوسف بنوری نے اس دینی علمی و تحقیقی کام کی ضرورت پر اداریہ لکھا ہے اور پاکستان کے مخلص علماء اور ارباب مدارس کو اس اجتماعی اور شورائی نہج پر اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے پکارا ہو ـــــ مولانا ممدوح نے اپنا مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کیا ہے۔

عن علی قال قلت یا رسول اللہ ان ـــ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو

نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نہی فما تامرنی؟ قال شاوروا فیہ الفقہاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رای خاصۃ ــــ

رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اہل الصحیح

مجمع الزوائد ص ۱۷۸ ج ۱

کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا معاملہ آئے جس میں کوئی واضح بیان اور مثبت یا منفی حکم موجود نہ ہو ایسے معاملہ میں ہمارے لئے کیا حکم ہو آپ نے فرمایا کہ اصحاب تفقہ اور عبادت گزاروں سے مشورہ کر کے فیصلہ کرو شخصی رائے مت چلاؤ۔

ہمارے موجودہ حالات و مشکلات میں کیسی واضح رہنمائی ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پاک میں۔

اچاریہ ونوبا بھاوے جی کی خدمت میں اسی مہینے اگست کے اخباروں میں اچاریہ ونوبا بھاوے جی کے رسالہ "بھودان تحریک" کے حوالہ سے یہ بات شائع ہوئی ہو کہ اچاریہ جی نے ایک ملاقات کے دوران اپنے دو مسلمان دوستوں سے فرمایا کہ:-

میں اللہ کو مانتا ہوں، رسول کو مانتا ہوں، کتاب کو مانتا ہوں اسکے بعد مجھ کو مسلمان ہونے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟

ان اخبارات سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان مسلمان صاحبان نے اچاریہ جی کے اس سوال کا کیا جواب دیا ــــ لیکن بلاشبہ اس سوال کا حق ہو کہ اسلام کی طرف سے اس کا واضح اور غیر مبہم جواب دیا جائے، خاص کر جب کہ یہ سوال ملک کی ایک باوقار شخصیت کی طرف سے کیا گیا ہو جن کے متعلق یہ توقع ہو کہ انھوں نے یہ سوال سنجیدگی ہی سے کیا ہوگا۔

اس سلسلہ میں ہم ونوبا بھاوے جی اور اُن سب حضرات کی خدمت میں جن کے دلیں یہ سوال ہو عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ اللہ کو، رسول کو اور اس کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید کو

اس طرح ماننے ہیں جس طرح کا ماننا اسلام میں معتبر ہو (جس کی کچھ وضاحت ابھی آئندہ سطروں میں کی جائے گی) تو پھر آپ مسلمان ہیں اور آپکو مسلمان ہونے کے لئے کچھ اور کرنے کی مطلق ضرورت نہیں سوائے اس کے جو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہو یعنی یہ کہ اللہ، رسول اور کتاب کو ماننے کے جو لازمی اور بدیہی تقاضے ہیں انکو پورا کیا جائے اور اپنی عملی زندگی کو اللہ و رسول اور کتاب کے احکام کا پابند بنا دیا جائے۔

اب صرف یہ بات وضاحت طلب رہ جاتی ہو کہ اسلام میں اللہ، رسول اور کتاب کا کس طرح ماننا معتبر ہو؟ ــــــ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ و رسول اور کتاب کو ماننے کی بعض صورتیں وہ بھی ہو سکتی ہیں جو نہ صرف یہ کہ غلط اور نامعتبر ہوں بلکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے وہ بجائے خود ایک مستقل کفر ہوں۔

اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہوگی ــــــ قرآن مجید میں اہل تثلیث مسیحیوں کے بارہ میں فرمایا گیا ہو۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ	یقیناً وہ لوگ کفر کے مجرم ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا تین میں کا ایک ہے (یعنی
(المائدہ ع ۱۰)	باپ، بیٹا اور روح القدس)

ظاہر ہے کہ یہ مسیحی خدا کے منکر نہیں تھے، بلکہ اُس کو مانتے تھے حضرت مسیح کو بھی مانتے تھے بلکہ جیسا ماننا چاہیئے اُس سے بھی کچھ زیادہ مانتے تھے، انجیل کو بھی مانتے تھے لیکن ایسے غلط طریقے پر مانتے تھے جس میں شرک ملا ہوا تھا اور جو اللہ اور رسول کی اصل تعلیم کے خلاف تھا، اسی وجہ سے اس آیت میں قرآن مجید نے اس کو اُن کا کفر قرار دیا، اور وہ کفر کے مجرم یعنی کافر قرار دئے گئے ــــــ ہر عربی شناس جانتا ہو کہ اس آیت میں اہل تثلیث مسیحیوں کو رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن مجید کے انکار کی وجہ سے کافر نہیں کہا گیا ہو بلکہ خدا اور اُس کے رسول مسیح اور روح القدس کو تثلیث کے رنگ میں ماننے کی وجہ سے کفر کا مجرم قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خدا اور رسول کو ماننے کی بعض صورتیں اتنی غلط اور گمراہانہ بھی ہو سکتی ہیں، جو بجائے خود کفر و ضلال ہوں۔ اس لئے اسلام میں وہی ماننا معتبر ہے جو اس قسم کی غلطیوں سے پاک ہو ــــــ اس کو دوسرے لفظوں میں اور مثبت انداز میں

یوں کہا جائے گا کہ اسلام میں اللہ کو ماننے کا مطلب یہ ہو کہ اسکو ذات وصفات کے لحاظ سے اس طرح مانا جائے جس طرح قرآن مجید نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلایا ہو اور رسول کے ماننے کا مطلب یہ ہو کہ اس کو خدا کا پیغمبر اور اللہ کی مرضی کا ترجمان یقین کرتے ہوئے واجب الاطاعت مانا جائے، جس عقیدے اور جس عمل کو وہ غلط قرار دے اس کو غلط اور جس کو صحیح قرار دے اسکو صحیح مانا جائے۔ الغرض اپنے علم و فکر کو اُس کے پیغمبرانہ علم کے تابع کر دیا جائے۔ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (النساء ۔ ع ۹) اور ہر پیغمبر ہنے اسی واسطے بھیجا کہ بحکم خداوندی اسکی اطاعت اور تابعداری کی جائے۔

اسی طرح کتاب یعنی قرآن کا ماننا یہ ہو کہ اسکو اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب ہدایت یقین کرتے ہوئے اس کی ہر بات کو حق اور قول فیصل مانا جائے، وہ جس کو حق و ہدایت کہے اسے حق و ہدایت اور جس کو باطل اور گمراہی قرار دے اسکو باطل اور گمراہی یقین کیا جائے، جن باتوں کو وہ حلال بتائے ان کو حلال اور جن کو حرام تبلائے ان کو حرام مانا جائے اور اس کو خدا کا لاریب ہدایت نامہ یقین کرتے ہوئے اپنے علم و عمل کو اس کا تابع کر دیا جائے۔

اس مختصر وضاحت کے بعد ونوبا بھاوے جی کی خدمت میں گزارش ہو کہ انھیں اپنے بارہ میں کسی دوسرے سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود اپنے باطن اور اپنی روح سے پوچھیں کہ انھوں نے خدا، رسول اور کتاب کو اس طرح مانا ہو یا نہیں، اگر مانا ہو تو یقیناً وہ مسلمان ہیں اور انھیں مسلمان بننے کے لئے کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں سوا اس کے جو ہر مسلمان کے لئے کرنا ضروری ہو —— اور اگر ابھی انھوں نے اللہ و رسول اور کتاب کو اسلام کے مطالبہ کے مطابق نہیں مانا ہو تو اُن کے مسلمان ہونے میں بس اتنی ہی کمی ہو جتنی اس ماننے میں کمی ہے ——

بھاوے جی کے سوال کے جواب میں جو کچھ ہمیں عرض کرنا تھا وہ ہم عرض کر چکے —— اسکے بعد ہم اُن کے اس سوال سے صرف نظر کر کے عرض کرتے ہیں —— کہ مختلف ذرائع سے ہمیں ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہو اسکی بنا پر ہم ان کو اسلام سے بہت قریب سمجھتے ہیں اور اس پہلو سے بھی ہمارے دل میں ان کی بڑی عظمت ہو۔

معارف الحدیث

(مُسلسل)

کتابُ الزکوٰۃ

دین میں زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کا مقام :-

یہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے کہ شہادتِ توحید و رسالت اور اقامتِ صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ قرآن مجید میں ستر سے زیادہ مقامات پر اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کا ذکر اس طرح ساتھ ساتھ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ان دونوں کا مقام اور درجہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض علاقوں کے ایسے لوگوں نے جو بظاہر اسلام قبول کر چکے تھے اور توحید و رسالت کا اقرار کرتے اور نمازیں پڑھتے تھے زکوٰۃ سے انکار کیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جہاد کا اسی بنیاد پر فیصلہ کیا تھا کہ یہ نماز اور زکوٰۃ کے حکم میں تفریق کرتے ہیں جو اللہ و رسول کے دین سے انحراف اور ارتداد ہے ـــــ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مشہور روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا

وَاللّٰهِ لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۔	خدا کی قسم نماز اور زکوٰۃ کے درمیان جو لوگ تفریق کریں گے میں ضرور ان کے خلاف جہاد کروں گا۔

پھر تمام صحابہ کرام نے انکے اس نقطۂ نظر کو قبول کرلیا اور اس پر سب کا اجماع ہوگیا۔

اسی سلسلہ میں معارف الحدیث کی پہلی جلد کے بالکل شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں مسلسل ذکر کی جا چکی ہیں جن میں آپ نے اسلام کے ارکان اور بنیادی احکام و مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے توحید و رسالت کی شہادت کے بعد اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ ہی کا ذکر کیا ہے، ——— بہرحال قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و خطبات میں اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا ذکر عموماً اس طرح ساتھ ساتھ کیا گیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا درجہ قریب قریب ایک ہی ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی خاص رابطہ ہے۔

زکوٰۃ کے تین پہلو:-

زکوٰۃ میں نیکی اور افادیت کے تین پہلو ہیں ——— ایک یہ کہ مومن بندہ جس طرح نماز کے قیام اور رکوع و سجود کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی بندگی اور تذلل و نیازمندی کا مظاہرہ جسم و جان اور زبان سے کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت اور اس کا قرب اس کو حاصل ہو۔ اسی طرح زکوٰۃ ادا کرکے وہ اس کی بارگاہ میں اپنی مالی نذرانہ اسی غرض سے پیش کرتا ہے اور اس بات کا عملی ثبوت دیتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اسے اپنا نہیں بلکہ خدا کا سمجھتا اور یقین کرتا ہے اور اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے وہ اس کو قربان کرتا اور نذرانہ چڑھاتا ہے ——— زکوٰۃ کا شمار "عبادات" میں اسی پہلو سے ہے۔ دین و شریعت کی خاص اصطلاح میں "عبادات" (جیسے کہ پہلے بھی اپنے موقع پر ذکر کیا جا چکا ہے) بندہ کے انہی اعمال کو کہا جاتا ہے جن کا خاص مقصد و موضوع اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے عبدیت اور بندگی کے تعلق کو ظاہر کرنا اور اس کے ذریعہ اس کے رحم و کرم اور اس کا قرب ڈھونڈھنا ہو۔

دوسرا پہلو زکوٰۃ میں یہ ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کے ضرورت مند اور پریشاں حال بندوں کی خدمت و اعانت ہوتی ہے، اس پہلو سے زکوٰۃ "اخلاقیات" کا نہایت

اہم باب ہے۔

تیسرا پہلو اس میں افادیت کا یہ ہے کہ حُبّ مال اور دولت پرستی جو ایک ایمان کُش اور نہایت مہلک روحانی بیماری ہے۔ زکوٰۃ اس کا علاج اور اس کے گندے اور زہریلے اثرات سے نفس کی تطہیر اور تزکیہ کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (توبہ ع ۱۳)

اے نبی آپ مسلمانوں کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجیے جس کے ذریعہ ان کے قلوب کی تطہیر اور ان کے نفوس کا تزکیہ ہو۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى۔ (سورۃ اللیل)

اور اس آتش دوزخ سے وہ نہایت متقی بندہ دور رکھا جائے گا جو اپنا مال راہِ خدا میں اس لیے دیتا ہو کہ اس کی روح اور اس کے دل کو پاکیزگی حاصل ہو۔

بلکہ زکوٰۃ کا نام غالباً اسی پہلو سے زکوٰۃ رکھا گیا ہے کیونکہ زکوٰۃ کے اصل معنی ہی پاکیزگی کے ہیں۔

زکوٰۃ کا حکم اگلی شریعتوں میں:۔

زکوٰۃ کی اس غیر معمولی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے اس کا حکم اگلے پیغمبروں کی شریعتوں میں بھی نماز کے ساتھ ہی ساتھ برابر رہا ہے۔

سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حضرت اسحاق اور پھر ان کے صاحبزادے حضرت یعقوب علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ

اور ہم نے ان کو حکم بھیجا نیکیوں کے کرنے کا (خاصکر) نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا

وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ ۝ اور وہ ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔

(انبیاء ع ۵)

اور سورۂ مریم میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے

وَكَانَ يَامُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ۔ (مریم ع ۴) اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔

اور اسرائیلی سلسلہ کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم کے متعلق ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے فرمایا۔

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَمَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا۔ (مریم ع ۲)

میں اللہ کا ایک بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے اور نبی بنایا ہے اور جہاں کہیں میں ہوں مجھے اس نے بابرکت بنایا ہے اور جب تک میں زندہ رہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی ہے۔

اور سورۂ بقرہ میں جہاں بنی اسرائیل کے ایمانی میثاق اور اُن بنیادی احکام کا ذکر کیا گیا ہے جن کی ادائیگی کا اُن سے عہد لیا گیا تھا اُن میں ایک حکم یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ ع ۱۰) اور نماز قائم کرتے رہنا اور زکوٰۃ ادا کیا کرنا۔

اسی طرح جہاں سورۂ مائدہ میں بنی اسرائیل کے اس عہد و میثاق کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی فرمایا گیا ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ (مائدہ ع ۳)

اور اللہ نے فرمایا میں (اپنی مدد کے ساتھ) تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم قائم کرتے رہے نماز اور ادا کرتے رہے زکوٰۃ اور ایمان لاتے رہے میرے رسولوں پر۔

قرآن مجید کی ان آیات سے ظاہر ہے کہ نماز اور زکوٰۃ ہمیشہ سے آسمانی شریعتوں کے

خاص ارکان اور شعائر رہے ہیں، ہاں ان کے حدود اور تفصیلی احکام و تعینات میں فرق رہا ہے اور یہ فرق تو خود ہماری شریعت کے بھی ابتدائی اور آخری تکمیلی دور میں رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے نماز تین وقت کی تھی پھر پانچ وقت کی ہوگئی۔ اور مثلاً یہ کہ پہلے ہر فرض نماز صرف دو رکعت پڑھی جاتی تھی پھر فجر کے علاوہ باقی چار وقتوں میں رکعتیں بڑھ گئیں۔ اور مثلاً یہ کہ ابتدائی دور میں نماز پڑھتے ہوئے سلام کلام کی اجازت تھی اس کے بعد اس کی ممانعت ہوگئی — اسی طرح ہجرت سے پہلے مکہ کے زمانۂ قیام میں زکوٰۃ کا حکم تھا۔ (چنانچہ سورۂ مومنون، سورۂ نحل اور سورۂ لقمان کی بالکل ابتدائی آیتوں میں اہل ایمان کی لازمی صفات کے طور پر اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے۔ حالانکہ یہ تینوں سورتیں مکی دور کی ہیں) لیکن اس دور میں زکوٰۃ کا مطلب صرف یہ تھا کہ اللہ کے حاجت مند بندوں پر اور خیر کی دوسری راہوں میں اپنی کمائی صرف کی جائے، نظام زکوٰۃ کے تفصیلی احکام اس وقت نہیں آئے تھے وہ ہجرت کے بعد مدینۂ طیبہ میں آئے۔ پس جن مورخین اور مصنفین نے یہ لکھا ہے کہ زکوٰۃ کا حکم ہجرت کے بعد دوسرے سال میں یا اس کے بھی بعد میں آیا، اُن کا مطلب غالباً یہی ہے کہ اس کی حدود و تعینات اور تفصیلی احکام اس وقت آئے، ورنہ زکوٰۃ کا مطلق حکم تو یقیناً اسلام کے ابتدائی دور میں ہجرت سے کافی پہلے آچکا تھا، یہ بات قرآن مجید کی محولۂ بالا مکی سورتوں کی اُن آیات کے علاوہ جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے بھی ثابت ہوتی ہے جس میں انھوں نے حبشہ کی ہجرت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت جعفر طیار کی اُس گفتگو کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے سوال کے جواب میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعارف میں کی تھی، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تعلیم کے بارہ میں اُن کے یہ الفاظ بھی ہیں۔

وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ..... الخ — اور وہ ہمیں نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں۔

اور یہ معلوم ہے کہ جعفر طیار اور ان کے رفقاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے

بہت پہلے اسلام کے ابتدائی دور میں حبشہ جا چکے تھے۔

اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق شاہ روم کے سوال کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق (اس وقت کے آپ کے شدید دشمن) ابوسفیان کا یہ بیان کہ

يَأْمُرُنَا بِالصَّلوٰةِ وَالزَّكوٰةِ — وہ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں اور صلہ

وَالصِّلَةِ وَالْعَفَافِ... الخ — رحمی اور پاکدامنی کی ہدایت کرتے ہیں۔

اس کا واضح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں بھی نماز اور زکوٰۃ کی دعوت دیتے تھے ـــــ ہاں نظامِ زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل اور حدود و تعینات ہجرت کے بعد آئے اور مرکزی طور پر اس کی تحصیل وصول کا نظام ۲ھ کے بعد قائم ہوا۔

اس تمہید کے بعد زکوٰۃ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پڑھیے۔

ایمان اور نماز کے بعد زکوٰۃ کی دعوت :-

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ اِنَّكَ تَاْتِيْ قَوْمًا اَهْلَ كِتَابٍ فَادْعُهُمْ اِلٰى شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاِيَّاكَ وَكَرَائِمَ اَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰہِ حِجَابٌ۔

ـــــــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) کو یمن کی طرف بھیجا تو (رخصت کرتے ہوئے ان سے) فرمایا کہ تم وہاں ایک صاحب کتاب قوم کے پاس پہونچو گے (جب تم ان کے پاس پہونچو) تو سب سے پہلے ان کو اس کی دعوت دینا کہ وہ (اس حقیقت کو مانیں اور) اس کی شہادت ادا کریں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں اور محمد اس اللہ کے رسول ہیں، پھر اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو تم ان کو بتلائیو کہ اس اللہ نے تم پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں پھر اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتلائیو کہ اللہ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کی ہے جو ان میں کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور انہی میں کے فقراء اور غرباء کو دے دی جائے گی، پھر اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو (زکوٰۃ کی اس وصولیابی کے سلسلہ میں چھانٹ چھانٹ کے) اُن کے اچھے نفیس اموال لینے سے پرہیز کرنا (بلکہ اوسط کے حساب سے وصول کرنا اور اس بارہ میں کوئی ظلم و زیادتی کسی پر نہ کرنا) اور مظلوم کی بد دعا سے بچنا کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی روک نہیں ہے (وہ بلا روک ٹوک سیدھی بارگاہ خداوندی میں پہونچتی ہے اور قبول ہوتی ہے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ حدیث اگرچہ اس سلسلۂ معارف الحدیث کی پہلی جلد کتاب الایمان میں گزر چکی ہے اور وہاں اس کی تشریح بھی کافی تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ لیکن امام بخاریؒ وغیرہ کے طریقہ پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ کتاب الزکوٰۃ کا آغاز بھی اسی حدیث سے کیا جائے۔

حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا والی اور قاضی بنا کر بھیجے کا یہ واقعہ جس کا ذکر اس حدیث میں ہے اکثر علماء اور اہل سیر کی تحقیق کے مطابق ۹ھ ہجری کا ہے اور امام بخاریؒ اور بعض دوسرے اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ ۱۰ھ کا واقعہ ہے ـــ یمن میں اگرچہ اہل کتاب کے علاوہ بُت پرست مشرکین بھی تھے۔ لیکن اہل کتاب کی خاص اہمیت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر کیا اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا یہ حکیمانہ اصول تعلیم فرمایا کہ اسلام کے سارے احکام و مطالبات ایک ساتھ مخاطبین کے سامنے نہ رکھے جائیں۔ اس

صورت میں اسلام انھیں بہت کٹھن اور ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہوگا، اس لیے پہلے ان کے سامنے اسلام کی اعتقادی بنیاد صرف توحید و رسالت کی شہادت رکھی جائے جس کو ہر معقولیت پسند اور ہر سلیم الفطرت اور نیک دل انسان آسانی سے ماننے پہ آمادہ ہو سکتا ہے خصوصاً اہلِ کتاب کے لیے وہ جانی پوجھی بات ہے ـــــ پھر جب مخاطب کا ذہن اور دل اس کو قبول کرلے اور وہ اس فطری اور بنیادی بات کو مان لے تو اس کے سامنے فریضۂ نماز رکھا جائے جو جانی، جسمانی اور زبانی عبادت کا نہایت حسین اور بہترین مرقع ہے، اور جب وہ اس کو قبول کرلے تو اس کے سامنے فریضۂ زکوٰۃ رکھا جائے اور اس کے بارہ میں خصوصیت سے یہ وضاحت کردی جائے کہ یہ زکوٰۃ اور صدقہ اسلام کا داعی اور مبلغ تم سے اپنے لیے نہیں مانگتا بلکہ ایک مقررہ حساب اور قاعدہ کے مطابق جس قوم اور علاقہ کے دولت مندوں سے یہ لی جائے گی اسی قوم اور علاقہ کے پریشاں حال ضرورت مندوں میں خرچ کردی جائے گی ـــــ دعوتِ اسلام کے بارہ میں اس ہدایت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یہ تاکید بھی فرمائی کہ زکوٰۃ کی وصولی میں پورے انصاف سے کام لیا جائے، اُن کے مویشی اور ان کی پیداوار میں سے چھانٹ چھانٹ کے بہتر مال نہ لیا جائے ـــــ سب سے آخر میں نصیحت فرمائی کہ تم ایک علاقہ کے حاکم اور والی بن کے جارہے ہو، ظلم و زیادتی سے بہت بچیو، اللہ کا مظلوم بندہ جب ظالم کے حق میں بددعا کرتا ہے تو وہ سیدھی عرش پر پہونچتی ہے ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن   اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید

اس حدیث میں دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں صرف شہادت توحید و رسالت اور نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے اسلام کے دوسرے احکام حتیٰ کہ روزہ اور حج کا بھی ذکر نہیں فرمایا گیا ہے جو نماز اور زکوٰۃ ہی کی طرح اسلام کے ارکان خمسہ میں سے ہیں حالانکہ حضرت معاذ جس زمانہ میں یمن بھیجے گئے ہیں روزہ اور حج دونوں کی فرضیت کا حکم آچکا تھا ـــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مقصد دعوت اسلام کے اصول اور حکیمانہ طریقہ کی تعلیم دینا تھا اس لیے آپ نے صرف ان تین ارکان کا ذکر فرمایا، اگر ارکانِ اسلام کی

تعلیم دینا مقصود ہوتا تو آپ سب ارکان کا ذکر فرماتے، لیکن حضرت معاذ کو اس کی تعلیم کی ضرورت نہیں تھی وہ ان صحابۂ کرام میں سے تھے جو علم دین میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا عذاب:-

(۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَلَمْ يُؤَدِّ زَكٰوتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ يَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ (يَعْنِىْ بِشِدْقَيْهِ) ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ ثُمَّ تَلَا وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الْآيَة ——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے دولت عطا فرمائی پھر اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں ادا کی تو وہ دولت قیامت کے دن اس آدمی کے سامنے ایسے زہریلے ناگ کی شکل میں آئے گی جس کے انتہائی زہریلے پن سے اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہوں اور اس کی آنکھوں کے اوپر دو سفید نقطے ہوں (جس سانپ میں یہ دو باتیں پائی جائیں وہ انتہائی زہریلا سمجھا جاتا ہے) پھر وہ سانپ اس (زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے بخیل) کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا (یعنی اس کے گلے میں لپٹ جائے گا) پھر اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا (اور کاٹے گا) اور کہے گا کہ میں تیری دولت ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں ——— یہ فرمانے کے بعد ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔	اور نہ گمان کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس مال و دولت میں جو اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو دیا ہے (اور اس کی زکوٰۃ نہیں نکالتے) کہ وہ مال د

(آل عمران ع ۱۹) دولت ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ انجام کے لحاظ سے وہ ان کے لیے بدتر ہے اور شرہو قیامت کے دن ان کے گلوں میں طوق بنا کے ڈالی جائے گی وہ دولت جس میں انھوں نے بخل کیا (اور جس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی) (صحیح بخاری)

تشریح) قرآن وحدیث میں خاص خاص اعمال کی جو مخصوص جزائیں یا سزائیں بیان کی گئیں ہیں ان اعمال اور ان کی ان جزاؤں اور سزاؤں میں ہمیشہ کوئی خاص مناسبت ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ ایسی واضح ہوتی ہے جس کا سمجھنا ہم جیسے عوام کے لیے بھی زیادہ مشکل نہیں ہوتا اور کبھی کبھی وہ ایسی دقیق اور خفی مناسبت ہوتی ہے جس کو صرف خواص عرفا اور اُمت کے اذکیا رہی سمجھ سکتے ہیں ـــــــ اس حدیث میں زکوٰۃ نہ دینے کے گناہ کی جو خاص سزا بیان ہوئی ہے یعنی اس دولت کا ایک زہریلے ناگ کی شکل میں اس کے گلے میں لپٹ جانا اور اس کی دونوں باچھوں کو کاٹنا۔ یقیناً اس گناہ اور اس کی سزا میں بھی ایک خاص مناسبت ہے ـــــــ یہ وہی لطیف مناسبت ہے جس کی وجہ سے اُس بخیل آدمی کو جو حبّ مال کی وجہ سے اپنی دولت سے چمٹا رہے اور خرچ کرنے کے موقعوں پر خرچ نہ کرے، کہتے ہیں کہ وہ اپنی دولت اور اپنے خزانے پر سانپ بنا بیٹھا رہتا ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے بخیل و خسیس آدمی کبھی کبھی اس طرح کے خواب بھی دیکھتے ہیں۔

اس حدیث میں نیز آل عمران کی مندرجہ بالا آیت میں "یوم القیٰمۃ" کا جو لفظ ہے اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دوزخ یا جنت کے فیصلہ سے پہلے محشر میں ہوگا، حضرت ابوہریرہ ہی کی ایک دوسری حدیث میں (جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے) زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے ایک خاص طبقہ کے اسی طرح کے ایک خاص عذاب کے بیان کے ساتھ آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ الْعِبَادِ فَيُرَىٰ — اس عذاب کا سلسلہ اس وقت تک جاری

سَبِيلَهٗ إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ وَإِمَّا إِلَى النَّارِ۔

رہے گا جب تک کہ حساب کتاب کے بعد بندوں کے بارہ میں فیصلہ کیا جائے گا۔ اس فیصلہ کے بعد یہ آدمی یا جنت کی طرف چلا جائے گا یا دوزخ کی طرف (جیسا بھی اس کے حق میں فیصلہ ہوگا)

یعنی جتنا عذاب وہ حساب اور آخری فیصلہ سے پہلے اٹھا چکے گا اگر اس کی بد اعمالی کی سزا کے لیے اللہ کے نزدیک وہی کافی ہوگا تو اس کے بعد اس کو چھٹی اور نجات مل جائے گی اور وہ جنت میں بھیج دیا جائے گا اور اگر محشر کے اس عذاب سے اس کا حساب بے باق نہ ہوا ہوگا تو مزید سزا اور عذاب پانے کے لیے وہ دوزخ میں بھی بھیجا جائے گا۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا وَاغْفِرْ لَنَا وَلَا تُعَذِّبْنَا۔

قیامت اور جنت دوزخ کے عذاب و ثواب کے بارہ میں جو اصولی باتیں معارف الحدیث جلد اول میں لکھی جا چکی ہیں جن حضرات کی نظر سے نہ گزری ہوں وہ ان کا ضرور مطالعہ کریں، ان چیزوں کے بارے میں جو ذہنی الجھنیں بہت سوں کے لیے خلجان کا باعث بنتی ہیں ان شاء اللہ وہ اس کے مطالعہ سے دور ہو جائیں گی۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا خَالَطَتِ الصَّدَقَةُ مَالًا قَطُّ إِلَّا أَهْلَكَتْهُ۔

——— رواہ الشافعی والبخاری فی تاریخہ والحمیدی فی مسندہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ مالِ زکوٰۃ جب دوسرے مال میں مخلوط ہوگا تو ضرور اس کو تباہ کرے گا۔ (مسند شافعی، تاریخ کبیر بخاری، مسند حمیدی)

تشریح) امام حمیدی جو امام بخاری کے استاذ ہیں انھوں نے اپنی مسند میں حضرت عائشہ کی یہ روایت نقل کر کے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی آدمی پر زکوٰۃ واجب ہو اور وہ اس کو ادا نہ کرے تو بے برکتی سے اس کا باقی مال بھی تباہ ہو جائے گا۔[1]

[1] مسند حمیدی شائع کردہ مجلس علمی جلد اول صفحہ ۱۱۵۔

اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں امام احمد بن حنبلؒ کی سند سے حضرت عائشہ کی یہی روایت نقل کر کے لکھا ہو کہ امام احمد فرماتے تھے کہ اس حدیث کا مطلب اور مصداق یہ ہے کہ اگر ایک غنی آدمی (جو زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے) غلط طریقے پر زکوٰۃ وصول کرلے تو یہ زکوٰۃ اسکے باقی مال میں شامل ہو کر اس کو بھی تباہ کر دے گی ——— راقم سطور عرض کرتا ہے کہ حدیث کے الفاظ میں ان دونوں تشریحوں کی گنجائش ہے اور ان دونوں میں کوئی تناقص اور منافات بھی نہیں ہے۔

تجلیات مجدد الف ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

از۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۹۹) میر محمد نعمان اکبر آبادی کے نام

[چند استفسارات کے جواب میں ایک طویل مکتوب ہے۔ یہاں درمیان کے کچھ حصے کا ترجمہ کیا گیا ہے۔]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

...... تم نے دریافت کیا ہے کہ اس کا کیا سبب ہے کہ (اکثر) انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرامؒ دنیا کے اندر بلاء و مصیبت میں مبتلا رہے جیسا کہ حدیث میں بھی ہے۔ اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ بَلَاءً الانبیاءُ ثُمَّ الاولیاءُ ثُمَّ الامثلُ فالامثل (اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی سب سے زیادہ اور سخت مصائب انبیاء علیہم السلام جھیلتے ہیں پھر اولیاء و صالحین پھر درجہ بدرجہ نیک بندے ....

...... ہونا یہ چاہیے تھا کہ غیر انبیاء و اولیاء، اشدّ بلا اور اشدّ مصائب میں گرفتار ہوتے نہ کہ انبیاء و اولیاء ــــــ علاوہ ازیں انبیاء و اولیاء اصالۃً و طبعاً محبوبانِ حق اور خواص مقربان باری تعالیٰ میں سے ہیں۔ بلائیں اور مصیبتیں اپنے محبوبوں اور مقربان

خاص کے حصے میں کر دینا اور اُن کو تکلیفوں میں مبتلا کرنا کس طریقے سے درست ہوگا؟ (کہ ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں) دشمن ناز و نعمت میں اور دوست بلا و مشقت میں، آخر اس میں کیا سِر ہے؟

اللہ تعالیٰ تم کو صراط مستقیم دکھائے سنو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا ناز و نعمت کیساتھ زندگی گذارنے اور لذت حاصل کرنے کی جگہ نہیں ہے، اس کام کے لئے آخرت ہے اسی کو ناز و نعمت اور تلذذ کے لئے بنایا گیا ہے اور چونکہ دنیا و آخرت آپس میں ایک دوسرے کی ضد و نقیض ہیں اور ایک کی خوشی دوسرے کی ناخوشی کو مستلزم ہے اس لئے ان دونوں میں سے کسی ایک کے اندر تلذذ (لذت پانا) دوسرے کے اندر تالم (الم و غم پانے) کو مستلزم ہوگا۔ پس جو شخص دنیا میں زیادہ لذت یاب اور ناز و نعمت میں پرورش پائے ہوگا آخرت میں الم یاب اور ندامت مآب ہوگا۔ اسی طرح جو دنیا میں بلاؤں کے اندر زیادہ مبتلا رہا ہوگا آخرت میں نعمت و لذت سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہوگا۔ بقائے دنیا کی نسبت بقائے آخرت کے مقابلے میں اتنی بھی تو نہیں ہے جتنی قطرے کو سمندر سے نسبت ہے، اور متناہی کو غیر متناہی سے نسبت آخر ہو بھی کیا سکتی ہے؟ پس تقاضائے کرم خداوندی ہوا کہ دوستوں کو دنیا میں چند روزہ مشقت اور سختی میں مبتلا رکھا جائے تاکہ تنعمات ابدی سے (آخرت میں) خوش وقت ہوں ــــ اور دشمنوں کے استدراج کے طور پر ضروری ہوا کہ اُن کو لذات قلیلہ سے خوش کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کے رنج ہائے گوناگوں میں گرفتار ہوں۔ اگر سوال کیا جائے کہ ایک نادار و مفلس کافر تو دنیا و آخرت دونوں جگہ محروم ہے اس کو دنیا میں الم نصیب ہوا اور آخرت میں یہ امر اس کی لذت یابی کا باعث نہ ہوا اسکا سبب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ کافر، دشمن خدا ہے وہ تو عذاب دائمی کا مستحق ہے۔ دنیا میں اس سے عذاب کو اُٹھا لینا اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا بھی اُس کے حق میں بڑی نعمت و لذت یابی اور بڑا احسان ہے (حدیث میں) اسی بنا پر کافر کے حق میں دنیا کو جنت فرمایا گیا ہے.......

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے دوستوں کو دنیا

میں بھی لذت یاب کرے اور آخرت میں بھی نعمتیں عطا کرے اور ایک جگہ کی لذت یابی کو دوسرے مقام کی الم یابی لازم نہ ہو۔ اس کے چند جواب ہیں (۱) دوستانِ خدا اگر دنیا میں چند روزہ بلا و مشقت کو نہ جھیلیں تو تنعمات ابدی کی قدر و قیمت نہ پہچانیں اور آخرت کی دائمی صحت و عافیت کی نعمت کو کماحقہٗ نہ سمجھ سکیں۔ بےشک جب تک کوئی بھوک کی مشقت برداشت نہیں کرتا۔ لذت طعام نہیں پاتا اور جب تک گرفتارِ مشاغل نہ ہو، فراغت کی قدر نہیں جانتا۔ پس دنیا کی وقتی الم یابی و مشقت سے مقصود کمالِ لذت دائمی کو حاصل کرنا ہو۔ یہ جمال ہے جو عوام کی آزمائش کے لئے ان بزرگوں کے حق میں بصورتِ جلال نمودار ہوا ہو........

(۲) بلیات، ہرچند عوام کے نزدیک اسبابِ الم یابی میں سے ہیں لیکن ان بزرگوں کے نزدیک جو کچھ بھی جمیل مطلق جلّ شانہٗ کی طرف سے پہونچتا ہو وہ اُن کے لئے اسبابِ لذت یابی میں سے ہے ـــــ وہ بلاؤں سے وہی لذت حاصل کرتے ہیں جو نعمتوں سے کرتے، بلکہ بلاؤں سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ خالص مرادِ محبوب ہوتی ہو نعمتوں میں یہ خلوص نہیں ہوتا کیونکہ نفس، خود نعمتوں کا خواہاں اور بلاؤں سے گریزاں رہتا ہو۔ پس بلا اور کلفت ان اکابر کے نزدیک نعمت سے بہتر ہوتی ہو اور وہ نعمت کے مقابلے میں بلا سے زیادہ لذت حاصل کرتے ہیں، اُن کو کوئی لطف اگر دنیا میں حاصل ہو تو انھیں بلیات و مصائب کی وجہ سے ہے اگر دنیا یہ نمک نہ رکھتی ہوتی تو اُن کے نزدیک ایک جو کے برابر قیمت نہ رکھتی اگر یہ (مصائب کی) حلاوت، دنیا میں نہ ہوتی تو اُن کی نظر میں یہ دنیا بیکار تھی۔ سہ

غرض[عہ] از عشق توام چاشنیٔ دردوغم است ٭ ورنہ زیرِ فلک اسبابِ تنعم چہ کم است

پس درحقیقت دوستانِ خدا دنیا میں بھی لذت یاب ہیں اور آخرت میں بھی محظوظ و مسرور ـــــ اور یہ لذتِ دنیا، لذتِ آخرت کے منافی بھی نہیں ہو وہ اور لذت ہے جو لذتِ آخرت سے جنگ رکھتی ہے وہ عوام کو حاصل ہے ـــ الٰہی! یہ کیا عجیب معاملہ ہے جو تو نے اپنے دوستوں کے ساتھ کیا ہو جو کچھ دوسروں کے لئے سببِ الم یابی ہے وہ ان کے لئے سبب

عہ تیرے عشق سے میری غرض یہ ہو کہ درد و غم کی چاشنی حاصل ہو جائے ورنہ عیش و عشرت کے سبب دنیا میں کچھ کم نہیں بہت زیادہ ہیں۔

لذت یابی ہے اور جو دوسروں کے لئے زحمت ہے وہ ان کے نزدیک رحمت ہو..... لوگ خوشی میں خوش اور غمی میں غمناک ہوتے ہیں اور یہ بزرگ خوشی میں بھی خوش اور غمی میں بھی خوش ـــــــ اس لئے کہ ان بزرگوں کی نظر، جملہ افعالِ جمیلہ و رذیلہ سے ہٹ کر صرف ان افعال کے (حقیقی) فاعل کے جمال پر جم گئی ہے جو کہ جمیل مطلق ہے ـــــــ فاعلِ حقیقی کی محبت میں اُس کے سارے افعال و تصرفات ان کے لئے محبوب اور لذت بخش ہو گئے ہیں ـــــــ دنیا میں جو کچھ بھی فاعلِ جمیل جلّ سلطانہ کی مشیت کے مطابق صادر ہوتا ہے چاہے وہ از قسم الم و ضرر ہی کیوں نہ ہو وہ ان کے نزدیک عین مراد و محبوب اور لذت یابی کا سبب ہے ـــــــ اے خدا یہ کیا عظیم فضل و احسان ہے کہ ایسی دولت اور نعمتِ خوشگوار اغیار کی آنکھ سے چھپا دی اور اپنے دوستوں کو عطا فرما دی اور برابر ان کو اپنی مُراد پر قائم رکھ کر محظوظ فرمایا اور ناگواری و تکلیف کے احساس کو جو کہ نصیبِ دیگراں ہے ان بزرگوں سے اٹھا دیا ہے...... اور عین نامُرادی میں ان کی مُراد کو ودیعت کر دیا ہے اور اس نقد حاصل ہونے والے سرور کو ـــــــ برخلاف دیگراں ـــــــ سبب ترقیاتِ آخرت بنا دیا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

(۳) تیسرا جواب یہ ہو کہ دُنیا، مقام امتحان ہے یہاں (بظاہر) حق باطل کے ساتھ اور اور اہلِ حق، اہلِ باطل کے ساتھ ملے جلے اور آمیختہ ہیں اگر دوستوں کو بلا و مشقت نہ دیں اور دشمنوں کو بلا و مشقت دیں تو دوست، دشمن میں تمیز ہو جائے گی اور امتحان و آزمائش کی حکمت ہی باطل ہو جائے گی اور یہ بات ایمان بالغیب کے مُنافی ہو اور سعادت دُنیویہ و اُخرویہ ایمان بالغیب کے اندر رکھی گئی ہیں ـــــــ

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ۔ اور لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ـــ

ان آیتوں میں اسی حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے ـــــــ پس دشمنوں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر دوستوں کو بھی بلا و مشقت میں گرفتار کر دیا تاکہ حکمت آزمائش پوری ہو جائے

ف تاکہ جان لے اللہ تعالیٰ اس شخص کو جو مدد کرے اللہ کے دین کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے۔ بیشک اللہ تعالیٰ قوی و غالب ہے۔

اور دوست عین بلا میں لذت یاب ہوں اور کور باطن، دشمن خائب و خاسر ہوں....... انبیاء کا معاملہ کفار کے ساتھ یوں ہی رہا کہ کبھی غلبہ اُن کا ہوا کبھی اِن کا ــــ چنانچہ جنگ بدر میں اہل اسلام کو فتح و نصرت نصیب ہوئی اور جنگ اُحد میں اہل کفر کو غلبہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِن یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ[1]۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ ہر چند اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر قادر و توانا ہے وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ دوستوں کو یہاں بھی ناز و نعم عطا فرمائے اور وہاں بھی، لیکن یہ بات منافی حکمت اور منافی عادت خداوندی ہے اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ اپنی قدرت کو اپنی حکمت و عادت کے اندر پوشیدہ رکھے اور اسباب و علل کو اپنی جناب قدس کے لئے پردہ پوش بنائے ــــ پس دنیا و آخرت کے آپس میں نقیض ہونے کی وجہ سے دوستانِ حق کو دنیا کی مصیبتوں اور اور بلاؤں کے بغیر چارہ کار نہیں ــــ تاکہ آخرت کی نعمتیں اُن کو خوشگوار ہوں۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ اصل سوال کے جواب میں اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے ــــ........

.... تم نے یہ بھی لکھا تھا کہ لوگ تمسخر کے طور پر کہتے ہیں کہ حضرتِ حق جل مجدہٗ اپنے دوستوں کو کیوں مشقت و بلا میں رکھتا ہے اور کیوں ہمیشہ ناز و نعم میں نہیں رکھتا؟ اُن کا مقصد اس بات سے جماعت فقراء پر اعتراض کرنا ہے" ــــ کفار بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اسی قسم کی باتیں کہا کرتے تھے چنانچہ قرآن مجید میں ہے ــــ

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا اَوْ یُلْقٰۤی اِلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ

---

[1] اگر تمہیں زخم پہونچے پس جماعت کفار کو بھی ایسے ہی زخم پہونچ چکے ہیں اور ہم ان حوادث کو ادھر اُدھر کرتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان بہت سے فوائد کے لئے ــــ اور تاکہ متمیز کر دے خدا مومنوں کو اور شہادت دے تم میں سے بعض کو اور اللہ تعالیٰ ستمگاروں کو دوست نہیں رکھتا ــــ اور تاکہ خالص کر دے اللہ تعالیٰ مومنوں کو اور گھٹا دے کافروں کو۔

لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا[1]

اس قسم کی باتوں کا دار ومدار انکار آخرت اور انکار عذاب و ثواب دائمی پر ہو نیز اس وجہ سے بھی یہ باتیں کہی جاتی ہیں کہ دنیا کی فانی لذتوں پر ان معترضین کو اعتبار اور بھروسہ ہوتا ہو، جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور عذاب و ثواب آخرت کو دائمی جانتا ہو دنیا کی چند روزہ سختی اس کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہوتی ۔ بلکہ یہ وقتی اور عارضی مشقت و مصیبت جو کہ راحتِ ابدی کا سبب بنتی ہے اُس کو عین راحت معلوم ہوتی ہو تم ان لوگوں کی گفتگو کی طرف دھیان نہ دو ـــــــ بلا و مصیبت کا وارد ہونا (اللہ تعالیٰ کے اپنے دوستوں کے ساتھ) محبت پر شاہد عدل ہے اگر لوگ اس کو منافی محبت تصور کریں تو کیا کیا جا سکتا ہے ـــــــ سوائے اس کے کہ جاہلوں سے اور ان کی گفتگو سے سے اعراض و پرہیز کیا جائے اور کوئی علاج نہیں ہے ۔ پس تم صبر جمیل اختیار کرو ـــــــ

اصل سوال کا جواب دیگر یہ ہے کہ بلا و مصیبت محبوب کی طرف سے ایک تازیانہ ہو جو محب صادق کو ماسوا کی طرف التفات کرنے سے باز رکھتا ہے اور پورے طریقے سے درگاہِ محبوب حقیقی کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے ۔ اس لحاظ سے بھی ورودِ بلا کے شایان شان، دوستان حق ہی ہوں گے یہ بلا و مصیبت ماسوا کی طرف اُن کی توجہ کا کفارہ ہو گی ـــــــ دوسرے لوگ اس دولت کے لائق نہیں ہیں اُن کو کیوں بزور و قوت جانبِ محبوب لایا جائے؟ جس کسی کو چاہتے ہیں بزور و قوت اپنی جانب کھینچتے ہیں اور محبوبیت کے درجے پر فائز کر دیتے ہیں اور جس کسی کو نہیں چاہتے اُس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اگر سعادت ابدی رکھتا ہو گا تو انابت و رجوع الی اللہ کے راستے میں ہاتھ پاؤں مار کر بامدادِ فضل و عنایتِ الٰہی وہ بھی اپنے مقصد کو پہونچ جائے گا ورنہ وہ جانے اور اس کا کام ـــــــ

اے اللہ تو مجھے ایک پل بھی میرے نفس کے سپرد نہ کرنا ـــــــ

[1] کفار نے کہا کہ کیا ہو اس رسول کی یہ بات کہ یہ کھاتا پیتا ہو اور خرید فروخت کے لئے بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہو ـــ اس کے پاس ایک فرشتہ کو کیوں نہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ ہو کر ڈرانے والا ہوتا یا اس کے لئے ایک خزانہ ڈالا گیا ہوتا یا ایک گنجان اور تر و تازہ باغ اس کو دیا جاتا جس سے یہ پھل کھاتا ـــــ

پس معلوم ہوا کہ جو شخص مُراد و محبوب ہوتا ہے اُس کے لئے مُرید و محب کے مقابلے میں بلا زیادہ نامزد ہوتی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جو کہ رئیسِ مُراداں و محبوباں ہیں فرماتے ہیں "میں جتنا اللہ کے راستے میں تکلیف پہونچایا گیا ہوں کسی نبی کو اتنی تکلیف نہیں پہونچائی گئی" ——— پس بلا ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے کہ اپنے حُسنِ رہنمائی سے دوست کو دوست تک پہونچاتی ہے اور غیر دوست کی طرف التفات کرنے سے روکتی ہے ——— ....

مسلم ممالک میں پرسنل لا اور جدید تمدن کے پیدا کئے ہوئے قابل غور مسائل

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

اس شمارہ کے افتتاحیہ میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے جس اجتماع کا ذکر آیا ہے، مندرجہ ذیل مقالہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بحیثیت داعی کے اس میں پڑھا تھا۔ اس اجتماع کا کچھ تعلق مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی اس تحریک سے بھی تھا جس نے پچھلے دنوں ملک میں بڑی اہمیت اختیار کی۔ اس سلسلہ میں مسلم ممالک کا نام بھی لیا گیا تھا۔ مولانا نے اپنے اس مقالہ میں خصوصیت سے دکھایا ہے کہ پرسنل لا کے مسئلہ میں مسلم ممالک میں کیا ہوتا رہا ہے۔

حضرات علماء کرام و مندوبین محترم! اس وقت جبکہ ہم جدید تمدن کے پیدا کردہ مسائل اور خاص کر اُس مسلم پرسنل لا پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو برطانوی عہد سے لیکر اس وقت تک ہندوستان میں رائج ہے اور جس پر ایک طویل مدت سے عمل کیا جا رہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دوسرے مسلم ممالک میں اس قانون کی صورت حال، اس پر عمل درآمد کی کیفیت اس کے ارتقاء و تغیرات پر بھی نظر ڈال لیں اور ان تبدیلیوں اور ترمیمات کا بھی تاریخی جائزہ لیں جو مختلف صحیح و غلط محرکات و مقاصد اور حکومتوں کے صحیح و غلط رجحان اور دباؤ کے ماتحت اس نصف صدی کی مدت میں پیش آتے رہے ہیں، یہ مسئلہ اس لیے بھی اہم اور ضروری ہو گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا کی تشکیل جدید یا ترمیم و اصلاح کے سلسلہ میں ان مسلم ممالک کا بکثرت حوالہ دیا گیا ہے۔

آپ جیسے حضرات اہل علم واہل فکر کی موجودگی میں اس بات کا اظہار اور اس کی تفصیل قطعاً غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی قانون، اسلامی اقتدار کے عہد میں ان دو شعبوں میں منقسم نہیں تھا جن میں وہ مغربی اثر و اقتدار کے زمانے میں منقسم ہو گیا ہے۔ یعنی "سول لا" اور "پرسنل لا" اور مسلمان عرب ممالک کی اصطلاح میں "قضاء مدنی" اور "قضاء شرعی" پہلے اسلامی قانون اور اسلامی ممالک کا نظام قضاء ایک وحدت اور جزء لا یتجزیٰ تھا جس کا ماخذ کتاب و سنت اور فقہ کا ذخیرہ تھا جسکو اجمالی طور پر شریعت اسلامی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، تیرہویں صدی ہجری میں جب سلطنت عثمانی میں اضمحلال پیدا ہوا اور بڑھتے ہوئے مغربی نفوذ کے سامنے اس نے بھی ہتھیار ڈالنے شروع کیے تو قضا کو ان دو شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا، پرسنل لا کو الاحوال الشخصیۃ" کا نام دیا گیا، سول لا کے لیے بھی ۱۲۸۶ھ میں ایک مرتب قانون تعزیرات ہند کی طرح مرتب کیا گیا اس قانون میں علیحدہ علیحدہ دفعات کی شکل میں قانون کو پیش کیا گیا تھا، اس میں ۱۸۵۱ دفعات ہیں اور وہ فقہ حنفی کی کتابوں کے معاملات کے حصے سے ماخوذ اور اس پر مبنی ہیں یہ "قانون" عام کتب فقہ کی طرح "کتابوں" اور "ابواب فقہی" پر منقسم ہے لیکن احکام کی تفصیل نمبر وار دفعات میں کی گئی ہے جیسا کہ جدید قوانین اور کوڈ (CODE) میں نظر آتا ہے، اس "قانون" میں بعض وقتی مصالح اور زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کی بنا پر ان بعض اقوال کو اختیار کیا گیا ہے جو فقہ حنفی میں مرجوح قرار دیے گئے ہیں، اس مجموعے میں ۱۶ "کتابیں" ہیں۔ ہر کتاب کے تحت میں ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت میں فصول۔ قانون کی ابتدا کتاب البیوع سے ہوتی ہے اور تکمیل کتاب القضاء پر، اس مجموعے کی ابتدا ایک وضاحتی نوٹ سے ہوتی ہے جس کا عنوان ہے "لائحۃ الاسباب الموجبۃ" گویا اس میں اس قانونی اقدام کے محرکات وموجبات اور اس کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد ایک تفصیلی مقدمہ ہے جو دو مقالات پر مشتمل ہے، مقالہ اولیٰ فقہ کی تعریف و تقسیم پر ہے، مقالۂ ثانیہ میں وہ قواعد کلی بیان کئے گئے ہیں جن میں سے ہر قاعدہ ایک مستقل بالذات فقہی اصل ہے، جس سے بہت سے فقہی احکام متفرع ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں مرتبین قانون نے ۹۹ قواعد کلی بیان کیے ہیں، ان قواعد کا اندازہ کرنے کے لیے دو قواعد کی مثال پیش کی

جا سکتی ہے۔ ایک جو پہلے قاعدہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے "الامور بمقاصدها"
دوسرا جو آخری ہے "من سعی فی نقض ما تم من جهته فسعیه مردود علیه"
شعبان ۱۲۹۳ھ کو ایک فرمان سلطانی کے ذریعے اس قانون کا اعلان کیا گیا اور پوری دولت عثمانیہ کی عدالتوں میں اس پر عمل کرنا اور اس کے مطابق فیصلے صادر کرنا ضروری قرار دیا گیا اس طرح یہ پوری وسیع سلطنت عثمانیہ کا عدالتی قانون بن گیا، اور چونکہ فرمانِ سلطانی سے اس کا نفاذ ہوا تھا اس لیے اس کے مخالف جو آرار اور فتاوی کتب فقہیہ میں درج تھے وہ قابل عمل نہیں رہے۔ اس مجموعے کی خصوصیات حسن ترتیب، نمبر شمار، وضاحت وعبارت کی سہولت کے علاوہ یہ تھی کہ اس میں ہر مسئلے میں ایک ہی قول پر اکتفا کیا گیا تھا اور فقہار کے ان اختلافات اور فقہی اقوال کو جو قدیم متون اور شروح کی خصوصیت ہیں نظر انداز کر دیا گیا تھا لیکن اس مجموعے کی شروح میں ان اختلافات اور فقہی اقوال کو جگہ دی گئی، اس کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا کہ ہر مسئلہ کو اس کی اس جگہ پر درج کیا جائے جہاں اس زمانہ میں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور جہاں عصر جدید کا آدمی اس کو تلاش کرے گا، مثلاً عقد مضاربہ کا ذکر کمپنیوں کے تحت میں ملے گا، اس لیے کہ دراصل مضاربۃ بھی ایک شرکت عقد ہے جس میں ایک فریق کا راس لمال ہوتا ہے دوسرے فریق کی محنت اور عمل،

اسی طرح کی ایک قانونی کوشش، اسی طرح کی ایک وسیع اسلامی سلطنت میں (جو نسلی طور پر بھی آل عثمان سے کچھ زیادہ دور نہ تھی) تین صدی پہلے کی گئی، میری مراد سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی فقہ کی تدوین جدید کی اس کوشش سے ہے جو ہندوستان میں فتاوی عالمگیری اور اسلامی ممالک میں "الفتاوی الهندیة" کے نام سے معروف ہے اور جس سے آخر آخر دور تک مصر و شام جیسے ملکوں میں بھی بڑا استفادہ کیا گیا، سلطان دین پناہ (نور الله مرقدہ) نے اس کے لیے اپنے عہد کے ممتاز ترین علمار و فقہار کی ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔
مصنف "الثقافة الاسلامية فی الهند" اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"۔۔۔ فتاوی عالمگیری جسے " فتاوی ہندیہ " کہا جاتا ہے

کثرت مسائل، سہل طرز نگارش اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے لیے نہایت مفید کتاب ہے۔ مصر و شام اور بلاد عرب میں یہ فتاویٰ ہندیہ کے نام سے مشہور ہے، اس کی چھ بڑی بڑی جلدیں ہیں، جنھیں ہدایہ کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے اور نوادر سے قطع نظر کر کے صرف "ظاہر الروایات" پر اکتفا کی گئی ہے، لیکن جس مسئلہ میں ظاہر الروایۃ نہ مل سکی اس میں نادر روایتوں کی علامت فتویٰ کے تحت بے کم و کاست صاحب عبارت کے حوالہ کے ساتھ اصل عبارت نقل کر دی ہے، فقہائے احناف کی مدد سے اس جمع و تدوین کا کام سلطان اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی عہد سلطنت میں شیخ نظام الدین برہان پوری کے سپرد کیا تھا اور دو لاکھ روپے اس پر صرف کئے تھے۔

مولف مذکور نے ۴۲ ممتاز ہندوستانی علماء کے نام گنائے ہیں، جنھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں حصہ لیا، ان میں سے چار علماء یہ ہیں، قاضی محمد حسین جونپوری محتسب، شیخ علی اکبر حسینی، اسعد اللہ خانی شیخ حامد ابن ابو حامد جونپوری اور مفتی محمد اکرم حنفی لاہوری ان چاروں علماء نے تدوین کے کام کی ملکر نگرانی کی۔"

دولت عثمانیہ کے اس قانونی مجموعے کا نام جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے: "مجلۃ الاحکام الشرعیۃ" ہے جسکو عموماً "المجلہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مصر میں نپولین بونا پارٹ کے (۱۷۹۸ء) حملہ کے بعد ہی سے "پرسنل لا" "الاحوال الشخصیۃ" کے دائرہ کے علاوہ شہری زندگی کے تمام دائروں میں فرانسیسی قانون کو اختیار کر لیا گیا تھا۔ مصر و عراق اور دولت عثمانیہ کی دوسری ماتحت ریاستوں میں "مجلۃ الاحکام الشرعیۃ" پر عمل ہوتا رہا۔ شام میں ۸ مارچ ۱۹۴۹ء تک مجلہ ہی پر عمل تھا حسنی زعیم کی حکومت میں جس نے شام میں پہلا فوجی انقلاب کیا تھا اس وقت کے وزیر قانون اسعد کورانی کے مشورے سے (جنھوں نے حوصلہ مند زعیم انقلاب اور فوجی ڈکیٹر کو یہ باور کرایا کہ ملک کے قانون کی تبدیلی اور مغربی قوانین کا اختیار کرنا ان کو

تاریخ میں بقائے دوام بخشے گا اور وہ عرب ملک میں کمال اتاترک کا مقام حاصل کرلیں گے۔) اسلامی قانون کا (جس کی مجلہ نمائندگی کرتا تھا) الغاء ہوا اور مغربی قانون سول لا ملک کا قانون قرار دیا گیا اور ایک گردش قلم سے صدیوں کا پرانا قانون جو ملک وقوم کے مزاج، عقائد، روایات اور تمدن سے ہم آہنگ تھا کالعدم قرار پاگیا، عراق میں بھی اس قانون پر کئی انقلابات آئے۔ مجلہ پر عمل درآمد اگرچہ وہاں بھی عرصے سے موقوف تھا لیکن مشرق وسطیٰ کے مشہور ماہر قانون عبدالرزاق السنہوری کے قبول جو مشرق وسطیٰ کی وحدت قوانین کمیٹی کے صدر تھے۔ عراق کا سول قانون اپنے اندر زیادہ سے زیادہ اسلامی عنصر رکھتا ہے۔ عراق کے ڈکٹیٹر عبدالکریم قاسم نے تو اپنے مختصر عہد حکومت میں "احوال شخصیہ" (پرسنل لا) کے اندر بھی ترمیم و اصلاح کا کام شروع کردیا تھا اور لڑکے اور لڑکی کا حصہ ترکہ میں مساوی قرار دیا تھا لیکن جدید انقلاب کے بعد یہ ترمیم ختم کردی گئی۔ اس وقت مملکت سعودیہ کے علاوہ کہیں بھی اسلامی سول قانون نافذ نہیں ہے۔ مملکت سعودیہ (جہاں بہت حد تک اسلامی حدود و تعزیرات بھی نافذ ہیں) نے ثابت کردیا ہے کہ اس کا نظام عدالت کہیں زیادہ سادہ، مختصر، عملی اور مقاصد قانون سازی کی تکمیل کا زیادہ ضامن اور امن و نظام قائم رکھنے میں زیادہ کامیاب ہے۔

اسلامی ممالک میں صرف پاکستان میں جس کی بنیاد اسلام کے نام پر رکھی گئی ہے اور اس کے بانیوں نے اس کو اسلامی طریق حیات کی ایک نئی تجربہ گاہ اور معمل قرار دیا تھا۔ قانون کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کا آغاز کیا گیا۔ مرحوم نواب زیادہ لیاقت علی خاں نے اسلامی قانون کی تشکیل جدید کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور جس کے ارکان میں ملک کے مشہور عالم و فقیہ مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ تھے لیکن حکومتوں کی تبدیلیوں، پاکستان کے بڑھتے ہوئے تجدد و مغربیت کے رجحانات اور حکومت پاکستان کے غیر واضح اور مبہم مقاصد اور تذبذب کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔ ملک کے تمام قانون عدالت کو اسلامی بنانے کے بجائے وہاں اب مسلّمہ مسلم پرسنل لا کے اندر تصرف و ترمیم کا کام شروع ہوگیا۔ ۱۹۶۱ء میں مسلم فیملی لا آرڈیننس MUSLIM FAMILY LAW ORDINANCE کے نام سے ایک قانون کا اجرا ہوا جس میں تعدد ازدواج، مرد کے لیے طلاق کی آزادی اور دوسرے بعض اختیارات

درآبادیوں پر پابندی عائد کی گئیں اور نصوص صریحہ اور قوانین مسلّمہ میں ایسی مداخلت کی نظیر قائم کی گئی جو غیر اسلامی ممالک کے لیے بھی ایک نئے فتنے کا باعث بن سکتی ہے۔

اب ان ممالک میں مسلم پرسنل لا یا قانون احوال شخصیہ کی کیفیت نفاذ اور ارتقار کا جائزہ لیجئے جہاں یہ قانون زیادہ صحیح شکل میں نافذ ہے، سلطنت عثمانیہ کے قلمرو میں اس قانون کی اساس تمام تر مذہب حنفی تھا اور اس کی تفریعات وتفصیلات میں سراسر اسی مذہب پر دارومدار تھا، لیکن ۸ محرم ۱۳۳۶ھ کو "قانون حقوق العائلۃ" (فیملی لا) کے نام سے ایک آرڈیننس یا ایک ترمیم کا اجرا ہوا اس قانون کی رو سے متعدد مسائل میں ضرورت کے احساس کی بنا پر مذہب حنفی سے عدول کیا گیا اور دوسرے مذاہب کے احکام پر عمل کیا گیا تھا۔ مثلاً شوہر کی بدمعاملگی اور بدسلوکی کی بنا پر زوجین کے درمیان تفریق کا جواز، عورت کو ایسی حالت میں فسخ نکاح کا اختیار دینا کہ شوہر میں کسی مرض مزمن مثلاً جنون، جذام اور سل کا طبی ثبوت حاصل ہو جائے، ایسے مفقود الخبر کی بیوی کو نکاح کی اجازت جو معتدل حالات میں چار سال تک اور جنگ کی حالت میں ایک سال تک غائب رہے، وغیرہ وغیرہ، لیکن اس ترمیم وقانون کے نفاذ کے بعد بھی قانون پر نظر ثانی کی ضرورت، جدید تقاضوں کی رعایت، اور نئی مشکلات کے مداوا کی ضرورت باقی رہی اور وسیع النظر علمار کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہی کہ مسلمان خاندانوں کی بہترین تنظیم، تعلقات کی خوشگواری، معاشرہ کی خوشگواری اور بدلتے ہوئے زمانے کی ضروریات پورا کرنے کے لیے مذاہب اربعہ اور مختلف فقہی مکاتب فکر سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے مصر میں نئے حالات وضروریات کو پورا کرنے کے لیے مذہب حنفی کے علاوہ دوسرے مذاہب سے استفادہ کا فیصلہ کیا گیا اس کی تحریک سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور مذاہب اربعہ کے ممتاز ترین علمار اور نمائندوں کی ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، اور اس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ احوال شخصیہ (پرسنل لا) کا ایک ایسا مجموعہ قوانین مرتب کرے جس کی بنیاد مذاہب اربعہ پر ہو۔ کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا، لیکن جب اسکو علمار اور ماہرین قانون کے سامنے لانے کا وقت آیا، تو اس کی ایسی شدت سے مخالفت ہوئی کہ اسکو

تہ کرکے رکھ دینا مناسب معلوم ہوا، اس کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں پھر ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کے ارکان میں شیخ الازہر، مالکیوں کے سب سے بڑے عالم شیخ المالکیہ، مصر کی سب سے بڑی شرعی عدالت "المحکمۃ العلیا الشرعیہ" کے صدر مصر کے سرکاری مفتی اعظم (مفتی الدیار المصریہ) اور دوسرے علماء تھے اس کمیٹی کا کام محدود تھا، اس کو صرف بعض مسائل احوال شخصیہ کے بارے میں جن میں مذہب حنفی کے (جو مصر کا سرکاری قانون تھا) پابند رہنے سے بعض دقتیں پیدا ہوتی تھیں، قانون مرتب کرنا تھا، اس کمیٹی کی سفارشات پر سنہ ۱۹۲۰ء میں قانون ۲۵ جاری ہوا وہ حسب ذیل اصلاحات و ترمیمات پر مشتمل تھا۔

(الف) نفقۂ زوجیت و عدت کو اس وقت سے دین اور واجب الادا شمار کیا جائے گا جب سے شوہر نے اس سے دست کشی اختیار کی خواہ اس سلسلے میں کوئی عدالتی فیصلہ یا آپس کا سمجھوتہ نہ ہو، اسی طرح سے اس شخص کی زوجہ کے لیے جو نفقہ دینے سے قاصر رہا ہے طلاق طلب کرنے کی اجازت ہوگی، اور ایک مہینہ کی تاجیل کے بعد اس کو طلاق ہو جائے گی، اس طرح سے جس کو نفقہ دینے سے انکار ہو اس کی زوجہ کو اور مفقود الخبر کی زوجہ کو ایسی حالت میں بغیر کسی مہلت و تاجیل کے طلاق ہو جائے گی کہ زوج کے پاس کوئی قائم مالیت نہ ہو۔

(ب) زوجہ کو تفریق کے مطالبہ کا حق ہوگا، اگر وہ اپنے زوج میں کوئی ایسا مستقل عیب محسوس کرے جس سے یا تو صحت یابی ممکن نہ ہو، یا طویل مدت کے بعد ممکن ہو،

(ج) مفقود الخبر میت کے حکم میں شمار کیا جائیگا اور یہ حکم زواج کے ساتھ محدود ہوگا، بشرطیکہ وہ ۴ سال تک واپس نہ آجائے۔ ایسی حالت میں زوجہ وہ عدت پوری کرے گی جو شوہر کی وفات پر کرتی ہے اور اسکو اس مدت کے گذر جانے کے بعد دوسرے مرد سے شادی کرنے کا حق ہوگا۔

یہ اس قانون مذکور کی اہم ترمیمات تھیں جو تمام تر مذہب مالکی سے ماخوذ ہیں؛
پھر سنہ ۱۹۲۹ء میں دوسرا قانون نمبری ۲۵ صادر ہوا جس میں بعض جدید ترمیمات تھیں زیادہ اہم ترمیمات حسب ذیل ہیں:-

(الف) سکران اور مکرہ کی طلاق اور وہ طلاق جسکو فقہ کی اصطلاح میں طلاق غیر المنجز کہتے ہیں معتبر نہ ہوگا جبکہ اس کا مقصود کسی چیز کے کرنے یا کسی فعل کے ترک پر مجبور کرنا ہو،

(ب) ایک سے زائد طلاق لفظاً یا اشارۃً ایک ہی واقع ہوگی،

(ج) طلاق کے کنایات سے طلاق اسی وقت واقع ہوگی جب نیت متحقق ہو۔

(د) ہر طلاق رجعی شمار ہوگی، سوائے اس طلاق کے جو دو رجعی طلاقوں کے بعد واقع ہو اور اس سے تین کا عدد پورا ہوتا ہو اور سوائے اس طلاق کے جو خلوت صحیحہ سے پہلے دی جائے۔ اسی طرح وہ طلاق جو مال کے ساتھ مشروط ہو (الطلاق علی مال) اسی طرح سے طلاق کی وہ صورتیں مستثنیٰ ہوں گی اور وہ طلاق بائن شمار ہوں گی جن کے بائن ہونے کی اس قانون میں اور قانونِ سابق نمبری ۲۵ بابت ۱۹۲۰ء میں تصریح ہے،

(ہ) ضرر اور ناموافقت اور مخاصمت ہونے پر زوجین میں تفریق جائز ہوگی۔

(و) شوہر کے ایک سال یا اس سے زائد مسلسل مفقود الخبر رہنے پر تفریق ہو سکے گی اسی طرح جس مرد کو تین سال یا اس سے زائد مدت کی سزائے قید ہو جائے اس کی زوجہ کو بھی تفریق کا حق ہوگا۔

اسی طرح سے اس قانون میں دعوائے نسب، مطالبہ نفقہ، حق عدت و مہر، حضانت کی مدت اور مفقود الخبر کی مدت کے بارے میں کچھ دوسری دفعات بھی ہیں جن کی تفصیل عالم جلیل پروفیسر عبدالوہاب خلاف کی فاضلانہ کتاب "احکام الاحوال الشخصیہ" کے صفحہ ۲۸۹ تا ۲۹۲ سے معلوم ہو سکتی ہے۔

۱۹۴۳ء میں احکام میراث کا نیا قانون نمبری ۷۷ صادر ہوا پھر ۱۹۴۶ء میں بعض احکام وقف کی تنظیم جدید کے لیے قانون ۴۸ اور قانون ۷۱ صادر ہوا جو وصیت کے تمام قوانین و احکام پر مشتمل ہے اس وقت تک مصر میں (ہمارے علم میں) پرسنل لا کا کوئی ایسا مکمل قانون نہیں بنا جو تمام مسائل و احکام پر حاوی ہو اس حیثیت سے یہ کام سب سے پہلے سوریہ میں ہوا۔ اور سب سے پہلے یہ قدم شام کی وزارت قانون نے اٹھایا۔

اس نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں محکمہ قانون کے ایک لائق رکن استاذ علی طنطاوی کو جو اس وقت دومہ دمشق کے قاضی شرعی تھے اور اب عدالت عالیہ محکمۃ التمییز کے مستشار ہیں قانون احوال شخصیہ (پرسنل لا) پر نظر ثانی کرنے اور رپورٹ پیش کرنے کا کام سپرد کیا، اگلے سال ۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو وزارت قانون نے صاحب موصوف کو مصر کے قوانین اور اس کا مطالعہ کرنے کے لئے کہ مصر میں "احوال شخصیہ" اور قانون میراث و وصیت میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں مصر بھیجا استاذ علی طنطاوی نے مصر میں ایک سال رہ کر مسئلے کا مطالعہ کیا اس کے بعد اپنی سفارشات اور ریمارکس پیش کیے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۴۹ء کو وزارت قانون نے ماہرین فن کی ایک کمیٹی مقرر کی جو ان سفارشات پر غور کرے، دو سال بعد ۱۹۵۱ء میں اس کام کی تکمیل اور اس کو آخری قانونی شکل دینے کے لیے ایک دوسری کمیٹی کا تقرر کیا۔ اس کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا اور احوال شخصیہ کا ایک ترمیم شدہ قانون وزارت قانون کے سامنے پیش کیا لیکن دمشق کے بہت سے علماء نے اس نئی قانونی شکل کے خلاف احتجاج کیا جس میں مذہب حنفی سے کئی جگہ عدول کیا گیا تھا، اس احتجاج و مخالفت کے نتیجہ میں دو سال تک اس کا نفاذ ملتوی رہا بالآخر، ا ستمبر ۱۹۵۳ء کو اس کا اجراء ہوا اور وہ حکومت سوریہ کا قانون احوال شخصیہ قرار دیا گیا،

لبنان میں قدیم اسلامی قانون پر اب بھی عمل ہو رہا ہے۔ جو ترکی سلطنت کے دور میں حقوق العائلہ (فیملی لا) کے نام سے صادر ہوا تھا جس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ اس ملک میں ابھی تک کوئی نیا پرسنل لا نہیں بنا، چند سال ہوئے بعض انجمنوں اور بعض حلقوں کی طرف سے پُر زور طریقے پر مطالبہ کیا گیا تھا کہ احوال شخصیہ کا ایک ایسا قانون مرتب کیا جائے جس میں وحدت ہو اور جو ملک کے تمام فرقوں پر یکساں نافذ ہو لیکن مسیحی کلیسا اور علماء اسلام کے مشترک احتجاج و مخالفت کی بنا پر یہ تحریک ختم ہو گئی اور حکومت نے کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔

عراق میں جہاں سنی اور شیعہ دو بڑے فرقے پائے جاتے ہیں ۱۹۴۷ء میں وزارت قانون نے ایک قانون کا اجراء کیا تھا جس کا نام "لائحۃ الاحوال الشخصیۃ" تھا، یہ دراصل عراق کے قانون مدنی کا محض ایک ضمیمہ اور تکملہ تھا، اور وہ احوال شخصیہ سے متعلق تمام احکام پر مشتمل بھی نہیں تھا، اس میں اس کی تصریح تھی کہ شیعہ عدالتوں میں مذہب جعفری کے احکام پر عمل کیا جائیگا

یہ قانون درحقیقت اس قانون احوال شخصیہ کا اختصار تھا جس کو مرحوم قدری پاشا نے سلطنت عثمانیہ کے دور میں مرتب کیا تھا اور جو تمام تر مذہب حنفی سے ماخوذ ہے۔ عراق کے متعلق تفصیلات معلوم کرنے کے لیے استاذ حسین علی الاعظمی کی کتاب "الاحوال الشخصیۃ" کے پہلے حصے کے مقدمہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

جہاں تک شام کا تعلق ہے جہاں سب سے زیادہ سنجیدہ اور ذمہ دارانہ طریقہ پر نظر ثانی کا کام انجام پایا اور وہاں سب سے زیادہ مکمل و مرتب قانون احوال شخصیہ نافذ ہے ان قانونی تفصیلات و ترمیمات کے معلوم کرنے کے لیے شام کے مشہور فاضل اور دینی رہنما ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی پروفیسر قانونِ احوال شخصیہ دمشق یونیورسٹی کی فاضلانہ کتاب "شرح قانون الاحوال الشخصیۃ" (۱-۲-۳) کا مطالعہ مفید ہوگا، مجھے اس کے اظہار میں مسرت ہے کہ اس مقالہ کی بیشتر معلومات اسی کتاب کے حصہ اول کے مقدمہ اور اپنے دوسرے فاضل دوست الاستاذ مصطفےٰ احمد الزرقاء استاذ حقوق مدنیہ و شریعت اسلامیہ، لا کالج دمشق و سابق وزیر قانون حکومت شام، کی قابل فخر کتاب "المدخل الفقھی العام" کے حصہ اول کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں۔

حضرات! ہندوستان کے "مسلم پرسنل لا" پر غور اور نظر ثانی کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کا جائزہ لے لیا جائے کہ دوسرے مسلم ممالک میں اس سلسلہ میں اس وقت تک کیا کیا کام کیا گیا ہے اور کس طرز پر کیا گیا ہے، اگر ضرورت ہو تو ان علمی کاوشوں اور اس علمی ذخیرے سے جو ان ملکوں میں مہیا ہو گیا ہے۔ مناسب طریقہ پر فائدہ اٹھایا جائے، یہ بات اس لئے بھی ضروری تھی کہ خوش قسمتی سے ابھی مصر و شام میں چند اہم علمی ادارے اور دینی مرکز موجود ہیں۔ جہاں تک علمی شخصیتوں کا تعلق ہے مصر میں علامہ محمدؐ ابو زہرہ کی نہایت اہم و جلیل القدر علمی شخصیت ہے جو نہ صرف اپنی وسعت نظر میں خاص امتیاز رکھتے ہیں بلکہ علمی و دینی استقامت میں بھی پایۂ بلند رکھتے ہیں۔ انھوں نے متعدد مواقع پر مصر کے حدود سے تجاوز کرنے والے متجددانہ رجحانات اور شیخ الازہر کی جیسی مرکزی شخصیت کے بعض علمی آراء اور "اجتہادات" کا بڑی پامردی اور دلیری سے مقابلہ کیا ان کی فاضلانہ کتاب "الاحوال الشخصیۃ" ہمارے لئے خاص طور پر قابل استفادہ ہے، شام میں ڈاکٹر مصطفےٰ السباعیؒ استاذ مصطفےٰ الزرقاء

اور ڈاکٹر معروف الدوالیبی کی شخصیت بڑی نمایاں اور ممتاز ہے، ان کا وسیع علم، قدیم وجدید سے واقفیت اور دماغی توازن، ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو بھی کام کیا جائے گا اس میں ہم اپنے ان نامور معاصر علماء کے مفید مشوروں اور مخلصانہ محنتوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

اس علمی وسعت نظر اور وسعت قلب کے ساتھ جو ہمارا دینی فریضہ اور علماء سلف کی روایت و وراثت ہے ہم اس حقیقت کا بھی برملا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے لیے کوئی مسلم ملک قطعی وکلی طور پر واجب الاتباع اور واجب التقلید نہیں اور نہ کسی ملک کے جدید رجحانات، نئے قوانین اور حکومت کے فیصلے ہمارے اوپر حجت بن سکتے ہیں۔ ماسوا اس بات کے کہ یہ کوئی شرعی اور فقہی دلیل نہیں، "قانون اسلامی کے مآخذ اور اس کی بنیادیں کتاب وسنت، اجماع وقیاس عالمگیر و دائمی ماخذ ہیں، اور انھیں کی روشنی میں اس زمانہ میں کام ہوا ہے اور آئندہ کام ہوگا اور ماسوا اس بات کے کہ ایک مسلمان پر کسی دوسرے مسلمان کا عمل یا رجحان حجت نہیں بن سکتا حجت صرف اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت صحیحہ اور استنباط مسائل کے وہ ماخذ اور سرچشمے ہیں جن پر کسی ملک یا قوم کی اجارہ داری نہیں ہے اور امام احمد بن حنبلؒ کی زبان سے نکلا ہوا یہ فقرہ اب بھی فضا میں گونج رہا ہے اور قیامت تک گونجتا رہے گا کہ ایتونی بشئی من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتی اقول بہ، ماسوائے ان سب حقائق کے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خود ہندوستان اپنی ایک مستقل ومنفرد علمی ودینی شخصیت رکھتا ہے۔ عالم اسلام کی دینی وعلمی تاریخ میں اس کا اپنا ایک مقام رہا ہے جب سارے عالم اسلام پر فکری اضمحلال و علمی انحطاط کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور کوئی ایسی شخصیت وہاں نہیں پیدا ہو رہی تھی جو متوسط علمی سطح سے بلند ہو، اور کوئی مجتہدانہ فکر یا نئی علمی تحقیق پیش کرسکے تو ہندوستان نے ایسے باکمال اور مجتہد الفکر علماء ومصنف پیدا کیے جن کے علمی تفرد اور مجتہدانہ قابلیت کا سکہ عرب وعجم نے مان لیا اور علمی وتدریسی حلقے عرصہ تک ان کی کتابوں اور ان کے متوں کی شروح سے گونجتے رہے۔ علامہ محمود جونپوری، ملا محب اللہ بہاری، مولانا عبدالعلی بحر العلوم، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں، عصر حاضر میں بھی مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے فقیہ النفس عالم پیدا کیے جو اس اہم کام کی تکمیل کے لیے نہایت موزوں تھے، پھر اس سب کے ماسوا ہندوستان نے دینی استقامت، فکری توازن اور رسوخ فی العلم کا ایسا ثبوت دیا کہ وہ دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کے لیے ایک قابل تقلید مثال بن گیا، اور آج بھی عرب اور قدیم اسلامی ممالک کے اہل علم و اہل فکر ہندوستان کی طرف عظمت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بہت سے مسائل میں اس سے دینی و علمی رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں اس لیے کسی ایسے مسئلہ میں جس میں غلط تجدد، مغربی افکار و اقدار سے مرعوبیت، قانون سازی میں سطحیت و عجلت صاف جھلکتی ہو اور شرعی اصول اس کی تائید نہ کرتے ہوں، ہمارے لیے کسی بڑے سے بڑے مسلمان یا عرب ملک کا کوئی فعل یا قانون حجت نہیں بن سکتا، اگر سارا عالم اسلام کسی غلط چیز پر اتفاق کرلے اور سارے مسلمان ممالک اور وہاں کے علماء کوئی غلط فیصلہ کریں یا اپنے حدود سے تجاوز کریں تو بھی ہم ہندوستانی مسلمان، شریعت اسلامی کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے اور خدا کے قانون کو آخری قانون سمجھتے رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ سارا عالم اسلام بھی دین و شریعت سے انحراف کرے تو بھی کسی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کے لیے بھی یہ انحراف حجت اور وجہ جواز نہیں ہوگا۔ لیکن خدا کا شکر ہے سوائے ترکی کے کہیں بھی مجموعی طور پر انحراف نہیں کیا گیا ہے۔ تیونس اور پاکستان میں البتہ بعض ایسی تبدیلیاں زیر بحث ہیں جو بڑے دوررس نتائج و اثرات رکھتی ہیں اور ان میں سے بعض نصوص صریحہ اور اجماع و تواتر کے خلاف ہیں اس لیے اس سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مسلم ممالک کا نام بار بار لینا بے سود اور بے محل ہے اور ہم اس ذہنیت کو بہت غلط سمجھتے ہیں کہ ان ممالک کا نام لے کر ہندوستان میں اصلاح قانون شخصی اور تجدد کی دعوت دی جائے۔

دوسرے ہم پوری قوت کے ساتھ اس بات کو بھی واضح کردینا چاہتے ہیں کہ یہ کام تنہا ماہرین فن اصحاب اختصاص اور ان علماء کرام کا ہے جو ہر قسم کے دباؤ اور نفوذ سے آزاد ہیں، اور ہر غلط رجحان اور خام خیالی سے محفوظ ہیں۔ یہ کام خالص علمی انداز پر آزادانہ فضا میں اور پورے

اخلاص، سنجیدگی و گہرائی، غور و فکر، مشورے و تعاون کے ساتھ ہونا چاہئے اور درحقیقت اس مجلس کا انعقاد اسی راہ کا پہلا قدم ہے، خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی علمی و دینی ذمہ داریاں اچھے طریقے پر ادا کریں اور قبل اس کے کہ یہ کام غلط طریقہ پر ہو ہم صحیح طریقے پر انجام دینے کی توفیق پائیں۔

حضرات! مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کے ماسوا جس پر غور کرنے کی اور اس کی تکمیل اور تدوین جدید کی ضرورت اپنی جگہ پر ہے۔ بہت سے ایسے مسائل ہیں جو جدید تمدن، نئی علمی ترقیات جدید معاشیات، اور عالمی نظام اقتصاد و تجارت نے پیدا کر دیئے ہیں اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جس کو ان مسائل سے واسطہ پڑ رہا ہے اور وہ دینی ذہن و احساس رکھتا ہے یا دینی تعلیمات و احکام کے مطابق زندگی گذارنا چاہتا ہے۔ شدت سے ان کے بارے میں علماء کی رہنمائی کا منتظر اور بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا ہے کہ ان کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرے، درحقیقت یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا، اور ان مسائل پر اجتماعی طور پر غور ہونا چاہئے تھا، مجھے اپنے فاضل دوست استاذ مصطفیٰ الزرقا کی اس رائے سے بالکل اتفاق ہے کہ اس زمانہ میں انفرادی اجتہاد اور شخصی اظہار رائے بہت خطرناک ہے اور اس سے بڑے انتشار اور نئے نئے فتنوں کا اندیشہ ہے۔ ان مسائل پر مستند و محتاط علماء کو اجتماعی طور پر غور کرنا چاہیئے اور اجتماعی طور پر اپنا فیصلہ دینا چاہئے ان میں سے بہت سے مسائل ہیں جو مدت دراز سے پیش ہیں اور مسلمان مختلف طریقوں پر ان پر عمل کر رہے ہیں لیکن ابھی تک عالم اسلام کے علماء نے اجتماعی طور پر ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا نہ کسی ایسی تعداد میں علماء نے متفقہ طور پر اظہار رائے کیا جس سے کسی مسلمان کو اطمینان قلب اور یہ اعتماد حاصل ہو کہ یہ فیصلہ قابل عمل اور موجب اطمینان ہے۔ نیا بینک سسٹم، کمپنیوں کے قوانین، حکومتوں کے پرائیوٹ فنڈ، انشورنس، تنسیخ زمینداری، تحدید ملکیت، تامیم (NATIONALISATIOM) اور ایسے کئی مسائل تقریباً ہر ملک میں درپیش ہیں، پھر جدید وسائل سفر اور ان کی رفتار کی سرعت نے عبادات و فرائض کے متعلق کئی نئے مسائل پیدا کر دئے ہیں، ان سب میں علماء و فقہاء امت کے فوری غور و فکر اور زیادہ سے زیادہ حد تک اجتماعی فیصلے کی ضرورت ہے۔

بہت عرصے کے انتظار کے بعد اور بڑی غیر مناسب تاخیر کے ساتھ ہم نے ندوۃ العلماء میں اس سلسلے کے آغاز کا ارادہ کیا، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کام کے لئے یہاں مختلف سہولتیں مہیا ہیں۔ دوسرے یہ کام شروع سے ندوۃ العلماء کے بانی نظیانیوں کے پیش نظر تھا اور اس کے سالانہ اجلاسوں اور تقریروں میں وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا رہا ۱۹۲۶ء کے اجلاس کانپور میں صدر اجلاس مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں خاص طور پر اس ضرورت کا اظہار کیا اور ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور رہنماؤں کو اس کی طرف توجہ دلائی حکیم صاحب نے فرمایا :۔

> "—— مسلمانوں کے ہاتھ میں علم فقہ ایک ایسا مضبوط اور اعلےٰ قانون ہے کہ ان واجب الاحترام ہستیوں کی جنھوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، ہر ایک غور کرنے والا انسان دل سے عزت اور قدر کر سکتا ہے، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ جزئیات فقہ میں زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے وہ حضرات علماء کرام مناسب تبدیلیاں کر سکتے ہیں جن کا علم و فضل انھیں اس قسم کے تغیرات کی اجازت دے سکتا ہے ——"

ان خصوصیتوں کے پیش نظر ہم نے سر دست دار العلوم ندوۃ العلماء کو اس کا مرکز بنایا ہے اور ایک مستقل تحقیقی شعبہ کی حیثیت سے یا جدید اصطلاح میں ایک علمی اکیڈمی کے طور پر اس کام کو شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہاں بیٹھ کر آسانی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان کے اکابر اہل علم سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے بلکہ مصر و شام و عراق کے فضلاء سے بھی رابطہ قائم کر کے ان کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم کو اس کام کو شروع کرنے اور اس کو علمی انداز میں جاری رکھنے کے لیے ایک ایسے فاضل کا تعاون حاصل ہو گیا ہے جنھوں نے اس سلسلے میں خاص طور سے غور کیا ہے اور اس سلسلہ میں کچھ عرصے سے کام بھی کر رہے ہیں۔ میری مراد مولانا محمد تقی صاحب امینی سے ہے جو اس وقت ہماری مجلس میں شریک ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہم کو اس کام کے لیے ان کی رفاقت حاصل رہے

گی اور ہم ان کی علمی و ذہنی صلاحیتوں اور ان کے مطالعہ و تجربات سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ خدا اس کام کو بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچائے اور ہم کو ہر قسم کی بے اعتدالیوں، شرور نفس اور انحراف و تحریف سے محفوظ رکھے اور جادۂ شریعت پر استقامت کے ساتھ قائم رکھے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هدیتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب،

حرمین شریفین کی حاضری

محمد منظور نعمانی

(۳)

مدینہ طیبہ حاضری یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ ہم لوگ ۱۲ر ذی الحجہ (مطابق ۱۵ر مئی) بدھ کے دن اشراق کے وقت مدینہ طیبہ پہونچ گئے تھے ہم نے یہ سفر پرائیویٹ ٹیکسی سے کیا تھا اور اس میں صرف ہم پانچ رفیق تھے، یہ عاجز، حکیم عبد القوی صاحب دریا بادی، قاری سلیمان صاحب، ملک الٰہی بخش صاحب اور مولوی محمد انور صاحب سندھی قاری صاحب اور ملک صاحب مولانا احمد عبد اللہ المیمنی کے مکان پہ قیام کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس ناچیز نے اور حکیم صاحب نے قیام کے بارہ میں کوئی قطعی فیصلہ ابھی تک نہیں کیا تھا قاری صاحب کے مشورہ پر یہ طے کیا گیا کہ فی الحال تو ہم بھی اپنا اسباب مولانا احمد عبد اللہ صاحب ہی کے مکان پر رکھ دیں، اس کے بعد اطمینان سے قیام کے بارہ میں فیصلہ کر لیا جائے گا قاری صاحب کا مولانا سے بہت خاص تعلق ہے اس ناچیز کے بھی وہ قدیمی مخلص دوستوں میں ہیں پہلے بمبئی قیام رہتا تھا اب ۱۲-۱۳ سال سے حجاز مقدس میں مقیم ہیں پہلے چند سال مکہ معظمہ میں رہے اب مدینہ طیبہ میں قیام ہے، مسجد نبوی کے باب جبرئیل سے بالکل قریب کرایہ کے ایک مکان میں درویشانہ طور پر رہتے ہیں، مدینہ طیبہ میں تبلیغی کام، تبلیغی جماعت اور اس کے مرکز مسجد نور سے خاص تعلق رکھتے ہیں، بلکہ غالباً وہی وہاں کی جماعت کے امیر اور اس کے کاموں کے خاص ذمہ دار ہیں۔ باب مجیدی کی جانب مدرسۃ العلوم الشرعیہ کے دار الاقامہ کے قریب گزارہ کے لیے ایک چھوٹی سی دوکان بھی کر رکھی ہے، مولانا کے مکان کی نیچے کی منزل میں کچھ حجاج کا قیام تھا، دوسری منزل میں خود مولانا اور ان کے اہل و عیال مقیم تھے اس دوسری منزل کے اوپر بھی بہت مختصر سی برائے نام مکانیت تھی، ہم لوگوں کے پہونچنے پر انہوں نے اپنے اہل و عیال

کو تیسری ہی منزل میں منتقل کردیا۔ اور دوسری منزل ہمارے واسطے خالی کردی۔ اسی وقت ہم لوگوں کے لیے ناشتہ اور چائے کا انتظام کیا۔ ہم لوگوں میں سے بعض نے غسل کیا اور بعض نے صرف وضو کیا، کپڑے بدلے اور چائے ناشتہ سے فارغ ہو کے مسجد نبوی حاضر ہوئے

<u>مسجد نبوی میں پہلی حاضری</u> مسجد شریف کے تمام دروازوں میں روضۂ اقدس اور ریاض الجنۃ سے سب سے زیادہ قریب باب جبریل ہی ہے۔ اور مولانا احمد عبداللہ صاحب کے مکان اور باب جبریل کے درمیان فاصلہ ۲۵۔۳۰ قدم سے زیادہ نہ ہوگا مسجد شریف میں داخلہ کے بعد سب سے پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھیں اور اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم پر کہ یہاں حاضری کی دولت نصیب فرمائی سجدہ شکر ادا کیا، اس کے بعد سلام عرض کرنے کے لیے مواجہہ شریف میں حاضر ہوئے یعنی روضۂ اقدس کی قبلہ کی جانب والی جالی کے سامنے خاص اس جگہ پہونچے جہاں کھڑے ہونے والا زائر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کے بالکل سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ آپ سے ایمانی رابطہ رکھنے والوں کی یہاں پہونچ کر جو حالت ہوتی ہے صحیح یہ ہے کہ وہ الفاظ و بیان میں آنے والی چیز نہیں ہے۔

بلاشبہ خانۂ کعبہ کا مقام بہت بلند ہے اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص نسبت ہے۔ وہ اس کی خاص الخاص تجلی گاہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں اس کو "بَیْتِیَ" (میرا گھر) کہا ہے۔ قیامت تک کے لیے اس کو ایمان والوں کا قبلہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم ہے روضۂ اقدس کے مکین رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی کی طرف رخ کرکے نمازیں پڑھتے تھے، اس کا طواف کرتے تھے، اس کے ایک حصے (ملتزم) سے اس طرح لپٹ کے جس طرح بچہ ماں کی چھاتی سے لپٹ جاتا ہے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے تھے، اس کے ایک گوشہ میں لگے ہوئے سیاہ پتھر کے ایک ٹکڑے (حجر اسود) کو بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ چومتے تھے۔ الغرض خانہ کعبہ کی یہ ساری عظمتیں برحق ہیں اور زمین و آسمان کی اس پوری کائنات میں کسی مسجد، کسی معبد اور کسی مقدس مقام کو یہ رتبہ حاصل نہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حق ہے کہ خانۂ کعبہ اللہ تعالیٰ کا مسکن نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا مکین نہیں ہے۔ وہ بس اس کی خاص تجلی گاہ ہے اور اس نے اپنی خاص الخاص نسبت کا شرف اس کو بخش دیا ہے مگر روضۂ اقدس اس کے حبیب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن و مرقد اور آپ کی

آرام گاہ ہے آپ پر ایمان رکھنے والا زائر جب مواجہہ اقدس میں پہونچتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اور بالکل آپ کے روبرو حاضر ہوں اور اگرچہ درمیان میں دیوار اور زمین کے پردوں کے حائل ہونے کی وجہ سے آپ کے چہرۂ انور کو دیکھ نہیں رہا ہوں لیکن آپ میرا سلام اور میری عرض معروض بہ نفس نفیس سن رہے ہیں تو اس کا ایک عجیب حال اور عجب کیف ہوتا ہے، خاص کر مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد مواجہہ شریف کی پہلی حاضری میں آپ کے بعض امتیوں پر اس حال اور کیف کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ ان کے ہوش وحواس بھی پوری طرح قائم نہیں رہتے اور سوائے اس کے کہ آنکھوں سے آنسو گراتے ہوئے اور لرزتے کانپتے ہوئے بس سلام عرض کر سکیں، کچھ بھی عرض کرنے پر اس وقت قدرت نہیں رہتی، لیکن بعض بندگان خدا اس کیف وتاثر کے باوجود اپنے ہوش وحواس قائم رکھنے میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، اس وقت انکا احساس یہ ہوتا ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت کو نہیں پایا۔ اور اس دنیوی حیات میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضری کی دولت اور شرف زیارت وصحبت ہم حاصل نہیں کر سکے لیکن اس وقت کی یہ حاضری بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت اور ہماری انتہائی خوش بختی ہے، وہ اس وقت یقین کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اسی جسد مقدس کے ساتھ جس کے ساتھ آپ قریباً چودہ سو برس پہلے اس دنیا میں آپ رونق افروز تھے اس خواب گاہ میں آرام فرما ہیں ہر تعلق رکھنے والے زائر کا سلام بہ نفس نفیس سن رہے ہیں اور عنایت وشفقت کے ساتھ جواب دے رہے ہیں ان بندگان خدا کے سامنے اس وقت قرآن مجید کی وہ آیت رحمت بھی ہوتی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ:۔

إِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (الانعام ع ۶)	اے نبی جب تمہارے پاس ہمارے ایمان والے بندے آئیں تو آپ انکو سلام کہیں اور یہ خوشخبری سنا دیں، کہ تمہارے مالک وپروردگار نے اپنے ذمہ رحمت مقرر کر لی ہے اور یہ فیصلہ فرما دیا ہے، کہ تم میں سے جب کسی سے کوئی برا عمل یا کوئی گناہ، جہالت ونادانی سے سرز

ہو جائے پھر وہ اس سے توبہ کرے اور اپنے کو
درست کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دینے والا
اور رحمت فرمانے والا ہے۔

بہرحال وہ بندگانِ خدا اپنے اس یقین و احساس اور ان تصورات کے ساتھ مواجہہ شریف میں کھڑے ہو کر باادب اور با دیدۂ نم سلام نیاز عرض کرتے ہیں، اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو گواہ بنا کر ایمانی عہد و میثاق اور معاہدۂ بیعت کی تجدید کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی و تبلیغی جد و جہد اور راہ خدا میں آپ کی محنتوں قربانیوں کی گواہی دیتے ہیں، پچھلے گناہوں سے توبہ و استغفار اور آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور آپ کی پیروی کا عزم اور عہد کرتے ہیں اور آخر میں پھر صلوٰۃ و سلام پر اس عرض معروض کو ختم کرتے ہیں۔ ان زائرین کے لیے مواجہہ شریف کے یہ لمحات گویا سفرِ زیارت کا بلکہ پوری ایمانی زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔

خیر یہ تو مواجہہ شریف کی حاضری اور اس وقت کے صلوٰۃ و سلام کے بارہ میں ایک علمی اور اصولی بات تھی جو زبانِ قلم پر آ گئی اور چونکہ "حکایت لذیذ" تھی اس لیے قدرتی طور پر ذرا دراز ہو گئی ورنہ میں عرض کر رہا تھا کہ ہم لوگ ریاض الجنۃ کے ایک گوشہ میں تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھنے کے بعد مواجہہ شریف میں حاضر ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس وقت جیسی توفیق دی صلوٰۃ و سلام عرض کیا، اس کے بعد چاشت کی چند رکعتیں پڑھ کے مسجد شریف سے باہر آ گیے۔

حضرت مولانا شیر محمد صاحب مہاجر کی خدمت میں

ابھی نمازِ ظہر میں قریباً دو گھنٹے باقی تھے، اس وقفہ میں حضرت مولینا شیر محمد سندھی دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری اور زیارت و ملاقات کا فیصلہ کیا۔

مولینا ممدوح سابق صوبہ سندھ کے ضلع سکھر کے باشندے ہیں، حکیم الامت حضرت مولینا اشرف علی تھانوی کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں، تواضع اور بے نفسی میں آپ اپنی مثال ہیں جو شخص جانتا نہ ہو کسی طرح نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کوئی بڑے عالم یا بزرگ ہیں۔ "الفرقان" اب سے پورے تیس سال پہلے جاری ہوا تھا، مولینا ممدوح قریباً اس وقت سے اس کے قدردان قارئین میں شامل تھے ناواقفی کی وجہ سے برسوں تک دفتر الفرقان کے رجسٹر میں ان کا اسمِ گرامی صرف شیر محمد صاحب

لکھا جاتا رہا، ان کے خطوط سے کبھی اس کا شبہہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ اکابر یا علماء میں سے ہیں برسوں کے بعد الفرقان میں ایک شرعی مسئلہ سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا اس وقت مولینا نے اس ناچیز کو خط لکھا کہ میں عالم نہیں ہوں عامی ہوں لیکن اکابر کی خدمت میں حاضری اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق رہا ہے، اس مسئلہ کے بارہ میں حضرت گنگوہیؒ نے اپنے فتاویٰ میں یہ تحریر فرمایا ہے۔ اور حضرت تھانویؒ نے فتاویٰ امدادیہ میں یہ اظہار خیال فرمایا ہے۔" اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں شرعی مسائل ہی کے بارے میں آپ کے اس قسم کے خطوط آتے رہے ابتداءً ان خطوط ہی سے آپ کا کچھ تعارف حاصل ہوا۔ پھر ملک کی تقسیم سے پہلے ۱۹۴۶ء میں ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ سندھ اور بلوچستان کا سفر پیش آیا اس کے پروگرام میں سکھر اور غالباً اس کا سب ڈویژن شکارپور بھی تھا اس موقع پر سکھر یا شکارپور میں پہلی دفعہ مولانا کی زیارت ہوئی اور اس وقت معلوم ہوا کہ ممدوح اپنے علم، دین اور درس تینوں حیثیتوں سے اس دور کے اکابر میں سے ہیں۔ اس کے بعد پھر کبھی زیارت کی نوبت نہیں آئی۔ اور اس درمیان میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی منقطع رہا۔

اب سے چند سال پہلے معلوم ہوا کہ مولینا ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، پھر اب سے کوئی دو سال پہلے مناسک حج پر ان کی گرامی قدر کتاب (قرۃ العینین طبع سورت) بھی دیکھنے میں آئی جو اردو میں اس موضوع پر سب سے زیادہ، جامع اور مستند کتاب ہے۔ بعض جاننے والوں سے یہ بھی سن چکا تھا کہ اس دور کے خاصان خدا میں مولینا موصوف کا خاص مقام ہے۔ ان وجوہ سے مدینہ طیبہ پہونچ کر سب سے پہلی فرصت میں آپ ہی کی زیارت اور حاضری خدمت کا فیصلہ کیا اور قاری سلیمان صاحب کی رہنمائی اور معیت میں مولینا کی قیام گاہ پر حاضر ہوا، حکیم عبدالقوی صاحب بھی ساتھ تھے باب مجیدی سے کچھ فاصلہ پر مدرسہ علوم شرعیہ کا دارالاقامہ ہے اسی کا ایک چھوٹا سا حجرہ مولانا کی قیام گاہ ہے۔ سن یقیناً ۸۰ سے متجاوز ہوگا ضعف پیری اپنی انتہا کو پہونچ چکا ہے۔ اٹھنا بیٹھنا بلکہ بات کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ جہاں تک اس عاجز نے محسوس کیا ممدوح نے اپنے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی فقر و مسکنت اور مجاہدہ کی زندگی کا انتخاب کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور دعا "اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ" کے ایسے نمونے اب اکابر و مشائخ میں بھی

شاذ و نادر ہی ہوں گے ۔ مولینا کو دیکھ کر اپنی نفس پروری اور تنعم والی زندگی پر بڑا ہی افسوس آیا۔
اللہ کے یہی وہ بندے ہیں جنہیں دیکھ کر دنیا سے دل سرد ہوتا ہے اور آخرت کی فکر پیدا
ہوتی ہے بلاشبہ مولینا ممدوح اُن "صعالیک المہاجرین" کی یادگار اور نمونہ ہیں
جن کے بارہ میں ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے وسیلہ سے فتح کی
دعا کیا کرتے تھے۔

یہ ناچیز جب مولینا کے حجرہ میں داخل ہوا اور سلام عرض کرنے کے ساتھ اپنا نام بتایا
تو بڑی ہی عنایت اور شفقت کے ساتھ پیش آئے اور بڑی ہی مسرت کا اظہار فرمایا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں میرا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ پہونچ کر اہل ہند اور اہل
پاکستان کے لیے جدّہ سے احرام باندھ سکنے کے مسئلہ پر مزید تحقیق اور اطمینان کے لیے میں مولینا
سے گفتگو کروں گا۔ لیکن مولینا کا انتہائی ضعف دیکھ کر میں نے کوئی تفصیلی اور تحقیقی گفتگو
کرنا مناسب نہیں سمجھا صرف مسئلہ کا ذکر کیا۔ مولینا نے اپنی اسی حالت میں بہت تفصیل سے گفتگو
شروع فرمائی۔ پہلے تو موافقت کے بارہ میں فقہی انداز میں گفتگو فرماتے رہے اور کتب فقیہہ
اور مناسک کے حوالوں سے مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے اس کے بعد حرمین شریفین کا ایک
مطبوعہ نقشہ سامنے رکھ کر مواقیت کا جغرافیہ اور ان کی محاذاۃ کا مسئلہ اس طرح سمجھایا کہ
حقیقت واضح ہو کر گویا آنکھوں کے سامنے آگئی (جیسا کہ اسی سلسلہ میں پہلے لکھا جا چکا ہے
انشاءاللہ ایک مستقل مضمون اس مسئلہ پہ الفرقان کی کسی قریبی اشاعت ہی میں لکھا جائے گا)
مولینا نے ضعف کی ایسی حالت میں کہ ۵ منٹ بات کرنا بھی مشکل تھا تقریباً ایک گھنٹہ تک
یہ گفتگو فرمائی اور آخر میں میں نے ہی یہ عرض کر کے گفتگو کا یہ سلسلہ ختم کرایا کہ اب ہم لوگوں
کو نماز ظہر کے لیے مسجد شریف جانا چاہیے بعد میں جگہ ملنی مشکل ہو جائے گی، انشاءاللہ میں
پھر حاضر ہونگا ۔ واضح رہے کہ حضرت مولینا اس ضعف کے باوجود کہ اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل
ہے پانچوں وقت کی نماز کے لیے پابندی کے ساتھ مسجد شریف حاضر ہوتے ہیں، اور بس
اپنی لکڑی کے سہارے چل کر آتے ہیں۔ مسجد شریف اور مولینا کی قیام گاہ کے درمیان
ایک فرلانگ سے زیادہ ہی فاصلہ ہو گا۔

مولینا کے پاس سے اٹھ کر ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر آئے اور وضو وغیرہ سے فارغ ہو کے مسجد شریف میں حاضر ہوئے ابھی ظہر کی نماز میں کافی وقت باقی تھا لیکن مسجد بالکل بھر چکی تھی، جگہ کی تلاش میں دیر تک چکر لگاتے رہے بڑی مشکل سے ایسی تنگ جگہ کھڑے ہو سکے جہاں سجدہ بھی مشکل ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد سے روزانہ کا یہ پروگرام اور معمول بنالیا کہ صبح حوائج ضروریہ اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر تھوڑا سا آرام کر کے چاشت کے وقت (ہندوستانی وقت کے حساب سے ۱۰ بجے کے قریب) مسجد شریف چلے جاتے اور پھر ظہر سے فارغ ہو کر ہی قیام گاہ پہ آتے اور کھانے سے فارغ ہو کر قیلولہ کرتے اور عصر سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے پھر مسجد شریف حاضر ہوتے اور کوئی خاص ضرورت باہر نکلنے کی نہ ہوتی تو پھر عشا پڑھ کے واپس آتے اور سحر میں اٹھ کے تہجد کے وقت چلے جاتے اور حتی الوسع صبح اشراق پڑھ کے واپس آتے۔ فرض نمازیں حتی الوسع صف اول میں ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور نوافل اور تلاوت وغیرہ کے لیے ریاض الجنۃ میں گنجائش تلاش کرتے تھے۔

قیام کا فیصلہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ۱۲ر ذی الحجہ کی صبح مدینہ منورہ پہونچ کر اس عاجز اور حکیم عبدالقوی صاحب نے بھی اپنا سامان وقتی طور پر مولینا احمد عبداللہ ہی کے مکان پر اتروا دیا تھا، قیام کے بارہ میں اس وقت ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے اسی دن ظہر کے بعد مولینا احمد عبداللہ صاحب نے ہمیں بتایا کہ جدہ سے جناب عبدالقادر نور ولی صاحب پٹنی نے ان کو تار سے پیام دیا ہے کہ ہم دونوں (یہ عاجز اور حکیم عبدالقوی صاحب) ان کی کوٹھی میں قیام کریں اور کوٹھی کے محافظ چوکیدار کو بھی اس کی اطلاع دیدی جائے، "گجرات کی تاریخی قصبہ پٹن (جو مولانا محمد طاہر پٹنی صاحب "مجمع بحار الانوار" کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں معروف ہو رہا ہے) اس کے متعدد خاندانوں نے مدت دراز سے (ترکی حکومت کے زمانہ سے) جدہ میں اقامت اختیار کر لی ہے، وہاں تجارت ان کا مشغلہ ہے سچی دینداری اور کردار کی بلندی کی وجہ سے وہاں ان کو احترام اور امتیاز کا خاص مقام حاصل ہے انہی میں ایک ہمارے دوست قمر عبدالقادر نور ولی صاحب ہیں انکی تجارت تو جدہ اور مکہ معظمہ میں ہے لیکن ایک بہت اچھی کوٹھی جسکے ساتھ اچھا خاصا باغیچہ بھی ہے انہوں نے مدینہ طیبہ میں صرف اسلئے خرید رکھی ہے کہ وہ یا

ان کے خاص متعلقین جب وہاں جائیں تو اس میں قیام کر سکیں ۔ عام طور پر وہ خالی رہتی ہے اور ایک چوکیدار اس کی نگہبانی کے لیے مقرر ہے جو اس میں رہتا ہے۔ رفیق محترم مولینا علی میاں نے بھی اسی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔ اور مجھے بھی اس میں قیام کا مشورہ دیا تھا، یہ مسجد شریف سے قریباً تین چار فرلانگ کے فاصلہ پہ ہے ۔ لیکن ہم لوگ جب ۲۰ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے تو ہم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ آج کل خالی ہے یا نہیں اور عبدالغفار ندوی صاحب کا کوئی خط بھی ہمارے ساتھ نہیں آسکا تھا، مکہ معظمہ سے ہمارے روانہ ہو جانے کے بعد جب ان کے بھائی عبدالرحمٰن ندوی صاحب کو ہماری مدینہ روانگی کا علم ہوا تو انہوں نے مولینا احمد عبداللہ صاحب کو تار کے ذریعہ یہ پیام دیا، مولینا موصوف نے پیام تو ہمیں پہونچا دیا لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اگر تکلیف نہ ہو تو میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ کا قیام میرے ہی مکان پر رہے مولانا کا مکان جیسا کہ لکھا جا چکا ہے چونکہ مسجد نبوی کے بالکل ہی متصل ہے اور وہاں قیام کرنے میں قاری سلیمان صاحب اور ملک الٰہی بخش صاحب جیسے مخلص دوستوں کی رفاقت بھی حاصل رہتی تھی اور خود مولانا عبداللہ صاحب کے تعلق کا حق بھی تھا اس لیے ہم لوگوں نے بھی وہیں قیام کا فیصلہ کر لیا اور پھر وہیں قیام رہا ۔ لیکن ایک دن اس کوٹھی میں بھی گئے کچھ دیر بیٹھے اور نماز وغیرہ پڑھی اور دعا کی تاکہ ایک مخلص عنایت فرما کی مخلصانہ پیش کش کا بھی کچھ حق ادا ہو جائے ۔

حضرت مولانا شیر محمد صاحب کی خاص عنایت

حضرت مولینا شیر محمد صاحب کی خدمت میں دو دفعہ اور حاضری دی ان ملاقاتوں میں بھی حضرت ممدوح حج کے اہم مسائل ہی پر گفتگو فرماتے رہے، ازراہ عنایت اپنی عظیم اور ضخیم کتاب " زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک" شائع کردہ دارالاشاعت کراچی کا ایک نسخہ بھی عنایت فرمایا (جس کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ مناسک حج پر نہایت محققانہ اور جامع ترین کتاب ہے لیکن کراچی سے شائع ہونے والا یہ نسخہ بے حد غلط چھپا ہے ایسی غلطیاں بھی بکثرت ہیں جن کی وجہ سے مسائل بالکل غلط ہو گیے ہیں) حضرت مولانا نے اس کا جو نسخہ اس عاجز کو عطا فرمایا اگرچہ بڑی عرقریزی سے خود مولانا نے اس کی تصحیح کی ہے لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے بعد

بھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں، کتاب کے اس نسخہ کے ساتھ مولانا نے حرمین شریفین کا ایک مطبوعہ نقشہ بھی عنایت فرمایا جس سے حج کا جغرافیہ سمجھنے میں اور بعض اہم مسائل کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور ان سب عنایتوں سے بڑی عنایت یہ فرمائی کہ ارشاد الساری الی مناسک الملا علی قاری (طبع مصر) کا اپنا ذاتی خاص نسخہ بھی اس ناچیز کو مرحمت فرمایا، جس پر کہیں کہیں خود مولانا کے نوٹ لکھے ہوئے ہیں، میں نے عرض بھی کیا کہ اس نسخہ پر آپ کے نوٹ اور یادداشتیں لکھی ہوئی ہیں یہ آپ اپنے ہی پاس رہنے دیں، میں نیا نسخہ بازار سے خرید لوں گا لیکن مولانا نے اصرار کے ساتھ وہی نسخہ مرحمت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میری زندگی اب آخر ہو رہی ہے اسلئے یہ نسخہ آپکے حوالہ کر رہا ہوں۔

اس ناچیز بندہ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات اور انعامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنی زندگی میں اس کے جن اچھے بندوں کو پایا اور ان کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی اگرچہ ان کی روش پر چلنا نصیب نہ ہو سکا لیکن دل کو اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت عقیدت بھرپور عطا فرمائی اور ان سب کی شفقت و عنایت بھی نصیب ہوئی۔

احب الصالحین ولست منہم　　لعل اللہ یرزقنی صلاحا

حضرت مولانا بدرعالم صاحب کی خدمت میں

ترجمان السنہ کے مصنف حضرت مولانا بدرعالم صاحب میرٹھی قریبا ۱۲-۱۳ سال سے مدینہ منورہ ہی میں مقیم ہیں اور اس ارض پاک ہی میں اپنی بقیہ زندگی پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس عاجز کے ساتھ ایک خاص تعلق اور رشتہ تو یہ ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے وہ خاص الخاص تلامذہ میں سے ہیں اس کے علاوہ ان کے ذاتی فضائل و کمالات کی وجہ سے بھی اور مزاج اور طرز فکر میں قرب و یگانگت کی وجہ سے بھی مولانا کے ساتھ راقم سطور کو خاص تعلق ہے اس لیے ان کی زیارت و ملاقات تو گویا اس مبارک سفر کے مقاصد میں سے تھی۔ کئی سال ہوئے ایک ایکسیڈنٹ میں مولانا بہت زیادہ زخمی ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے جان تو بچا دی لیکن اس وقت سے مستقل صاحب فراش ہیں بس لیٹے ہی رہ سکتے ہیں، تصنیف و تالیف ارشاد و تلقین سارے کام لیٹے لیٹے

انجام پاتے ہیں، کئی دفعہ حاضری ہوئی، دو تین دفعہ مولانا نے اہتمام کے ساتھ ایسے اوقات میں بلایا جب کوئی اور موجود نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ دو تین کاموں کے لیے باصرار فرمایا جن کی مولانا کے نزدیک جدید ہندستان میں خاص اہمیت اور ضرورت ہے ۔ گزشتہ اور گزشتہ سے سابق سال جن احباب نے موسم حج میں حضرت مولانا کی زیارت کی تھی انہوں نے موصوف کے ضعف کا جو حال بیان کیا تھا الحمد للہ اس ناچیز نے امسال اس سے بہتر حالت میں دیکھا خود مولانا نے بھی فرمایا کہ میں پہلے کے بہ نسبت بہتر اور اچھے حال میں ہوں، لیکن یہ بہتری صرف نسبت ہی کے لحاظ سے ہے ورنہ جسم میں خون اور گوشت بس قسم کھانے ہی کو ہوگا، مگر ذہن و دماغ پر اور اسی طرح گفتگو پر اس ضعف کا الحمد للہ کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (معروف مدینہ یونیورسٹی) میں تعلیم پانے والے عزیز ندوی طلبا مولوی سراج الرحمن اندوری، مولوی محمد یونس نگرامی، مولوی محمد تقی بہاری، مولوی محمد مزمل رامپوری وغیرہ کی دعوت پر ایک دن صبح وہاں بھی جانا ہوا۔ یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ سعودی حکومت یونیورسٹی کے ان طلبہ کو تین سو ریال ماہوار وظیفہ دیتی ہے اس کے علاوہ سال میں ایک دفعہ وطن آمد و رفت کا کرایہ بھی لیکن وہاں جاکر دیکھا کہ ان طلبا کے لیے قیمتی پرتکلف بستروں تک کا انتظام حکومت کی جانب سے ہے اور ان کے رہائشی کمرے ایر کنڈیشنڈ ہیں اپنے ان عزیزوں کی راحتوں کا یہ حال دیکھ کر خوشی کا ہونا بالکل قدرتی بات تھی لیکن ذہن یہ سوچ رہا کہ ہائے جو طلبہ ان راحتوں اور خوش عیشیوں کے ساتھ تعلیم حاصل کریں گے ان میں سے کتنے ضرورت دین کے ان تقاضوں کو پورا کر سکیں گے جو حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں اور سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں، سنا بھی یہی ہے اور عام تجربہ بھی یہی ہے کہ ؎

عیش پروردہ تنعم نہ برد راہ بدوست عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

جامعہ اسلامیہ کے نصاب اور طریقہ تعلیم کے بارہ میں جو معلومات حاصل ہوئے ان سے بھی اندازہ ہوا کہ اگرچہ اس کا نام جامعہ اور یونیورسٹی ہے اور ایک فیاض فرمانروا کی سرپرستی کی وجہ سے اس پر بے حساب روپیہ بھی صرف کیا جا رہا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ ہمارے ہندستان

کے قدیم دینی مدارس ہی کے طرز کی ایک دینی درس گاہ ہے جس طرح ہمارے مدرسوں میں اب تک قرأت فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر اور رفع یدین جیسے اختلافی فقہی مسائل پر کئی کئی دن مسلسل اساتذہ کرام تقریریں فرماتے ہیں اسی طرح اس جامعہ کے سلفی المسلک اساتذہ معلوم ہوا کہ استواء علی العرش جیسے مسائل پر ایک ایک ہفتہ بحثیں فرماتے ہیں۔

مسجد نبوی کی توسیع اور مدینہ طیبہ کی تعمیری ترقیاں

مسجد نبوی اور مسجد الحرام کی توسیع اور جدید تعمیر کا ذکر تو برسوں سے سننے میں آرہا تھا لیکن وہاں جاکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کتنا عظیم الشان کام ہوا ہے۔ مسجد حرام کی توسیع اور جدید تعمیر کا کام تو جاری ہے اگرچہ بہت زیادہ ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کافی باقی ہے لیکن مسجد نبوی کی توسیع و تعمیر کا کام اب سے کئی برس پہلے مکمل ہو چکا ہے۔ ترکوں کی بنائی ہوئی مسجد شریف کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا گیا ہے اور صرف دو جانبوں میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ترکوں کی بنائی ہوئی قدیم مسجد نبوی بھی عمارتی حسن و جمال اور استحکام کے لحاظ سے شاہکار ہے اور جدید توسیع اور اضافہ کا اس کے ساتھ جو پیوند لگایا گیا ہے وہ بھی دونوں حیثیتوں سے آپ اپنی مثال ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ توسیع کے سلسلہ میں جن لوگوں کے مکانات اور زمینیں لی گئی ہیں حکومت نے خود ان سے قیمت دریافت کی اور جو قیمتیں انھوں نے لکھ کے دیں اس کی دو گنی رقم ان کو دیدی گئی جس کے نتیجہ میں لوگوں نے اپنے پرانے معمولی مکانات کے عوض شاندار نئی کوٹھیاں بنالیں ــــ اب سے ۱۲ سال پہلے جب حاضری نصیب ہوئی تھی تو صرف جدہ میں نئے طرز کی عالیشان کوٹھیاں نظر پڑتی تھیں، مکہ معظمہ میں بھی اس طرح کی تعمیرات کا سلسلہ کچھ شروع ہو چکا تھا لیکن مدینہ طیبہ میں غالباً ایک بھی نئے طرز کی عمارت اس وقت تک نہیں بنی تھی سارا شہر پرانے طرز کے مکانات کا شہر تھا، لیکن اس مرتبہ دیکھا کہ جدہ تو اپنی عمارتوں اور کشادہ سڑکوں اور پارکوں کے لحاظ سے گویا ایک اپٹوڈیٹ یورپین شہر بن چکا ہے، مکہ معظمہ میں بھی نئے محلے کے محلے اسی طرح کے بن چکے ہیں، حرم شریف کے قریب ایسے عالیشان ہوٹل بنے کھڑے ہیں جن کے متعلق جاننے والوں نے بتایا کہ یہ انگلستان اور امریکا کے ہوٹلوں کے معیار کے ہیں مدینہ طیبہ میں بھی مسجد نبوی کے قریب اب بالکل نئے طرز کی عالیشان عمارتیں بن چکی ہیں اور بن رہی ہیں، مسجد شریف سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر ایک ہوٹل "فندق التیسیر" ہے

جس کے متعلق مدینہ سے ایک پاکستانی دوست نے جو امریکہ بھی ہو آئے ہیں مجھے بتایا کہ اس کا معیار امریکہ کے بلند معیار ہوٹلوں سے کم نہیں ہے، یہ سب ہوٹل ایرکنڈیشنڈ ہیں۔ بہرحال مدینہ طیبہ بھی اب بالکل نئے طرز کا شہر بنتا جارہا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان ترقیات میں کتنا خیر ہے اور کتنا شر۔

عام خوشحالی

اب سے ۱۳-۱۴ سال پہلے جب حجاز مقدس حاضری نصیب ہوئی تھی اس وقت وہاں غربت اور افلاس کے مناظر گویا قدم قدم پہ نظر آتے تھے خاص کر مدینہ طیبہ کے ان راستوں پر جن پر حجاج کی چلت پھرت زیادہ ہوتی ہے مثلاً مسجد نبوی سے جنت البقیع جانے والے راستہ پر حاجتمند بدوی عورتوں اور بچوں کی قطاریں ہوتی تھیں جن کے سوکھے سوکھے چہرے اور پھٹے پرانے کپڑے بلکہ چیتھڑے ان کی انتہائی غربت اور خستہ حالی کا یقین دلاتے تھے مقامی واقفین بھی یہی بتلاتے تھے کہ یہاں بہت بڑا طبقہ سخت افلاس و غربت کا شکار ہے لیکن اس دفعہ اس لحاظ سے حال بالکل بدلا ہوا پایا، ہر طرف رفاہیت اور خوش حالی کے آثار نظر آئے دریافت کرنے پر واقفین نے بھی یہی بتایا کہ اس لحاظ سے اب حالت بالکل بدل چکی ہے اور اب خوشحالی اور رفاہیت عام ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ حکومت کی طرف سے جا بجا جو نئی نئی سڑکیں بن رہی ہیں، اور بہت وسیع پیمانہ پر جدید تعمیرات کا جو کام ہو رہا ہے اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے عام دولت مند شہری (تجار اور سرکاری ملازمین وغیرہ) جو نئی نئی عمارتیں بنا رہے ہیں اور اس طرح کے جو دوسرے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں ان کاموں نے غریب طبقہ کے لیے روزگار اور مزدوری کی شکل پیدا کر دی ہے اور مزدوری کی آمدنی اور یافت کا حال یہ ہے کہ صرف ڈلیا ڈھونے والے بالکل بے ہنر مزدوروں کو بھی ۶ سے ۸ ریال یومیہ تک مل جاتے ہیں، اور معمولی کاریگر ۱۵-۲۰ ریال یومیہ کما لیتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں تعلیم عام کرنے کے لیے نیچے سے اوپر تک ساری تعلیم مفت کرنے کے علاوہ سعودی حکومت چھوٹے بڑے طلبہ کو جس فیاضی سے وظیفے دے رہی ہے اس نے بھی غالباً غریب طبقہ کو بہت سہارا دیا ہے۔ بہرحال اس دفعہ یہی محسوس ہوا کہ غربت یہاں سے ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ دیکھ کے بڑا افسوس ہوا کہ زندگی عام طور سے سخت مسرفانہ ہوتی جارہی ہے اور زندگی کی ضروریات خود اپنے ملک میں پیدا کرنے کی طرف بالکل توجہ نہیں ہے۔ بس دولت کی فراوانی ہے اور ہر چیز باہر سے آرہی ہے ہر چھوٹی بڑی دوکا

ں جو کچھ ہے باہر کے ملکوں سے، اور زیادہ تر امریکا، یورپ یا جاپان کا ہے، اس دور میں یہ صورت
حال جس قدر خطرناک ہے اس کے سمجھنے کے لیے نہ بڑی عقل کی ضرورت ہے اور نہ کسی بڑے
غور و فکر کی، کاش جن ملکوں سے زندگی کی ساری ضروریات لی جا رہی ہیں انہیں سے یہ
سبق بھی لیا جاتا

(باقی)

مُسنَد حُمیدی جلد ثانی

اب سے ۵-۶ مہینے پہلے شوال و ذیقعدہ کے مشترک شمارہ میں امام بخاریؒ کے خاص استاذ امام ابوبکر عبداللہ بن الزبیر الاسدی الحُمیدی کی "مسند" کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرایا گیا تھا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی تصحیح اور تعلیقات و تخریجات وغیرہ کے ساتھ اسکی جلد اول کی تیاری کی خوشخبری سنائی گئی تھی، اسی کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ اسکی دوسری جلد بھی انشاءاللہ جلد ہی چھپ کر ہمارے سامنے آجائے گی ____ الحمدللہ ایسا ہی ہوا اور اسکی دوسری جلد بھی اُن تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے ساتھ جن کا تذکرہ پہلی جلد کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہو چھپ کر آگئی ہے اور اس جلد پر کتاب مکمل ہو گئی۔
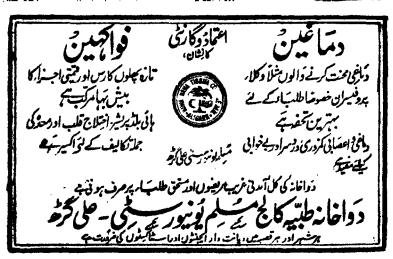
اس جلد ثانی کے صفحات ۳۶۰ ہیں، شروع میں ۶ صفحے پر کتاب کی ترتیب کے مطابق احادیث کی فہرست ہے، اس کے بعد احادیث کے مضامین اور ابواب فقہ و شریعت کے لحاظ سے ایک مسلسل فہرست پورے ۲۴ صفحے پر ہے ____ اسکے بعد ۹ صفحے پر اعلام اور امکنہ کی دو فہرستیں ہیں، اس کے بعد ۲۸۰ صفحے پر اصل مُسند حمیدی جلد ثانی ہے جو ۹۰ صحابہ کرام کی ۷۱۰ حدیثوں پر مشتمل ہے، اس کے بعد چند صفحے پر استدراکات و تعقیبات اور سب سے آخر میں چند صفحوں پر مطبعی اغلاط کی تصحیحات ہیں۔

پہلی جلد کے تذکرہ میں یہ بات لکھی جا چکی ہو کہ اس صحیفۂ حدیث کی طباعت و اشاعت کا پورا اہتمام اور اس سلسلہ کے سارے مصارف کا تکفل مجلس علمی سملک ڈابھیل (ضلع سورت) نے کیا ہے جسکے بانی و سرپرست مرحوم مولانا الحاج محمد بن موسیٰ میاں سملکی (مقیم جوہانسبرگ، ٹرانسوال) تھے۔ ناظرین الفرقان کو ذی الحجہ کے شمارے سے معلوم ہو چکا ہے کہ موصوف گزشتہ اپریل ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو کر اللہ کے جوارِ رحمت میں پہونچ چکے ہیں رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

مسند حمیدی کامل کی قیمت ۱۸ روپیہ ہے اور ہر جلد کی الگ الگ قیمت ۹ روپے ہو۔ ہندوستان میں۔ مجلس علمی سملک۔ ڈابھیل (ضلع سورت سے) اور پاکستان میں مجلس علمی پوسٹ بکس ۴۸۰۴۳ کراچی ۲ سے طلب کی جا سکتی ہے لہ

لہ مسند حمیدی کی دونوں جلدیں کتب خانہ الفرقان [illegible]

شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار پر

(مولینا محمد ثانی الحسنی)

سنہ ۱۹۵۵ء میں پہلی بار بالاکوٹ جانا ہوا تو عین مغرب کے وقت حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار پر حاضری دی۔ ان کی زندگی اور راہ خدا میں شہادت کا نقشہ آنکھوں میں آگیا اور دل بے حد متاثر ہوا اور وہ اثر اشعار کی شکل میں زبان سے ظاہر ہوا۔ لیکن ابتک یہ اشعار شایع نہیں ہوسکے تھے آج نذر الفرقان کیے جاتے ہیں

ارضِ بالاکوٹ پر بہتا ہے دریائے کنہار — مغربی جانب ہے اُس کے ایک گرتا آبشار
چند کھیتوں کے کنارے ست بنے نالے کے پار — چار دیواری کے اندر ایک واقع ہے مزار
تھی فضا خاموش بے حد پر سکوں ماحول تھا — وقتِ مغرب ہو رہا تھا سامنے تھا سبزہ زار
قبر پر چادر نہ تھی روشن نہ تھا کوئی دیا — اور پھولوں کا مجھے کوئی نظر آیا نہ ہار
تھی مگر اتنی کشش اتنا جمال اتنا جلال — ٹھیرتی آنکھیں نہ تھیں دل ہو گیا بے اختیار
یہ کہا میں نے کوئی اللہ والا ہے ضرور — جس کی برکت سے فضا تک ہو رہی ہے نور بار
دیکھ کر میرا تأثر سُن کے یہ میرا خیال — مجھ سے بولی اک عجب انداز سے لوحِ مزار
یہ ہے مرقد حضرتِ مولانا اسمٰعیلؒ کا — مردِ مومن علم کے دریائے ناپیدا کنار
وہ عظیم المرتبت انسان حق کا پاسباں — جو شریعت کا نشاں تھا زہد و تقویٰ کا شعار
خاک میں جس نے ملایا کفر کا سارا غرور — کر دیا جس نے ردائے شرک و بدعت تار تار
خاندانِ شاہ ولی اللہؒ کا چشم و چراغ — معترف تھا جس کے علم و فضل کا سارا دیار
نائبِ ختمِ رسالت ہادیٔ راہ ہدیٰ — مردِ دانا، مردِ حق، علم و عمل کا تاجدار
سارے خطے ہند کے ہیں اسکی عظمت کے گواہ — سرحد و پنجاب و یوپی، اور بنگال و بہار
دلپذیری جس کی تقریروں کی ابتک یاد ہے — توبہ کرنے والیوں کی وہ قطار اندر قطار
جب پکارا سید احمدؒ مردِ حق آگاہ نے — پڑ گیا قدموں میں ان کے چھوڑ کر اپنا دیار

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ادارہ الفرقان

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول
محمد منظور نعمانی

نماز کی حقیقت
حج کیسے کریں؟
آسان حج
انیس نسواں

شمارہ ۵	بابتہ ماہ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۳ء	جلد ۳۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ اکتوبر تک دفتر میں ضرور آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔ **پاکستان کے خریدار:** ۔ اپنا چندہ "سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور" کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

نمبر خریداری: ۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: ۔ "الفرقان" ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

دفتر: الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اولیں

محمد منظور نعمانی ۔

قرآن مجید کی ایک آیت ہے ۔ وَاِن مِّن شَیۡءٍ اِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۝ (الحجر ع ۲)

[ہر چیز کے ذخیرے ہمارے پاس اور ہمارے قبضۂ قدرت میں ہیں اور دنیا والوں کے لیے ہر چیز ہم ایک معلوم و مقرر حساب اور اندازہ سے اتارتے ہیں۔]

اس آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ دنیا کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں اگرچہ ہر چیز کے بے انتہا ذخیرے ہیں، لیکن اس دنیا میں چیزوں کے پیدا کرنے اور اتارنے کا اُس کی طرف سے ایک قانون اور حساب مقرر ہے اور وہ اسی کے مطابق چیزوں کو کم یا بیش پیدا کرتا ہے ، جب کسی چیز کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے تو اُس کی پیداوار بڑھا دی جاتی ہے ، اور جب اس کی ضرورت کسی وقت کم ہو جاتی ہے تو اس کی پیداوار بھی گھٹا دی جاتی ہے ——— قرآن مجید کے اس بیان کی روشنی میں ذیل کے واقعات اور شاہدات پر غور کیجئے !

جن حضرات کی عمر اس وقت ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ ہے انھیں یاد ہو گا کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) تک ہمارے ملک میں گھوڑوں کی کتنی کثرت تھی ، آج ہم جس طرح سڑکوں پر موٹر سائیکلیں ، کاریں ، بسیں دوڑتی دیکھتے ہیں اُس وقت اسی طرح ان سڑکوں پر گھوڑے گاڑیاں اور رنگ برنگ کے گھوڑے رواں دواں نظر آتے تھے ، آج جو کام فوجی ٹرکوں اور مال بردار موٹر گاڑیوں سے لیے جاتے ہیں اُس زمانہ میں یہ سارے کام گھوڑا گاڑیوں اور خچر گاڑیوں

ہی سے لیے جاتے تھے، فوجی سپاہیوں پولیس کے جوانوں، حکومت کے افسروں اور عام امیروں، رئیسوں کی بھی معزز سواری اس زمانہ میں گھوڑا ہی تھا، کلکتہ، بمبئی جیسے بڑے شہروں میں آج جو ہزاروں ٹیکسیاں چل رہی ہیں اُن کی جگہ اُس زمانہ میں عمدہ قسم کی گھوڑا گاڑیاں ہی چلتی تھیں، الغرض اُس وقت ان سب کاموں کے لیے گھوڑے کی ضرورت تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ضرورت کے مطابق ہی گھوڑے کی پیداوار تھی، ملک کے قریباً ہر خطہ میں گھوڑوں کی خرید و فروخت کے بڑے بڑے بازار اور میلے لگتے تھے جہاں بہتر سے بہتر قسم کے کلاں راس ہزار ہا ہزار گھوڑے آتے تھے، عام خرید و فروخت کے علاوہ ان میلوں میں فوجی اور سرکاری خریداری بھی ہوتی تھی۔ ان میلوں میں میلوں تک گھوڑے ہی گھوڑے نظر آیا کرتے تھے ــــ لیکن اب گھوڑوں کی تعداد ملک میں دس فیصدی بھی نہیں رہی بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ پانچ فیصدی بھی نہیں رہی، ــــ ۴۰۔۵۰ سال کی اس مدت میں گھوڑوں کی تعداد اتنی کم کیوں ہوگئی؟ ایسا بھی نہیں ہوا کہ اس نسل کو کم کرنے کے لیے کوئی خاص مہم چلائی گئی ہو اور کبھی لاکھ دو لاکھ گھوڑوں کو گولی مار کے ختم کیا گیا ہو ــــ غور کیجئے اس کی کوئی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ جب دُنیا میں اس کی ضرورت کم ہوگئی تو پیدا کرنے والے نے پیداوار گھٹا دی ــــ وان من شیئ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔

اسی طرح کا دوسرا مشاہدہ اور واقعہ یہ ہے کہ حجاز میں سعودی حکومت کے ابتدائی دور تک یعنی جب تک وہاں موٹریں اور بسیں نہیں آئی تھیں اونٹ اتنی تعداد میں تھے کہ ساری دنیا سے آنے والے حاجی انھیں پر سوار ہو کے مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر کرتے تھے اور وہاں کی بہت بڑی آبادی کا ذریعہ معاش اونٹوں کا ہی کرایہ تھا جو موسم حج میں اُن کو حاجیوں سے وصول ہوتا تھا۔ راقم سطور کو تو اس زمانہ میں وہاں کی حاضری نصیب نہیں ہوئی اس لیے وہ منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن دیکھنے والوں سے سُنا ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں جس طرح حج میں بس آدمی اور موٹر کاریں اور بسیں ہی نظر پڑتی ہیں اسی طرح اُس زمانے میں آدمی اور اونٹ اور اونٹوں کے شُغدُف ہی نظر آتے تھے، لیکن اب خود آنکھوں سے دیکھا کہ وہاں بھی اپنے ہندوستان ہی کی طرح اونٹ بس کہیں کہیں اتفاقیہ ہی نظر پڑ جاتے ہیں ــــ غور کیا

جائے کہ اتنی تھوڑی سی مدت میں اونٹوں کی یہ نسل وہاں اتنی کم کیسے ہو گئی؟ اس نسل کو ختم کرنے یا کم کرنے کے لیے وہاں کبھی کوئی مہم نہیں چلائی گئی، کبھی اونٹوں کا قتل عام نہیں کیا گیا، بلکہ اس کے برعکس غذا کے لیے بھی اونٹ کے ذبیحہ کا رواج پہلے کے مقابلہ میں وہاں اب بہت کم ہو گیا ــــ اس سب کے باوجود اونٹوں کی اس سرزمین میں اونٹوں کی اتنی کمی کا راز بس وہی ہے جو اس آیت میں بتایا گیا ــــ وان من شیئ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔

بالکل اسی نوع کا ایک تیسرا واقعہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ ہمارے اس ملک میں آزادی سے پہلے بلا مبالغہ روزانہ لاکھوں گائیں ذبح ہوتی تھیں، صحیح اعداد و شمار معلوم ہونے کا تو کوئی ذریعہ میسر نہیں لیکن کسی قدر اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب سے کوئی ۲۰۔۲۵ سال پہلے جب راقم سطور کا قیام بریلی میں تھا اور اپنی عادت کے مطابق گھر کا سودا سلف خریدنے میں خود ہی بازار جاتا تھا، ایک دن گوشت کے مارکٹ میں میں نے اتفاقاً پوچھ لیا کہ یہاں بریلی میں روزانہ کتنی گائیں ذبح ہو جاتی ہیں؟ تو ایک قابل اعتبار اور واقف کار قصائی نے مجھے بتلایا کہ تین سو روزانہ شہر کے لیے اور ایک سو عدد یعنی کنٹونمنٹ کے لیے۔ گویا روزانہ چار سو۔ جب صرف بریلی میں چار سو روزانہ ذبح ہوتی تھیں تو ضلع بریلی کے قصبات آنولہ، بھیڑی اور نواب گنج وغیرہ اور ان ہزاروں دیہات میں جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی کم از کم اس کی دگنی یعنی ۸ سو روزانہ ضرور ذبح ہو جاتی ہوں گی، گویا صرف ایک ضلع بریلی میں تقریباً ۱۲ سو یومیہ، اور ضلع بریلی مسلم آبادی کے لحاظ سے درجہ اول کا ضلع نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اوسط درجہ کا ضلع کہا جا سکتا ہے، مغربی اضلاع مراد آباد، بجنور، میرٹھ، بلند شہر، مظفر نگر، سہارن پور وغیرہ میں مسلم آبادی کا تناسب بریلی سے بہت زیادہ ہے اور پوربی اضلاع میں بریلی کے مقابلہ میں کم ہے۔ ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یو۔پی کے ۵۲ ضلعوں میں روزانہ کم از کم پچاس ہزار گائیں ضرور ذبح ہو جاتی تھیں، گویا ہر مہینے کم از کم دس بارہ لاکھ۔ اور ہر سال تقریباً سوا کروڑ ڈیڑھ کروڑ۔ اب تقریباً ۱۵ سال سے ہماری ریاست میں ذبیحہ گاؤ قریب قریب بالکل بند ہے، اس حساب سے صرف ہماری ریاست میں ہر سال سوا کروڑ ڈیڑھ کروڑ گایوں کا اضافہ ہونا چاہیے

تھا، پھر ان بچی ہوئی گایوں سے جو نسلی اضافہ ہونا چاہیئے تھا وہ اس کے علاوہ، اور ریاضی کے حساب سے وہ اضافہ اس سے بھی زیادہ ہونا چاہئے تھا یعنی ۱۹۵۵ء کے بعد سے ہر سال ہماری ریاست میں دو تین کروڑ گایوں کا اضافہ ہونا چاہئے تھا جس کے نتیجہ میں گایوں کا ایک طوفان اور سیلاب ہماری ریاست میں ہونا چاہیئے تھا، لیکن ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا ہے کہ دس فی صدی بھی اضافہ نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کے برعکس حیوانات شماری کے شعبہ کی رپورٹ یہ ہے کہ گایوں کی تعداد کچھ گھٹ ہی رہی ہے ——— اس کی توجیہہ بھی اس کے سوا کیا کی جا سکتی ہے کہ جب گایوں کا خرچ کم ہو گیا تو پیدا کرنے والے حکیم و خبیر نے پیدا وار گھٹا دی۔

وان من شیئ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔

——— (باقی)

گزشتہ مہینے، یو، پی کے ایک نامور اور نہایت نیک نام آئی، سی، ایس آفیسر جناب سید صدیق حسن صاحب کا اچانک انتقال حلقۂ الفرقان کا ایک نہایت قلق انگیز سانحہ ہے، مرحوم برسوں سے الفرقان کے قدرداں خریداروں میں سے تھے، ابتداءً کئی سال تک ہمیں کوئی قریبی واقفیت نہ تھی، بس الفرقان کی خریداری کی بنا پر حسنِ ظن تھا کہ صحیح العقیدہ اور دینی جذبات کے حامل ہوں گے، لیکن ادھر چار پانچ سال سے مرحوم کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کی صورتیں پیدا ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اپنے طبقہ میں ایک نرالا انسان ہے، گورنر کے بعد ریاست کے سب سے بڑے عہدے (سینیر ممبر بورڈ آف ریوینو) پر فائز ہونے کے باوجود دینی نسبت کے سامنے اس طرح جھکتے اور اس قدر قلبی انبساط و تواضع سے پیش آتے کہ بس آدمی دیکھتا ہی رہ جائے، دینی فرائض کی پابندی ہی نہیں دین کی تبلیغ کا بھی گہرا جذبہ رکھتے تھے، جن لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کا سچا خدمتگزار سمجھتے ان پر حکومت کی نظریں آج کی خاص فضا کی وجہ سے کتنی بھی خراب ہوتیں اُن کے علاالاعلان ان کی مشکلات کو اپنے اثر سے دور کرانے میں ذرا نہ ہچکچاتے تھے۔ اسی کے ساتھ اپنے اخلاق اور انسان دوست کردار کی بنا پر غیر مسلموں میں بھی قدر دانوں کا بڑا وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ انسان نوازی اور ضرورت مندوں کی کار برآری گویا زندگی کا وظیفہ تھی اور خدا ہی اُن اُن لوگوں کی تعداد جانتا ہے جنھوں نے مرحوم کے انتقال پر محسوس کیا ہوگا کہ جیسے آسمان سر سے ہٹ گیا ——— اس مختصر نوٹ میں مرحوم کی خوبیوں کی کیا تفصیل کی جائے، ان کا اثر سے

تجلّیاتِ مجدّد الف ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

[بحمد اللہ مکتوبات امام ربّانیؒ دفتر دوم کے کام سے فراغت کے بعد اب دفتر سوم کا کام شروع ہو رہا ہے، اس دفتر کو خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے مرتب کیا ہے، معرفۃ الحقائق اس دفتر کا تاریخی نام ہے، لفظ ثالث سے بھی اس کا سنِ ترتیب ۱۰۳۱ھ برآمد ہوتا ہے ——— اللہ تعالیٰ بحسن وخوبی اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچائے ——— فریدی]

لہ مولانا محمد ہاشم کشمیؒ۔ آپ کشمیر کے رہنے والے تھے، ہندوستان آکر جب شہر برہان پور پہونچے وہاں میر محمد نعمانؒ کی خدمت میں آئے اور ان سے ذکر و مراقبہ کی تعلیم حاصل کی ۱۰۳۱ھ میں سرہند آگئے اور تا وصالِ حضرت (۱۰۳۴ھ) خدمتِ اقدس میں رہے، اسرار و معارف سنے اور الطاف و عنایات کے مورد بنے رہے۔ مکتوبات کی جلد ثالث آپ نے ہی مرتب کی ہے۔ اور وفات حضرت مجددؒ کے بعد دلِ مہجور کو تسلّی دینے کے لیے زبدۃ المقامات لکھی، جس میں حضرت مجددؒ کے حالات کے علاوہ حضرتؒ کے پیر و مرشد، خلفاء اور صاحبزادگان وغیرہم کے حالات نہایت عمدہ طریقے پر لکھے۔ حضرت کے حالات میں اس سے زیادہ مستند اور قدیم کتاب غالباً کوئی اور نہیں ——— بیجا مبالغے سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے اور مجالس مجددیہ کی ایسی دلآویز و مکمل تصاویر کھینچی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ناظر کتاب دربارِ مجددی
(باقی بر صفحہ آئندہ)

مکتوب (۲) - مخدوم زادگان گرامی قدر خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے نام (نصائح)

[قلعہ گوالیار سے بزمانۂ قید و بند]

ستائش بے حد، پروردگارِ عالمیاں کے لیے ہے ہر حال میں، خواہ راحت و رنج ہو، یا آسانی و دشواری، عقوبت و رحمت ہو یا تنگی و فراخی، عطا ہو یا بلا ______ اور درود و سلام ایسے نبی مکرّم پر کہ کوئی نبی اللہ کے راستے میں اُن کی مانند تکلیف و مشقت میں نہیں ڈالا گیا، اور جو رحمۃ للعالمین اور سید اوّلین و آخرین ہوئے ______

فرزندانِ گرامی! ہر چند یہ آزمائش کا وقت تلخ و بے مزہ ہے لیکن یہ وقت بھی اگر فرصت نصیب ہو تو غنیمت وقت ہے ______ اس وقت جبکہ تم کو فرصت نصیب ہے حمدِ خدا کرتے ہوئے اپنے کام میں لگے رہو اور ایک لمحہ اور ایک لحظہ فارغ ہو کر بیٹھنا تجویز نہ کرو ______ چاہیے کہ ان تین کاموں میں سے کسی ایک سے خالی نہ رہو۔

(۱) تلاوتِ قرآن مجید۔ (۲) ادائیگیٔ نماز بطولِ قراءۃ۔ (۳) تکرارِ کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ

چاہیے کہ کلمۂ "لا" سے خواہشاتِ نفس کے باطل معبودوں کی نفی کرکے اپنے تمام مقاصد و مرادات کو دفع کرو ______ اپنی مراد کو طلب کرنا (اور اس کو نصب العین بنا کر برابر ہی دھن میں رہنا) دعوئے الوہیت کے مرادف ہے۔ چاہیے کہ کسی مراد کی صحن سینہ میں گنجائش نہ ہو۔ کوئی ہوس قوتِ خیالیہ میں بھی باقی نہ رہے تاکہ حقیقتِ بندگی ثابت ہو، اپنی ہی مراد کو چاہنا اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)
میں بیٹھا ہوا حضرت مجددؒ کو دیکھ رہا ہے اور ان کے ملفوظات کو سُن رہا ہے ______ تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ ایک دیوان بھی جس کو کلیاتِ ہاشم کہنا چاہیے یادگار چھوڑا۔ بمبئی کے خورشید جاہ ہاشم جی کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے جو ۱۰۵۱ھ میں بمقام سورت لکھا گیا ہو۔ (جیسا کہ مؤلف جواہر ہاشمیہ نے تحریر کیا ہے) کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ مخطوطات میں بھی دیوانِ ہاشم کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس کا احقر نے مطالعہ کیا ہے۔ آپ کے ایک صاحبزادے خواجہ محمد قاسم تھے۔ مؤلف جواہر ہاشمیہ نے آپ کے خلفاء میں آپ کے صاحبزادے کے علاوہ شاہ عبداللطیف حصاری کا نام بھی لکھا ہے۔ رجب ۱۰۵۴ھ میں آپ نے وفات پائی مزار برہان پور میں ہے۔

مولائے حقیقی کی مراد کو دفع کرنا اور اپنے آقائے حقیقی سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس بات سے تو اپنے مولا کی نفی اور اپنی آقائیت کا اثبات ہوتا ہے ۔۔۔ اس بات کی برائی کو خوب ذہن نشین کر کے دعوئے الوہیت کی نفی کرو ۔۔۔ یہ عمل نفی اس وقت تک جاری رہے جب تک ہوا و ہوس سے پوری طرح رستگاری نہ ہو جائے اور سوائے مرادِ مولیٰ تعالیٰ کے کوئی مراد باقی نہ رہے یہ چیز اللہ کی عنایت سے امید ہے کہ اس مصیبت کے زمانے میں سہولت و آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔ اگر یہ مصیبت کے ایام نہ ہوں تو ہوا و ہوس کی فراوانی راہِ حق کے لیے سدِ سکندری (رکاوٹ) بن جائے گی ۔۔۔ گوشۂ تنہائی میں رہ کر اس ضروری کام میں مشغول رہو فرصت غنیمت ہے ۔۔۔ فتنوں کے زمانے میں تھوڑی سی محنت کو بھی بہت قبول کیا جاتا ہے۔ فتنوں کا زمانہ نہ ہو تو بڑی بڑی ریاضتیں اور مجاہدے درکار ہوتے ہیں ۔۔۔ یہ نصیحت ضروری تھی اس لیے کی جا رہی ہے، دیکھو ملاقات ہو یا نہ ہو ۔۔۔ نصیحت کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی مراد اور ہوس باقی نہ رہنے پائے، اپنی والدہ کو بھی اس بات سے مطلع کر دو اور یہ راہ دکھاؤ ۔۔۔ دنیا جب کہ فانی ہے اس کے حالات کیا بیان کروں، تم اپنے چھوٹوں پر شفقت و مہربانی کا سلوک کرتے رہنا اُن کو پڑھنے کی ترغیب دو اور اہلِ حقوق کو جہاں تک ہو سکے ہماری طرف سے راضی کرو، نیز دعائے سلامتی ایمان کے ساتھ ہماری مدد و معاونت کرتے رہو ۔۔۔

پھر تاکید سے لکھا جاتا ہے کہ اس وقت کو بے فائدہ کاموں میں صرف نہ کرنا، اور ذکرِ الٰہی کے علاوہ کسی کام میں (ہمہ تن) مشغول نہ ہونا اگرچہ مطالعۂ کتب اور تکرارِ طلبہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ذکر الٰہی کا وقت ہے، خواہشاتِ نفسانی کو جو کہ معبودانِ باطل ہیں لا کے تحت لاؤ تاکہ یہ تمام کی تمام خواہشات منتفی ہو جائیں۔ اور کوئی مراد و مقصود سینے میں نہ رہے، حتیٰ کہ میری قید سے آزاد ہونے کی تمنا بھی دل میں نہ رہے۔ حالانکہ یہ بالفعل تمہارے اہم مقاصد میں سے ہے۔ پس تقدیر اور ارادۂ خداوندی پر راضی رہو اور کلمۂ طیبہ کی جانب اثبات میں (یعنی الا اللہ) سوائے مرتبۂ وحدت و ذاتِ باری تعالیٰ ۔۔۔ جو کہ معلومات و متخیلات سے وراء الوراء ہے ۔۔۔ اور کچھ باقی نہ ہو ۔۔۔

مکان، کنوئیں، باغ، کتابوں اور دوسری اشیاء کا فکر بیکار ہے، ان میں سے

کسی کا فکر تمہاری مشغولیتِ باطن میں مزاحم نہ ہو اور مرضیاتِ حق تعالیٰ کے علاوہ تمہاری کوئی مراد و مرضی نہ ہو، ہم انتقال کر جاتے تب بھی تو یہ چیزیں ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتیں، اب ہماری زندگی ہی میں چلی جائیں، یہی سہی کوئی فکر نہ کرو ــــ اولیاءِ خدا نے ان تمام چیزوں کو اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے چھوڑا ہے ہم اپنی مرضی سے ان چیزوں کو چھوڑ دیں اور شکر بجا لائیں۔ تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں میں سے ہو جائیں جن کو اُس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے ــــ جہاں تم بیٹھے ہو اُسی کو وطن سمجھو، حیاتِ چند روزہ کہیں گزرے، بس اللہ کی یاد میں گزرنی چاہیے ــــ دُنیا کا معاملہ کچھ بھی نہیں آخرت کی طرف متوجہ رہو، اور اپنی والدہ کو تسلی اور آخرت کی ترغیب دیتے رہو ــــ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا ہماری تمہاری ملاقات ہو جائے گی ورنہ تقدیرِ خداوندی پر راضی رہو اور دعا کرو کہ جنت میں ہم سب جمع ہوں، اور اس دنیا کی ملاقات کی تلافی بکرمِ خداوندی آخرت میں کریں ــــ الحمد للہ علیٰ کلِّ حال ــــ

مکتوب ۳ - سیادت مآب میر محب اللہ[۱] مانکپوری کے نام ــــ [دربیان معنی کلمہ لا الٰہ الا اللہ]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ــــ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ نہیں ہے کوئی بھی کہ اُلوہیت و معبودیت کا استحقاق رکھتا ہو، مگر خدائے بے مثل و بے ہمتا۔ ــــ وہی واجب الوجود ہے اور وا جملۂ نقص و حدوث سے منزہ و مبرا ہے ــــ اس لیے کہ مستحقِ عبادت (اور عبادت نام ہے کمالِ تذلل اور کمالِ خضوع و انکسار کا) وہی

[۱] سید محب اللہ مانکپوری ــــ آپ علوم دینیہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آغازِ سلوک میں قدوۃ المشائخ شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری کی خدمت میں رہ کر اجازت و خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد برہان پور ہی میں میر محمد نعمان کی خدمت میں پہنچے اور اُن سے سلسلۂ نقشبندیہ کا ذکر سیکھا پھر حضرت مجددؒ کی خدمت میں پہنچنے کا شوق غالب ہوا۔ چنانچہ بارگاہِ مجددیؒ میں حاضر ہوئے مدتوں وہاں اکتسابِ فیض کرتے رہے، بالآخر خلافت سے سرفراز کر کے مانک پور رخصت فرما دیا گیا۔ مانکپور کچھ عرصے رہنے کے بعد آپ نے اہلِ وطن کی شکایت لکھی کہ وہ اذیت پہنچاتے ہیں،

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ذات ہے جس کے لیے جمیع کمالات ثابت ہیں اور جمیع نقائص اُس سے مسلوب ہیں۔ تمام چیزیں اپنے وجود اور توابع وجود، صفات وافعال میں اُسی کی محتاج ہیں وہ کسی امر میں کسی چیز کا محتاج نہیں۔ وہی نفع دینے والا ہے وہی ضرر پہونچانے والا ہے اور کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر کسی کو ضرر نفع نہیں پہونچا سکتی۔ ان صفات کاملہ کے ساتھ اللہ کے علاوہ نہ تو کوئی ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ غیر خدا ان صفات کاملہ کے ساتھ بے زیادتی ونقصان ثابت ہو جائے تو وہ غیر نہ ہوگا، کیونکہ دو غیر آپس میں متمائز ہوا کرتے ہیں اور یہاں کوئی تمیز باقی نہیں رہی ـــــ اور اگر ہم اثبات غیریت، تمیز کے ساتھ کریں تو بھی لازم آئے گا کہ وہ غیر خدا ناقص ہو ـــــ اور یہ نقص اُس کی الوہیت ومعبودیت کے منافی ہوگا ـــــ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اگر ہم جمیع کمالات اُس غیر کے لیے ثابت نہ کریں تاکہ آپس میں تمیز رہے تو بھی اس غیر کا نقص لازم آئے گا، اور اسی طرح تمام نقائص کی اُس سے نفی نہ کریں تب بھی اس کا نقص لازم آتا ہے ـــــ اگر چیزیں اس غیر کی محتاج نہ ہوں تو پھر کیوں وہ مستحق عبادت ہو؟ اگر وہ خود کسی چیز کا کسی امر میں محتاج ہے تب بھی ناقص ہوگا۔ ایسے ہی اگر نفع پہونچانے والا اور ضرر پہونچانے والا نہ ہو تو پھر اشیاء کو اس کی کیا ضرورت؟ اور وہ عبادت کا مستحق کس طرح ٹھہرے؟ اور اگر کوئی دوسرا اس کی اجازت کے بغیر کسی کو نفع ونقصان پہونچا سکتا ہو تو پھر بھی یہ بیکار قرار پایا اور مستحق عبادت کسی طرح نہ رہا، لامحالہ ان صفات کاملہ کا جامع ایک اللہ ہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اس واحد قہار کے علاوہ کوئی بھی مستحق عبادت نہیں ـــــ اگر سوال کیا جائے کہ ان صفات کا امتیاز جس طرح بیان کیا گیا ہے اگرچہ وہ مستلزم نقص غیر اور منافی الوہیت ومعبودیت غیر ہے مگر ہو سکتا ہے کہ وہ غیر کچھ اور دوسری ایسی صفات رکھتا ہو جو باعث امتیاز ہوں اور کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

حضرت نے جواب میں صبر وتحمل کی تلقین فرمائی اور یہ شعر تحریر فرمایا "ہر کہ عاشق شد الخ"۔ لیکن جب آپ نے انچھورے منتقل ہونے کے لیے منت وسماجت کے ساتھ اجازت چاہی تو حضرتؒ نے تحریر فرمایا کہ "آج کی رات ہم نے عالم کشف میں دیکھا کہ تمہارا سامان انچھورے سے الٰہ آباد منتقل کیا گیا ہے۔ اب تم الٰہ آباد میں یکسوئی کی جگہ اختیار کرو، اور اپنے اوقات ذکر الٰہی میں بسر کرو" ـــــ ؎ یہ شعر آگے صفحہ ۱۷ پر آرہا ہے ۱۲۔

نقص لازم نہ آئے ہر چند کہ ہم ان صفات کو نہ جانیں کہ یہ کون سی ہیں ـــــ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ صفات بھی دو حال سے خالی نہیں، یا صفاتِ کاملہ ہوں گی یا صفاتِ ناقصہ، ہر دو صورت میں وہی مذکورہ بالا استحالہ لازم آتا ہے ـــــ ہر چند کہ ہم ان صفات کو نہ جانیں کہ کون سی ہیں مگر اتنا تو معلوم ہے کہ وہ صفات، دائرۂ کمال و نقصان سے خارج نہ ہوں گی، بہر صورت نقص دامنگیر ہوگا جیسا کہ گذر چکا ـــــ

دوسری دلیل، غیر حق کے عدم استحقاقِ معبودیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کہ تمام اشیاء کی ضروریاتِ وجودی و توابع وجودی کے لیے کافی ہے اور اشیاء کا نفع و ضرر اسی سے تعلق رکھتا ہے تو لامحالہ غیر، بیکار و بے فائدہ ہوگا، اشیاء کو اس کی کوئی احتیاج نہ ہوگی، ایسی حالت میں اشیاء کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ذلت، خضوع اور انکسار کے ساتھ اس کے سامنے جھکیں؟ کفار جو غیر حق کی عبادت کرتے ہیں اور بتوں کو اپنے ہاتھوں سے تراش کر اپنا معبود بناتے ہیں اُن کا گمان فاسد یہ ہے کہ یہ بُت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سفارش کرنے والے ہوں گے اور ان کے ذریعے سے ہم درگاہِ حق تعالیٰ میں تقرب حاصل کر لیں گے۔ عجیب نادان ہیں، انھوں نے یہ کہاں سے جان لیا کہ بتوں کو مرتبۂ شفاعت حاصل ہوگا اور اللہ تعالیٰ اُن کو اذنِ شفاعت دے گا ـــــ محض توہم سے کسی کو عبادت میں شریکِ خدا کرنا انتہائی بدنصیبی اور خسارے کی بات ہے ـــــ عبادت کھیل نہیں ہے کہ ہر پتھر اور بے جان کی عبادت کر لی جائے اور ہر عاجز بلکہ اپنے سے زیادہ عاجز کو مستحقِ عبادت تصور کر لیا جائے ـــــ معنیٔ اُلوہیت کے پائے جانے کے بغیر عبادت کا استحقاق متصور نہیں ہے ـــــ بلکہ وہ مستحقِ عبادت ہے جو صلاحیتِ اُلوہیت رکھتا ہو۔ جس میں صلاحیتِ اُلوہیت نہیں اُس کے لیے استحقاقِ عبادت بھی نہیں ـــــ صلاحیتِ اُلوہیت، وجوبِ وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو واجب الوجود نہیں وہ اُلوہیت کے قابل اور عبادت کے لائق بھی نہیں ـــــ بے عقل ہیں وہ لوگ جو حق سبحانہٗ کو واجب الوجود تو مانیں اور عبادت میں اوروں کو بھی شریک کریں ـــــ اُنھیں معلوم نہیں کہ وجوبِ وجود، استحقاقِ عبادت کی شرط ہے۔ جب وجوبِ وجود میں کوئی شریک نہیں تو استحقاقِ عبادت میں بھی کوئی شریک نہ ہوگا ـــــ استحقاقِ عبادت میں کسی کو شریک کرنا وجوبِ وجود میں شریک کرنے کو مستلزم ہے ـــــ پس تکرارِ کلمۂ طیبہ کے ذریعے شریکِ وجوبِ وجود کی بھی نفی کرنا چاہیے اور شریکِ استحقاقِ عبادت کی بھی ـــــ

بلکہ اس راہ میں شریک استحقاقِ عبادت کی نفی بہت ضروری اور زیادہ نافع ہے، کیونکہ یہ نفی دعوتِ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے ـــــ لوگ دلائل عقلیہ سے شریک وجوبِ وجود کی نفی تو کرتے ہیں اور ایک کے علاوہ کسی اور کو نہیں جانتے۔ لیکن معاملۂ استحقاقِ عبادت سے غافل اور شریکِ استحقاقِ عبادت کی نفی سے فارغ ہیں۔ ان کو عبادتِ غیر سے پرہیز نہیں اور مراکزِ اصنام کی تعمیر سے باز نہیں آتے۔ انبیاء علیہم السلام کا یہ کام ہے کہ وہ بتوں کے اڈوں کو منہدم اور عبادتِ غیر کے استحقاق کو ختم کردیں ـــــ ان بزرگوں کی اصطلاح میں مشرک وہ ہے جو غیرِ حق کی عبادت میں گرفتار ہے اگرچہ واجب الوجود خدا ہی کو جانتا ہو ـــــ انبیاء کا اہتمام یہ ہوتا ہے کہ عبادت ماسوائے حق کی نفی ہو جس کا تعلق عمل و معاملے سے ہے اور اسی نفی سے یہ لازم آتا ہے کہ شریک وجوبِ وجود کی بھی نفی ہوئی ـــــ پس جب تک کوئی انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں پر، جو کہ استحقاقِ عبادتِ غیر کی نفی سے خبردار کرنے والی ہیں ـــــ عملدرآمد نہ کرے گا ـــــ شرک سے آزاد نہ ہوگا اور آفاقی و انفسی معبودانِ باطل کی شرکتِ عبادت کے شعبوں سے نجات نہ پائے گا ـــــ انبیاء علیہم السلام کے شرائع، شرک سے رستگاری کے ضامن ہیں بلکہ اُن کے مبعوث ہونے کا مقصود یہی یہ دولتِ توحید تھی ـــ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسروں کے یہاں شرک سے نجات میسر نہیں اور نہ ان کی ملت پر عمل کیے بغیر توحید ممکن ہے......

جاننا چاہیے کہ غیر اللہ کے لیے عبادت کا استحقاق نہ ہونا بدیہی ہے...... اس لیے کہ جو معنیٔ عبادت کو اچھی طرح سمجھ لے گا اور غیر اللہ کا مطلب بھی جان لے گا، وہ بغیر توقف کے غیرِ خدا کے عدمِ استحقاقِ عبادت کا فیصلہ کرلے گا، جو مقدمات اس سلسلے میں بیان کیے جاتے وہ فقط بدیہیات پر تنبیہات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مقدمات پر نقض اور معارضہ وارد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بس نورِ ایمان کی ضرورت ہے تاکہ فراست سے ان مقدمات کو سمجھ سکے۔ بہت سے بدیہی امور ہیں جو بے وقوفوں اور کم سمجھ لوگوں پر مخفی رہے ہیں ـــــ اسی طرح وہ گروہ جو مرضِ ظاہر اور علتِ باطن میں مبتلا ہے جلی و خفی بدیہیات اس پر پوشیدہ ہیں....

...... رہا یہ سوال کہ مشائخ طریقت قدس اللہ اسرارہم کے یہاں جو یہ مقولہ ہے "ہرچہ مقصودِ تست معبودِ تست" یعنی جو تیرا مقصود ہے وہی تیرا معبود ہے، اس کے کیا معنیٰ ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کا مقصود وہ شے ہوتی ہے جس کی طرف وہ (ہمہ تن) متوجہ ہوتا ہے اور جب تک جان میں جان رہتی ہے اُس مقصود کے حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ ہر قسم کی ذلت و انکساری جو اس مقصود کے حاصل کرنے میں پیش آئے اس کو برداشت کرتا ہے، سستی نہیں برتتا ہے اور عبادت کا ماحصل بھی یہی ہے، کیونکہ عبادت انتہائی ذلت کا اظہار کرتی ہے، لہٰذا کسی چیز کا مقصود ہونا اُس شے کے معبود ہونے کو مستلزم ہوا ___ پس غیر اللہ کی معبودیت کی نفی اُس وقت متحقق ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی مقصود باقی نہ رہے اور اُس کی مراد، سوائے حق تعالیٰ کے اور کوئی چیز نہ ہو ___ اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے معنیٰ لا مقصود اِلَّا اللّٰہ قرار دینا مناسب حالِ سالک ہے ___ اس کلمۂ طیبہ کی اتنی تکرار کی جائے کہ مقصودیتِ غیر کا نام و نشان نہ رہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مُراد نہ ہو، جب ایسا ہوگا تو معبودیتِ غیر کی نفی میں صادق ہوگا اور بے شمار معبودانِ باطل کے ازالہ میں سچا سمجھا جائے گا ___ اس طرح سے کثیر التعداد معبودانِ باطل کی نفی کرنا اور مقصودیتِ غیر کی نفی کر کے معبودیتِ غیر کی نفی میں داخل ہونا کمالِ ایمان کی شرط ہے ___ کمالِ ایمان، ولایت سے وابستہ اور خواہشاتِ نفس کے بُتوں کی نفی سے متعلق ہے ___ جب تک نفس مطمئنّہ نہ بنے اس کمال کی توقع نہیں ___ اور اطمینانِ نفس، کمالِ فنا و بقا کے بعد متصور ہے ___

ظاہر شریعت میں تو ___ جو کہ آسانی و سہولت کی خبر دینے والی ہے اور بندوں کے حرج کو رفع کرنے والی ہے، اس لیے کہ بندے ضعف پر مخلوق ہوئے ہیں ___ ایسا ہے کہ کسی مقصود کے حاصل کرنے میں اگر شریعت کی مخالفت اور حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرے تو البتہ وہ مقصود اس کا معبود ہوگا، لیکن اگر وہ مقصود اس طرح کا نہیں ہے اور اس کے حاصل کرنے میں ممنوعاتِ شرعیہ کا ارتکاب نہیں کرتا ہے تو وہ مقصود شرعاً ممنوع نہ ہوگا گویا کہ وہ مقصود درحقیقت اس کا مقصود و مطلوب نہیں ہے دراصل اس کا مقصود، حق تعالیٰ ہی ہے اور اوامر و نواہیِ شرعیہ اس کے مطلوب ہیں ___ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس کو شے مقصود کی طرف طبعی میلان ہو گیا ہے اور وہ میلان بھی احکامِ شرعیہ میں دبا ہوا ہے۔

مگر حقیقتِ شریعت میں جو کہ کمالِ ایمان کی طرف رہنمائی کرتی ہے ـــــ مقصودیتِ غیر کے مادّے کا قلع قمع کر دینا ہی مدنظر ہے ـــــ اس لیے کہ مقصودیتِ غیر حق کی تجویز کی صورت میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غلبۂ ہوا و ہوس کے ہاتھوں مقصودیتِ غیر، مقصودیتِ حق سے مقابلے کی ٹھان لیتی ہے، بلکہ اس مقصود کو حاصل کرنے کو مرضیٔ حق تعالیٰ کے حصول پر ترجیح دیتا ہے ـــــ اور اس طرح خسارتِ ابدی تک نوبت پہونچتی ہے ـــــ پس مقصودیتِ غیر کی مطلق نفی تکمیلِ ایمان کے لیے ضروری ہوئی تاکہ زوالِ ایمان سے محفوظ رہ سکے.......

مکتوب ۵ - سیادت پناہ میر محمد نعمان اکبرآبادی[۱] کے نام

[قلعۂ گوالیار میں قید و نظربندی کے زمانے سے متعلق احوال و اذواق]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الّذین اصطفیٰ ـــــ

واضح ہو کہ جس وقت تک میں اللہ کی عنایت سے ـــــ وہ عنایت جس نے بصورت جلال و غضب ظہور فرمایا ـــــ قفس زندان میں محبوس و مقیّد نہ ہو گیا ـــــ اُس وقت تک نہ تو ایمانِ شہودی کے کوچۂ تنگ سے بالکلیہ آزاد ہوا، نہ کوچہ ہائے ظلال و خیال سے باہر نکلا۔ نہ شاہراہِ ایمان بالغیب پر آزادانہ گامزن ہو سکا نہ حضور سے غیب، عین سے علم اور شہود سے استدلال تک کامل طریقے پر پہونچا، نہ بے ننگی و بے ناموسی کے خوشگوار شربت اور نہ خواری و رسوائی کے مزے دار مُربّے چکھ سکا، نہ طعن و ملامتِ خلق کے جمال سے کوئی حصہ حاصل کر سکا، نہ بلا و جفائے

---

[۱] اس سے پہلے زبدۃ المقامات سے اخذ کر کے آپ کے مختصر حالات لکھ چکا ہوں یہاں بوستانِ اخیار تذکرۂ مشاہیر اکبرآباد سے آپ کے متعلق جو دو ایک اور باتیں معلوم ہوئی ہیں ان کو لکھتا ہوں ـــــ حضرت مجددؒ نے خرقۂ خلافت سے مشرف فرما کر آپ کو دکن (برہان پور) متعین فرمایا ـــــ آخر کار جہانگیر بادشاہ نے (غالباً حضرت مجددؒ کی وفات کے بعد) آپ کو دار الخلافہ (آگرہ) کی صدارتِ عظمیٰ کے منصب پر سرفراز کیا۔ آگرہ میں آپ کا مکان اور خانقاہ محلہ صوفی پورہ میں واقع تھی جہاں اب مزار مبارک ہے ـــــ آپ کی وفات ۱۰ صفر ۱۰۵۸ھ میں ہوئی ـــــ میر نعمان ستودہ دیں بودہ ـــــ مصرع تاریخ وفات ہے ـــــ

دم کے حسن سے بہرہ یاب ہوا ــــــ نہ غسّال کے ہاتھوں میں جس طرح میّت بے حس و حرکت ہوتی
ہے اس طرح ترکِ ارادہ و اختیار میں نے کیا، نہ آفاق و انفس کے رشتہ ہائے تعلق کو تمام و کمال
توڑ سکا، نہ تضرع و التجا، انابت و استغفار اور ذلّت و انکسار کی حقیقت کو حاصل کر سکا ــــ نہ استغنائے
حضرتِ حق جلّ مجدہٗ کی رفیع المنزلت ترازو کا جو عظمت و کبریائی کے پردوں سے ڈھکی ہوئی ہے
مشاہدہ کر سکا اور نہ اپنے کو بندۂ خوار و زار، ذلیل و بے اعتبار، بے ہنر و بے اقتدار اور انتہائی
محتاج و افتقار دالاعلوم کر سکا ــــ وما اُبَرِّءُ نفسی اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بالسُّوءِ اِلَّا ما
رَحِمَ رَبِّی اِنَّ رَبِّی غَفُوْرٌ رَّحِیْم ــــ (میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں، بیشک
نفس، بدی کا بہت حکم دینے والا ہے، مگر اس وقت نہیں جبکہ میرا پروردگار مہربانی کرے، بیشک
میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے) ــــ اگر محض فضلِ خداوندی سے فیوض و وارداتِ
الٰہی اور اس کے عطیات و انعاماتِ لامتناہی، متواتر و پیہم اس محنت کدہ (قید خانے) میں اس
شکستہ خاطر کے شاملِ حال نہ ہوتے تو قریب تھا کہ معاملہ یاس و ناامیدی تک پہونچ جاتا اور
رشتۂ امید ٹوٹ جاتا، اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے عینِ بلا میں عافیت دی اور نفس جفا کے
اور اکرام کیا، نیز حالتِ مشقت میں میرے اوپر احسان فرمایا اور مجھ کو خوشحالی و تنگ حالی میں شکر
کی توفیق بخشی اور مجھ کو انبیاء کے متبعین اور اولیاء کے نقشِ قدم پر چلنے والوں اور علماء و صلحاء
سے محبت رکھنے والوں میں کر دیا ــــ صلواتُ اللہِ سُبحانہٗ وتسلیماتہٗ علی الانبیاء
اوّلاً وعلیٰ مُصدّقیھم ثانیاً ــــ

مکتوب (۶) ـ معارف آگاہ شیخ بدیع الدین[1] سہارنپوری کے نام ــــ [قلعۂ گوالیار سے بحالتِ قید و بند]

الحمد للہِ وسلامٌ علیٰ عبادہِ الَّذینَ اصطفیٰ ــــ تمہارا مکتوب جو شیخ

---

[1] آپ حضرت مجددؒ کے قدیم خلفاء میں سے ہیں ۔ آپ کے حالات میں سے اس جگہ یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ بعد حصولِ خلافت آپ اپنے وطنِ مالوف سہارنپور تشریف لے آئے اور طالبانِ معرفت کی اصلاح و تربیت میں مشغول ہو گئے ۔ چند روز بعد حضرتؒ نے آپ کو آگرہ جانے کا حکم دیا۔ یہ شہر دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے اس وقت خاص مرکز ہت

(باقی برصفحہ آئندہ)

فتح اللہ کی معرفت بھیجا تھا پہونچا ـــــ جفا و ملامتِ خلق کی شکایت تم نے لکھی تھی ـــــ (برادرم) یہ ملامتِ خلق تو اس طائفۂ صوفیا کا جمال ہے اور اُن کے زنگار کا صیقل ہے، پھر باعثِ رنجیدگی کیوں ہو؟ فقیر جب اس قلعۂ گوالیار میں (بحکم جہانگیر) پہونچا تو شروع شروع میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامتِ خلق کے انوار مختلف شہروں اور بستیوں سے نکل کر سجا بہائے نورانی کی طرح پے در پے پہونچ رہے ہیں اور حال کو پستی سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جارہے ہیں ـــــ تم سالہا سال تربیتِ جمالی کے ساتھ منازل طے کرتے رہے ہو اب تربیتِ جلالی کے ساتھ بھی قطع مسافت کرو اور مقامِ صبر بلکہ مقامِ رضا میں رہو ـــــ جمال و جلال کو ساوی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
رکھتا تھا اور ابھی تک اس سلسلے کے خلفاء سے خالی تھا۔ حضرت نے تاکید فرمادی تھی کہ آگرہ میں پوری استقامت سے رہنا اور ہمارے حکم کے بغیر وہاں سے کہیں نہ جانا۔ یہ آگرہ پہونچے، حق تعالیٰ نے مقبولیتِ عامہ نصیب فرمائی اُمراء وغیرہ سب آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے۔ لیکن آپ سے یہ لغزش ہوئی کہ اپنے پیر و مرشد کی اجازت کے بغیر وہاں سے سہارن پور چلے آئے۔ یہ بات حضرت رح کو سخت ناگوار گزری۔ جب آپ کو ناگواری کا علم ہوا تو دوبارہ آگرہ کا قصد کیا اور حضرتؒ کو اپنے ارادے کی اطلاع دی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ وہاں کا صحیح وقت وہی تھا اب اگر تم جاتے ہو تو تم جانو تمہیں اختیار ہے۔ آپ بحالتِ اضطراب اس امید میں کہ شاید حضرتؒ کی ناراضگی دور ہو جائے دوبارہ آگرہ چلے گئے۔ اس دفعہ بھی شروع شروع خلقِ خدا کو بہت نفع پہونچا۔ لیکن اتفاق کی بات ایک دن وہاں کی چھاؤنی کے چند اُجڈ فوجی آپ کے پاس آئے آپ نے اُن کی ذہنیت و صلاحیت کا لحاظ کیے بغیر اُن کو سختی کے ساتھ بعض منکرات پر نصیحت فرمائی جسکی وجہ سے ان میں بعض بدنصیب آپ کے دشمن ہو گئے۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنے بلند احوال و انکشافات عام لوگوں کے سامنے بیان کیے جو معاندین کے کانوں میں پہونچ کر فتنے کا باعث بن گئے چنانچہ ایک زبردست فتنہ آپ کے خلاف برپا کر دیا گیا۔ اس فتنے کا اثر حضرت مجددؒ تک بھی پہونچا، اور جہانگیر بادشاہ نے جو اس وقت تک طائفۂ فقراء سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا حضرتؒ کو طلب کر کے ایذا پہنچائی اور قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ (ماخوذ از نزہۃ الخواطر) آپ کی وفات [illegible] ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر جلد پنجم مؤلفہ مولانا حکیم سید فخر الدین حسنی رائے بریلویؒ)۔

جانو ــــ تم نے لکھا تھا کہ ظہور فتنہ کے وقت سے (آپ کے قید میں جانے کے وقت سے) نہ ذوق باقی رہا نہ حال، (ارے بھائی) چاہیے تو یہ تھا کہ اب ذوق وحال دوچند ہو جاتا اس لیے کہ جفائے محبوب وفائے محبوب سے زیادہ لذت بخش ہوتی ہے ــــ تعجب ہے کہ تم بالکل عوام الناس کی سی باتیں کرتے ہو اور محبت ذاتیہ سے دور ہو گئے ہو (ایسی باتیں نہ کرو بلکہ) اس کے برخلاف جلال کو جمال سے بڑھ کر سمجھو ــــ ایلام کو انعام سے زیادہ تصور کرو، اس لیے کہ جمال وانعام میں تو مراد محبوب ہماری اپنی مراد سے ملی جلی ہوئی ہے، اور جلال وایلام میں خالص مراد محبوب ہوتی ہے ہماری مراد کے خلاف ــــ ابتلا وایلام کا وقت جمال وانعام کے وقت سے اونچا ہوتا ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے ــــ زیارت حرمین شریفین کے متعلق تم نے لکھا تھا اس میں کون مانع ہے؟ ــــ حسبنا اللہ ونعم الوکیل ــــ

مکتوب (۷)۔ سیادت پناہ میر محب اللہ مانکپوری کے نام ــ [تحمل ایذائے خلق کے بیان میں]

بعد الحمد وتبلیغ الدعوات ــــ واضح ہو کہ تمہارا مکتوب پہونچا، فرحت فراواں ہوئی (دیکھو) مخلوق کی ایذا دہی اور رشتے داروں کی زیادتی پر تحمل وصبر کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ (آپ صبر کیجئے جس طرح عالی ہمت پیغمبروں نے صبر کیا ہو۔ اور کفار کے لیے عذاب جلد طلب نہ کیجئے)

جس جگہ تم مقیم ہو وہاں کی سکونت میں نمکین شے تو یہی ایذا وجفا ہے ــــ اور تم اس نمکین شے سے بھاگتے ہو ــــ ہاں بھائی جو شکر پروردہ (ناز پروردہ) ہوتا ہے وہ تاب وطاقت نمک نہیں رکھتا ــــ مگر کیا کیا جائے ــ ؎[۵]

ہر کہ عاشق شد اگرچہ نازنین عالم است
نازکی کے راست آید بار می باید کشید

---

[۵] جس نے کوچۂ عشق میں قدم رکھا وہ نازنین عالم ہی کیوں نہ ہو اس کی نزاکت نہیں چلے گی۔ اس کو تو بوجھ اٹھانا ہی پڑے گا۔

تم نے لکھا تھا کہ اگر اجازت ہو تو الہ آباد میں سکونت اختیار کرلوں (اچھی بات ہے الہ آباد کے علاوہ) کوئی دوسری جگہ تجویز کرسکتے ہو تاکہ وہاں جفائے خلق کی زیادتی سے بچ کر اطمینان کا سانس لے سکو۔ مگر یہ طریق رخصت ہے — طریق عزیمت، جفا و ایذا پر صبر و تحمل کرنا ہی ہے — اس زمانے میں فقیر پر ضعف غالب ہے جیسا کہ تم کو معلوم ہے — اسی وجہ سے چند کلمات پر اکتفا کیا گیا — والسلام —

مکتوب (۹) سیادت مآب میر محمد نعمان اکبرآبادی کے نام — [ورع و تقویٰ کے بیان میں]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ — (رسول جو کچھ تمہیں (حکم) دیں اس کو قبول کرلو اور جس سے منع کریں تم کو پس باز رہو اُس سے اور اللہ سے ڈرتے رہو)

اس آیت میں تقویٰ کا ذکر بجا آوریِ اوامر اور پرہیزگاریِ مناہی کے بعد کیا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے پرہیزگاری کے اہتمام کی طرف — ممنوعات سے پرہیز کرنا اور باز رہنا ہی حقیقتِ تقویٰ ہے اور دین کی اصل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "تقویٰ تمہارے دین کی اصل بنیاد ہے"۔ دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا ہے کہ "تقویٰ کے برابر کسی چیز کو مت شمار کرو"........ (میرے نزدیک پرہیزگاری و تقویٰ کے اہتمام کی — واللہ اعلم بالصواب — وجہ یہ ہے کہ پرہیزگاری و تقویٰ وجود کے لحاظ سے بہت عام اور نفع کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کہ پرہیز کرنا، اور باز رہنا بجا آوریِ احکام کے ضمن میں بھی پایا جاتا ہے — کسی امر کا بجالانا اُس کی ضد سے بچنا اور رکنا ہے۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے — عموم والی بات کے علاوہ بھی پرہیزگاری کا نفع بہت ہے، اس لیے کہ پرہیزگاری، خالص مخالفتِ نفس ہے۔ نفس کے لیے اس میں کوئی حظ نہیں بخلاف بجا آوری کے کہ اس سے نفس کبھی لذت یاب بھی ہوتا ہے — اور جس چیز میں نفس کی مخالفت زیادہ ہو اس میں شک نہیں کہ اس میں نفع بھی زیادہ ہو اور یہ نجات کا قریب ترین راستہ ہو اس لیے کہ تکلیفاتِ شرعیہ سے مقصود اصلی نفس کو مقہور کرنا ہے — کیونکہ نفس دشمنیِ حق تعالیٰ پر ڈٹا ہوا ہے — ....

اثرات

از ــــــــــــ ڈاکٹر میر ولی الدین

زہر بادے چو کاہے گر بہ لرزی
اگر کوہی بکاہے ہم نیرزی!

انسان کی زندگی اثرات کے ایک بحرِ ناپیدا کنار میں بسر ہو رہی ہے۔ اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں یہ اثرات بھی بدلتے رہتے ہیں، یہ کبھی ملائم طبع ہوتے ہیں، کبھی ناملائم طبع، کبھی موافق، کبھی ناموافق۔

زندگی کے کسی دور میں اگر اس کو مخالف و ناسازگار اثرات سے سابقہ پڑ جائے تو وہ ان پر کس طرح غالب آسکتا ہے؟ اگر کسی وقت غیر ملائم طبع اثرات کی تقناطیسیؒ دکا وہ شکار ہو جائے تو اس کے لیے راہِ نجات کیا ہے؟ محض اپنی محدود قوت سے ان کا مقابلہ کامیابی کی یقینی راہ نہیں کہ ع جا با بابد سپر انداختن! کامیابی کی قطعی و یقینی راہ تو وہ ہے جو خود اس کے باطن میں موجود ہے، اور یہ اس کے نفس کا تغیّر ہے! اگر وہ خود بدل جائے تو وہ ان مخالف اثرات سے متاثر ہی نہیں ہوتا، اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر مفکّرین کے ایک گروہ نے شر کو بھی خیر قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں اپنے اندر تغیّر پیدا کرنے یعنی اپنی اصلاح و تزکیہ کے لیے اُبھارتا ہے تاکہ اس کا مقابلہ کیا جاسکے۔

انسان ایک قسم کا وائرلیس (لاسلکی) اسٹیشن ہے جہاں غیر مرئی عالم سے بےشمار تموّجات وصول ہوتے رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر وائرلس سٹ کا ایک ٹیونر یا سر ٹھیک کرنے والا آلہ ہوتا ہے، اسی کی مدد سے ہم مختلف طول کے اثیری تموّجات اپنے سٹ سے حاصل کرنے کے

کے قابل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم اس سے ایک خاص طول کے تموّجات حاصل کرتے ہیں تو یہ آلہ اس وقت دوسرے طول کے تموّجات حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ دوسرے طول کے تموّجات اثیر کو جھونکے دیتے رہتے ہیں لیکن آلہ ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اس کی بعض مستثنیات بھی ہیں لیکن ان کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ جو تمثیل ہم نے یہاں پیش کی ہے وہ عام طور پر صحیح ہے۔

اسی طرح انسان کو بھی ایک باطنی ملکہ حاصل ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کو بیدار کیا جائے اور قوی بنایا جائے تاکہ وہ اس سے اچھی طرح کام لے سکے۔ اس کے بغیر انسان خارجی حالات کا شکار اور "قسمت" کا کشتہ ہوتا ہے، انقلاباتِ زمانہ کا قیدی ہوتا ہے اسکی مثال اس پرِ کاہ کی سی ہوتی ہے جو ہوا کے معمولی سے جھونکے کی بھی تاب نہیں لا سکتا، اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی حالت کا استحضار جب خیّام کو ہوا تو اس کی زبان سے یہ چیخ نکلی:

آورد باضطرابم اوّل بوجود جز حیرتم از حیات چیزے نہ فزود!
رفتیم باکراہ و ندانیم چہ بود زیں آمدن و بودن و رفتن مقصود؟

واقعی بے بصیرت عامی، جو نورِ باطن سے محروم ہے اس کا یہی حال ہے، وہ اضطراب و اضطرار میں اپنی زندگی کے چند دن بسر کرتا ہے، ہر حادثہ اور ہر واقعہ سے لرزاں و ترساں و پریشان رہتا ہے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے باطن میں ایک قوت موجود ہے جو اس کو تمام منفی اثرات سے نجات دلا سکتی ہے اور خوف و حزن کو اس کے قلب سے دور کر سکتی ہے، اسکی روح کو طمانیت اور سکینت سے معمور کر سکتی ہے۔ وہ وائرلیس آلہ کی طرح بعض اثرات کے لیے 'میّت' اور بعض کے لیے 'حیّ' بن سکتا ہے۔ ہم آپ کی تفہیم کے لیے اس قوتِ باطنی کو لنکر کی قوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب آپ کو اس قوت پر قابو حاصل ہو جائے تو آپ اپنی مرضی کے مطابق خود کو ایک اعلیٰ مقام پر منتقل کر سکتے ہیں اور سارے منفی اثرات کے دائرہ سے باہر نکل آ سکتے ہیں، یہی راہِ نجات ہے اور یہی فوز و فلاح کی راہ۔ جب انسان کو صداقت کے اس اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا قلب اس مقام کے برتر

اثرات کو قبول کرنے لگتا ہے اور گوادنیٰ یا منفی اثرات کا اس کے قلب پر ہجوم کیوں نہ ہو وہ ان سے ذرّہ برابر متاثر نہیں ہوسکتا، اسی لیے کسی واقف حال نے نصیحت کی تھی :

بر کنارے شو زہر نقشے کہ می آید پدید
تا ترا نقاش صورت از میاں آید پدید!

امر واقعی تو یہ ہے کہ انسان اپنی قوت فکر کے سوا ہر چیز میں مجبور ہے۔ اپنی فکر کے دائرہ میں وہ آزاد ہوسکتا ہے۔ اگر وہ چاہے! اگر وہ چاہے کہ اس مقام تک رسائی حاصل کرے جو فکر سے بھی ماورار ہے تو اسی فکر کی راہ سے اس تک پہونچ سکتا ہے اور یہی وہ راہ بھی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کو ظلمت و تباہی، نقص و زوال کے دائرہ سے نکال کر اعلیٰ و برتر مقام پر پہونچا سکتا ہے۔

وقت آمد کز جہانِ بیکسی
پائے کوباں سوئے بامِ او رسی

اس اجمال کی کسی قدر تفصیل یہ ہے کہ انسان کو فکر کی بلندی حق تعالیٰ کے متعلق صحیح فکر ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، حق ہی کُلِ حقیقت ہے اور حقیقت کُل خیر ہے، سبّوح و قدوس ہے، اب انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے خیالات و تصورات اور ساری فکری زندگی کو اس عظیم الشان صداقت کے مطابق کرلے، کیمیائے فکر کا حصول اس وقت ممکن ہے جب انسان غلط خیالات و تصورات کو قبول کرنے سے انکار کردے اور اُن کی بجائے، ان کے خلاف حق ہی کی فکر کرے اور اسی پر قائم رہے، حواس کی جھوٹی شہادت کو رد کر کے اور حق ہی کا اثبات کر کے انسان اپنے فکر کی تقلیب کرسکتا ہے، اور اس طرح اعلیٰ روحانی قوانین کو ظہور کا موقع دے سکتا ہے اور یہ سطح اسفل کے قوانین کو مقہور و مسخر کرلیتے ہیں۔ یہی وہ کبریت احمر ہے، یا پارس پتھر ہے جو گھٹیا دھات کو سونا بنا دیتا ہے! یہ جبلی یا فاسد خیالات، تیقنات و تصورات کو حقیقی و اصلی خیالات میں بدل دیتا ہے (حق و صداقت) جس کے بعد انسان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں رہتی، کیونکہ خارجی زندگی تو باطنی زندگی کا عکس ہوا کرتی ہے :-

تاکے از دار الغرور سے ساختن دار السرور؟ تاکے از دار الفرار سے ساختن دار القرار؟

"تعطیب افکار" کا مطلب یہ ہے کہ ہم غلط یا فاسد یا منفی خیالات کی ذہن سے نفی کریں یا صوفیائے کرام کی زبان میں "نفی خواطر" کریں اور ان کی جگہ مثبت، حقیقی، ربانی خیالات کا اثبات کریں۔ اس مشق کی انتہا پر وہ مقام ہے جو "انقطاع عما سوی اللہ و عدم التفات بہمہ اکوان واستہلاک در بیرنگی محض و اطلاق صرف" کا مقام کہلاتا ہے۔ یہ منتہیوں کا مقام ہے۔ یہاں اس کا ذکر مقصود نہیں۔ ہمیں یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ فکر کی قوت قاہرہ کے ذریعہ کس طرح ہم زندگی کے طوفان سے نکل سکتے ہیں اور اپنا اصلی کام سکون و طمانیت، جمعیت و یکدلی کے ساتھ کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں خواطر ردیہ کی نفی پر دسترس حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے ہم زمین کو فردوسی بنا سکتے ہیں، یعنی اپنے قلب میں نعیم فردوس کو محسوس کرسکتے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ جنت کا ظاہری حسن بھی باطنی سکون ہی کا خارجی عکس ہے۔ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا:

اِنَّ الْجَنَّۃَ قَاعٌ صفصفٌ لیس فیھا عمارۃٌ فاکثروا من غراس الجنۃ فی الدنیا۔	جنت ایک صاف اور ہموار زمین ہے جس میں کوئی تعمیر نہیں، تم دنیا ہی میں جنت کے زیادہ سے زیادہ درخت اگاؤ کہ ان کو وہاں پاؤگے)

پوچھا گیا: ما غراس الجنۃ یا رسول اللہ؟ (جنت کی شجرکاری، یا رسول اللہ! کیا ہے؟) فرمایا: التسبیح والتھلیل۔ اسی سلسلہ کی بات تھی جو ارشاد فرمائی گئی:

دوزخی آتش با خود بدوزخ می برد ۔۔۔ دوزخی اپنی آگ خود دوزخ میں لے جاتا ہے

اسی مفہوم کی اگر اس طرح تعبیر کی جائے کہ جنت و دوزخ انسان ہی کے باطن کا عکس ہیں تو تنہا تعبیر میں غلطی نہیں بتلائی جاسکتی۔ اب باطن یا قلب میں جنت کی تعمیر کا پہلا قدم افکار کی تعطیب اٹھایا جاسکتا ہے، فکر و خیال کی تصحیح سے عمل کی تصحیح لازم آتی ہے، فکر یا علم اصل ہے عمل اس کا ظل ہے۔ اور جیسا عمل ہوگا ویسا ہی اس کا پھل ہوگا ۔۔۔ "ہر چہ بکاری بدروی"

آؤ، اب ہم تمھیں تعطیب افکار کا آسان طریقہ بتلائیں جو مبتدی کے لیے نہایت مفید ثابت ہوچکا ہے ۔۔۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔ یہ آسان طریقہ پہلا یہ ہے کہ ہر منفی دردی

خیال کے قلب میں آتے ہی اس کو مثبت و مفید خیال میں بدل دو، تضرع و الحاح کے ساتھ خالق مطلق سے اعانت چاہو اور اپنی ہمت کا پامردی سے استعمال کرو۔ ہم چند مثبت خیالات یا استغاثوں کا تمھاری سہولت کے لیے یہاں ذکر کرتے ہیں۔

(۱)

حسبنا اللہ و نعم الوکیل اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔

بر خدا بگذاشتم این کار و بار خویش را!
میر ساماں ساختم پروردگار خویش را!

(۲)

اللہ اللہ ربی، لا اشرك به شیئاً
اللہ ہی میرا ربّ ہو، اس کی ربوبیت میں میں کسی
دوسرے کو شریک نہیں کرتا

سخن بہ پیش کہ گویم، چارہ ساز توئی!
مرادِ دل ز کہ جویم چوں دل نواز توئی!

(۳)

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم
تو قبلہ مقصود منی در ہمہ حال
من روئے بکہ آرم و حاجت ز کہ خواہم؟

(۴)

یا حی یا قیوم برحمتك استغیث
نظرے بکن بکارم کہ ز دست رفت کارم
بکسم مکن حوالہ کہ بجز تو کس نہ دارم

(۵)

لا الٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین

ترا چو ہست بحالِ شکستگاں نظرے
بحالِ ما بنگر کز ہمہ شکستہ تریم!

(۶)

استغفرك اللّٰهُمَّ و اتوب اليك ياذا الجلال والاكرام

ز خواجگانِ جہاں کردہ ایم قطع امید
ہمیں بلطف تو داریم امیدواری بس

(۷)

حسبی اللہ لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم

پناہے بود ہر کسے را دہندہ
بجز آستانت پناہے نہ دارم

ہر کسے در جہاں کسے دارد
من ترا دارم و ترا و ترا

(۸)

الحمد للہ رب العالمین!

کرم گر از تو نہ بینم بس از کہ خواہم دید
عطا گر از تو نہ یابم پس از کہ خواہم یافت

یہ سب کلمات جن کا اوپر ہم نے ذکر کیا دُعَاءُ الفَرَج کہلاتے ہیں، مایوسی، مصیبت یا آفت کے وقت ان کی تکرار سے قلب کی حالت سنبھل جاتی ہے۔ اور جوں ہی قلب کو سنبھالا ملا کر خارجی حالات بھی بدل جاتے ہیں ــــ وھذا سرٌّ عجیب!

کسی دوسری صحبت میں ہم اس سلسلہ کی دوسری باتیں پیش کریں گے ان شاء ربّی۔

چوں شد سخن دراز کنم ختم بر دعا
خود کارِ من دعاست چہ در سر چہ در ملا

تجدد و مغرب زدگی کے اسباب

اور ان کا علاج

[مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی زیر طبع تازہ تالیف "اسلامی ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کا ایک اہم باب]

اس وقت جب کہ کمال اتاترک کی قیادت (۱۹۲۴-۱۹۳۸ء) میں عالم اسلام میں تجدد و مغرب زدگی کی تحریک کے آغاز سے لے کر اس وقت تک کی تاریخ اجمال و اختصار کے ساتھ آچکی ہے اور معزز ناظرین دیکھ چکے ہیں کہ آزاد ہونے والے اسلامی ممالک یا نئی قائم ہونے والی مسلمان سلطنتوں کے بانی اور رہنما کم و بیش کمال اتاترک کے فکر سے متفق یا اس سے متأثر نظر آتے ہیں اور ہر ملک کے ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب اختیار طبقہ کا رُخ کمالی طرز کی اصلاحات و ترقیات اور تجدد و مغربیت کی طرف ہے، ہم کو اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ آیا یہ محض اتفاق ہے یا یہ کمال اتاترک کی طاقتور شخصیت کا نتیجہ ہے، یا اس کی تہ میں اس سے زیادہ ٹھوس، مؤثر اور عالمگیر اسباب پائے جاتے ہیں کہ عالم اسلام میں ملک اور سوسائٹی کی نئی تعمیر و تشکیل کے لئے جو اٹھتا ہے وہ کمال اتاترک کے ہی نقش قدم پر چلتا ہے اور ملک کی ترقی اور استحکام کا راز تجدد و مغربیت ہی کو سمجھتا ہے، ہمارے نزدیک اس کے کچھ گہرے ٹھوس اور عمومی اسباب ہیں، ہم یہاں مختصر طریقہ پر علٰحدہ علٰحدہ ان اسباب و عوامل (FACTOR) کا جائزہ لیں گے۔

مغربی نظام تعلیم | اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظام تعلیم بھی اپنی ایک روح

اور ضمیر رکھتا ہے، یہ روح اور ضمیر در اصل اسکے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر، مطالعۂ کائنات، "علم اسماء" کے اساس و مقصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے، یہ روح اس کے پورے ڈھانچہ، ادب و فلسفہ، تاریخ، فنون لطیفہ، علوم عمرانیہ حتیٰ کہ معاشیات و سیاسیات میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرد کرنا بڑا کٹھن کام ہو جاتا ہے، یہ بہت بڑے صاحب اجتہاد اور اعلیٰ تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے کہ اسکے مفید اجزا کو مضر اجزاء سے الگ کرکے خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کرے، اور اصل و زوائد میں فرق کرکے اس کا جوہر اور اس کی روح لے لے، طبعی و تجربی (سائنٹفک) علوم میں یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں، لیکن ادب و فلسفہ اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بہت مشکل اور نازک ہے، خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین و محکم عقائد، مستقل فلسفۂ حیات اور مسلک زندگی، اور ایک مستقل تاریخ جو محض ماضی کا ایک ملبہ (D ...) نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس کے لئے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے، جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظام تعلیم قبول کرتی ہے جو اساس و بنیاد اور مثال و معیار میں اس سے مختلف بلکہ ضد واقع ہوتی ہے تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے، اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب، اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش، پھر عقائد میں "تزلزل" پھر اپنے دین سے انحراف اور قدیم افکار و اقدار (VIEWS VALUES) کے بجائے جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے، یہ سب ایک قدرتی امر ہے، اور بالکل قدرتی امور کی طرح اس کا پیش آنا ضروری ہے، کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش، سرپرستوں کی خواہش خارجی و جزئی انتظامات اس امر کے وقوع میں حائل نہیں ہو سکتے، اس کی رفتار کو سست اور اس کے وقوع کو موخر کر سکتے ہیں، ملتوی نہیں کر سکتے، درخت اگر اپنے طبعی نظام سے نشو و نما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا اور وقت پر پھل لائے گا، انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں، یا اس کو پانی نہ دیں، یا جب تیار ہو تو اسکی ہستی کو ختم کر دیں۔

مگر اس کا اختیار نہیں کہ ایک توانا و تندرست، سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نوعی وجود و شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھل پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظام تعلیم کا ہے کہ وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدۂ و ذہنیت کا عکس ہزاروں سال کے طبعی ارتقا کا نتیجہ اہل مغرب کے مسلّمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے، یہ نظام تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداءً ذہنی کشمکش پھر اعتقادی تزلزل پھر ذہنی اور بعد میں (الا ماشاء اللہ) دینی ارتداد قدرتی ہے، ایک سلیم الطبع مغربی مبصر[۱] نے جس کو مغرب کے نظام تعلیم اور مشرق میں اسکے نتائج کا وسیع تجربہ ہے، صحیح لکھا ہے:-

"ہم نے گذشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کئے ہیں، کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ملکر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے) مخالف اسلام اثرات سے پاک ہو سکتی ہے۔

ہماری اس توقع کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات کا استثنا کر دیں جن میں کسی انتہا درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لئے ایسا ممکن ہوا کہ وہ اپنے درسی مضامین سے متاثر نہیں ہو سکا تو بھی اصول یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی کہ وہ اپنے کو اس مخصوص ربانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں جس کو اسلام لے کر آیا۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں، کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضمحل ہوتے جاتے ہیں جنھوں نے مغربی

---

[۱] محمد اسد سابق (LEOPOLD VEISS)

بنیادوں پر تشدد و تمادہ اصل کیا ہے۔[1]

پھر وہ نصاب تعلیم کے مختلف اجزاء کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مغربی ادبیات کی تعلیم اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی جامعات میں رائج ہے اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بنجائے، یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفہ تاریخ پر صادق آتی ہے، اس لئے کہ یورپ کا قدیم نظریۂ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں، رومی (Romans) اور وحشی (Barbarians) تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے وہ یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کا اس وقت تک وجود ہوا، یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہو سکتا ہے، اس سے اہل مغرب کے حصول اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے۔[2]

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اسکے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں، اور مستقبل میں ان کے لئے ترقی و خدمت کے جو وسیع و روشن امکانات ہیں ان کا انکار کرنے لگیں، اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی حقارت پورے طور پر کارفرما ہوتی ہے، ان کے نزدیک ان کے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور

---

[1] Islam at the Cross Road P. 83-84

[2] " " P. 95

مغرب کے افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہوں۔[۱]

آگے چل کر وہ بڑی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں:۔

"اگر مسلمانوں نے زمانۂ ماضی میں علمی تحقیق و تفکر کے کام کو نظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظام تعلیم جوں کا توں قبول کر لیں، ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس ہلاکت اثر کے مقابلہ میں کوئی اثر نہیں رکھتی جو مغرب کے نظام تعلیم کی اندھی تقلید، اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی، اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ ہم مغربی تمدن کے ذہنی ماحول اور فضا سے دور دور رہیں، وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے تیار ہے، مغرب کے طور طریق اور اسکے لباس و مظاہر زندگی کو قبول کرنے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، خارجی مظاہر کی تقلید ذہنی رجحان تک پہونچا دیتی ہے۔"[۲]

اس تجزیہ کی پیشین گوئی بعض مغربی مفکرین نے بھی کی ہے جو ایشیائی اور مشرقی ممالک میں اس نظام تعلیم کو رواج دینے والے تھے، مشہور انگریز اہل قلم لارڈ میکالے نے جو ۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے جو یہ طے کرنے کے لئے بیٹھی تھی کہ ہندوستانیوں کو مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جایا کرے، اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:۔

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروروں رعایا کے درمیان ترجمان ہو، یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔[۳]

---

[۱] ص ۹۵۔ [۲] ص ۱۰۰۔ [۳] ص ۵۳ تاریخ التعلیم از میجر باسو صفحہ ۸۔

یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (genocide) کے مرادف تھا، عقلاء مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچہ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لئے جابجا مراکز قائم کئے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا، اکبر مرحوم نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، ان کا مشہور شعر ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انھوں نے مشرقی و مغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے ؎

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں   مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس سے کئی برس بعد اقبال نے (جنھوں نے اس نظام تعلیم کا خود زخم کھایا تھا) اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا ؎

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی   کہ از وے روحِ قومے می تواں کشت[1]

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو   ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب   سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر[2]

وہ مغرب کے نظام تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم   ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف[3]

اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو مغربی نظام تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل پر پہونچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہہ سے نکال کر لائے، اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت، اور اس کے وسیع مضمرات

---

[1] ارمغان حجاز ص۱۲۲ [2] ضرب کلیم، [3] ضرب کلیم ص۸۵

پران کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا، اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا اور ان کا دینی فہم کتاب و سنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے[۱] لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس آتش نمرود نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ

طلسم علم حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم بنار او چہ بے پروا نشستم

اس جدید تعلیم اور اس کے اثرات کے متعلق مولانا محمد علی مرحوم کی شہادت بھی بڑی وقعت رکھتی ہے جنھوں نے ایک راسخ العقیدہ دینی ماحول میں تربیت پائی تھی، پھر مغربی تعلیم کے بہترین ہندوستانی مرکزوں میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا، وہ اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں :۔

”حکومت برطانیہ مکمل مذہبی غیر جانبداری کی قائل اور علمبردار تھی مذہبی، حتیٰ کہ اخلاقی تعلیمات کو بھی بالکلیہ بے دخل کر کے اس نے اس (پالیسی کو) عملی جامہ بھی پہنایا، صرف وہ معلومات جن کو لڑکے از خود انگریزی اور مشرقی زبانوں کی درسی کتابوں میں پائے جانے والے لٹریچر سے اخذ کر لیں رہ گئیں۔

دوسری طرف وہ تعلیمی نظریہ جو حکومت نے ہندوستانی نوجوانوں کے لئے بہم پہونچایا تھا جدید تھا، لیکن اپنی تمام تخریبی صلاحیتوں کے ساتھ اس کا زور اس طرف تھا کہ طالب علم کے اندر ایک بے جا ہمہ دانی کا احساس پرورش پائے اور صدیوں پرانے توہمات کے ساتھ ساتھ روایت اور حجت و سند کی ساری عظمت کو ختم کر دے، اس میں شبہ نہیں کہ رفتار زمانہ کے

---

[۱] اس کا اندازہ ان کے ان خطبات سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے اور جن کا مجموعہ Reconstruction of Religious thoughts in Islam کے نام سے شائع ہوا ہے اور جن میں کہیں کہیں حقائق غیبی کی فلسفیانہ تعبیر اور کارلائل شعریت کا صاف رنگ جھلکتا ہے۔

ساتھ یہ تعلیم حقیقت کی تلاش و جستجو کے ایک مخلصانہ جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب بھی بنی لیکن اپنی پہلی پوزیشن میں یہ خاص طور پر تخریبی ہی رہی ہے۔ اور ختم کیے ہوئے توہمات کے بدلہ میں جو تھوڑا بہت اس نے دیا وہ بذات خود بے بنیاد عقائد اور توہمات پر مبنی تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تھوڑا بہت "جدید" تھا۔[1]

(Islam in modern History) کا مصنف (W. C. Smith) جو اسلامی ممالک میں کام کرنے والے رجحانات اور وہاں کے مختلف طبقوں سے متعلق زیادہ معلومات رکھتا ہے، اسلامی ممالک میں جدید مغربی تعلیم اور اسکے مرکزوں کے گہرے ذہنی اثر کا اعتراف کرتا ہے، وہ ممالک اسلامیہ کی حریت پسند تحریک (Liberalism) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"ممالک اسلامیہ میں آزاد خیالی اور حریت پسندی کی جو تحریک چل رہی ہے، اس کا ایک اہم سبب اور عامل (Factor) مغرب کا نفوذ بھی ہے، یورپ میں حریت پسندی کی تحریک انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک اپنے نقطۂ عروج پر رہی ہے، یہی معاملہ یورپ کے تفوق اور ترقی کا ہے۔ بہت سے مسلمان نوجوانوں نے مغرب کا سفر کیا اور یورپ کی اسپرٹ اور اس کے اقدار سے انھوں نے واقفیت حاصل کی اور ایک حد تک وہ ان کے گرویدہ ہوئے۔ یہ بات ان طلباء پر خصوصیت کے ساتھ صادق آتی ہے جو روزافزوں تعداد کے ساتھ یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے رہے ہیں (ان کے ذریعے) مغرب کی بہت سی چیزیں دنیائے اسلام میں آئیں۔ اس کام میں پیش پیش وہ تعلیمی ادارے تھے جنھوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی اور اسکو مغرب کے جدید طرز کے حوالہ کر دیا، مغرب سے آنے والی چیزوں میں وہ متعدد نئے

---

[1] my life a fragment P. 23.24

خیالات اور کم از کم اتنے ہی زیادہ اہم نازک اور باریک خام ذہنی انداز
اور نئے میلانات جن کو یہ مختلف تعلیمی اسٹائل پھیلانے کے ذمہ دار ہیں، مزید براں
مغرب کے دوسرے قانونی سیاسی اجتماعی اور دوسری قسم کے جدید اداروں کا
بڑھتا ہوا اثر و نفوذ ...... ان میں بعض تو زبردستی مسلط کئے جاتے ہیں
اور بعض کے لئے کوشش کی جاتی ہے، بعض مسلمانوں نے اس کا مقابلہ کیا
بعض نے ان کا خیر مقدم کیا، بعض کو ایسی تربیت دی گئی یا انھوں نے
خود تدریجی طور پر ان کو خوش آمدید کہا، انجام کار بہت سے مسلمان ان
نظریات اور اداروں کو مسلمہ حقائق سمجھنے لگے اس طرح سے مغربیت کی
کارروائی تیزی اور طاقت کے ساتھ جاری رہی[۱]

لیکن ان چند مستثنیٰ شخصیتوں (اقبال و محمد علی وغیرہ) کو چھوڑ کر جن کی "فطرت ابراہیمی"
یا خارجی موثرات و واقعات نے ان کے نور ایمان اور فہم اسلام کی حفاظت کی یا ان
کے اندر مغرب کی تہذیب و فکر کے خلاف کوئی شدید ردعمل پیدا ہوا، عام طور پر عرب
اور عجمی ممالک کے ذہین مسلم نوجوانوں کو (جو اپنی قوم کا جوہر اور سرمایہ تھے) اس نظام
تعلیم کے نیز ابیے اتنا بدل دیا کہ نہ اسلام (اپنی صحیح شکل و صورت میں) ان کے جدید
ذہن میں فٹ ہو سکتا ہے اور نہ وہ عام اسلامی معاشرہ میں فٹ ہوتے ہیں، اور
بقول اقبال ؎

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی

مذہب کے ایک پرائیوٹ معاملہ ہونے پر اصرار جس کو سیاست و ریاست میں دخل
دینے کا کوئی حق نہیں، دین اسلام کے ساتھ مسیحی کلیسا کا سا معاملہ، مذہب و سیاست
کی تفریق کا نظریہ مذہب کو ترقی، اکتشاف و تحقیق کی راہ میں حارج اور مخل سمجھنے کا
خیال، علماء اسلام کو مسیحی کلیسا کے ان نمائندوں کی صف میں کھڑا کرنا جو قرون وسطیٰ

---

[۱] P. 64

میں مطلق العنان اقتدار کے مالک تھے، عورت کو بالکل مرد کے مساوی سمجھ کر اس کو زندگی کے تمام میدانوں میں دوڑنے اور حصہ لینے کا اہل اور مستحق سمجھنا، پردہ کو (خواہ وہ کسی شکل میں ہو) مشرق کے قدیم حرم کے نظام کی یادگار اور مردوں کے صنفی استبداد کا نشان سمجھنا اور اس کے ختم کرنے کو اصلاح و ترقی کا پہلا قدم تصور کرنا، اسلام کے قانون میراث اور ضابطۂ نکاح و طلاق کو قرون وسطیٰ کے مسلمان فقیہوں کا اجتہاد اور اس محدود اور ابتدائی معاشرہ کا طبعی نتیجہ سمجھنا جو ساتویں آٹھویں صدی مسیحی میں قائم تھا اور اس کی تبدیلی و ترمیم اور مغربی اصولوں اور معیاروں کے مطابق بنانے کے کام کو وقت کا ایک ضروری فریضہ قرار دینا، سود، شراب، قمار، جنسی تعلقات میں آزادی و بے قیدی کو زیادہ معیوب نہ سمجھ کر نظر انداز کرنا، قوم پرستی، قدیم (ماقبل اسلام) تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کا جذبہ اور لاطینی رسم الخط کی افادیت و اہمیت پر یقین پر اور اس طرح کے بہت سے رجحانات (جو اس جدید تعلیم یافتہ نسل کے نزدیک) حقائق و مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں اور روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت ہیں، مغربی نظام تعلیم اور (محمد اسد صاحب کے الفاظ میں) اس کے ذہنی و فکری ماحول اور فضا اور اس کے تاریخی ورثہ کا نتیجہ ہیں،

آپ کو ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور رہنما نظر آئیں گے وہ سب اسی مغربی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں، ان میں سے جن کو براہ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا، انھوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظام تعلیم سے (اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی و سرپرستی میں) پورا فائدہ اٹھایا، ان میں سے متعدد اشخاص نے ملٹری کالجوں میں تعلیم پائی جہاں مغربی طرز کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔

اس بنا پر آج عالم اسلام میں دو ذہنوں، دو فلسفوں، دو معیاروں اور دو رخوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اور جو عام طور پر فتح ہوتی ہے زیادہ طاقتور مسلح، صاحب اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر وہ بالکل قدرتی ہے، وہ اگرچہ

تو خواہ کتنے ہی تاسف کی بات ہو تعجب کی بات نہیں، تعجب اس وقت ہوتا جب یہ کشمکش اور یہ دو مغربیت کا یہ رجحان پایا نہ جاتا۔

اس کا علاج (خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور کتنا ہی دیر طلب ہو) اسکے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے، اس کو مسلمان اقوام کے عقائد و مسلمات اور مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے، اسکے تمام علوم و مضامین سے مادہ پرستی خدا بیزاری، اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خدا پرستی، خدا طلبی، آخرت کوشی، تقوی شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ و نفسیات تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر معاشیات و سیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا جائے، مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے اسکی معصومیت و امامت کا انکار کیا جائے، اسکے علوم و نظریات کو آزادانہ تنقید اور جراحانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے، مغرب کی سیادت و بالاتری سے عالم انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے ان کی نشاندہی کی جائے، غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسکے علوم و فنون کو پڑھایا جائے، اور اسکے علوم و تجارب کو مواد خام (Raw material) فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد و قامت اور اپنے عقیدہ و معاشرت کے مطابق اس سے سامان تیار کیا جائے۔

اس عظیم کام میں خواہ کتنی ہی مشکلات ہوں اور اس میں خواہ کتنی ہی دیر لگے، عالم اسلام میں تجدد و مغربیت کی اس عالمگیر رو کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں جو اسلام کے وجود ملی اور اس کے اجتماعی ڈھانچہ کو چیلنج کر رہی ہے اور اسکے لئے شدید خطرہ بلکہ موت و حیات کا مسئلہ بن گئی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام کا خلوص، ان کی قربانیاں، انکا جذبہ اور ان کی قوت عمل جس کے سر ان ملکوں کی آزادی اور سلطنتوں کے قیام کا سہرا ہے، اس روشن خیالی و تجدد کی آگ کا حقیر ایندھن بنکر رہ گئی ہے اور یہ سادہ دل، بے زبان، گرم جوش اور مخلص عوام ان قائدین اور حکمرانوں کے ہاتھ میں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ بن کر رہ گئے ہیں جن کو جس منزل کی طرف چاہا جاتا ہے، خاموشی کے ساتھ ہنکایا جاتا ہے۔

باقی بر ص ۴۵

تدوین فقہ کی تاریخ اور موجودہ حالات کا جائزہ

از: ـــــ مولانا محمد تقی امینی

(ذیل کا مقالہ مجلس تحقیقات شرعیہ کے تاسیسی اجلاس میں پڑھا گیا تھا)

حضرات علماء کرام

جس کام کے لئے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں وہ ایک طرف تو انتہائی اہم و نازک ہے اور دوسری طرف مختلف وجوہ کی بنا پر اس سے ہماری طبیعتیں غیر مانوس بن چکی ہیں۔

ایسی حالت میں مناسب یہ معلوم ہوا کہ تدوین فقہ کی تاریخ سے متعلق کچھ "یاد دہانیاں" کرا دی جائیں تاکہ طبعی انقباض دور ہو اور شرعی انبساط کے ساتھ کام کا ابتدائی خاکہ و نقشہ بسہولت مرتب ہو سکے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ سے متعلق جملہ امور آپ کی ذات مبارک سے وابستہ تھے نہ فقہ کی باقاعدہ ترتیب و تدوین تھی اور ضروریات زندگی کے محدود ہونے کی وجہ سے نہ اس کی ضرورت واقع ہوئی تھی۔ ایک صالح اور سادہ اجتماعی زندگی کے جو مسائل و مصالح ہو سکتے ہیں بس وہ تھے اور انھیں کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کی وضاحت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات محدود تھیں۔

لیکن یہ تعلیمات عموماً اصولی اور دستوری رنگ میں تھیں جنھیں بنیاد بنا کر "قانون" کی عمارت تیار کی جاتی ہے اور بعض جزئیات کی تشریحات ایسی تھیں جو بڑی حد تک حالت و زمانہ کے تقاضہ پر مبنی تھیں، مثلاً

(۱) وہ جزئی احکام جو کسی عارضی مصلحت یا سیاست پر مبنی تھے۔

(۲) وہ احکام جو طریقۂ کار سے متعلق ہوتے ہیں اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے جنگ کے طریقے اور حکومت کے شعبوں کی ترتیب وغیرہ۔

(۳) وہ امور جن میں شخصی ذوق اور ملکی عادات و رواج کے مطابق اختیار کیا گیا تھا۔

(۴) وہ باتیں جو عرب میں بطور قصہ مشہور تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی وہ تفنن طبع یا کسی اخلاقی نتیجہ کے لحاظ سے بیان فرمائی تھیں۔

(۵) عربوں کے بعض تجربات، علاج، زراعت و باغبانی وغیرہ سے متعلق جو چیزیں رسول اللہ نے بیان فرمائی تھیں۔ ایک "فقیہ" کے لئے ان دونوں قسم کی تعلیمات و تشریحات میں نظر امتیاز ضروری ہے ورنہ اسلامی قانون کی وہ عملی استعداد ختم ہو جائے گی جو اسکو ضروریات زندگی سے ہم آہنگ بناتی اور حالات و زمانہ کے تقاضہ کے مطابق ڈھالتی رہتی ہے۔

اس زمانہ میں فقہ کے صرف دو ماخذ تھے (۱) قرآن حکیم اور (۲) تشریحات نبویؐ، ان دونوں کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون کو منضبط و مدون کرنے کا پورا خاکہ تیار فرمادیا تھا اور "نبوت" کے لئے ایک ایسی جماعت وجود میں آگئی تھی جو قانون کے آثار چڑھاؤ اور نوک پلک سے بخوبی واقف تھی۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں پہلی جیسی سادہ اجتماعی زندگی نہ باقی رہ سکی تھی بلکہ فتوحات کی کثرت اور مختلف تمدنی زندگی سے سابقہ کی وجہ سے نئے نئے اجتماعی مسائل ابھر آئے تھے جس کی بنا پر جو مجموعہ موجود اور سینوں میں محفوظ تھا اس کو اس حد تک وسیع کرنے کی ضرورت ہوئی کہ موجودہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسی اور جگہ سے استفادہ کی حاجت نہ رہے۔

چنانچہ اس زمانہ میں مذکورہ ضرورت کے پیش نظر مسائل حل کرنے کے لئے دو ماخذ (۱) اجماع اور (۲) رائے کا اضافہ ہوا۔ ان دونوں سے کام لینے کی ترغیب قرآن حکیم اور تشریحات نبویؐ میں موجود تھی۔

چونکہ رسول اللہؐ کے بعد صحابۂ کرامؓ ہی دین الٰہی کے اصل محافظ و امین تھے اور

رہتی دنیا تک ان کے عمل سے استفادہ خود نبوت کے نقشہ میں داخل تھا اس بنا پر ان حضرات نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے فقہ کو وسیع کرنے کی راہیں کھولیں اور بعد والوں کے لئے بہت کچھ سرمایہ جمع کر دیا۔

"اجماع کو منظم شکل دینے کے لئے صاحب صلاحیت افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنگئی تھی جب قرآن حکیم اور تشریحات میں کسی نئے مسئلہ کا صراحۃً حل نہ موجود ہوتا تو وہ اس "کمیٹی" کے سپرد ہوتا تھا اور جو کچھ یہ "کمیٹی" فیصلہ کر دیتی وہ قانون کا درجہ حاصل کر کے قابل عمل بنتا تھا۔

"رائے" کے استعمال کے لئے قواعد و ضوابط بعد میں منضبط ہوئے ہیں اب تک "رائے" کا استعمال مقاصد ہدایت اور اصول دین کے تحت ہوتا تھا اور جو "رائے" آزادانہ استعمال کی جاتی اور اسکی وجہ سے کسی اصولی کلیہ پر زد پڑتی تو اس پر سخت نکیر کیجاتی تھی۔

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) ان دونوں "ماخذ" کے ذریعہ جو ضرورت پیش آتی یا جو مسئلہ حل طلب ہوتا بس اسی کو طے فرمالیتے تھے نظری مسائل اور بعد میں پیش آنے والے واقعات و مسائل کی طرف توجہ کرنے کی انھیں فرصت نہ تھی گوناگوں مصلحتوں کے لحاظ سے اسلامی ضرورتیں اس قدر وسیع ہو گئی تھیں کہ ان پر قابو پالینا ہی اہم کام بنا رہتا تھا۔

موجودہ فقہ کی ترتیب و تدوین کا "مسالہ" صغار صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانہ میں تیار ہوا ہے اس بنا پر اسکو ترتیب و تدوین کا تاسیسی دور کہنا زیادہ مناسب ہے۔

صورت یہ ہوئی کہ "ماہرین قانون" اسلامی کاز کو آگے بڑھانے کی غرض سے مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیل گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار فرمائی تھی۔ ان حضرات کی تعلیم و تربیت سے وہاں تابعینؒ کی ایک جماعت تیار ہوئی جو صحابہ کرام کے بعد صحیح معنوں میں ان کی جانشین ثابت ہوئی اور قانونی صلاحیت کے لحاظ سے وہ اہل عرب کے مقابلہ میں کم نہ تھی۔ بلکہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ فقہ اور روایت میں عجم کا حصہ عرب سے زیادہ ہے۔

صحابہؓ نے اس جماعت کی طرف رسول اللہ کے اقوال و افعال ہی نہیں منتقل کئے

تھے بلکہ وہ زندگی بھی منتقل کی تھی جو رسول اللہ کے فیضِ صحبت سے انھیں حاصل ہوئی تھی اور وہ امور و مسائل بھی ان کے گوش گذار کئے تھے جن سے صحابہؓ کو نیا نیا سابقہ پڑا تھا۔

اس طرح عجمی ممالک کے لوگوں کو اسلامی قانون سمجھنے اس کا تجزیہ کرنے اور نئے انداز سے سوچنے کے کافی مواقع فراہم ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان عجمی ممالک میں بیرونی اثرات کافی تھے مختلف تمدن اور مختلف مکتبۂ فکر کے لوگ موجود تھے جس کی بنا پر گوناگوں احوال و مسائل سے فقہ کو دوچار ہونا پڑا جن کو حل کئے بغیر اسلامی نظام چلانا اور اس کا وقار برقرار رکھنا تقریباً ناممکن تھا۔

ان نئے احوال و مسائل کے دباؤ کی وجہ سے "رائے" کے استعمال کو منضبط اور مدون شکل دی گئی۔ نیز موجودہ قوانین کے علل و اسباب کا سراغ لگا کر ایک طرف تو سابقہ مسائل کی شیرازہ بندی کی گئی اور دوسری طرف نئے مسائل کے حل کے لئے راستہ تلاش کیا گیا۔

چنانچہ اس زمانہ میں قانونی ماخذ قیاس، استحسان اور استصلاح وغیرہ کا اضافہ کرکے فقہ کو ضروریات زندگی کے مطابق بنایا گیا۔

یہ زمانہ سنہ ۱۰۰ھ سے دوسری صدی ہجری کی ابتدا تک شمار ہوتا ہے۔ پھر اسکے بعد تمدن کی وسعت اور مختلف الاحوال معاشرہ سے معاملہ کی وجہ سے مزید نئی نئی ضرورتیں پیش آئیں اور نئے نئے مسائل ابھر آئے۔ نیز علمی حرکت اور یونانی علوم و فنون کے رواج پا جانے کی وجہ سے خیالات میں وسعت ہوئی اور مختلف ماحول و تمدن کی نیرنگیوں کو جذب کرنے کا حوصلہ بڑھا چار و ناچار فقہ کو اور وسیع کرکے باقاعدہ مدون کرنے کی ضرورت پڑی۔

چنانچہ اس زمانہ میں مختلف قانونی ماخذ سے کام لیا گیا جن کا ثبوت قرآن حکیم اور تشریحاتِ نبوی کے عمومی اور اصولی مفہوم میں موجود تھا غرض اس طرح مختلف مراحل سے گذر کر فقہ کی تدوین کا اہم کام تکمیل کو پہونچا۔[۱]

۱؎ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو [illegible]

چونکہ یہ زمانہ خیالات میں وسعت اور مختلف ماحول وتمدن کی "نیرنگیوں" کو جذب کرنے کا تھا اس بناء پر لازمی طور سے فقہ عملی اور واقعی نہ رہا کہ جو واقعات وحالات پیش آتے بس انھیں کے متعلق احکام ومسائل بیان کئے جاتے بلکہ پیش آنے سے پہلے بہت سے حالات وواقعات فرض کرکے ان سے متعلق احکام ومسائل بیان کئے جانے لگے جس سے فقہ نہایت وسیع وضخیم بن گیا اور اسکے بعد مدتوں اس میں کسی قسم کی ترمیم واضافہ کی ضرورت نہ سمجھی گئی لیکن اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ مذکورہ طریق سے بعد کے لوگوں میں سہل پسندی وعافیت کوشی کی روح سرایت کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کے موجودہ حالات ومسائل کا حل تلاش کرنے میں بھی ہمیں انقباض ہو رہا ہے جب کہ ہمارے بزرگوں نے موجودہ کے علاوہ آئندہ کے بہت سے حالات وواقعات فرض کرکے ان سے متعلق احکام ومسائل بیان کئے تھے۔

تدوین فقہ کی مذکورہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عصری رجحانات ومعاشرتی احوال کو فقہ کی وسعت وترقی میں کافی دخل رہا ہے۔ جیسی جیسی ضرورتیں پیدا ہوتی گئیں فقہ چاروناچار وسیع ہوتا گیا زندگی کو تنگ نہیں بنایا گیا بلکہ اسکی وسعتوں کو ضروری اور جائز حدتک فقہ میں سمیٹنے اور نئے حالات ومعاملات میں صحیح زاویہ نگاہ دینے کی کوشش کی گئی

یہ سارے امور بتدریج اس بنا پر انجام پائے کہ انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں کا دامن اس قدر وسیع اور متنوع ہے کہ ان کو یکبارگی سمیٹنا نہایت مشکل ہے۔ ضرورتوں اور مصلحتوں کی بنا دپہلے پڑتی ہے پھر انھیں منظم شکل دینے کے لئے قاعدہ وقانون مقرر کئے جاتے ہیں۔ نہ یکبارگی ساری ضرورتیں وجود میں آتی ہیں اور نہ دفعتہً ان کی تنظیم کی جا سکتی ہے۔

جب زندگی خود اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے تغیر پذیر ہے تو اسکی تنظیم وتہذیب کرنے والے قوانین کیوں کر تغیر پذیر نہ ہوں گے؟ اور اسکے بغیر وہ زندگی سے صحیح ربط کیونکر قائم رکھ سکیں گے؟۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اور سابقہ (تدوین فقہ کا زمانہ) حالات میں کافی فرق ہو گیا ہے اور یورپ کی "نشاۃ ثانیہ" کا زندگی کے بہت سے گوشوں پر جو اثر پڑا ہے اور اس سے نئی ضرورتیں اور نئے مسائل پیدا کئے ہیں ان پر قابو پانے اور ان کو صحیح

زاویۂ نگاہ عطا کئے بغیر اسلام کے قانونی وقار کو برقرار رکھنا تقریباً ناممکن بن گیا ہے۔

پھر بہت سی سماجی خرابیوں کے فروغ پانے کی وجہ سے بعض احکام کے موقع و محل میں تبدیلی ناگزیر بن گئی ہے اور حالات و مصالح کے بدل جانے کی وجہ سے بعض احکام پر عملدرآمد سے ان کا اصل مقصد فوت ہو رہا ہے۔ ان تمام امور میں غور و فکر کرکے فقہ کے معاشرتی و سماجی پہلو کو ضروریاتِ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زندگی و قانون میں صحیح ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے ورنہ زمانہ کا "مفتی" بہت سے مسائل کو مہمل قرار دے دیگا اور نئے مسائل میں اپنا رنگ بھر کر لوگوں کو عمل کے لئے مجبور کرے گا اور اس طرح تکمیل ہدایت کی بات بیکار ہو کر رہ جائے گی جیسا کہ موجودہ دور میں ہماری غفلت اور سہولت پسندی کی وجہ سے اس کا مشاہدہ ہو رہا ہو۔

ان تمام امور میں غور و خوض کرتے وقت چند باتیں پیش نظر ہونا ضروری ہیں۔

(۱) ہر دور میں توجہ اور نظر ثانی کے مستحق وہ مسائل ہوتے ہیں جن کے بغیر معاشرتی نظام چل نہیں سکتا ہے، یا چل تو سکتا ہے لیکن قومی و ملی ضرر کا واقعی اندیشہ ہوتا ہے اور معاشرہ و اجتماع کی نموبخش فضا پر اثر پڑتا ہے۔

فقہ میں اس قسم کے جو اجتماعی مسائل موجود ہیں اور حال کی ضروریات کے مطابق نہیں ہیں یا حالات کی تبدیلی کیوجہ سے معاشرہ کو جن مسائل کی ضرورت ہوگئی ہے اور فقہ میں موجود نہیں ہیں ایسے تمام مسائل بتدریج غور و فکر کے مستحق قرار پائیں گے۔

(۲) نئے قانون کا وجود یا موجودہ قانون میں نظر ثانی کا سوال قومی و ملی زندگی کے شدید احساس اور اسکے تقاضہ کی بناء پر ہوتا ہے۔ نہ ساری ضرورتیں بیک وقت پیدا ہوتی ہیں اور نہ ہر جگہ کی ضرورتیں یکساں ہوتی ہیں اس لئے انھیں مسائل میں از سر نو غور و فکر کی نوبت آئے گی جن کی قوم و ملت کو واقعی ضرورت ہوگی اور ان کے حل نہ ہونے سے زندگی میں خلا محسوس ہوگا۔

(۳) مذہبی قانون کے ثبات و استحکام کے لئے عظمت و تقدس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ عظمت سے دلوں میں قانون کا وقار و احترام برقرار رہتا ہے اور تقدس سے قانون میں خاص قسم کی شان دلربائی اور جاذبیت محسوس ہوتی ہے اس بناء پر ایسی کوئی بات

قابل قبول نہ ہوگی جس سے ان دونوں پر کسی طرح زد پڑنے کا اندیشہ ہے۔

مذکورہ اہم کام کی انجام دہی کے لئے تنہا ایک شخص کی رائے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے بلکہ صاحب صلاحیت افراد پر مشتمل ایک مجلس کی ضرورت ہے جو زیر بحث مسائل میں ضابطہ کے مطابق غور کر کے انکا حل تلاش کرلے۔

اس مجلس کو اونچے پیمانہ پر اجتہاد کی ضرورت ہوگی اور نہ کوئی نئی راہ نکالنے کی اجازت ہوگی البتہ اخذ و استفادہ کے باب میں یہ مجلس وسعت سے کام لے گی نہ تو بالکلیہ آزاد و خود رائے ہوگی اور نہ وقت ضرورت دوسرے امام سے استفادہ کو حرام جانے گی بلکہ ہر مسئلہ کو دلیل و بصیرت کی روشنی میں سمجھ کر قبول کرے گی اور اطمینان حاصل کرنے کے بعد فیصلہ کرے گی۔

اسی طرح مختلف اقوال میں جب ترجیحی صورت نکالنے کی ضرورت ہوگی تو حالات و مقامات کی مناسبت سے مقررہ قاعدہ اور ضابطہ کے مطابق بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دے گی۔

اگر کسی مسئلہ میں نص صریح یا تعلیل صحیح متقدمین سے نہ ملے گی تو تحقیق و تلاش کر کے مسئلہ کو دلیل سے آراستہ کرے گی اور اس بات کا تکلف اپنے آپ کو نہ جانے گی کہ مسئلہ میں پہلے کی کہی ہوئی ہر بات کی تقلید کی جائے خواہ اطمینان قلبی حاصل ہو یا نہ ہو اور موجودہ حالت کے وہ مطابق ہو یا نہ ہو۔

ایسے ہی جب نئی صورت درپیش ہوگی اور اس کا حل نکالنے کی ضرورت ہوگی یا حالات و مقامات کی تبدیلی سے موجودہ مسئلہ میں تبدیلی ناگزیر ہوگی تو یہ مجلس وہی طرز عمل اختیار کرے گی جس کا ثبوت متقدمین کے یہاں موجود ہے مثلاً پہلے زیر بحث مسئلہ کی روح اور مقصد سمجھنے کی کوشش کرے گی پھر اس پر غور کرے گی کہ معاشرتی حالت اور سماجی زندگی میں کس حد تک یہ اثر انداز ہے؟ اور شرعی نقطۂ نظر سے اسکے ذریعہ کس قسم کی مصلحت کا حصول اور مضرت کا دفعیہ ہو سکتا ہے؟

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد حل طلب مسئلہ کو اسکے مناسب باب سے متعلق کر کے

نظائر تلاش کرے گی اور پھر اس کی روح اور مقصد کو سامنے رکھ کر مقررہ قاعدہ کے مطابق بالترتیب قرآن وسنت اور اجماع وقیاس سے زیر بحث مسئلہ کا تعلق جوڑے گی۔

اس طریق کار کے اختیار کرنے سے بعض صورتیں ایسی ہوں گی جن کا حل آسان ہوگا صرف اصول وکلیات اور ضرورت ومصلحت میں صحیح تطبیق سے ان کا حل نکل آئے گا اور بعض میں دشواری پیش آئے گی اور ایسی حالت میں اختلاف آئمہ سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہوگی لیکن ہر حال میں روح اور مقصد سامنے ہوگا اور فقہی ضابطہ سے انحراف جائز نہ ہوگا ورنہ شریعت ہوا وہوس اور سہل پسندی کا "بازیچہ" بن کر رہ جائے گی۔

مجلس کو اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے فقہی مواد سے جس قسم کے استفادہ کی ضرورت ہوگی وہ یہ ہیں۔

(۱) قرآنی احکام کے موقع ومحل کی تعیین میں سیرت نبوی اور عہد صحابہؓ سے استفادہ۔

(۲) "حدیث" کے سلسلہ میں روایت ودرایت دونوں سے کام لینا۔

(۳) اجماعی مسائل کے انداز اور ان کے نوک پلک کو سمجھنا۔

(۴) قیاس میں حکمت وعلت کے امتیاز کو برقرار رکھنا اور استنباط مسائل میں ہر ایک کے کردار سے واقف ہونا۔

(۵) قانونی مآخذ استحسان۔ استصلاح اور استدلال سے مسائل کے استنباط میں اس امر کو ملحوظ رکھنا کہ متقدمین نے ان سے کس وقت کام لیا اور کن اسباب کی بناء پر یہ ماخذ قرار پائے؟

(۶) تعامل اور عرف ورواج کو استعمال کرنے کے لئے فقہاء کے طریقہ اور ضابطہ کو ملحوظ رکھنا۔

(۷) ملکی قانون (جن سے کسی کلی اصول پر زد نہ پڑتی ہو) سے استفادہ میں اس وسعت فراخی اور طریق کار کو ملحوظ رکھنا جو صحابہ کرام نے مختلف ممالک کے قوانین کے باب میں اختیار کیا تھا۔

(۸) فقہی اصول وکلیات سے استدلال میں فقہاء کے طرز عمل کو رہبر بنانا۔

(۹) فقہی احکام میں تخفیف وسہولت کے اسباب کو برمحل منطبق کرنا۔

(۱۰) اختلاف فقہاء کے اسباب پر گہری نظر رکھنا اور حالات کا صحیح تجزیہ کرکے ان سے فائدہ

اٹھانا۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتب اس قدر وسیع اور جامع ہیں کہ انکی مدد سے موجودہ حالات و تقاضوں کے مناسب بہترین کام انجام پا سکتا ہے۔ فقہاء کرامؒ نے فقہ پر کام کرنے کے لئے کافی مواد فراہم کر دیا ہے۔ اصول اور ضابطے مقرر کئے ہیں۔ انداز اور طریقہ بتایا ہے۔ کام کر کے دکھایا ہو اور کرتے رہنے کے لئے جیسی صلاحیت درکار ہے اسکی نہایت تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہو اس سے زیادہ ہماری محرومی اور بے بصری کیا ہوگی کہ اس ذخیرہ سے فائدہ اٹھانے کو ہم جرم سمجھیں یا خود فریبی میں مبتلاء ہو کر اسکی اہمیت نہ محسوس کریں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ندوۃ العلماء جیسے کسی علمی مرکز میں ایک فقہی و تحقیقی مجلس کا اہتمام ہو رہا ہے ورنہ ۲۶ جولائی ۱۹۶۳ء کے صدق جدید میں پڑھا ہوگا کہ کچھ انتظار کے بعد اپنی بساط کے مطابق ایسی فقہی مجلس کے انتظام کا ارادہ تھا۔

محترم مدیر "صدق جدید" کے "ہمارا نوٹ" اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی پرخلوص محبت و درد بھری دعوت نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ کام کا جو محل و مقام ہو وہیں کرنے سے اس میں رعنائی و دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری اس مجلس کا اصل کام جدید مدنی مسائل کا حل دریافت کر کے فقہ کی جدید تدوین ہے اس سلسلہ میں وہ بتدریج قدم اٹھائے گی اور ہمہ گیر و ہمہ جہتی کی کیفیت کا جائزہ لے کر موجودہ اور نئے پیدا شدہ مسائل میں انھیں کو مرکز توجہ بنائے گی جن کی واقعی معاشرہ کو ضرورت ہوگی اور جن کو حل کئے بغیر قومی و ملی ضرر کا اندیشہ ہوگا یا معاشرہ کی نموبخش فضاء پر اثر پڑتا ہوگا۔

دراصل قومی و جماعتی زندگی کا وہ "موڑ" نہایت نازک ہوتا ہے جب اس کو ایک مقام سے ہٹا کر دوسرے مقام پر لایا جاتا ہے اگر اس میں دوسرے مقام کو جذب اور ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی ہے اور پہلے سے بھی وہ اکھڑ چکی ہے تو نتیجۃً لازمی طور سے ذہنی طوائف الملوکی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی تو یہ "موڑ" اس قدر سخت ہوتا ہے کہ بنیادی عقائد و نظریات تک سے بدظنی عام ہو جاتی ہے اس بناء پر جو قدم بھی

اس راہ میں اٹھایا جائے گا وہ بہت محتاط اور قومی ذہن کو ملحوظ رکھ کر اٹھایا جائے گا

مجلس یہ کبھی نہ کرے گی کہ مخالف محاذ کے پیدا کئے ہوئے انسانیت سوز مسائل کا حل تلاش کرے اور خاطر خواہ حل نہ ملنے کی صورت میں فقہ کو قابل گردن زدنی قرار دیکر آزادی دنیا کی کی وہی راہ اختیار کرے جو تجدد پسند افراد اور مرعوب ذہن و مسحور دماغ کا شیوہ ہے۔

اور نہ مجلس یہ کرے گی کہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں تشدد و تقشف کے اس طریقہ کو اپنائے جس کی وجہ سے فقہ جامد و ساکت بن گیا ہے اور زمانہ کے "مفتی" کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ موجودہ فقہ ضروریات زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہے بلکہ وہ ہر مرحلہ اور ہر موقف پر توازن و اعتدال کی راہ اختیار کرے گی اور اللہ کے رویہ و جواب دہی کے تصور کو سامنے رکھ کر مسائل کا حل نکالے گی بس اللہ ہی کا پر بھروسہ ہے جو ہماری بصارت و بصیرت کی کمی کو اپنی دائمی مدد سے پورا کر کے حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب
لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب
واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

بقیہ مضمون ص ۳۵

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی کامیابی اور استحکام کا راز سول سروس کا طبقہ اور حکام کی مغربی تربیت، سلیقہ مندی اور اطاعت شعاری میں تھا، انہی نے اس ملک کا سانچہ بنایا اور سو برس تک کامیابی کے ساتھ اس ملک کو اسکے غیر ملکی حکمرانوں کے منشا اور مزاج کے مطابق چلاتے رہے، اب بھی اسلامی ممالک کے رُخ کی تبدیلی اور اسلامی فکر اور اسلامی زندگی کی طرف ان کو لے چلنے کی تدبیر یہی ہے کہ اس طبقہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے جس کے ہاتھ میں ملک کی رہنمائی اور اسکی زمام کار آنے والی ہے، اور اس نظام تعلیم کو درست کیا جائے جو اس طبقہ کو تیار کرتا ہے۔

آخری قسط

حرمین شریفین کی حاضری

از:- محمد منظور نعمانی

مدینہ منورہ سے واپسی

مدینہ طیبہ میں ہمارا قیام بس آٹھ دن رہا، موسم نہایت خوشگوار تھا اور شاید وہاں کا موسم تو ہمیشہ ہی خوشگوار اور صحت افزا رہتا ہے، ان آٹھ دن میں میری صحت میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور وزن حیرت انگیز رفتار سے بڑھا ۱۲ ذی الحجہ (۱۵ مئی) کی صبح ہم پہنچے تھے اور ۲۹ ذی الحجہ (۲۳ مئی) کی صبح وہاں سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ واپسی سفر بھی پرائیوٹ ٹیکسی سے کیا۔

پہلے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۵۱ء میں مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ آمد و رفت رات ہی میں ہوئی تھی یعنی راستہ کا بڑا حصہ رات ہی میں طے کیا تھا، اس دفعہ بھی جیسا کہ ذکر کیا جا چکا یہ راستہ رات ہی میں طے کر کے صبح مدینہ طیبہ پہونچے تھے اس لیے اس راستہ کو اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب کے واپسی میں پہلی دفعہ پورا راستہ دن میں طے کیا۔ صبح اشراق کے وقت مدینہ طیبہ سے روانگی ہوئی صرف ۸ گھنٹے چل کر ظہر اول وقت میں جدہ پہونچ کر پڑھی ٹیکسی ڈرائیور سے طے کر لیا تھا کہ ہم لوگ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے یہ مدینہ طیبہ سے تقریباً ۶ میل پر ایک بستی ہے (آج کل اس کو بیر علی کہتے ہیں) یہ اہل مدینہ کا میقات ہے مدینہ سے مکہ جانے والے راستہ پر یہ پہلی منزل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں سے حجۃ الوداع میں احرام باندھا تھا۔ اس مقام پر مسجد بنی ہوئی ہے، ہم لوگوں نے احرام کی تیاری تو مدینہ طیبہ ہی میں کر لی تھی، یہاں پہونچ کر ہم نے تازہ وضو کیا، احرام کی دو رکعتیں پڑھیں اور عمرہ کا احرام باندھا اور لبیک کہتے ہوئے ٹیکسی سے روانہ ہو گیے۔ بدر کا مقام اس راستہ پر مدینہ طیبہ سے ۱۵۰ کیلو میٹر ہے یہاں تک زمین خاصی ہموار ہے جا بجا راستہ میں کھجور کے چھوٹے بڑے باغات بھی نظر آتے ہیں، لیکن بدر سے آگے چل کر زمین کی نوعیت بالکل بدل جاتی ہے بدر سے جدہ تقریباً پونے تین سو کیلو میٹر ہے راستہ میں صرف مستورہ منزل پر تھوڑی دیر کے لیے اترے، تربوز اور خربوزے خرید کر کھائے

اور چلائے تھی، وہاں سے روانہ ہو کے بس جدہ ہی آ کر ٹھہرے۔ یہ پورا راستہ اس سفر میں پہلی مرتبہ دیکھا، راستہ میں چند چھوٹے چھوٹے غیر آباد گاؤں بھی نظر پڑے تھے، بسنے والے اپنے گھر خالی کر کے چلے گئے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ وہ گاؤں ہیں جن کے باشندے دوسری جگہ روزگار کی صورتیں پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہاں منتقل ہو گئے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے ظہر کے اول وقت ہم جدہ پہونچ گئے، قیام عبدالقادر نور دلی صاحب کے ہاں کیا، نماز ظہر سے فارغ ہونے کے بعد کھانا کھایا، کھانے میں ان حضرات نے بہت ہی تکلف اور اہتمام فرمایا تھا۔ یہاں آ کر یہ بھی معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جانے کے لیے جو ورقہ تنازل (سارٹیفکٹ اور اجازت نامہ) ہم نے حاصل کیا تھا وہ بس مدینہ طیبہ سے جدہ واپسی تک کے لیے تھا اور اب مکہ معظمہ جانے کے لیے ہمیں پھر اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مخلص عنایت فرما سید محمد دلی صاحب کو بہتر سے بہتر جزا دے ہمیں تو انہوں نے آرام سے سلا دیا۔ اور ٹیکسی لے کر اجازت نامہ کے لیے خود دوڑ دھوپ کرتے رہے، یہ اجازت نامہ غروب سے کچھ ہی پہلے حاصل ہو سکا اور ہم ایسے وقت ایک ٹیکسی سے روانہ ہو سکے کہ مغرب کی نماز جدہ ہی کے حدود میں پڑھی اور مکہ معظمہ ایسے وقت پہنچے کہ حرم شریف میں عشا کی نماز ہونے والی تھی، پہلے عشا پڑھی اس کے بعد عمرہ کا طواف کیا اور چونکہ اب حجاج کا مجمع بہت کم ہو چکا تھا اس لیے اس طواف میں حجر اسود کا استلام بار بار نصیب ہوا۔ پھر طواف کی دو رکعتیں پڑھ کے اور سعی شروع کرنے کے لیے حجر اسود کا پھر استلام کر کے ہم صفا پر آئے سعی شروع کی[1]، سعی میں بھی اب پہلا جیسا اژدہام نہیں تھا، سعی سے فارغ ہونے کے بعد پھر مطاف میں آ کر خاتمۂ سعی کی دو رکعتیں حجر اسود کے سامنے پڑھیں، اس کے بعد باب اسود کے قریب ہی ایک شاندار حجامت خانہ میں پہونچ کر حلق کرایا اور عمرہ سے فراغت حاصل کی

---

[1] جس طرح بیت اللہ شریف کا طواف حجر اسود کا استلام کر کے شروع کیا جاتا ہے اسی طرح حج یا عمرہ کی سعی کے لیے اس کا استلام کر کے جانا چاہیے گویا طواف اور سعی یہ دونوں عبادتیں حجر اسود کے استلام سے شروع ہونی چاہییں، سعی کے بارہ میں بہت سے لوگ اس سے غفلت کرتے ہیں۔ ۱۲

یہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب تھی، ہم جس وقت سعی اور حلق سے فارغ ہوئے رات کافی گزر چکی تھی، پھر حرم شریف سے جرول، مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مکان پر جانے کے لیے ہمیں کوئی ٹیکسی بھی نہ مل سکی اس لیے پیدل ہی جانا ہوا۔ چونکہ پہلے سے اس کا اندازہ تھا کہ ہم دیر میں پہونچ سکیں گے اس لیے مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب بستوی (ناظر کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء) کے ذریعہ جن کا قیام بھی ہمارے ساتھ مولانا عبداللہ عباس صاحب ہی کے مکان پر تھا اور ان سے ہماری ملاقات حرم شریف میں داخل ہوتے ہی نماز عشاء سے پہلے ہو چکی تھی، ہم نے مولانا عبداللہ عباس سے کہلوا دیا تھا کہ ہم دونوں (یہ ناچیز اور حکیم عبدالقوی صاحب) بہت دیر سے کسی وقت پہونچ سکیں گے اور کھانا نہیں کھائیں گے اسلئے ہمارا انتظار نہ کیا جائے، بس دروازہ کھلا رکھا جائے۔ بہرحال ہم بہت دیر سے پہنچے اور جا کر سو گئے۔

یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ ہم لوگ ۲۰؍ ذی الحجہ کو جب مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو مولانا علی میاں کے بارہ میں طے ہو گیا تھا کہ وہ ۲-۳ دن کے بعد ہی ہندستان روانہ ہو جائیں گے چنانچہ جب ہم لوگ ۲۹؍ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ واپس آئے تو مولانا اور مولوی محمد رابع صاحب حسب پروگرام ہندوستان روانہ ہو چکے تھے اور مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مکان پر ہمارے ساتھیوں میں سے اب اکیلے مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب بستوی رہ گئے تھے

مکہ معظمہ کے آخری تین دن

۲۲؍ ذی الحجہ جمعہ کی صبح ہم لوگ حسب معمول فجر کی نماز کے لیے حرم شریف گئے اشراق کے بعد واپس آکر ناشتہ مولانا عبداللہ عباس صاحب ہی کے ہاں کیا، ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ صولتیہ گئے۔ مدیر مدرسہ مولانا محمد سلیم صاحب اور ان کے سعید فرزند عزیزم مولوی محمد شمیم صاحب نے مدینہ منورہ روانگی سے پہلے اس ناچیز سے اصرار فرمایا تھا کہ وہاں سے واپسی کے بعد میں ان کے پاس مدرسہ ہی میں قیام کروں، اب جب میں حاضر ہوا تو پھر ان حضرات نے اصرار فرمایا میں نے عرض کیا کہ پرسوں ان شاء اللہ ہماری واپسی ہے اس لئے اب صرف دو راتیں مکہ معظمہ میں اور قیام ہے اور آخری رات میں مولانا عبداللہ عباس صاحب ہی کے مکان پر گزارنا چاہتا

ہوں ان کا ادران کے مکان کا مجھ پر یہ حق ہے اب صرف آج کی ایک رات رہ جاتی وہ انشاءاللہ یہاں مدرسہ ہی میں گزرے گی، رہا دن کے اوقات کا مسئلہ تو وہ یا حرم شریف میں گزریں گے یا باب السعود کے قریب والے آپ ہی کے دفتر میں، آخر فیصلہ یہی ہوا کہ آج رات قیام مدرسہ میں ہوگا اور کھانا بھی یہیں ہوگا۔ اور کل دن میں کھانا دفتر صولتیہ ہی میں پہونچے گا۔

حکیم عبدالقوی صاحب کا تو مستقل قیام ہی مدرسہ صولتیہ میں تھا اور اس عاجز نے بھی ڈاک کا پتہ مدرسہ صولتیہ ہی کا رکھا تھا مجھے سخت انتظار "ندائے ملت" کے سالنامہ کا تھا جس کے بارہ میں مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کا خط مجھے مدینہ طیبہ جانے سے پہلے ہی مل چکا تھا کہ اس کے ۵ پرچے رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے ۲ مئی کو میرے نام روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن آج ۱۴ر مئی تک بھی وہ نہیں پہونچے تھے [1]

چوں کہ آج جمعہ کا دن تھا اس لئے مدرسہ صولتیہ سے اٹھ کر ہم لوگ حرم شریف میں چلے گئے۔ جمعہ کے بعد جرول آ کر مولانا عبداللہ عباس صاحب کے ہاں کھانا کھایا آج انہوں نے اور بھی کئی حضرات کو کھانے پر مدعو کیا تھا، یوں تو روزانہ ہی ان کے ہاں کھانے اور ناشتہ میں دعوت والا اہتمام ہوتا تھا لیکن آج خصوصیت سے اور بھی زیادہ اہتمام تھا۔

صبح کے طے شدہ پروگرام کے مطابق رات کو عشا کے بعد حرم شریف سے سیدھے مدرسہ صولتیہ ہی گئے۔ وہیں کھانا کھایا اور باہر کے صحن میں وہیں سوئے اور صبح فجر کی نماز کے لئے حسب معمول حرم شریف آ گئے۔ اشراق کے بعد دفتر صولتیہ ہی میں چائے پی، چوں کہ مکہ معظمہ میں قیام کا آج آخری دن تھا، کل ہی واپسی ہونے والی تھی اور مجھے ایک کتاب (الموافقات للشاطبی) اور کچھ اور چیزیں خریدنی تھیں۔ اس لئے میں ان کی خریداری کے لئے بازار چلا گیا خیال یہ تھا کہ تھوڑی دیر میں واپسی ہو جائے گی۔ لیکن کئی گھنٹے صرف ہو گئے اور قریب ظہر کے واپسی ہو سکی۔ بہت ہی افسوس اور قلق ہوا کہ آج آخری دن کا بھی اتنا بڑا حصہ بازار

[1] مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب آخری بحری جہاز سے آخر جولائی میں واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ ندائے ملت کے وہ پرچے جولائی میں وہاں پہونچے یعنی دو مہینے سے زیادہ مدت میں حالانکہ وہ ہوائی ڈاک سے روانہ کئے گئے تھے معلوم نہیں اس میں ہماری حکومت کے محکمۂ ڈاک کے حسن انتظام کو دخل ہے یا سعودی حکومت کے اس محکمہ کو۔

میں گنوادیا، کاش یہ وقت حرم شریف ہی میں گزرا ہوتا۔

یہ مئی کی ۲۵ تاریخ تھی گرمی میں کافی تیزی آچکی تھی، دھوپ بہت سخت تھی اور ہوا بھی گرم یعنی لو چلنے لگی تھی پھر کئی گھنٹے بازاروں میں چلنے پھرنے کی وجہ سے طبیعت بہت تھک چکی تھی اور گرمی کا بھی بہت اثر تھا۔ لیکن حرم شریف میں پہونچ کر دیکھا کہ اس وقت مطاف بہت خالی ہے اور طواف کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے اگر اس وقت طواف کیا جائے تو انشاء اللہ بغیر کسی کو زحمت دیئے حجر اسود کی تقبیل (چومنا) کی سعادت بھی حاصل ہو سکے گی۔ مگر مطاف تک پہونچنے کا راستہ سخت گرم تھا گویا لوہے کی طرح تپ رہا تھا اور جیسا کہ ذکر کیا گیا طبیعت بھی بہت تھکی ہاری اور گرمی سے متاثر تھی مگر اس وقت دل نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور اسی وقت طواف کیا جائے کیا عجب کہ اس گرم وقت کا یہی طواف دوزخ کی گرمی اور آگ سے نجات کا وسیلہ بن جائے۔ ہمت کر کے مطاف تک کا راستہ دوڑ کر طے کیا، مطاف میں چونکہ ہر وقت طواف کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس لئے وہ گرم نہیں ہوتا اور اگر کسی وقت گرم ہوتا بھی ہے تو قابل برداشت ہوتا ہے، بہرحال ظہر کی اذان تک طواف کا سلسلہ جاری رہا اور جیسا کہ اندازہ تھا قریب قریب ہر شوط میں (یعنی ہر چکر میں) استلام نصیب ہوتا رہا آج کے اس طواف میں الحمد للہ بڑی لذت ملی اور دیر تک بازار میں گھومنے پھرنے کا دل پر جو بوجھ تھا اس "کفارہ" سے وہ بھی کچھ ہلکا ہوا ظہر کے بعد دفتر صولتیہ میں آئے یہاں مولینا محمد سلیم صاحب اور مولوی محمد شمیم صاحب منتظر تھے، کھانا حسب قرارداد مولانا کے ہاں سے آیا، ہمارے شیخ تبلیغ مولانا سعید احمد خاں صاحب نے بھی ہم لوگوں کی ضیافت ہی کی نیت سے اپنے مکان سے کھانا منگوالیا تھا، کھانا کھا کر دین میں آرام کیا، عصر اور مغرب کے درمیان بعض حضرات سے ملاقات کی مغرب اور عشا حرم شریف میں ادا کر کے جرول مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مکان پہ پہونچے اور کھانے سے فارغ ہو کے سو گئے۔

مکہ معظمہ کی آخری رات اور آخری دن | یہ مکہ معظمہ کی آخری رات تھی اگرچہ ہمت

ہوتی تو یہ پوری رات حرم شریف ہی میں طواف اور نوافل اور دعا میں کاٹی جاتی لیکن یہ سعادت حاصل نہیں کی جاسکی روزانہ کی طرح آج بھی رات کا بڑا حصہ سونے میں گیا آخر شب میں اٹھ کر حسب معمول حرم شریف جانا ہوا وقت کی گنجائش کے مطابق کچھ نوافل پڑھے کچھ طواف کئے پھر فجر کی نماز ہوئی اشراق تک حرم شریف ہی میں قیام رہا ہمارے خاص عنایت فرما اور نہایت مخلص محب قاری سلیمان صاحب اور ملک الٰہی بخش صاحب جو مدینہ طیبہ سے ہمارے ساتھ نہیں آسکے تھے ہمارے بعد دو دن مزید مدینہ منورہ قیام کر کے آج مکہ معظمہ آگئے اور حرم شریف ہی میں پہلی ملاقات ہوئی، چونکہ آج ہم لوگوں کی روانگی کا دن تھا اس لئے مجھے ان حضرات کا خاص انتظار تھا۔

اب آج ۲۶ مئی ہے اور بعد عصر ہندوستان واپسی کے لئے جدہ روانہ ہو جانا ہے گو بلد اللہ الحرام میں قیام کی سعادت کا یہ سلسلہ بس اب چند گھنٹے کے بعد ختم ہو جانے والا ہے، اس لئے جی چاہتا ہے کہ آج زیادہ وقت حتی الوسع حرم شریف میں گزرے آج صبح کے ناشتہ کے لیے مکہ معظمہ کے مقیم ہندوستان کے ایک مرد صالح حافظ محمد زکریا صاحب جونپوری تاجر عطر و تیل نے کل سے مدعو کر رکھا تھا۔ حافظ صاحب اللہ تعالیٰ کے ان خوش نصیب بندوں میں سے ہیں جنہیں دنیا اور دین کی دولت بھرپور عطا ہوئی ہے ہمارے اکابر کے ساتھ بھی انکا خاص تعلق رہا ہے۔ بڑھاپے نے بالکل معذور کر دیا ہے۔ لیکن نماز با جماعت حرم شریف ہی میں ادا ہوتی ہے اسی حالت میں طواف بھی کرتے ہیں ہر صاحب ایمان کیلئے ان کا حال بڑا قابل رشک ہے۔ یہ عاجز اور حکیم عبد القوی صاحب اشراق کے بعد اس خیال سے جلدی حافظ صاحب کے مکان پر پہونچ گئے کہ ناشتہ سے جلدی فراغت حاصل کرلیں تاکہ باقی وقت اطمینان سے اپنے کام میں لگایا جاسکے، لیکن وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ حافظ صاحب تو بہت دیر کے بعد حرم شریف سے گھر آتے ہیں، چنانچہ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد حافظ صاحب تشریف لائے، اس کے بعد ناشتہ آیا، اتنا پر تکلف اور کھانے کے اتنے انواع و اقسام کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر یہ بھی اسراف نہیں ہے تو پھر دنیا میں اسراف کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس عاجز کا یہ تکلیف دہ احساس

ہے کہ ہم مسلمانوں میں کھانے پینے میں خاص کر دعوتوں میں بڑے بیجا اسراف کی عادت ہے اور شاید یہ عادت بڑھتی ہی جا رہی ہے خصوصاً حجاز پاک میں تو قریب قریب ہر دعوت میں اس معاملہ میں اتنا تجاوز دیکھا جس سے ہر حساس آدمی کو تکلیف ہونی چاہیئے بیشک مسلمان کو بخیل نہیں، کشادہ دست اور فیاض ہونا چاہیئے، لیکن اس فیاضی کا مصرف اور محل یہ نہیں ہے کہ دسترخوان ضرورت سے زیادہ انواع و اقسام کے اور رنگ برنگ کے کھانے اور میوے ہوں، فیاضی اور اولوالعزمی کا صحیح محل و مصرف مسلمانوں کی دینی و ملی ضرورتیں ہیں۔

آج تبلیغی دعوت کے سلسلہ میں مدرسہ صولتیہ کے وسیع ہال میں ہندوستان و پاکستان کے حجاج کا ایک اجتماع بھی تھا، اس اجتماع میں بھی شرکت ہوئی اور اللہ کے بندوں سے کچھ دینی باتیں کرنے کا اور تبلیغی کام کے سلسلہ میں ان کو دینی مشورے دینے کا موقع بھی ملا، یہ واقعہ ہے جس میں ذرہ برابر انکسار نہیں کہ اپنے دل کی خرابی و بیماری اور نفس کی گندگی کی وجہ سے اپنا کوئی عمل بھی ایسا نظر نہیں آتا جس پر کوئی خاص امید ہو ہاں اللہ کے بندوں کو خیر کی دعوت اور دینی مشورے دینے کی جو سعادت کبھی کبھی نصیب ہو جاتی ہے بعض اوقات اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے اس میں ایسی کیفیت نصیب ہو جاتی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ اللہ کے یہ نیک دل بندے اس گفتگو کے نتیجہ میں جو اچھے اعمال کریں گے انشاء اللہ ان کی برکات سے حق تعالیٰ اپنے اس سیہ کار بندہ کو بھی محروم نہیں رکھے گا۔

اس اجتماع سے فارغ ہو کر حرم شریف آ گئے، ظہر میں کچھ وقت باقی تھا، آج بھی دھوپ بہت تیز تھی اور لو بھی بڑی سخت چل رہی تھی، طواف کرنے والوں کی تعداد کل کی طرح آج بھی اسوقت کم تھی موقع کو غنیمت جانا اور ظہر تک طواف کیا،

آج دوپہر کے کھانے کے لئے قاری سلمان صاحب اور ملک الٰہی بخش صاحب نے صبح ہی کہدیا تھا ظہر سے فارغ ہو کر صولتیہ کے دفتر میں ان حضرات کے ساتھ کھانا کھایا، یہ مکہ معظمہ میں آخری وقت کا کھانا تھا، کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کیا، پھر اٹھ کے

حرم شریف گئے، عصر کے بعد متصلاً جدہ روانہ ہونا تھا اس لئے طواف وداع عصر سے پہلے کیا۔

طواف وداع اور جدہ کو روانگی

یہ طواف وداع بھی بحمداللہ بڑے اطمینان سے نصیب ہوا۔ طواف کے ختم پر مقام ابراہیم پہ دوگانہ طواف ادا کیا یہ اس مقدس مقام پر آخری نماز تھی، اس کے بعد ملتزم پہ جا کے اور اس سے چمٹ کے دعا کی۔

آج کے پورے دن میں اور خاص کر اس آخری طواف کے وقت دو باتوں کا سخت صدمہ رہا ایک یہ کہ آج یہاں سے روانگی ہے اور معلوم نہیں کہ اس کے بعد پھر کبھی حاضری نصیب ہوگی یا نہیں، اور دوسرا اپنی اس محرومی کا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص الخاص فضل سے یہ حاضری نصیب فرمائی، پورے سفر میں وہ سہولتیں اور راحتیں نصیب فرمائیں جن کا ہرگز ہرگز یہ سیہ کار اہل نہیں تھا۔ لیکن اس ظلوم وجہول اور ناشکرے نے اس عظیم نعمت کا کوئی حق ادا نہیں کیا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ایک دن اور ایک رات بھی اس طرح نہیں گزاری جس طرح سارے دن اور ساری راتیں گزارنی چاہئیں تھیں اپنے اسی رنج وغم کے ساتھ یہ سیہ کار ملتزم پر دعا و استغفار میں مصروف تھا کہ عصر کی اذان شروع ہوگئی۔ عصر کی نماز کے بعد پھر ملتزم پہ جا کر دعا کی جس میں خصوصیت کے ساتھ اس کے بعد بھی حاضری کی التجا کی یہی یہاں کی آخری دعا تھی اس کے بعد رنج وغم بھرے دل سے بیت اللہ اور مسجد حرام کو الوداع کہا اور باہر آ کر صولیتہ کے دفتر کے قریب ہی کے اڈہ پر جا کر جدہ جانے کے لئے ایک ٹیکسی پر سوار ہوئے اور نماز مغرب جدہ پہونچ کر پڑھی اپنا سامان ہوائی جہاز کے دفتر میں اسی وقت پہونچا دینا ضروری تھا۔ چنانچہ سید محمد علی صاحب کے ساتھ اسی وقت سامان لے کر مطار گئے اور واپس آکر نماز عشاء پڑھی عبدالقادر نوری صاحب ارشد صاحب کو بھی ہمارے پروگرام کی اطلاع دیدی تھی۔ چنانچہ وہ بھی انکے مکان ہی پہ تشریف لے آئے تھے اس کا بڑا قلق اور افسوس ہے کہ مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ جاتے ہوئے اور پھر مدینہ طیبہ سے واپس آتے ہوئے جدہ سے گزرنا ہوا

لیکن ارشد صاحب کے ہاں جانے کا موقع نہ مل سکا۔ اور اسی طرح اس آخری دفعہ میں بھی اس کی گنجائش نہیں نکل سکی، لیکن نور ولی صاحب کے مکان پر ارشد صاحب خود تشریف لے آئے اس لئے واپسی میں ملاقات سے محرومی نہیں رہی اللہ تعالیٰ ان کو بہتر سے بہتر جزا دے اللہ کے بڑے قابل رشک بندوں میں سے ہیں۔

نور ولی صاحب اور سید محمد ولی صاحب کے ہاں الفرقان جاتا ہے اس لئے غائبانہ تعارف تو برسوں سے ہے لیکن ان حضرات کے ہاں قیام اور اس طرح تفصیلی واقفیت کا یہ پہلا موقع تھا، سید محمد ولی صاحب کو "الفرقان" سے خاص تعلق ہے جدّہ اور مکہ معظمہ میں جہاں جہاں الفرقان جاتا ہے سب کے چندے کی رقم وصول کرنیکا وہی انتظام کرتے ہیں

رات کو جب ہوائی جہاز کے دفتر پر ہم سامان پہونچانے گئے تو وہاں ہم سے کہا گیا کہ صبح فجر کی نماز سے پہلے ہم تیار ہو کر اڈہ پر آجائیں لیکن ہمارے میزبانوں کو اندازہ تھا کہ اتنا سویرے جانا ضروری نہیں ہے اس لئے صبح اطمینان سے نماز فجر پڑھ کر اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ سید محمد ولی صاحب کی رہنمائی میں ہوائی اڈہ روانہ ہوئے تھوڑی دیر کے بعد ہمیں خدا حافظ کہنے کے لئے مولانا عبداللہ عباس صاحب ارشد صاحب، مولوی فریدالوحیدی صاحب اور بعض دوسرے مخلصین آ گئے جس ہوائی جہاز سے ہم کو بمبئی جانا تھا وہ ہمارے پہونچنے سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد بمبئی سے جدہ پہونچا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مسافروں کو اس پر سوار ہونے کی اجازت مل گئی اور تمام مسافر (جن کی تعداد ۱۶۰ کے قریب تھی) ۱۰-۵ منٹ میں سیٹوں پر پہونچ گئے۔

جدّہ سے بمبئی

جدہ میں سورج نکلے ابھی ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہ گزرا ہوگا لیکن ہندوستانی گھڑیوں میں اس وقت ۱۰ بجے تھے ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر جہاز نے پرواز شروع کی، ۲۰ اپریل کو جب بمبئی سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے تھے تو جہاز کے عملہ کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ ۵ گھنٹے اور ۵ منٹ میں جہاز جدّہ پہونچے گا اور ٹھیک اس اعلان کے مطابق وہ جہاز جدّہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا تھا، آج ۷ مئی کو جب جدّہ سے بمبئی کے لیے جہاز

نے پرواز شروع کی تو اس کے عملہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جدّہ سے بمبئی کی ۲۳۰۰ میل کی مسافت یہ جہاز چار گھنٹے میں طے کرے گا چنانچہ ٹھیک چار گھنٹے میں بمبئی کا ہوائی اڈہ آ گیا اور سوا دو بجے ہم لوگ اتر گئے جہاز کی سیڑھی سے اتر کے زمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ بمبئی کے احباب حاجی اسمٰعیل ہاشم صاحب حاجی عبدالکریم عرف بچو بھائی وغیرہ نے آکر سامان ہمارے ہاتھوں سے لے لیا جن حجاج کو اپنا سامان لے کر چلنا مشکل ہو رہا تھا ان حضرات نے ان کی پوری مدد کی، اللہ تعالیٰ نے بمبئی کے ان دوستوں کو حجاج کی اس خدمت کی خاص الخاص توفیق دی ہے اور یہ ان احباب کا مستقل وظیفہ ہے، جس دن حاجیوں کا کوئی بحری یا ہوائی جہاز بمبئی سے جدہ کے لیے روانہ ہوتا ہے اور اسی طرح جس دن جدہ سے کوئی جہاز بمبئی پہونچتا ہے اللہ تعالیٰ کے یہ باتوفیق بندے حجاج کی خدمت اور ان کو سہولت پہونچانے کے لئے موجود رہتے ہیں اور ہر ممکن سہولت پہونچاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت میں اس خدمت کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔

حج کو ذلیل کرنے والے بمبئی کے ان دوستوں نے بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا کہ بعض حجاج جو مقررہ حدود سے زیادہ مال خرید کے لاتے ہیں اور اس کو بغیر کسٹم ادا کئے لے جانا چاہتے ہیں وہ ہمارے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے بڑی رسوائی کا باعث بن رہے ہیں انہوں نے بتایا کہ حاجیوں کا جو پہلا بحری جہاز آیا تھا صرف اس کے حاجیوں سے ایک لاکھ پینتیس ہزار کسٹم وصول ہوا ہے جو لے دے کے نکل گئے ہوں وہ اس کے علاوہ ہے یہ سن کے بہت ہی دل دکھا کیسے ظالم اور بدبخت ہیں وہ لوگ جو حج جیسی مقدس عبادت کو اپنی سیہ کاری اور بددیانتی سے ذلیل اور رسوا کرتے ہیں اور حج کے راستہ میں مشکلات پیدا کرنے کا اخلاقی جواز حکومت کے لئے فراہم کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کسٹم کے سلسلہ میں رشوت کا کاروبار بھی خوب چلتا ہے اور جو لوگ بطور پیشے کے یہ حرکت کرتے ہیں وہ خوب اس کے گُر جانتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کو محض ناواقفی کی وجہ سے کسٹم دینا پڑجاتا ہے اور بہت سے غریب حاجی صرف علمی غلامی

حاصل کرنے کے لئے چپکے سے ۱۰۔۲۰ روپے ہاتھ پہ رکھ کے نجات حاصل کر لیتے ہیں حالانکہ قاعدے سے ایک پیسہ کسٹم ان پر واجب نہیں ہوتا۔ یہ سب کس قدر افسوس اور دکھ کی باتیں ہیں۔ ان باتوں کے انسداد کی دوسری تدبیروں اور کوششوں کے علاوہ ایک کام یہ بھی اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ ہر حاجی کو پاسپورٹ اور ٹکٹ کے ساتھ ایک کتابچہ بھی دیا جائے جس میں تفصیل کے ساتھ درج ہو کہ وہ اس حد تک فلاں فلاں چیزیں بغیر کسٹم لا سکتا ہے اور اس سے زیادہ پر اس کو اس حساب سے کسٹم ادا کرنا ہوگا۔ یہ کتابچہ ملک کی مختلف زبانوں میں چھپنا چاہیئے اور ہر حاجی جو زبان پڑھ سکتا ہو اس کو اسی زبان کی کاپی دینی چاہیئے کم از کم اردو، گجراتی، بنگالی اور تامل اور انگریزی میں ضرور چھپنا چاہیئے۔

آخری بات اور آخری کلمہ اللہ تعالیٰ کا شکر اور اس کی حمد ہے جس نے محض اپنے فضل و کرم سے یہ نعمت نصیب فرمائی اے اللہ! اس عاجز بندہ کے پاس تیری حمد و شکر کے لئے الفاظ نہیں ہیں، میں تیری حمد اور تیرا شکر ان الفاظ میں کرتا ہوں جو تیری کتاب پاک نے اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائے ہیں، اے کریم پروردگار جس طرح تو نے محض اپنے فضل سے یہ نصیب فرمایا اس طرح اپنے کرم سے قبول بھی فرما!۔

اگست ۶۳ء کی خاص اشاعت ختم

جولائی، اگست ۶۳ء کا مشترکہ شمارہ (الفرقان) گزشتہ مہینے سے دفتر میں ختم ہو چکا ہے اس لئے دفتر اب اس کے بارے میں کسی آرڈر یا شکایت کی تعمیل سے قاصر ہے۔ بلکہ بعض پیشگی قیمت والے آرڈروں کی بھی تعمیل نہیں کی جا سکی ہے جس کے لئے ان حضرات کو خطوط لکھے جا رہے ہیں۔

ادارہ

دنیا میں

سب سے بڑا روحانی انقلاب

پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ برپا ہوا تھا

جو لوگ اردو زبان کے ذریعہ

اس تعلیم و ہدایت سے واقف ہونا اور فائدہ اٹھانا چاہیں جس نے یہ انقلاب برپا کیا تھا

ہم ان کی خدمت میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ کی تالیف

معارف الحدیث

اعتماد اور یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں

اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ جس کو موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری سطح کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اس کتاب کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ مصنف کی خاص کوشش اس کتاب میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابہ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے کتاب کے ناظرین کے دلوں پر بھی وہی اثرات کسی درجہ میں پڑیں۔ (دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں)

جلد اول — جس میں ایمان و آخرت سے متعلق ۳۰۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible]

جلد دوم — جس میں تزکیہ اور اصلاح اخلاق سے متعلق ۲۰۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے [illegible]

[illegible]

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

ALFURQAN (Regd. No. A-366) LUCKNOW

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ادارۂ الفرقان

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

محمد منظور نعمانی

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ ۶ر
ششماہی ۳ر
فی کاپی .... ۶۰ نئے پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ..... ۱۲ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۱۵ش

جلد ۳۱	بابتہ ماہ رجب المرجب ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۳ء	شمارہ ۷

اگر اس دائرہ میں ⭘ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں نئے خریداروں کے لیے بھی یہی طریقہ ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ تک اطلاع آجانی چاہیے۔

دفتر:۔ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

الفرقان کی گزشتہ سے پیوستہ اشاعت (بابتہ جمادی الاولیٰ) کے ان صفحات میں چند مشاہداتی مثالیں اس کی ذکر کی گئی تھیں کہ جس زمانہ میں جس چیز کی ضرورت جس قدر اور جس پیمانہ پر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیز اس زمانہ میں اسی حساب سے پیدا کی جاتی ہے اور جب اس کی ضرورت کم ہو جاتی ہے تو اس کی پیداوار بھی کم کر دی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں اب تک جو مثالیں ذکر کی گئی تھیں اُن سب کا تعلق انسان کے علاوہ دوسری انواع مخلوقات سے تھا، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انسانوں کو بھی جو صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہیں اُن میں بھی اسی قانون کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہتی ہے ——— ہم میں سے جن کو اب سے صرف چالیس بیالیس سال پہلے کی باتیں بھی یاد ہیں اُن کے حافظہ میں تحریک خلافت کے دور کے بڑے بڑے جلسے ضرور ہوں گے۔ اس وقت تک لاؤڈ اسپیکر نہیں آیا تھا، مجھے ایسے متعدد جلسے اچھی طرح یاد ہیں جن کے شرکاء کی تعداد اخبارات میں تو ۴۰۔ ۵۰ ہزار لکھی جاتی ہوگی لیکن واقعہ میں بھی ۱۵۔ ۲۰ ہزار سے کم نہ ہوگی، اور اپنا مشاہدہ ہے کہ یہ پوری تعداد حتیٰ کہ آخری کناروں پر کھڑے ہونے والے لوگ بھی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اُن مقررین کی تقریریں بھی پوری طرح سُن لیتے تھے جو بہت زیادہ بلند آواز بھی نہیں ہوتے تھے ——— بلکہ تحریک خلافت کے کئی سال بعد کے بھی جمعیۃ علماء ہند کے دو ایسے بڑے اجلاسوں کا پورا سماں میرے حافظہ کی آنکھوں

کے سامنے ہے۔ ایک مراد آباد کا اجلاس جو مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار کی صدارت میں غالباً ۱۹۲۳ء میں ہوا تھا، اور دوسرا امروہہ کا اجلاس جو مولانا معین الدین اجمیریؒ کے زیر صدارت ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا، ان میں خاصکر رات کے عام اجلاسوں میں حاضری ۱۵۔۲۰ ہزار سے کم یقیناً نہیں ہوتی تھی۔ اور خوب یاد ہے کہ لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کے باوجود مقررین کی تقریریں برابر سنی جاتی تھیں ـــــ اجلاس مراد آباد کی درمیانی رات کی جس نشست میں مولانا محمد علی مرحوم نے اور ان کے بعد مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ نے تقریر فرمائی تھی اس میں تو حاضری غالباً ۲۰ ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی، لیکن مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب کے جثہ کی طرح ان کی آواز بھی باریک ہونے کے باوجود پورے جلسہ نے ان کی تقریر سُن لی تھی اور کسی طرف سے یہ آواز نہیں اٹھی کہ "ہمیں آواز نہیں پہونچ رہی ہے" ـــــ لیکن بعد میں جب لاؤڈ اسپیکر آگیا اور اس کا رواج عام ہوگیا تو اب حال یہ ہے کہ اس کے آدھے چوتھائی مجمع میں بھی اگر لاؤڈ اسپیکر کے بغیر تقریر کی جائے تو اچھے خاصے بلند آواز مقرر کی تقریر بھی اس طرح نہیں سنی جاتی، اور ہر طرف سے شور برپا ہو جاتا ہے کہ "آواز نہیں آرہی ہے، ـــــ آواز نہیں پہونچ رہی ہے ـــــ یہ بارہا کا خود اپنا تجربہ اور مشاہدہ ہے ـــ اس فرق کی اس کے سوا کوئی صحیح توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ لاؤڈ اسپیکر کے دور سے پہلے انسانوں کو شنوائی کی جتنی قوت کی ضرورت تھی قدرت کی جانب سے اس کے حساب سے یہ قوت عطا کی جاتی تھی۔ لیکن جب لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد اور اس کے عام رواج کے بعد اس قدر ضرورت نہیں رہی تو اس میں کمی کردی گئی۔

ـــــ وان من شیئ الا عندنا خزائنه وماننزله الا بقدر معلوم۔

انسانوں کی قوت سامعہ کی یہ کمی بیشی تو خود اپنے تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہوئی چیز ہے اور اس کا تجربہ اور مشاہدہ کرنے والے ہماری اس دنیا میں ابھی لاکھوں بلکہ کروڑوں موجود ہیں۔ لیکن کچھ مدت کے بعد ان واقعات پر بھی اسی طرح کا تعجب کیا جایا کرے گا جس طرح کا تعجب اگلے دور کے (خاصکر ائمہ محدثین کے) حافظہ کے غیر معمولی واقعات سُن کر آج کے بہت سے لوگ کرتے ہیں اور بعض مدعیانِ عقل تو استعجاب و استبعاد ہی کی بنا پر

ان کی صحت سے انکار کر دیتے ہیں ــــــ بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ــــــ لیکن ہم نے جس طرح ۴۰ سال سے بھی کم مدت میں انسانوں کی قوت سامعہ کی کمی بیشی کا خود تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے اور ہمیں اس کے بارے میں کوئی شک شبہ نہیں ہے اسی طرح اس میں ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اب سے ۱۲۔۱۴ سو سال پہلے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب علوم اور تاریخ کی حفاظت و امانت غیر معمولی حافظوں ہی سے ہو سکتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے صحابہ اور تابعین اور ائمہ محدثین کو اس درجہ کے حافظے عطا فرمائے، اور بعد کو جب کتابوں کی تدوین و تالیف کا دور آگیا اور اس کے بھی بعد جب پریس کی ایجاد نے علوم و تاریخ کی حفاظت و امانت کا مسئلہ اور آسان آسان کر دیا تو انسانوں کو اس حافظے کی ضرورت نہیں رہی جو کتب کا کام دے اس لیے اب صرف اتنے حافظے عطا ہونے لگے جتنے کی اب انسانوں کو ضرورت ہے ــــــ وان من شیئٍ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدرٍ معلوم ۝

معارف الحدیث

(مسلسل)

زکوٰۃ اور صدقات کے مستحقین:-

(۱۲) عَنْ زِيَادِ بْنِ الْحَارِثِ الصُّدَائِي قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْتُهُ فَذَكَرَ حَدِيثًا طَوِيلًا ـــــ فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ أَعْطِنِي مِنَ الصَّدَقَةِ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ لَمْ يَرْضَ بِحُكْمِ نَبِيٍّ وَلَا غَيْرِهِ فِي الصَّدَقَاتِ حَتَّى حَكَمَ هُوَ فَجَزَّأَهَا ثَمَانِيَةَ أَجْزَاءٍ فَإِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْأَجْزَاءِ أَعْطَيْتُكَ ـــــ (رواہ ابوداؤد)

زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ سے بیعت کی ـــــ زیاد نے اس موقع پر ایک طویل حدیث ذکر کی اور اسی سلسلۂ بیان میں یہ واقعہ نقل کیا۔ کہ آپ کی خدمت میں اس وقت ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ مجھے عنایت فرمائیے!۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف کو نہ تو کسی نبی کی مرضی پر چھوڑا ہے اور نہ کسی غیر نبی کی مرضی پر۔ بلکہ خود ہی فیصلہ فرما دیا ہے اور اُن کے آٹھ حصے یعنی آٹھ

قسمیں کردی ہیں تو اگر تم ان قسموں میں سے کسی قسم کے آدمی ہو تو میں زکوٰۃ میں سے تم کو دے دوں گا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں مصارف زکوٰۃ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے جس حکم کا حوالہ دیا ہے وہ سورۂ توبہ کی اس آیت میں مذکور ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (توبہ۔ ع ۸)	زکوٰۃ بس حق ہے مفلسوں اور محتاجوں کا اور اس کی تحصیل وصول کا کام کرنے والوں کا اور مؤلفۃ القلوب کا، نیز وہ صرف کی جا سکتی ہے غلاموں کو آزادی دلانے اور ان کی گلو خلاصی کرانے میں اور اُن لوگوں کی مدد میں جو قرض وغیرہ کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اور (اسی طرح) مجاہدوں اور مسافروں کی مدد میں۔

زکوٰۃ کے یہ آٹھ مصرف ہیں جو خود قرآن مجید میں بیان فرما دیئے گئے ہیں۔

فقراء: یعنی عام غریب اور مفلس لوگ ــــــ فقیر عربی زبان میں غنی کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اس لحاظ سے وہ تمام غریب لوگ اس میں آجاتے ہیں جو غنی نہیں ہیں یعنی جن کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ شریعت میں غنا کا معیار یہی ہے۔ کتاب الزکوٰۃ کے بالکل شروع میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے جس میں زکوٰۃ کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے "تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هِمْ وَ تُرَدُّ اِلٰى فُقَرَاءِ هِمْ"

مساکین: وہ حاجت مند جن کے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کچھ نہ ہو اور بالکل خالی ہاتھ ہوں۔

عاملین: یعنی زکوٰۃ کی تحصیل وصول کرنے والا عملہ ــــــ یہ لوگ اگر بالفرض غنی بھی ہوں جب بھی ان کی محنت اور ان کے وقت کا معاوضہ زکوٰۃ سے دیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی دستور تھا۔

"مؤلفۃ القلوب" ــــ ایسے لوگ جن کی تالیف قلب اور دلجوئی اہم دینی و ملی مصالح کے لیے ضروری ہو۔ وہ اگر دولت مند بھی ہوں تب بھی اس مقصد کے لیے زکوٰۃ کی مد سے ان پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔

"رقاب" ــــ یعنی غلاموں اور باندیوں کی آزادی اور گلو خلاصی۔ اس مد میں بھی زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔

"غارمین" ــــ جن لوگوں پر کوئی ایسا مالی بار آ پڑا ہو، جس کے اٹھانے کی ان میں طاقت و قوت نہ ہو، جیسے اپنی مالی حیثیت سے زیادہ قرض کا بوجھ یا کوئی دوسرا مالی تاوان۔ ان لوگوں کی مدد بھی زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے۔

"فی سبیل اللہ" ــــ اکثر علماء اور ائمہ کے نزدیک اس سے مراد دین کی نصرت و حفاظت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے سلسلہ کی ضروریات ہیں۔

"ابن السبیل" ــــ اس سے مراد وہ مسافر ہیں جنھیں مسافرت میں ہونے کی وجہ سے مدد کی ضرورت ہو۔

زیاد بن حارث صدائی کی اس حدیث میں جن صاحب کے متعلق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ زکوٰۃ کے مال میں سے مجھے کچھ عنایت فرما دیجئے، انھیں جواب دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے زکوٰۃ کے یہ آٹھ مصارف خود ہی مقرر فرما دیے ہیں، اگر تم ان میں سے کسی طبقہ میں داخل ہو تو میں دے سکتا ہوں، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مجھے یہ حق اور اختیار نہیں ہے کہ اس مد میں سے میں تم کو کچھ دے سکوں۔

(یہاں صرف حدیث کی تشریح اور تفہیم کے لیے مصارف کا مختصر بیان کر دیا گیا ہے۔ تفصیلی مسائل فقہ کی کتابوں میں دیکھے جائیں یا علماء و اصحاب فتویٰ سے دریافت کیے جائیں)

(۱۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلٰكِنَّ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ

لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيهِ وَلَا يُفْطَنُ بِهِ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَلَا يَقُومُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ ——— (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اصلی مسکین (جس کی صدقہ سے مدد کرنی چاہیئے) وہ آدمی نہیں ہے جو (مانگنے کے لیے) لوگوں کے پاس آتا جاتا ہے (در در پھرتا ہے اور سائلانہ چکر لگاتا ہے) اور ایک دو لقمے یا ایک دو کھجوریں (جب اس کے ہاتھ پہ رکھ دی جاتی ہیں تو) لے کر واپس لوٹ جاتا ہے، بلکہ اصل مسکین وہ بندہ ہے جس کے پاس اپنی ضرورتیں پوری کرنے کا سامان بھی نہیں ہے اور (چونکہ وہ اپنے اس حال کو لوگوں سے چھپاتا ہو اسلئے) کسی کو اس کی حاجت مندی کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ صدقہ سے اس کی مدد کی جائے۔ اور نہ وہ چل پھر کر لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا مدعا یہ ہے کہ وہ پیشہ ور سائل اور گداگر جو در در پھر کے لوگوں سے مانگتے ہیں۔ اصل مسکین اور صدقہ کے اصل مستحق نہیں ہیں، بلکہ صدقہ کے لیے ایسے باعفت ضرورتمندوں کو تلاش کرنا چاہیے جو شرم وحیا اور عفتِ نفس کی وجہ سے لوگوں پر اپنی حاجت مندی ظاہر نہیں کرتے اور کسی سے سوال نہیں کرتے ——— یہی لوگ اصل مسکین ہیں جن کی خدمت اور مدد نہایت مقبول اور پسندیدہ عمل ہے۔

(۱۴) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِي مِرَّةٍ سَوِيٍّ۔

——— (رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، زکوٰۃ حلال نہیں ہے غنی (مالدار) کو اور توانا وتندرست کو۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن دارمی)

(۱۵) عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الْخِيَارِ قَالَ أَخْبَرَنِي رَجُلَانِ أَنَّهُمَا أَتَيَا النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ

وَهُوَ يَقْسِمُ الصَّدَقَةَ فَسَأَلَاهُ مِنْهَا فَرَفَعَ فِيْنَا النَّظَرَ وَخَفَضَهُ فَرَآنَا جَلْدَيْنِ فَقَالَ إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا وَلَا حَظَّ فِيْهَا لِغَنِيٍّ وَلَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ ——— رواه ابوداؤد والنسائی

عبیداللہ بن عدی بن الخیار تابعی نقل کرتے ہیں کہ مجھے دو آدمیوں نے بتایا کہ وہ دونوں حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ اس وقت زکوٰۃ کے اموال تقسیم فرما رہے تھے، تو ہم دونوں نے بھی اس میں سے کچھ مانگا، آپ نے نظر اٹھا کر ہمیں اوپر سے نیچے تک دیکھا تو آپ نے ہم کو تندرست و توانا محسوس کیا، پھر فرمایا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دوں (مگر یہ سمجھ لو کہ) ان اموال میں مال داروں کا اور ایسے تندرست و توانا لوگوں کا حصہ نہیں ہے جو اپنی معاش کمانے کے قابل ہوں۔ (سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(**تشریح**) ان دونوں حدیثوں میں غنی سے مراد غالباً وہ آدمی ہے جس کے پاس اپنے کھانے کپڑے جیسی ضروریات کے لیے کچھ سامان موجود ہو اور اسے فی الحال ضرورت نہ ہو، ایسے آدمی کو اگر وہ مالک نصاب نہیں ہے زکوٰۃ دی جائے تو اگرچہ ادا ہو جائے گی لیکن خود اس آدمی کو زکوٰۃ لینے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اسی طرح جو آدمی تندرست و توانا ہو اور محنت کر کے روزی کما سکتا ہو اس کو بھی زکوٰۃ لینے سے بچنا چاہیے ——— عام ضابطہ یہی ہے اور ان دونوں حدیثوں میں اسی عام ضابطہ کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ لیکن خاص حالات میں ایسے لوگوں کو بھی زکوٰۃ لینے کی گنجائش ہے، اسی لیے عبیداللہ بن عدی والی دوسری حدیث میں آپ نے ان دونوں صاحبوں سے یہ بھی فرمایا کہ "اگر تم لینا چاہو تو میں دے دوں گا" (اِنْ شِئْتُمَا اَعْطَيْتُكُمَا)

زکوٰۃ و صدقات اور خاندانِ نبوت:-

(۱۶) عَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ وَإِنَّهَا

لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِآلِ مُحَمَّدٍ ——— رواہ مسلم

عبد المطلب بن ربیعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ صدقات لوگوں کے مال و دولت کا میل کچیل ہیں اور وہ محمد اور آل محمد کے لیے حلال نہیں ہیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں زکوٰۃ و صدقات کو میل کچیل اس لحاظ سے کہا گیا کہ جس طرح میل کچیل نکل جانے کے بعد کپڑا ظاہری نظر میں صاف ہو جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ نکلنے کے بعد باقی مال عند اللہ اور باطنی نظر میں پاک ہو جاتا ہے۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مال زکوٰۃ کے استعمال سے پرہیز ہی کیا جائے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے اور قیامت تک کے واسطے اپنے اہل خاندان بنی ہاشم کے لیے زکوٰۃ کو ناجائز قرار دے دیا ہے۔

(۱۷) عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرَةٍ فِي الطَّرِيْقِ فَقَالَ لَوْلَا اَنِّيْ اَخَافُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَاَكَلْتُهَا ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گزر رہے تھے، راستہ میں پڑی ہوئی ایک کھجور آپ نے دیکھی تو فرمایا کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ شاید یہ زکوٰۃ کی ہو تو میں اس کو اٹھا کے کھا لیتا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس موقع پر آپ کا یہ فرمانا دراصل لوگوں کو یہ سبق دینے کے لیے تھا کہ اگر اللہ کا رزق اور اس کی کوئی نعمت (اگرچہ کیسی ہی کم حیثیت اور کم قیمت ہو) کہیں گری پڑی نظر آئے تو اس کا احترام اور اس کی قدر کی جائے اور اس سے وہ کام لیا جائے جس کے لیے اللہ نے وہ بنائی ہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے یہ بتا کے کہ "میں اس کو اس لیے نہیں کھا سکتا کہ شاید یہ زکوٰۃ کی کھجوروں میں سے گر گئی ہو" مشکوک اور مشتبہ چیزوں کے استعمال کرنے سے پرہیز اور احتیاط کا سبق بھی اہل تقویٰ کو دے دیا۔

(۱۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ تَمْرَةً مِنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ فَجَعَلَهَا فِیْ فِیْهِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَخْ كَخْ لِیَطْرَحَهَا ثُمَّ قَالَ اَمَا شَعَرْتَ اَنَّا لَا نَاْكُلُ الصَّدَقَةَ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حسن بن علیؓ نے (اپنے بچپن میں) زکوٰۃ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کے اپنے منہ میں رکھ لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا اور فرمایا کخ کخ (اخ اخ) تاکہ وہ اس کو منہ سے نکال دیں اور تھوک دیں۔ پھر آپ نے فرمایا، بیٹا کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ ہم لوگ (بنی ہاشم) زکوٰۃ نہیں کھاتے ہیں۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(۱۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِطَعَامٍ سَاَلَ عَنْهُ اَهَدِیَّةٌ اَمْ صَدَقَةٌ؟ فَاِنْ قِیْلَ صَدَقَةٌ قَالَ لِاَصْحَابِهٖ كُلُوْا وَلَمْ یَاْكُلْ وَاِنْ قِیْلَ هَدِیَّةٌ ضَرَبَ بِیَدِهٖ فَاَكَلَ مَعَهُمْ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اور دستور تھا کہ جب کوئی کھانے کی چیز آپ کے پاس لائی جاتی تو آپ اس کے بارے میں دریافت فرماتے کہ یہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر آپ کو بتایا جاتا کہ یہ صدقہ ہے تو آپ اپنے اصحاب سے (یعنی ان اصحاب سے جن کے لیے صدقہ کھانے میں کوئی مضائقہ نہ ہوتا جیسے کہ اصحاب صفہ) فرمادیتے کہ آپ لوگ کھاؤ۔ اور خود اس میں سے نہ کھاتے، اور اگر آپ کو بتایا جاتا کہ یہ کھانا ہدیہ ہے تو آپ بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے اور ان اصحاب کے ساتھ اس کے کھانے میں شرکت فرماتے۔

(صحیح مسلم وصحیح بخاری)

(تشریح) کسی شخص کو غریب اور ضرورتمند سمجھ کر اعانت و امداد کے طور پر ثواب کی

نیت سے جو کچھ دیا جائے وہ شریعت کی اصطلاح میں صدقہ کہلاتا ہے خواہ وہ فرض و واجب ہو جیسے زکوٰۃ یا صدقۂ فطر یا نفلی ہو جس کو ہماری زبان میں امداد اور خیرات کہا جاتا ہو۔

اور اگر عقیدت اور تعلق و محبت کی وجہ سے اور اس کے تقاضے سے کسی اپنے محترم اور محبوب کی خدمت میں کچھ پیش کیا جائے تو وہ ہدیہ کہلاتا ہے ___ صدقہ میں دینے والے کی پوزیشن اونچی اور بلند ہوتی ہے اور بیچارے لینے والے کی نیچی اور پست، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی قسم کا صدقہ استعمال نہیں فرماتے تھے ___ اور ہدیہ دینے والا اس کے ذریعے احترام و عقیدت اور تعلق و محبت کا اظہار کرتا ہے اور اس کو اپنی ذاتی ضرورت سمجھتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خوشی سے قبول فرماتے تھے، پیش کرنے والے کو دعائیں دیتے تھے، اور بسا اوقات اپنی طرف سے اس کو ہدیہ دے کر اس کی مکافات بھی کرتے تھے[۱] ___ اور جب کوئی صدقہ کے طور پر کچھ لاتا تو وہ اپنے اصحاب مستحقین کو دے دیتے تھے۔

(۲۰) عَنْ أَبِي رَافِعٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ رَجُلاً مِنْ بَنِي مَخْزُومٍ عَلَى الصَّدَقَةِ فَقَالَ لِأَبِي رَافِعٍ اصْحَبْنِي كَيْمَا تُصِيبَ مِنْهَا فَقَالَ لَا حَتَّى آتِيَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْأَلَهُ فَانْطَلَقَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لَنَا وَإِنَّ مَوَالِيَ الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ___ رواه الترمذي وابو داود والنسائي

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مخزوم کے ایک آدمی کو زکوٰۃ

---

[۱] صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقبل الهدية ويثيب عليها۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے اور ہدیہ پیش کرنے والوں کو خود بھی ہدیہ دیتے تھے۔

وصول کرنے کے لیے مقرر فرمایا، اس مخزومی نے ابورافع سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو تاکہ تمھیں بھی (حق المحنت کے طور پر) اس میں سے کچھ مل جائے جس طرح مجھے ملیگا۔ ابورافع نے اُن سے کہا کہ جب تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت نہ کرلوں تمھارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس کے بعد ابورافع حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے گھر اور ہمارے خاندان کے لیے زکوٰۃ میں سے کچھ لینا جائز نہیں ہے۔ اور کسی گھرانے کے غلام بھی انہی میں سے ہیں (اس لیے ہماری طرح تمھارے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے) (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں ہے، اسی طرح آپ کے اور آپ کے خاندان والوں کے غلاموں کے لیے بھی حلال نہیں ہے، حتیٰ کہ آزاد ہونے کے بعد بھی وہ زکوٰۃ فنڈ سے کچھ نہیں لے سکتے ——— دوسری بات اس حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ زکوٰۃ کی تحصیل وصول کی اُجرت اور حق المحنت کے طور پر اسی زکوٰۃ میں سے ہر عامل کو دیا جاسکتا ہے (حتیٰ کہ عامل اگر اپنے گھر کا دولتمند ہو اور خود اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو، تب بھی اس کو بطور اجرت زکوٰۃ سے دیا جاسکتا ہے) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں اور اُن کے غلاموں کے لیے اس کی بھی گنجائش نہیں ہے ——— ایک تیسری بات اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اسلامی قانون نے غلاموں کو اس زمانہ میں جب دنیا میں ان کی کوئی بھی حیثیت نہیں تھی کتنا بلند درجہ دیا تھا اور قانونی مالکوں کی خاندانی خصوصیات تک میں ان کو کس حد تک شریک کر دیا تھا۔

کن حالات میں سوال کرنے کی اجازت ہے اور کن حالات میں ممانعت :-

حضرات محدثین کتاب الزکوٰۃ ہی میں وہ حدیثیں بھی درج کرتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کن حالات میں سوال کرنے کی ممانعت ہے اور کن حالات میں اجازت ہے، اُن کے

اس طریقہ کی پیروی میں اس سلسلہ (معارف الحدیث) میں بھی وہ حدیثیں یہیں درج کی جاتی ہیں۔

(۲۱) عَنْ حُبْشِيِّ بْنِ جُنَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَا تَحِلُّ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ اِلَّا لِذِيْ فَقْرٍ مُدْقِعٍ اَوْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ وَمَنْ سَأَلَ النَّاسَ لِيُثْرِيَ بِهٖ مَالَهٗ كَانَ خُمُوْشًا فِيْ وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَرَضْفًا يَاْكُلُهٗ مِنْ جَهَنَّمَ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُقِلَّ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْثِرْ —— رواه الترمذی

حُبشی بن جنادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوال کرنا جائز نہیں ہے غنی آدمی کو اور نہ توانا و تندرست آدمی کو، البتہ ایسے آدمی کو جائز ہے جس کو ناداری و افلاس نے زمین پر گرا دیا ہو، یا جس پر قرض یا کسی تاوان وغیرہ کا کوئی بھاری بوجھ پڑ گیا ہو، اور جو آدمی (محتاجی کی وجہ سے نہیں بلکہ) اپنے مال میں اضافہ کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور سوال کرے تو قیامت کے دن اس کا یہ سوال اس کے چہرہ پر ایک زخم اور گھاؤ کی شکل میں نمایاں ہوگا، اور جہنم کا گرم جلتا ہوا پتھر ہوگا جس کو وہاں وہ کھائے گا اس کے بعد جس کا جی چاہے سوال کم کرے اور جس کا جی چاہے زیادہ کرے (اور آخرت میں اس کا یہ نتیجہ بھگتے) (جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں بھی عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث (نمبر ۱۲) کی طرح غنی سے مراد وہ آدمی ہے جو فی الحال محتاج اور ضرورت مند نہ ہو (اگرچہ وہ صاحب نصاب اور سرمایہ دار بھی نہ ہو) ایسے آدمی کو اور اس تندرست و توانا آدمی کو جو محنت کر کے اپنی روزی کما سکتا ہو اس حدیث میں سوال کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، عام ضابطہ اور مسئلہ بھی ہے کہ ایسے آدمی کو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاں اگر افلاس و ناداری نے کسی کو بالکل ہی گرا دیا ہو اور سوال کے سوا اس کے سامنے کوئی راہ نہ ہو، یا کسی کو کوئی جرمانہ یا تاوان یا قرض ادا کرنا ہو اور وہ دوسروں سے

امداد لیے بغیر اُس کو ادا نہ کر سکتا ہو تو ان صورتوں میں اس کو سوال کرنے کی اجازت ہو ــــ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ضرورتمندی اور محتاجی کی مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے گا اس کو قیامت میں اس کی سزا یہ دی جائے گی کہ اس کے چہرہ پر ایک بدنما گھاؤ ہوگا ــــ اور جو کچھ اس نے سوال کر کے لوگوں سے لیا تھا وہ وہاں جہنم کا گرم پتھر بنا دیا جائے گا اور وہ اُسے کھانے پر مجبور ہوگا۔

(۲۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ ــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو کوئی (حاجت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ) زیادہ مال حاصل کرنے کے لیے لوگوں سے مانگتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے لیے جہنم کا انگارا مانگتا ہے (یعنی جو کچھ اس طرح سوال کر کے وہ حاصل کرے گا وہ آخرت میں اس کے لیے دوزخ کا انگارا بن جائے گا) ــــ اب خواہ اس میں کمی کرے یا زیادتی کرے۔

(صحیح مسلم)

(۲۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَأَلَ النَّاسَ وَلَهُ مَا يُغْنِيْهِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَسْئَلَتُهُ فِيْ وَجْهِهِ خُمُوْشٌ أَوْ خُدُوْشٌ أَوْ كُدُوْحٌ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُغْنِيْهِ؟ قَالَ خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا أَوْ قِيْمَتُهَا مِنَ الذَّهَبِ۔

ــــ رواہ ابوداؤد، والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص ایسی حالت میں لوگوں سے سوال کرے کہ اس کے پاس "مَا يُغْنِيْهِ" ہو (یعنی اتنا موجود ہو جو اس کے لیے کافی ہو، اور جس کے بعد وہ دوسروں کا محتاج اور دست نگر نہ رہے) تو وہ قیامت کے دن محشر میں اس حال میں آئے گا کہ اس کا سوال اس کے چہرہ میں ایک گھاؤ کی صورت میں ہوگا (خُمُوْش، خُدُوْش، کُدُوْح

یہ تینوں لفظ قریب المعنیٰ ہیں۔ ان کے معنی زخم کے ہیں۔ غالباً راوی کو شک ہو گیا ہو کہ اصل حدیث میں ان تینوں میں سے کون لفظ تھا ــــ آگے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر) آپ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ وہ کتنی مقدار ہے جس کو آپ نے "مَا يُغْنِيهِ" فرمایا ہے (اور جس کے بعد وہ دوسروں کا محتاج اور دست نگر نہیں رہتا) آپ نے فرمایا کہ پچاس درہم یا ان کی قیمت کا سونا۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس پچاس درہم یا اس کے قریب مالیت موجود ہو، جسے وہ اپنی ضروریات میں استعمال کر سکتا ہو اور کسی کاروبار میں لگا سکتا ہو اس کے لیے سوال کرنا گناہ ہے اور ایسا شخص قیامت میں اس حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر اس ناجائز سوال کی وجہ سے بدنما داغ ہو گا۔

اس حدیث میں اُس غِنا کا معیار جس کے ہوتے ہوئے سوال جائز نہیں، پچاس درہم کی مالیت کو قرار دیا گیا ہے ــــ ایک دوسری حدیث میں ایک اوقیہ ــــ یعنی چالیس درہم کی مالیت کا بھی ذکر ہے ــــ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، لیکن سنن ابی داؤد کی ایک اور حدیث میں جو سہل بن الحنظلیہ سے مروی ہے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا ــ "ما الغِنَى الذى لَا تَنْبَغِى مَعَهُ الْمَسْئَلَةُ" (غِنا کی وہ کیا مقدار ہے جس کے ہوتے ہوئے سوال نہیں کرنا چاہیے) تو آپ نے فرمایا ــ "قَدْرُ مَا يُغَدِّيهِ وَيُعَشِّيهِ" (اتنا کہ اس سے دن کا کھانا کھا سکے اور رات کا کھانا کھا سکے) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس ایک دن کے کھانے بھر بھی ہے تو اُس کو سوال کرنا درست نہیں۔

وہ غِنا جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اُس کا معیار تو متعین ہے اور اُس کے متعلق حدیثیں پہلے گزر چکیں، لیکن وہ غِنا جس کے حاصل ہوتے ہوئے سوال نہیں کرنا چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں اُس کے معیار مختلف بیان فرمائے ہیں۔ شارحین حدیث نے اس اختلاف کی توجیہ کئی طرح سے کی ہے۔ اس عاجز کے نزدیک سب

اقرب بات یہ ہے کہ یہ اختلاف اشخاص اور احوال کے لحاظ سے ہے یعنی بعض حالات اور اشخاص ایسے ہو سکتے ہیں کہ تھوڑا بہت اثاثہ ہونے کی صورت میں بھی ان کے لیے سوال کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہ اثاثہ ۴۰۔۵۰ درہم کے قریب ہو تو پھر بالکل گنجائش نہیں ــــ اور بعض حالات اور اشخاص ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے پاس اگر ایک دن کے کھانے کے لیے بھی کچھ ہو تو ان کے لیے سوال کی گنجائش نہیں ــــ اسی طرح اس اختلاف کو رخصت و عزیمت کے فرق پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ جن احادیث میں ۴۰۔۵۰ درہم کی مالیت کو معیار بتایا گیا ہے ان میں رخصت اور فتوے کا بیان ہے اور جن میں ایک دن کے کھانے بھر ہونے کی صورت میں بھی سوال سے منع کیا گیا ہے وہ عزیمت اور تقوے کا مقام ہے۔ واللہ اعلم

سوال میں بہرحال ذلّت ہے :-

(۲۴) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَذْكُرُ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْئَلَةِ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى وَالْيَدُ الْعُلْيَا هِىَ الْمُنْفِقَةُ وَالسُّفْلٰى هِىَ السَّائِلَةُ ــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا اور مانگنے سے پرہیز کرنے کا ذکر کرتے ہوئے برسر منبر ایک دن فرمایا "اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، اوپر والا ہاتھ دینے والا ہاتھ ہے اور نیچے والا ہاتھ مانگنے والے کا ہاتھ ہے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ دینے والے کا مقام اونچا اور عزت کا ہے اور مانگنے والے کا نیچا اور ذلت کا۔ اس لیے مومن کو دینے والا بننا چاہیئے اور سوال کی ذلت سے اپنے کو حتی الامکان بچانا ہی چاہیئے۔

اگر سوال کرنا ناگزیر ہو تو اللہ کے نیک بندوں سے کیا جائے :-

(۲۵) عَنِ ابْنِ الْفِرَاسِيِّ اَنَّ الْفِرَاسِيَّ قَالَ قُلْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَسْأَلُ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا وَاِنْ كُنْتَ لَابُدَّ فَسَلِ الصَّالِحِيْنَ۔

______ رواہ ابوداؤد والنسائی

ابن الفراسی تابعی اپنے والد فراسی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میں اپنی ضرورت کے لیے لوگوں سے سوال کرسکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا (جہاں تک ہو سکے) سوال نہ کرو، اور اگر تم سوال کے لیے مجبور ہی ہو جاؤ تو اللہ کے نیک بندوں سے سوال کرو۔

(سنن ابی داؤد ۔ سنن نسائی)

اپنی حاجت بندوں کے سامنے نہ رکھو اللہ کے سامنے رکھو:۔

(۲۶) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصَابَتْهُ فَاقَةٌ فَاَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تُسَدَّ فَاقَتُهُ وَمَنْ اَنْزَلَهَا بِاللهِ اَوْشَكَ اللهُ لَهُ بِالْغِنَا اِمَّا بِمَوْتٍ عَاجِلٍ اَوْ غِنًى اٰجِلٍ۔

______ رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس آدمی کو کوئی سخت حاجت پیش آئی اور اسے اُس نے بندوں کے سامنے رکھا اور اُنسے مدد چاہی تو اسے اس مصیبت سے مستقل نجات نہیں ملے گی اور جس آدمی نے اسے اللہ کے سامنے رکھا اور اس سے دعا کی تو پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی اس کی یہ حاجت ختم کرے گا یا تو جلدی موت دے کر (اگر اسکی موت کا مقرر وقت آگیا ہو) یا کچھ تاخیر سے خوشحالی دے کر۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

بندوں سے سوال نہ کرنے پر جنت کی ضمانت:۔

(۲۷) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَنْ يَكْفُلُ لِي أَنْ لَا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئًا فَأَتَكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ ثَوْبَانُ أَنَا فَكَانَ لَا يَسْأَلُ أَحَدًا شَيْئًا ـــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا جو مجھ سے اس بات کا عہد کرے کہ وہ اللہ کے بندوں سے اپنی کوئی حاجت نہ مانگے گا تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، ثوبان کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں یہ عہد کرتا ہوں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وجہ سے حضرت ثوبان کا یہ دستور تھا کہ وہ کسی آدمی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔

(سنن ابی داؤد۔ سنن نسائی)

اگر بغیر سوال اور طمع نفس کے کچھ ملے تو اسکو لے لینا چاہیے :-

(۲۸) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِينِي الْعَطَاءَ فَأَقُولُ أَعْطِهِ أَفْقَرَ إِلَيْهِ مِنِّي فَقَالَ خُذْهُ فَتَمَوَّلْهُ وَتَصَدَّقْ بِهِ فَمَا جَاءَكَ مِنْ هَذَا الْمَالِ وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَلَا سَائِلٍ فَخُذْهُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی مجھے کچھ عطا فرماتے تھے تو میں عرض کرتا تھا کہ حضرت کسی ایسے آدمی کو دے دیجئے جس کو مجھ سے زیادہ اس کی ضرورت ہو، تو آپ فرماتے کہ عمر اس کو لے لو اور اپنی ملکیت بنا لو (پھر چاہو تو) صدقہ کے طور پر کسی حاجت مند کو دے دو، (اور اپنا یہ اصول بنا لو کہ) جب کوئی مال تمھیں اس طرح ملے کہ نہ تو تم نے اس کے لیے سوال کیا ہو اور نہ تمھارے دل میں اس کی چاہت اور طمع ہو (تو اس کو اللہ کا عطیہ سمجھ کر) لے لیا کرو، اور جو مال اس طرح تمھارے پاس نہ آئے تو اس کی طرف توجہ بھی نہ کرو۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

جب تک محنت سے کما سکتے ہو سوال نہ کرو:۔

(۲۹) عَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يَّاْخُذَ اَحَدُكُمْ حَبْلَهٗ فَيَاْتِيَ بِحُزْمَةِ حَطَبٍ عَلٰى
ظَهْرِهٖ فَيَبِيْعَهَا فَيَكُفَّ اللّٰهُ بِهَا وَجْهَهٗ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّسْاَلَ
النَّاسَ اَعْطَوْهُ اَوْ مَنَعُوْهُ ـــــــــ رواہ البخاری

حضرت زبیر بن العوام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ـــ تم میں سے کسی (ضرورتمند) آدمی کا یہ رویہ کہ وہ رسی لے کر جنگل جائے اور
لکڑیوں کا ایک گٹھا اپنی کمر پر لاد کے لائے اور بیچے اور اس طرح اللہ کی توفیق
سے وہ سوال کی ذلّت سے اپنے کو بچالے، اس سے بہت بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے
سامنے سوال کا ہاتھ پھیلائے پھر خواہ وہ اس کو دیں یا نہ دیں۔ (صحیح بخاری)

(۳۰) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْاَنْصَارِ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْاَلُهٗ فَقَالَ اَمَا فِيْ بَيْتِكَ شَيْءٌ فَقَالَ بَلٰى حِلْسٌ
نَلْبَسُ بَعْضَهٗ وَنَبْسُطُ بَعْضَهٗ وَقَعْبٌ نَشْرَبُ فِيْهِ مِنَ الْمَاءِ
قَالَ اِئْتِنِيْ بِهِمَا فَاَتَاهُ بِهِمَا فَاَخَذَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ وَقَالَ مَنْ يَّشْتَرِيْ هٰذَيْنِ؟ قَالَ رَجُلٌ اَنَا اٰخُذُهُمَا
بِدِرْهَمٍ قَالَ مَنْ يَّزِيْدُ عَلٰى دِرْهَمٍ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا قَالَ رَجُلٌ
اَنَا اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمَيْنِ فَاَعْطَاهُمَا اِيَّاهُ فَاَخَذَ الدِّرْهَمَيْنِ فَاَعْطَا
هُمَا الْاَنْصَارِيَّ وَقَالَ اِشْتَرِ بِاَحَدِهِمَا طَعَامًا فَانْبِذْهُ اِلٰى اَهْلِكَ
وَاشْتَرِ بِالْاٰخَرِ قَدُوْمًا فَاْتِنِيْ بِهٖ فَاَتَاهُ بِهٖ فَشَدَّ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُوْدًا بِيَدِهٖ ثُمَّ قَالَ اِذْهَبْ فَاحْتَطِبْ وَبِعْ
وَلَا اُرَيَنَّكَ خَمْسَةَ عَشَرَ يَوْمًا فَذَهَبَ الرَّجُلُ يَحْتَطِبُ وَيَبِيْعُ
فَجَاءَهٗ وَقَدْ اَصَابَ عَشَرَةَ دَرَاهِمَ فَاشْتَرٰى بِبَعْضِهَا ثَوْبًا وَ

بِبَعْضِهَا طَعَامًا فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا خَيْرٌ لَكَ مِنْ اَنْ تَجِيئَ الْمَسْئَلَةُ نُكْتَةً فِي وَجْهِكَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَا تَصْلُحُ اِلَّا لِثَلٰثَةٍ لِذِي فَقْرٍ مُدْقِعٍ اَوْ لِذِي غُرْمٍ مُفْظِعٍ اَوْ لِذِي دَمٍ مُوْجِعٍ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک (مفلس اور غریب شخص) انصار میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور (اپنی حاجتمندی ظاہر کر کے) آپ سے کچھ مانگا، آپ نے فرمایا کہ کیا تمھارے گھر میں کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ انھوں نے عرض کیا، بس ایک کمبل ہے جس میں سے کچھ ہم اوڑھ لیتے ہیں اور کچھ بچھا لیتے ہیں، اور ایک پیالہ ہے جس سے ہم پانی پیتے ہیں (باقی بس اللہ کا نام) آپ نے فرمایا یہی دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ، انھوں نے وہ دونوں لا کر آپ کو دے دیں، آپ نے وہ کمبل اور پیالہ ہاتھ میں لیا اور (نیلام کے طریقہ پر) حاضرین سے فرمایا —— کون ان دونوں چیزوں کو خریدنے پر تیار ہے؟ ایک صاحب نے عرض کیا حضرت میں ایک درہم میں ان کو لے سکتا ہوں، آپ نے فرمایا کون ایک درہم سے زیادہ لگاتا ہے —— یہ بات آپ نے دو دفعہ یا تین دفعہ فرمائی —— ایک دوسرے صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں دو درہم میں لے سکتا ہوں، آپ نے دونوں چیزیں ان صاحب کو دے دیں اور ان سے دو درہم لے لیے اور ان انصاری کے حوالے کیے اور ان سے فرمایا کہ ان میں سے ایک کا تم کھانے کا کچھ سامان (غلہ وغیرہ) لے کر اپنے بیوی بچوں کو دے دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید دو اور اس کو میرے پاس لے کر آؤ، انھوں نے ایسا ہی کیا اور کلہاڑی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے اس کلہاڑی میں لکڑی کا ایک دستہ خوب مضبوط لگا دیا اور ان سے فرمایا جاؤ اور جنگل کی لکڑیاں لا کر بیچو اور اب میں پندرہ ۱۵ دن تک تم کو نہ دیکھوں (یعنی دو ہفتہ تک یہی کام کرو اور میرے پاس آنے کی بھی کوشش نہ کرو) چنانچہ وہ صاحب چلے گئے اور آپ کی ہدایت

کے مطابق جنگل کی لکڑیاں لا لا کر بیچتے رہے، پھر ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنی محنت اور لکڑی کے اس کاروبار سے دس درہم کما لیے تھے۔ جن میں سے کچھ کا انھوں نے کپڑا خریدا اور کچھ کا غلہ وغیرہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا، اپنی محنت سے یہ کمانا تمھارے لیے اس سے بہت ہی بہتر ہے کہ قیامت کے دن لوگوں سے مانگنے کا داغ تمھارے چہرہ پر ہو۔ (پھر آپ نے فرمایا) سوال کرنا صرف تین قسم کے آدمیوں کے لیے درست ہے۔ ایک وہ آدمی جسے فقر و فاقہ نے زمین سے لگا دیا ہو اور بالکل لاچار کر دیا ہو۔ دوسرے وہ جس پر قرض یا کسی ڈنڈ کا بھاری بوجھ ہو (جس کی ادائیگی اُسکے امکان میں نہ ہو) تیسرے وہ جس کو کوئی خونبہا ادا کرنا ہو اور وہ اُسے ادا نہ کر سکتا ہو۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح) یہ حدیث کسی تشریح کی محتاج نہیں، افسوس جس پیغمبر کی یہ ہدایت اور یہ طرزِ عمل تھا، اُس کی اُمت میں پیشہ ور سائلوں اور گداگروں کا ایک طبقہ موجود ہے اور کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو عالم یا پیر بن کر معزز قسم کی گداگری کرتے ہیں۔ یہ لوگ سوال اور گداگری کے علاوہ فریب دہی اور دین فروشی کے بھی مجرم ہیں۔

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۱۸)۔ سیادت پناہ میر محمد نعمان اکبر آبادی کے نام۔

[ماسوا سے بے تعلقی اور صحبت طالبانِ حق کی ترغیب
(انداز تحریر میں محسوس ہوتا ہو کہ یہ مکتوب بھی بحالت قید و نظر بندی لکھا گیا ہے]

اللہ تعالیٰ کا شکر ہو ہر حال میں ہمیشہ، خوشحالی میں اور تنگ حالی میں بھی ——— صحیفۂ شریفہ مع ہدیہ جو سلیمان کے ہاتھ روانہ کیا تھا پہونچا جزاکم اللہ خیراً ——— تم نے لکھا تھا کہ اس سفر (سفر آگرہ) سے مقصود بعض مقاصد کا حاصل کرنا تھا جن کا حصول مشکل ہو گیا ہے ——— تم کو حصول مقصد کا امیدوار رہنا چاہئے۔ (قرآن مجید میں ہے) فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (بیشک دشواری سے متصل آسانی ہے بیشک دشواری سے متصل آسانی ہے) ——— حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "ایک عُسر دو یُسر پر ہرگز غالب آئے گا" یعنی قرآن کی اس آیت میں ایک عُسر کے ساتھ دو یُسر بتائے گئے ہیں۔ یہ اشارہ ہو اس جانب کہ حالت (سختی) حالتِ یُسر (آسانی) سے ضرور تبدیل ہوگی) اپنے ہولناک حالات کو کیا لکھوں اور کیوں

دوستوں کو بے مزہ اور بے لطف کروں ـــــ پھر بھی خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہو کہ عین بلا میں عافیت (نصیب) ہے ـــــ وہ ذات پاک اور منزہ ہے جس نے ضدین (بلا اور عافیت) کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ـــــــ ایک دن فقیر، تلاوت قرآن مجید کر رہا تھا (تلاوت کرتے کرتے) یہ آیت آئی۔ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَاؤُکُمْ وَ اَبْنَاؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَ مَسَاکِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ.

(کہہ دیجئے اے رسول اگر تم کو تمھارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتے دار اور وہ اموال جن کو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تم کو خوف ہو اور وہ مکانات جنکو تم پسند کرتے ہو (یہ سب چیزیں) زیادہ محبوب ہیں اللہ اور اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ عقوبت نازل کرے ـــــ اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا) اس آیت کے پڑھنے پر گریہ وزاری کا غلبہ ہوا اسی اثناء میں اپنے حال کا جائزہ لیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ میں اس آیت میں ذکر کی ہوئی چیزوں میں سے کسی کے اندر گرفتار نہیں ہوں (اور اپنے دل میں یہ جذبہ پایا کہ) اگر یہ تمام چیزیں تلف و ہلاک ہو جائیں تب بھی ایسے امر کو روا نہ رکھوں گا جس کا کرنا شریعت میں منکر و قبیح ہے ـــــــ اور اس امر کو ان امور مذکورہ (خدا و رسول اور جہاد وغیرہ) پر (ہرگز) ترجیح نہ دوں گا ـــــــــ

علاوہ اس کے یہ بات لکھنی ہے کہ چونکہ ہمارے دوست (طالبین) خدا کے واسطے ہم سے صحبت و ہمنشینی رکھتے ہیں اس لئے ہم کو چاہیئے کہ اُن کو اچھی طرح رکھیں اور اُن کے احوال ظاہر باطن سے خبردار رہیں ـــــ مشہور حدیث قدسی ہے یَا دَاوٗدُ اِذَا رَاَیْتَ لِیْ طَالِبًا فَکُنْ لَهٗ خَادِمًا (اے داؤد! جب تم ہمارا کوئی طالب دیکھو تو اُسکی (دینی) خدمت کرو) ـــــــــ

اس تحریر کے بعد تم دوستوں کی طرف اُس سے زیادہ توجہ کرنا جتنی سابق میں توجہ کرتے تھے ـ بے پرواہی اور تغافل کو بالکل روا نہ رکھنا ـــــــ اللہ تعالےٰ سے تمھارے حق میں سلامتی عافیت، ثابت قدمی، استقامت دین، زیادتی توفیق اور حسن عاقبت مطلوب ہے ــــــ والسلام ـ

مکتوب (۱۹) ۔ سیادت پناہ میر محمد نعمان اکبرآبادی کے نام (بزبان عربی) [صبر و رضا کے بیان میں بحالت قید و بند]

اللہ رب العلمین کی حمد ہے ہر حال میں خواہ خوشحالی ہو یا تنگ حالی، خواہ عافیت ہو خواہ بلا ۔۔۔ حکیم کا فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا ۔۔۔ شاید اللہ تعالیٰ نے (ہماری اس مصیبت سے) ہماری بہتری کا ارادہ فرمایا ہو (چنانچہ اُس کا ارشاد ہے) عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (بعید نہیں کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ بہتر ہو تمھارے لئے اور (اسی طرح) بعید نہیں کہ تم پسند کرو ایک چیز کو حالانکہ وہ بری ہو تمھارے حق میں بس (حقیقت حال اور انجام کار) اللہ تعالیٰ جانتا ہے تم نہیں جانتے) ۔۔۔ اُسکی بھیجی ہوئی بلا پر صبر کرو اور اس کے فیصلے پر راضی ہو۔ اُسکی اطاعت پر ثابت قدم رہتے ہوئے اُسکی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ "ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور ہم سب کو اُسی کی طرف جانا ہے" اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ ۔۔۔ (یعنی جو مصیبت تم کو پہونچتی ہے وہ تمہارے (غلط) اعمال کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ تمھاری بہت سی خطاؤں سے تو درگزر فرماتا رہتا ہے) پس اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اس کی جناب میں استغفار کرو اُن اعمال کے متعلق جو تمھارے ہاتھوں نے کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے عفو و عافیت کو مانگو اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا ہے اور معافی دینے کو پسند کرتا ہے اور حتی الامکان تکلیف و مشقت سے بچو کیونکہ جو تکلیف و مشقت برداشت نہ ہوسکے اس سے بچنے کی کوشش کرنا اور حتی الوسع اس سے دور رہنا انبیاء علیہم السلام کی عادات سے ہے ۔ (رہا ہمارا حال سو) ہم تو عین بلا میں مع العافیت ہیں۔ پس اللہ کی حمد ہے اور اس کا شکر ہے ۔

والسلام علیکم وعلیٰ سائر من اتبع الھدیٰ والتزم متابعة المصطفیٰ علیه وعلیٰ اٰله الصلوات والتسلیمات العلیٰ۔

مکتوب (۲۰) ۔ مولانا امان اللہ کے نام [بلند ہمتی کے بیان میں]

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ برادرم شیخ امان اللہ کا خط ملا۔ احوال و مواجید جو لکھے تھے اُن سے آگاہی حاصل ہوئی ـــ تم سے تو ان امور (احوال و مواجید) سے زیادہ کی توقع ہے ـــ جو کچھ عطا فرمائیں وہ ادب اور احسانمندی کے ساتھ قبول کر لینا چاہیئے ـــ مگر تفرع زاری اور التجا اور انکسار کے ساتھ ہل من مزید کا نعرہ لگاتے ہوئے طلب مزید اور سوالِ مقام بلند کرنا چاہیئے ـــ احکام شرعیہ کی بجاآوری میں خوب اچھی طرح اہتمام کیا جائے اس لئے کہ شریعت پر استقامت ہونا حالات کے صحیح ہونے کی دلیل ہو ـــ

عالم مثال کے واقعے کی جو تعبیر لکھی تھی وہ ٹھیک ہے ـ حقیقت امر اللہ کے سپرد ہے ـــ چونکہ تم ہماری صحبت میں بہت رہے ہو اور اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری نظر بھی بہت بلند واقع ہوئی ہو (اس لئے تم کو نصیحت ہو کہ اب) تم بچوں کی طرح اخروٹ اور انگور خشک پر مائل نہ ہو جانا اللہ تعالیٰ بلند ہمتی کو پسند کرتا ہے ....

مکتوب (۴۲) مُلّا مقصود علی تبریزی کے نام ـــ

[اس بیان میں کہ نجاست مشرکین سے مراد اُن کا خبث باطن اور سوءِ اعتقاد ہو نہ اُن کا نجس العین ہونا]

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ مخدوما شفقت آثارا! یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تفسیر حسینی کے بھیجنے سے تمہارا مقصود کیا تھا ـ صاحب تفسیر حسینی (کمال الدین حسین واعظ کاشفی) نے تو یہ آیت کریمہ انما المشرکون نجسٌ کی تفسیر موافق ائمہ حنفیہ کی ہو اور نجاست مشرک سے اُن کی خباثتِ باطنی اور بد اعتقادی مُراد لی ہو اور اس کے بعد یہ لکھا ہو کہ "مشرکین نجاسات ظاہری سے پرہیز نہیں کرتے" ـــ اور یہ بات تو بہت سے اہل اسلام میں بھی آج کل موجود ہو (کہ وہ نجاسات ظاہری سے پرہیز نہیں کرتے) اس لحاظ سے بہت سے عوام اہل ایمان اور کفار کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے پس اگر کسی کا نجاست سے پرہیز نہ کرنا اسکی نجاست کا سبب بن جائے تو پھر معاملہ بہت تنگ ہو جائے گا اور اسلام میں تنگی ہے نہیں ـــ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ "مشرکین مانند سگ نجس العین ہیں"

اس قسم کے اقوال شاذ ہیں اور اکابر دین سے بہت منقول ہیں ان کی تاویل و توجیہ کیجاتی ہو ــــ بھلا وہ نجس العین کیسے ہو جائیں گے جب کہ سرورِ دین صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی کے یہاں کھانا تناول فرمایا ہو اور ایک مشرکہ کے برتن سے وضو فرمایا ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی ایک نصرانیہ کے برتن سے وضو کیا ہو ــــ اگر یہ کہا جائے کہ آیت کریمہ انما المشرکون نجس ــــ ہو سکتا ہو کہ بعد کو نازل ہوئی ہو اور (پہلے عملدرآمد کی) ناسخ ہو۔ اس کا جواب یہ ہو کہ یہاں یہ کہدینا کافی نہیں کہ "ہو سکتا ہو بعد کو نازل ہوئی ہو" بلکہ بعدیت کا ثبوت مہیا کرنا ہوگا تاکہ دعویٰ نسخ صحیح ہو جائے۔ اسلئے کہ مدمقابل کو گنجائش ہو کہ وہ تاخر کو (بلا ثبوت) تسلیم نہ کرے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ آیت بعد میں اُتری ہو تب بھی حرمت کو ثابت کرنے والی نہ ہوگی ــــ اور نجاست سے مراد خبث باطن ہی ہوگا اسلئے کہ یہ بات منقول ہو کہ کوئی پیغمبر کبھی کسی ایسے امر کا مرتکب نہیں ہوا جو آخر کار اُس کی شریعت میں یا کسی نبی کی شریعت میں درجۂ حرمت تک پہونچا ہو (یعنی) آخر میں وہ حرام ہو گیا ہو اگرچہ ارتکابِ عمل کے وقت مباح ہو۔ شراب کو دیکھو کہ اوّل مباح تھی اور آخر میں حرام ہوئی ــــ کسی پیغمبر نے اس کو نہیں پیا۔ اگر مشرکوں کا مآل کار نجاست ظاہری قرار پاتا اور وہ نجس العین ہوتے تو سرورِ دین محبوب رب العلمین صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے برتنوں کو ہاتھ تک نہ لگاتے چہ جائیکہ اُن سے آپ طعام کو استعمال فرمائیں ــــ علاوہ ازیں نجس العین ہر وقت نجس العین ہو اُس میں اِباحت سابق و لاحق کی گنجائش ہی نہیں اگر مشرک نجس العین ہوتے تو چاہئے تھا کہ ابتدا ہی سے ایسے ہوں اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم (شروع ہی سے) اُس کے مطابق اُن سے معاملہ فرماتے (اُن کے برتنوں سے بھی پرہیز فرماتے) جب ایسا نہیں ہوا تو وہ نجس العین بھی نہیں ــــ پھر یہ بھی تو ہو کہ دین میں تنگی و دشواری نہیں رکھی گئی تم اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ اُن کی نجاست کا حکم لگانا اور ان کو نجس العین قرار دینا مسلمانوں کے حق میں کس قدر تنگی و دشواری پیدا کرنا ہے ــــ ائمہ حنفیہ کا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لئے چھٹکارے کی ایک راہ نکالدی ہے اور ارتکابِ حرام سے بچا لیا ہے ــــ نہ کہ اُلٹا اُن پر طعنہ کسا جائے اور اُن کے ہنر کو عیب شمار کیا جائے ــــ مجتہد پر اعتراض کا کیا موقع ہے اس کی خطائے اجتہادی

بھی ایک درجہ ثواب رکھتی ہے اور اس کی تقلید بصورت خطائے اجتہادی بھی موجب نجات ہے ـــــــ جو لوگ کفار کی اشیاء خوردنی و نوشیدنی کی حرمت کے قائل ہیں از روئے عادت محال ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُن کی اِن چیزوں سے محفوظ رکھ سکیں خصوصاً ملک ہندوستان میں کہ یہاں یہ مجبوری بہت زیادہ ہے ـــــ یہ مسئلہ عموم بلوی کا حکم رکھتا ہے ایسے مسئلوں میں احتیاط یہی ہے کہ کسی نہ کسی مجتہد کے قول پر سہل و آسان بات کا فتویٰ دیا جائے ـــ چاہے وہ اپنے مسلکِ فقہی کے مطابق نہ ہو ـــ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالےٰ تمھاری آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا) ـــــ دوسری جگہ فرمایا ہے يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (اللہ تعالےٰ تمھارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے اور انسان تو پیدائشی طور پر ضعیف واقع ہوا ہے) ـــــــ (خواہ مخواہ سخت فتویٰ دیکر) مخلوق خدا کو تنگی میں ڈالنا اور پریشان کرنا حرام ہے اور حضرت حق جل مجدہٗ کے نزدیک غیر پسندیدہ فعل ہے[1] ـــــــ شافعیہ بعض ایسے مسائل میں جن میں حضرت امام شافعیؒ کے یہاں (کچھ) سختی ہے ـــــ مذہب حنفیہ کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور اللہ کے بندوں کے لئے آسانی کرتے ہیں ـــــ مثلاً مصارف زکوٰۃ کے بارے میں امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم تمام اقسام مصارف زکوٰۃ میں تقسیم کرنا چاہیئے اُن مصارف میں سے ایک مولفۃ القلوب (جن کی تالیفِ قلب مدنظر ہوتی ہے) بھی ہیں اور یہ قسم اس وقت مفقود ہے لہذا علماء شافعیہ نے مذہب حنفیہ کے مطابق فتویٰ دیا ہے اور یہ کافی سمجھا ہے کہ ان مستحقینِ زکوٰۃ کی اقسام میں سے کسی ایک قسم کو زکوٰۃ دیدی جائے ـــــــ مُشرکین اگر نجس العین ہوں تو اس سے لازم آتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی پاک نہ ہوں (حالانکہ ایسا نہیں ہے) پس معلوم ہوا کہ اُن کی نجاست خباثتِ اعتقاد کی بنا پر ہے اور یہ نجاست (ایمان لانے سے) زائل ہو سکتی ہے ۔

---

[1] حضرت مجددؒ نے یہ جو اصولی بات یہاں فرمائی ہے۔ اس میں ہمارے اصحاب فتویٰ کے لئے بڑی روشنی ہے، اور ضرورت ہے کہ جن معاملات میں تغیر حالات کی وجہ سے امت کو سخت تنگی پیش آرہی ہو اور بعض دوسرے ائمہ مجتہدین کے مسلک کو اختیار کرکے یہ تنگی دور ہو سکتی ہو۔ اُن پر حضرت مجددؒ کی اس رہنمائی کی روشنی میں غور کیا جائے ـــ محمد منظور نعمانی

اور یہ نجاست، باطن تک ہی محدود ہے اور محل اعتقاد (صرف) باطن ہے ——— نجاست درونی کا طہارت بیرونی سے کوئی تضاد نہیں (نجاستِ باطنی، طہارت ظاہری کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے) اور یہ ایک ایسی موٹی بات ہو کہ ہر خاص و عام جانتا ہے ——— اور یہ بھی ہو کہ آیۂ کریمہ انما المشرکون نجسٌ حالِ مشرکین کی خبر دیتی ہے خبر میں ناسخیت و منسوخیت کا کوئی دخل نہیں ہے نسخ تو انشاءِ حکم شرعی (اوامر و نواہی) میں ہوتا ہے نہ کہ کسی شے کی خبر دینے میں۔ پس ایسا مطلب لینا چاہیئے کہ مشرکین ہمہ وقت نجس قرار پائیں ——— اور (یہ جب ہوگا کہ) نجاست سے مراد، خبث و نجاستِ اعتقاد ہو (نہ کہ نجاست ظاہری) تاکہ دلائل میں تعارض نہ ہونے پائے ——— اور مشرکین کا کسی شے کا چھو دینا ممنوع نہ ہو ———

ایک روز اس فقیر نے یہ آیت، طعام الذین اوتوا الکتٰب حل لکم۔ (اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لئے حلال ہے) (تمہاری موجودگی میں) اس بحث کے سلسلے میں پڑھی تھی تم نے اس وقت کہدیا تھا کہ یہاں طعام سے مراد گیہوں، چنا، مسور (وغیرہ غلہ) ہے اگر اس توجیہ کو اہل عرف (ماہرین عرف) پسند کریں تو کیا مضائقہ ہے لیکن انصاف کی ضرورت ہو ——— اس تکلیف دہی اور اس طول کلام سے مقصودِ اصلی یہ ہو کہ مخلوق پر رحم کرو، مشرکین کے حق میں عموم نجاست کا حکم نہ لگاؤ اہل اسلام کو، اختلاطِ کفار کی وجہ سے جس کے بغیر چارہ کار نہیں نجس نہ جانو مسلمانوں کے کھانے پینے کی چیزوں سے وہمی نجاست کی بناپر اجتناب نہ کرو اور اس (بیجا) اجتناب و احتیاط کو احتیاط نہ سمجھو بلکہ اس مسئلے میں احتیاط تو ترکِ احتیاط ہی میں ہو ——— زیادہ کیا تکلیف دوں۔

سہ اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم ﴿ ﴾ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است ———

والسلام ———

علہ میں نے اپنا غم دل تیرے سامنے تھوڑا سا بیان کیا ہے۔ مجھے تیرے رنجیدہ ہونے کا خوف ہوا ورنہ کہنے کے لئے ——— (ابھی) باتیں بہت کچھ باقی ہیں ———

تجدّد و مغرب زدگی کے اسباب

اور اُن کا علاج

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیرِ طبع تازہ تالیف "اسلامی ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کا ایک اہم باب

(۲)

مغربی مستشرقین اور ان کی تحقیقات و افکار کا اثر

موجودہ عالم اسلام کے رہنما و حکمراں طبقہ کے (جس نے عام طور پر اعلیٰ مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے، یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے) ذہنوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بیزاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، اسلام و پیغمبر اسلام اور اسلامی مآخذ (Sources) کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور "اصلاح مذہب" "اصلاح قانون اسلامی" کے اس طرز پر آمادہ کرنے میں جس کا نمونہ اوپر گزر چکا ہے، بہت بڑا حصہ اُن علمائے مغرب کا ہے جنھوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین (Oreintalists) کہا جاتا ہے۔ اور جو اپنے علمی تبحر، تحقیقی انہماک اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی و سیاسی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان مشرقی اسلامی مباحث و مسائل میں ان کی تحقیق و نظریات کو حرفِ آخر اور قولِ فیصل سمجھا جاتا ہے۔

اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ واضح طریقہ پر تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوجاتی ہے۔ اس کے محرکات دینی بھی تھے، سیاسی بھی، اقتصادی بھی، دینی محرک واضح ہے اس کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لیے مسیحیت میں کشش پیدا ہو، چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے۔

سیاسی محرک یہ ہے کہ یہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہراول دستہ (Pioneers) رہے ہیں، مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہونچانا ان کا کام ہے، وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق ماند و بود، اور زبان و ادب، بلکہ جذبات و نفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہونچاتے ہیں۔ تاکہ ان پر اہل مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان خیالات و تحریکات، عقائد و خیالات کا "توڑ" کرتے رہتے ہیں جو ان حکومتوں کے لیے پریشانی اور دردسر کا باعث ہیں اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے اسکے بالمقابل انکی تہذیب کی عظمت اور انکی خدمات کی وقعت پیدا ہو اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقش قدم پر لے چلنے کا دیا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی، اور اسی مقصد کے ماتحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام سے متعلق مختلف رسائل اور مجلات شائع کرتے ہیں جن میں عالم اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ تبصرہ اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں، اس وقت بھی رسالہ شرق اوسط (Journal of Near East) اور مجلہ عالم اسلامی (The Muslim World) امریکا سے اور (Le monde Musalmans) فرانس سے نکل رہے ہیں۔

ان اہم مذہبی و سیاسی محرکات کے علاوہ قدرتی طور پر استشراق کا ایک محرک اقتصادی

بھی ہے، بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں، بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں، یورپ اور ایشیا میں بڑی منڈی ہے، اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں اور بڑی سرعت کے ساتھ یورپ و امریکا میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بہت بڑی مالی منفعت اور کاروبار کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔

ان مقاصد کے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فضلاء مشرقیات و اسلامیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے ماتحت بھی اختیار کرتے ہیں، اور اس کے لیے اس دیدہ ریزی، دماغ سوزی اور جفاکشی سے کام لیتے ہیں، جس کی داد نہ دینا ایک اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے ان کی مساعی سے بہت سے مشرقی و اسلامی علمی جواہرات و نوادر پردۂ خفا سے نکل کر منظر عام پر آئے اور جاہل وارثوں اور ظالم کیڑوں کی دست برد سے محفوظ ہو گئے، متعدد اعلیٰ اسلامی مآخذ اور تاریخی وثائق ہیں جو انہی کی محنت و ہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے[۵] اور مشرق کے اہل علم نے دیدہ و آنکھوں کو ان سے روشن کیا۔

اس علمی اعتراف کے باوجود اس کے کہنے میں باک نہیں کہ مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے جس نے قرآن و حدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا، بلکہ اس سے اس کا عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں، عام طور پر ان مستشرقین کا مقصد کمزوریوں کا تلاش کرنا اور دینی یا سیاسی مقاصد کے ماتحت ان کو نمایاں کرنا اور چمکانا ہوتا ہے چنانچہ صفائی کے انسپکٹر کی طرح ان کو ایک گلزار و جنت نشان شہر میں صرف غیر صحت مند مقامات ہی نظر آتے ہیں۔

---

[۵] طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ کامل ابن اثیر، انساب سمعانی، فتوح البلدان بلاذری، کتاب الہند للبیرونی وغیرہ پہلی مرتبہ یورپ سے شائع ہوئیں پھر ان کے متعدد ایڈیشن مصر سے نکلے۔

مستشرقین کی محرومی صرف ان کی ذات تک محدود نہیں، اگر تنہا یہ پہلو ہوتا تو وہ ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری اس بحث کا موضوع نہ ہوتا۔ مسئلہ کا زیادہ سنگین اور دور رس پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول و غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشان دہی اور ان کو نہایت مہیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ خوردبین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دوربین سے دکھاتے ہیں۔ رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ اپنے اس کام میں (یعنی اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں) اس چابک دستی، ہنرمندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں اور ایک بات طے کر لیتے ہیں کہ اسکو ثابت کرنا ہے۔ پھر اس مقصد کے لیے ہر طرح رطب و یابس مذہب و تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری، مستند و غیر مستند ذخیرہ سے مواد فراہم کرتے ہیں اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآری ہوتی ہو (خواہ وہ صحت و استناد کے اعتبار سے کتنا ہی مجروح و مشکوک و بے قیمت ہو) اس کو بڑے آب و تاب سے پیش کرتے ہیں اور اس متفرق مواد سے ایک نظریہ کا پورا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا اجتماعی وجود صرف ان کے ذہن میں ہوتا ہے، وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے اور اس کو دماغوں میں بٹھانے کے لیے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے کا ذہن ان کے انصاف، وسعت قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک برائی کو (جو تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے) قبول کر لے، وہ کسی شخصیت یا دعوت کے ماحول، تاریخی پس منظر، قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے کھینچتے ہیں (خواہ وہ محض خیالی ہو) کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جائے اور اس کے نتیجے میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی ردعمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے، اور اس کی عظمت و تقدیس اور کسی غیر انسانی سرچشمہ سے اس کے اتصال و تعلق کا منکر بن جاتا ہے، اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں "زہر" کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کر دے، ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے۔

قرآن، سیرت نبوی، فقہ و کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہا، مشائخ و

صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو (جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو) پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہے، اس کا علمی جائزہ لینا ان کی تحریفات، فنی غلطیوں اور ان کے دجل و تلبیس کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے جس کے لیے ایک تنظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو وہ اپنے پڑھے لکھے حوصلہ مند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول کرتا چلا جاتا ہے، اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی "اصلاح و ترقی" کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے اور ان کی نوعیت کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطور اقتباس پیش کرتے ہیں جو ایک مصری فاضل (ڈاکٹر محمد البہیؒ[1]) نے اپنی فاضلانہ کتاب "الفکر الاسلامی الحدیث" میں پیش کیا ہے اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدر مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے:

"اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی، یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جبکہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دور طفولیت میں تھا اس ابتدائی حالت اور دور طفولیت نے اس کا موقعہ دیا کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا، کلچرل، سیاسی، اقتصادی اور دوسرے خارجی محرکات و عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر زندگی جتنی تبدیل ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی اتنا ہی

---

[1] سابق ڈائرکٹر شعبۂ ثقافت اسلامی حکومت مصر و حال وزیر اوقاف جمہوریہ عربیہ متحدہ۔

اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا، یہ خلیج برابر وسیع ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ خلافت اسلامی کے آخری مرکز (جدید ترکی) نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب عام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا اور اب اسکی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی اور یہ فرد بغیر کسی اعلان اور جوش کے اپنی ذات کے لیے اس کا اظہار کر سکے گا۔[۵۱]

اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا، اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے اور یہ نتیجہ ہے روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا، اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانے میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے، تمدن جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں، مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے، یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے اس لیے وہ اس بات کا نمونہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔[۵۲]

تغیر و ترقی جو زندگی کا ایسا عام قانون ہے جس سے مفر نہیں، مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ جدید مغربی دنیا کے قدم بقدم چل سکیں اور کمزوری و بدنظمی کے اسباب سے نجات پا سکیں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں، ملت اسلامی کو بھی تغیر و ترقی کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی میں مغربی معیار (Ideal)

---

۵۱ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۱۸۱، ۱۸۲ ۵۲ ایضاً ص ۱۸۲۔

کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس سے متاثر ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ فکر و زندگی کے میدان میں اہل مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ ہیں۔
اہل مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور سائنٹیفک طریقہ استعمال کیا، یہ طریقہ اوہام و خرافات اور مخصوص عقاید سے متاثر نہیں ہوتا، اس کے پیش نظر صرف انسانیت کی فلاح ہوتی ہے۔[1]

مستشرقین کے طریق کار میں ایک خطرناک تبدیلی

تقریباً ڈیڑھ دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے محسوس کیا کہ ان کے طریق کار میں ایک بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کی جدو جہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا، اور بعض اوقات اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید ردعمل اور اشتعال پیدا ہو جاتا تھا جو تبلیغی و دعوتی نقطۂ نظر سے خطرناک تھا۔ وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے۔ اب ان نتائج کی روشنی میں انھوں نے طے کیا کہ ان کو اپنے رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔ اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کی جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاح مذہب (Reform) کی تحریک چلانی چاہیے۔ اور جہاں جہاں تجدد و اصلاحِ مذہب کی تحریک چل رہی ہے اس کی ہمت افزائی اور تائید کرنی چاہیے اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریق کار کی حسب ذیل اقتباس سے بخوبی نشان دہی ہوتی ہے HARRY GAYLORD DORMAN اپنی کتاب TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM میں لکھتا ہے۔

"اصلاحی تحریکیں دینی تعلیمات کی موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سر نو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوششیں ہوتی ہیں۔ یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس لیے وہ (مسیحیت کے) ایک مبلغ کے لیے اولین اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہر

---

[1] الفکر الاسلامی الحدیث صد ۱۳۲۔

نئی تحریک جس کو کہ چند خبلی شروع کردیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ ہماری مراد اُن تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہے اور پھیلتی جارہی ہے اور جس میں روحانی قوتیں حقائق سے برسرِ پیکار ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلے میں بالآخر بڑی اہم ثابت ہو۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح و احیاء سے زیادہ خود اسلام کی تجدید و احیاء[1] ہو۔ بہرحال یہ کام کا ایک میدان ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی، یہ میدان کھلا ہوا ہے۔ یہ اُن معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"[2]

اس نصف صدی کے اندر عالمِ اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدد و مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے اُن کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریقۂ کار میں مستشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین و زعما کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے، اور اس کو ان کا مشترک منشور (MANIFESTO) کہا جاسکتا ہے۔

---

[1] یہ تجدید و احیاء ظاہر ہے کہ ان مستشرقین کے اصول و معیار کے مطابق ہی ہوگا۔ اور یہ درحقیقت تجدید کے بجائے تحریف و تجدد کا عمل ہے جو تقریباً تمام اسلامی ممالک میں شروع ہوگیا ہے۔

[2] HARRY GAYLORD DORMAN
TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM P.125 PUBLISHED BY
BUREAU OF PUBLICATION LEACERS COLLEGE COLUMBIA
UNIVERSITY NEW YORK 1948

ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اصول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہو جائے۔ کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ایک طرف انھوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت و دقیانوسیت کا مرادف قرار دیا، دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انھوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سیکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہونچانے اور جاہلیت قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، چنانچہ انہی کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردانِ رشید کے ذریعہ مصر میں "فرعونی" عراق میں "آشوری" شمالی افریقہ میں "بربری" فلسطین و لبنان کے ساحل پر فینیقی تہذیب و زبان کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں اور ان کے مستقل داعی پیدا ہو گئے۔ انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شد و مد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ قرآنی عربی زبان "فصحیٰ" اس زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس کے بجائے عامی (CLOCKER) اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہیے۔ اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہیے، یہ بات انھوں نے اتنی خوبصورتی سے اور اتنے بار کہی کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحب قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی[1] جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہر ملک اور ہر صوبہ کی الگ

---

[1] سلامہ موسیٰ اس تحریک کا خاص علمبردار ہے۔ محمد حسین ہیکل، احمد امین اور احمد حسن الزیات بھی جزوی طور پر اس کے حامی تھے۔

الگ زبان ہوجائے، قرآن مجید اور اسلامی ادب سے عرب قوموں کا رشتہ کٹ جائے اور وہ اُن کے لیے ایک اجنبی زبان بن جائے، عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کردے اور عرب اس پورے دینی سرمایہ اور ... سے محروم ہوکر الحاد وارتداد اور اختلاف وانتشار کے نذر ہوجائیں۔

اسی طرح انھوں نے عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط (ROMAN CHA-RACTER) کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کیے۔ اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ پوری عرب قوم صحیح طور پر قرآن مجید پڑھنے سے محروم و ناآشنا ہوجائے اور وہ پورا علمی ذخیرہ (جو اپنی وسعت اور علمی قیمت میں بے نظیر ہے) بے معنی اور بیکار ہو کر رہ جائے۔

ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے حقیقی مقاصد و خیالات ان کی دوربینی اور ان کی اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان میں سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی ہیں، اسلامیات کے سرچشموں (بشمول حدیث و فقہ) کو مشکوک قرار دیتی ہیں۔ مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار اور تشکک وارتیاب پیدا کرتی ہیں، اسلام کے حاملین شارحین (محدثین و فقہا) کی علمیت و ذہانت کی طرف سے متشکک بناتی ہیں۔ فاحش علمی غلطیوں، مضحکہ خیز غلط فہمیوں، زبان و قواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن ان کی اکثر و بیشتر تصنیفات مغربی و مشرقی دنیا میں مقبول ہیں، نیا تعلیم یافتہ طبقہ (جس میں سن رسیدہ اہلِ علم کی بھی ایک تعداد شامل ہے) اس کی حسن ترتیب، طرز استدلال، نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی (سائنٹیفک) طریقے سے مرعوب و مسحور ہے اور اس کی تشفی خالص علمائے مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی، مغربی علمائے مشرقیات جس وقعت و اعتماد کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور انھوں نے مشرق میں جو مقام حاصل کرلیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی تینوں موقر مجالس علمیہ (ACADEMIES) المجمع اللغوی (مصر) المجمع العلمی العربی (شام) المجمع اللغوی العراقی (بغداد) میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے اور اُن کے مطالعہ و آراء سے استفادہ کیا

جاتا ہے۔ عالم اسلام اور عالم عربی کی بے مائگی و کم ہمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خالص اسلامی و عربی موضوعات پر بھی عرصہ دراز سے مستشرقین ہی کی کتابوں پر دار و مدار ہے اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتاب مقدس (GOSPEL) کی حیثیت رکھتی ہیں، تاریخ ادبیات عرب پر نکلسن (R.A. NICHOLSON) کی کتاب (A LITRARY HISTORY-) تاریخ عرب و اسلام پر ڈاکٹر ہٹی (P.H. HITTI) کی کتاب (HISTORY OF ARABS) تاریخ ادبیات اسلامیہ پر بروکلمان (CARL BROCKELMAN) کی کتاب (GESCHICHTE DER ARAB-ISCHEN LITTE-RATURE) جرمن میں اور اس کا انگریزی ترجمہ (THE HISTORY OF ARAB LITRARY) اسلامی قانون پر شاخت (SCHACHT) کی کتاب (THE ORI-GINS OF MOHAMMADEN JURISPRUDENCE) اپنے اپنے موضوع پر منفرد سمجھی جاتی ہے۔ اور بیشتر مشرقی جامعات میں شعبۂ عربی و اسلامیات میں ان کی حیثیت ایک علمی مرجع (REF-ERENCE BOOK) اور سند (AUTHORITY) کی ہے۔ مستشرقین کا مرتب کیا ہوا دائرۃ المعارف الاسلامیہ (ENCYCLOPEDIA OF ISLAM) جس کے متعدد ایڈیشن یورپ و امریکا سے نکل چکے ہیں، اور جس میں برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہے، اسلامی معلومات و حقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے اور مصر و پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی و تشکیکی اثرات کو روکنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین و اہل نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابل تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں مستند و صحیح اسلامی معلومات اور نقطۂ نظر پیش کریں، یہ ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (ORIGNALITY) مطالعہ کی وسعت نظر کی گہرائی اور عمق، ماخذ کے استناد و صحت اور اپنے محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق و ممتاز ہوں۔ ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں اور وہ ان کی کمزوریوں اور عیوب سے پاک ہوں، دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے، اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب

کیا جائے، متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ واخذ مطلب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے، ان کے ماخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کیے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے، اور ان کی دعوت و تلقین میں ان کی جو بدنیتی، مذہبی اغراض اور سیاسی مقاصد شامل ہیں ان کو طشت از بام کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔

اس پہلے مثبت و ایجابی کام (اسلامی موضوعات پر تصنیف) اور اس دوسرے سلبی و جوابی جز (علمی محاسبہ) کے بغیر دنیائے اسلام کا ذہین و حوصلہ مند طبقہ جو یورپ وامریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے اور مغربی زبانوں ہی میں جن میں وہ زیادہ مہارت رکھتا ہے) اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، مستشرقین کے زہرآلود خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا، اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہو اسلامی ممالک برابر فکری انتشار اور ذہنی ارتداد کے خطرے سے دوچار رہیں گے اور ان ممالک میں تجدد و مغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے جو اسلام کی روح کے منافی ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں جو صرف نسل و قومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے جس کا رخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہو۔ جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلام کے ان فضلاء اور رہنماؤں سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ میروی بترکستان است

جماعت اسلامی کا ردِ عمل

(از جناب وحید الدین خاں صاحب)

اس عنوان کے تحت "پچھلے مہینے میں نے شکایت کی تھی کہ محترم مدیر زندگی نے میری کتاب "تعبیر کی غلطی" کے ایک حصہ پر تنقید کرتے ہوئے اقامت کے ترجمے کو اس طرح پیش کیا ہو گویا یہی میرے متعلقہ اعتراض کی بنیاد ہے۔ حالانکہ اصل مسئلہ زیر بحث آیت میں الدین کا مفہوم متعین کرنے کا تھا۔ اب میں اپنی اس شکایت کو واپس لے رہا ہوں۔ کیونکہ زندگی کی اگلی اشاعت میں موصوف نے اس پر بحث کی ہے کہ اقیموا الدین کی آیت میں الدین سے کیا مراد ہے۔

موصوف نے "واضح دلائل" (صفحہ ۸) کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ میں نے اس آیت میں الدین کی جو تشریح کی ہے وہ:

لغو بات ہے۔ (صفحہ ۲)

انتہائی غلط بات ہے۔ (صفحہ ۸)

مجھے اس سے توبہ کرنی چاہیئے۔ (صفحہ ۲)

یہ تحریر مجھے ۲۰ اکتوبر کی شام کو ملی۔ اس کے بعد میں نے وضو کرکے دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھی اور دعا کرکے مضمون کا مطالعہ کیا۔ مگر پہلی بار کچھ سمجھ میں نہیں آیا، اس کے بعد میں نے اسکو بار بار پڑھا اور اپنی حد تک پوری دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ موصوف کا استدلال کیا ہے، مگر افسوس کہ مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ استدلال میرے لیے اتنا عجیب تھا کہ میں یہ سوچنے لگا کہ آخر اس یقین کا منبع کیا ہے۔ کیونکہ جہاں تک مطبوعہ استدلال کا تعلق ہے۔

اس میں تو مجھے اس یقین کا منبع نظر نہیں آتا۔

موصوف لکھتے ہیں:

"(مفسرین) نے صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ ان اقیموا الدین میں دین کا جو لفظ آیا ہے اس سے شریعتیں مراد نہیں ہیں کیونکہ وہ مختلف رہی ہیں۔ یہی وہ سوال ہے جسے حل کرنے کے لیے یہ اشارات لکھے جا رہے ہیں۔

صحیح مطلب کیا ہے، سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انھوں نے یہ تصریح کیوں کی ہے، جس محل اور جس پس منظر میں جو بات کہی جاتی ہے اسے نہ سمجھنے یا نظر انداز کر دینے سے انسان خود بھی دھوکا کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے۔

ان اقیموا الدین کے ساتھ ولا تتفرقوا فیہ کا ٹکڑا بھی لگا ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دین میں تفرقہ نہ ڈالو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرات نوح، محمد، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دین کی اقامت کا حکم دیا اور یہ ممانعت بھی فرما دی کہ اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اب ایک زبردست اشکال اور شبہ یہ پیش آ رہا تھا کہ جب تمام انبیاء کو ایک ہی دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا تو پھر ان کی شریعتوں میں اختلاف کیوں پیدا ہوا جب کہ شریعت بھی دین ہی کا جزو ہوتی ہے۔ کیا نعوذ باللہ انبیاء نے اس ممانعت کا خیال نہیں کیا اور شریعتوں میں بطور خود اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ تھا وہ اشکال اور شبہ جسے دور کرنے کے لیے مفسرین کرام کو یہ تصریح کرنی پڑی کہ یہاں دین سے مراد شریعتیں نہیں ہیں بلکہ وہ اصول اور دین کا وہ جزو مراد ہے جو تمام انبیاء کے درمیان متفق علیہ رہا ہے اور جس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر توحید و رسالت اور آخرت کے عقائد ہمیشہ ایک رہے ہیں، اور بندگی رب کا حکم ہمیشہ دیا جاتا رہا ہے۔ انبیاء کرام کو اصول دین میں اختلاف پیدا کرنے کی ممانعت کی گئی تھی، اس ممانعت کا تعلق دین کے اس جزو سے نہیں ہے جس کو شریعت کہتے ہیں، کیونکہ مختلف شریعتیں، خدا ہی کی نازل کی ہوئی ہیں، انبیاء نے اپنے جی سے انھیں نہیں گھڑا ہے۔ مفسرین نے یہاں ان اقیموا الدین کی تفسیر میں شریعتیں مراد نہ ہونے کی جو نفی کی ہے

اس کا یہ ہے محل و مقام اور پس منظر"　　زندگی ماہ نومبر ۱۹۶۲ء ، صفحہ ۳

اس عبارت کا مطلب جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو دین کی اقامت کا حکم دیا اور اسی کے ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ اس میں متفرق نہ ہونا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف انبیاء کے دین بہت سے معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں پھر ایسا کیوں ہے، اس کا جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اختلاف بذات خود تو صحیح ہے، مگر اس مخصوص آیت میں تعلیمات نبوت کا وہ حصہ زیر بحث ہی نہیں ہے جو مختلف انبیاء کے یہاں مختلف نظر آتا ہے۔ بلکہ یہاں دین کے اس اصلی اور بنیادی حصے کا ذکر ہے جو سب کے یہاں مشترک ہے اور اس آیت میں اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کو قائم کرو۔ اس لیے اس آیت میں "تفرق" کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

خدا گواہ ہے کہ یہی وہ بات ہے جو میں نے مفسرین کی طرف منسوب کی ہے۔ کتاب کے مطبوعہ الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

"پوری آیت کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک ایسے دین کی اقامت کا حکم دیا جا رہا ہے جو حضرت نوح سے لے کر آخری رسول تک تمام انبیاء پر اترا تھا۔ اب چونکہ انبیاء پر نازل کی جانے والی تعلیمات اپنی پوری شکل میں یکساں نہیں تھیں۔ عقائد اور بنیادی اصولوں کی حد تک تو ان سب کا دین بالکل ایک تھا مگر تفصیلی شریعت اور عملی احکام میں ان کے درمیان کافی فرق تھا، اس لیے حکم کے الفاظ کے مطابق اس سے دین کا وہی حصہ مراد ہو سکتا ہے جو سب میں مشترک رہا ہو"　　تعبیر کی غلطی، صفحہ ۱۵ - ۳۱۴

مندرجۂ بالا تشریح کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک آیت اقیموا الدین کا تعلق ہے اس میں دین کی بنیادی تعلیمات کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت کو ساری شریعت قائم کرنے کے مسئلے کو سمجھنے کا ماخذ نہیں بنایا جا سکتا۔ خود مدیر زندگی کے مندرجۂ بالا اقتباس سے واضح طور پر یہ بات نکل رہی ہے۔ مگر اس مقدمہ کو بیان کرنے کے بعد انھوں نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ اسی طرح اس سے مختلف ہو گیا ہے جیسے کوئی کہے کہ "ابل" کے معنی اہل لغت

نے اونٹ کے لکھے ہیں، اس لیے ابل کا مطلب ہے "سارے جانور"۔ موصوف لکھتے ہیں:

"اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب ان کی عبارت کا مطلب سمجھنا آسان ہو۔
صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت نوح کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا تھا اس میں وہ شریعت بھی یقیناً داخل تھی جو ان پر نازل ہوئی، ان کے بعد حضرت ابراہیم کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا وہ اصل کی حد تک تو وہی تھا جس کا حکم حضرت نوح کو دیا گیا تھا، لیکن شریعت وہ تھی جو خاص طور سے ان پر نازل ہوئی تھی۔ نہ یہ کہ وہ بھی اسی شریعت کے مکلف بنائے گئے ہوں جو حضرت نوح پر اتری تھی۔
اسی طرح حضرت موسیٰ کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا وہ اصولوں کی حد تک وہی سابق دین تھا۔ لیکن شریعت وہ تھی جو ان پر کتاب توریت میں نازل کی گئی۔ حضرت عیسیٰ بھی اسی کے مکلف تھے الا یہ کہ کتاب انجیل میں کچھ فروعی احکام خاص طور سے نازل ہوئے ہوں۔ تو وہ انھیں احکام کے مکلف تھے جو ان پر خاص طور سے نازل ہوئے۔ اور اب آخر میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا جا رہا ہے وہ اصول کی حد تک بالکل وہی ہو جو سابق انبیاء کو دیا گیا تھا، لیکن شریعت وہ ہے جو خاص طور سے آپ پر نازل کی گئی اور آپ اسی شریعت کو قائم کرنے کے مکلف ہیں جو آپ پر نازل کی گئی۔
حاصل کلام یہ کہ مفسرین کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے وحدت دین کا جو اعلان کیا ہے اس سے مراد اصل دین کی وحدت ہے شریعتوں کی وحدت مراد نہیں ہے۔"
صفحہ ۳-۴

مندرجۂ بالا مقدمہ سے یہ نتیجہ کیسے نکل آیا، یہ میرے لیے بالکل ناقابل فہم ہے۔ اس عبارت کے مطابق موصوف کے نزدیک اقیموا الدین کا مطلب یہ ہے کہ ——— "اصل دین وہ قائم کرو جو تمام انبیاء پر اترا، اور شریعت وہ قائم کرو جو تمھارے اوپر اتری" ——— اس سے قطع نظر کہ یہ بجائے خود ایک عجیب و غریب جملہ ہے، میں پوچھتا ہوں کہ یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے۔ اصل فقرہ تو صرف اتنا ہے کہ "وہ الدین قائم کرو جو تمام انبیاء پر اترا" پھر وہ اتنا لمبا چوڑا فقرہ

کیسے بن گیا کہ ـــــ "اصل دین وہ قائم کرو جو تمام انبیاء پر اترا اور شریعت وہ قائم کرو جو تمہارے اوپر اتری" یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اقیموا الصلوٰۃ کا مطلب ہے "صوم و صلوٰۃ کے پابند بنو"۔ اب میں کہوں کہ اس فقرے میں تو صرف صلوٰۃ کا ذکر ہے، پھر صوم کا اضافہ آپ نے کہاں سے کر دیا۔ اس کے جواب میں وہ صلوٰۃ کی لغوی تحقیق پیش کرے جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہو کہ یہ لفظ نماز کے لیے آتا ہے، مگر اس کے بعد یکایک دعویٰ کرے کہ اقیموا الصلوٰۃ کا صحیح مطلب یہ ہے کہ نماز وہ پڑھو جو اس آیت میں لکھی ہوئی ہے اور روزہ وہ رکھو جو دوسری آیت میں درج ہے۔"

مدیر محترم سے دوسری شکایت یہ ہے کہ انھوں نے میرے موقف کو صحیح شکل میں پیش نہیں کیا۔ اقیموا الدین کے فقرے میں کل شریعت کے بجائے "اصل دین" مراد لینے کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے گویا عام معنوں میں میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ـــــ "دین کی اقامت کے حکم سے ان مخصوص شریعتوں کی اقامت کا حکم خارج ہے جو مختلف دور میں صاحب شریعت انبیاء پر نازل ہوتی رہی ہیں۔" (صفحہ ۴) اور اسی طرح "سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا اس سے وہ شریعت خارج ہے جو اللہ کی طرف سے آپ پر اتری تھی" (صفحہ ۲)

یہ موصوف کا ایک الزام ہے جو انھوں نے ایک خاص بات کو عام بنا کر میرے اوپر وارد کیا ہے۔ اقیموا الدین کی آیت پر میں نے جو کچھ اپنی کتاب میں لکھا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب کوئی شریعت کسی نبی پر اترتی تھی تو وہ بس یونہی بے ضرورت اترتی تھی، نبی اس کی تنفیذ کا مکلف نہیں ہوتا تھا، اس کی ذمہ داری اول و آخر بس یہی تھی کہ "اصل دین" کی اقامت کر دے۔ بلکہ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ اقیموا الدین کی جو آیت سورۂ شوریٰ میں ہے اس کو اس مسئلہ کے مطالبہ کا ماخذ نہیں بنایا جا سکتا کہ شریعت کے تفصیلی احکام کے نفاذ کے باب میں اللہ کا مطالبہ ہم سے کیا ہے کیونکہ اس مخصوص آیت میں شرائع کا مسئلہ زیر بحث ہی نہیں ہے۔ یہاں تو اصل دین کی اقامت کا حکم ہے اور اس آیت سے ہم اسی کو سمجھ سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں میری یہ بات قرآن کی ساڑھے چھ ہزار آیتوں میں سے صرف ایک آیت کے بارے میں ہے، نہ یہ کہ میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ اس کے سوا قرآن میں کوئی اور آیت یا کوئی اور حکم

سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کتاب کا وہ مطبوعہ نوٹ کافی ہے جو اقیموا الدین کی بحث کے آخر میں صفحہ ۳۲۱ پر درج ہے۔

۲۔ ایک ذمہ دار جماعت لکھتے ہیں :

"یہ تصنیف (تعبیر کی غلطی) خیالات و افکار کی ایک بھول بھلیاں ہے۔ اس میں داخل ہونے والا اس میں سے نکلنے کا راستہ پانے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ میں اس کتاب کو بھول بھلیاں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس میں ایک بات کو صحیح بھی کہا گیا ہو اور غلط بھی۔ ایک بات کو ضروری بھی قرار دیا گیا ہے اور غیر ضروری بھی، ایک چیز قابل برداشت بھی ہے اور ناقابل برداشت بھی، ایک چیز قابل تردید بھی ہو اور ناقابل تردید بھی۔ ایک چیز قابل فخر بھی ہے اور قابل حسرت بھی۔ اس کتاب کیلئے شاید یہ شعر موزوں ہو :

لکھ گیا ہوں جنون میں کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

یہ بات جس قسم کے جملوں کے پیش نظر کہی گئی ہے، ان میں سے ایک مثال یہ ہے :

" دین کا ایک نظام ہونا بذات خود غلط نہیں ہے، مگر جب نظام کے تصور کو یہ حیثیت دی جائے کہ یہی وہ سبب جامع ہے جو اس کے متفرق اجزاء کو ایک کل میں سموتا ہے تو یقیناً وہ غلط ہو جاتا ہے اور یہی اس فکر کی اصل غلطی ہے، یہ فکر دین کا مطالعہ اس حیثیت سے کرتی ہے کہ وہ زندگی کا ایک "نظام" ہے۔ اس کے نزدیک وہ مجموعی تخیل جس کے تحت پورے دین کو سمجھا جا سکتا ہے وہ اس کا نظام ہونا ہو۔ حالانکہ دین کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے۔ دین محض ایک قانونی نظام نہیں ہے جیسے دوسرے نظام ہوا کرتے ہیں، بلکہ وہ خدا سے نفسیاتی تعلق کا ایک ظہور ہے، عمل میں آنے کے بعد بے شک دین میں وہ ساری چیزیں شامل ہو جاتی ہیں جن کے مجموعے کو نظام حیات کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر دین کا نظام ہونا حقیقت دین کا ایک مظہر ہے۔ یہ اس کی اضافی

حیثیت ہے نہ کہ اصل حیثیت۔" تعبیر کی غلطی صفحہ ۱۹۱

جواباً عرض ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا میں نے پہلی بار انکشاف کیا ہو۔ یہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے کہ ایک بات بجائے خود غلط نہیں ہوتی مگر حیثیت کے فرق سے وہ قابلِ اعتراض بن جاتی ہے۔ اس کو چند مثالوں سے سمجھئے۔

الف۔ جسٹس منیر کی صدارت میں لاہور میں جو تحقیقاتی عدالت قائم ہوئی تھی اس میں جسٹس موصوف نے مطالبۂ نظامِ اسلامی کی مہم کو غلط ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل یہ دی تھی:

"وہ اہم ترین جماعتیں جو آج پاکستان میں مذہب کی بنیاد پر اپنے تین مطالبات کو منوانے کے لیے شور و غل کر رہی ہیں (تقسیم سے پہلے) یہ سب کی سب اسلامی ریاست کے تصور کے خلاف تھیں۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی یہ نظریہ تھا کہ نئی بننے والی مسلم ریاست، اگر وہ کبھی وجود میں آئی، تو اس کی حکومت کا ڈھانچہ صرف سکولر ہی ہوگا۔"

MUNIR REPORT. P. 201

اس اقتباس میں جسٹس منیر نے جو بات مولانا مودودی کی طرف منسوب کی ہے وہ اصلاً غلط نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تقسیم سے پہلے اس قسم کی بات کہی تھی۔ مگر اس کو منیر رپورٹ میں جس حیثیت سے پیش کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ رپورٹ نے اس کو یہ شکل دی ہے گویا مولانا مودودی تقسیم سے پہلے "اسلامی ریاست کے تصور کے خلاف" تھے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ مولانا مودودی نے جو بات کہی تھی وہ دراصل مسلم لیگ کے طریق کار پر تنقید تھی نہ کہ کسی مسلم علاقے کے بارے میں اپنی یہ ذاتی رائے کہ وہاں کس قسم کا نظام چلایا جائے۔ وہ خود تو اسلامی حکومت ہی قائم کرنے کے علم بردار تھے مگر مسلم لیگ کے طریقے کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اس طرح اسلامی حکومت نہیں بنا کرتی۔

ب۔ ابھی حال ہی اخباروں میں خبر آئی تھی کہ پاکستان کے صدر ایوب خاں نے اپنی دوسری ماہانہ نشری تقریر میں مولانا مودودی کا نام لیے بغیر ان پر بالواسطہ حملہ کرتے ہوئے کہا:

"مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے سیاست داں کہتے ہیں کہ اسلامی طرز زندگی کو نافذ کرنے

کرنے کے لیے سیاسی قوت حاصل کرنا ضروری ہے، مگر اقتدار کی ہوس میں وہ بھول جاتے ہیں کہ اس طرح وہ اسلام کے ان ناقدین کی بلا ارادہ تائید کر رہے ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام تلوار کا مذہب ہے۔"

ہندوستان ٹائمس ۲ر نومبر ۱۹۶۳ء

اس مثال میں بھی وہی چیز ہے کہ ایک بات جو بجائے خود غلط نہیں ہے اس کو غلط حیثیت دے کر قابل اعتراض بنا دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام تلوار کا مذہب نہیں ہے، جن لوگوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا، اُن کو اسلام صرف تبلیغ و تلقین کے ذریعہ اپنا مومن بنانا چاہتا ہے، مگر ان لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں میں بھی روح ایمان پیدا کرنے اور انھیں غفلت سے بچانے کے لیے تبلیغ و تلقین ہی اصل ذریعہ ہے، مگر اسی کے ساتھ اگر طاقت استعمال کرنے کا موقع ہو تو یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہو کہ طاقت کے ذریعہ انھیں اسلام کی ناگزیر حدود کا پابند بنایا جائے اور ان کے درمیان سے وہ تمام اسباب بزور ختم کیے جائیں جو دین و ایمان کے لیے مضر ہوں۔ گویا یہ بات عمومی اعتبار سے تو یقیناً غلط ہے کہ اسلام طاقت کے ذریعہ اپنے اصولوں کو منوانے پر عقیدہ رکھتا ہے، مگر جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہاں اسلامی طرز زندگی کے نفاذ کے لیے طاقت استعمال کرنے کا مطالبہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے اور مسلمانوں کے سلسلے میں یہی مطلوب ہے کہ جس حد تک ممکن ہو بزور انھیں اسلام کا پابند بنایا جائے۔

۳۔ کتاب کے دوسرے باب "گفتگو اور خط و کتابت" کے آغاز میں افراد جماعت سے تبادلۂ خیال کی روداد جو میں نے درج کی ہے، اُس کے متعلق میرے ایک محترم دوست کا خط موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے شکایت کی ہے کہ ان کی گفتگو کو میں نے صحیح طور پر نقل نہیں کیا۔ یہاں میں اُن کے خط کے الفاظ نقل کرتا ہوں تاکہ ان کی شکایت کی صحیح ترجمانی سامنے آجائے:۔

"آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد افسوس کہ وہ حسن ظن باقی نہیں رہا جو عرصہ سے آپ میں قائم تھا، حصۂ مضمون کے بارے میں کوئی شکایت نہیں، اس لیے کہ انسان

اگر مخلصانہ طور پر کسی ایک نظریہ پر اطمینان کر لے تو اسے حق ہے کہ اس کو منفی اور مثبت طور پر خلقِ خدا کے سامنے رکھے۔ البتہ مجھے جو شکایت ہے وہ خطوط اور گفتگوؤں کے بارے میں ہے۔ اصولاً میں یہ بات صحیح نہیں سمجھتا کہ مخاطب کو تو علم نہ ہو کہ اس کی باتیں کل پریس میں آنے والی ہیں اور اس سے بات چیت کر کے ڈائری کی زینت بنائے جائیں، پھر کتابی شکل میں اس کے الفاظ بطور ثبوت شائع کر دیے جائیں۔ کم و بیش یہی حال خطوط کا بھی ہے، دوسری بات جس سے مجھے خاص طور سے تکلیف پہونچی وہ وہ گفتگو ہے جو مجھ سے اور آپ سے اعظم گڑھ میں ہوئی تھی اور جس کو آپ نے کتاب کے دوسرے باب میں درج کیا ہے، مجھے اس کے بارے میں صرف یہ کہنا ہے کہ اگر آپ جیسا آدمی اس حد تک گر کر لوگوں کی باتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے لیے برائے ثبوت پیش کر سکتا ہے تو پھر کیا گلہ اور کیسی شکایت۔"

چونکہ میں نے کتاب میں اور بھی دوسرے بہت سے افراد جماعت کی گفتگوئیں نقل کی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ انھیں بھی اسی قسم کی شکایت ہو، اس لیے اس کا جواب بذریعہ پریس دے رہا ہوں، میرا یہ جواب بہت ہی مختصر ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کو شکایت ہے کہ میں نے اس کی بات کی صحیح ترجمانی نہیں کی ہے تو اس نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا اس کو خود اپنے الفاظ میں لکھ کر مجھے بھیج دے۔ میں کتاب کے اگلے اڈیشن میں پلیٹ پر موجود مطبوعہ الفاظ مٹا کر اس کے اپنے الفاظ لکھوا دوں گا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ الفاظ مقدار میں تقریباً اتنے ہی ہوں جتنے کہ اس وقت کتاب میں ہیں تاکہ دوبارہ درج کرنے میں زحمت نہ ہو۔

باقی جہاں تک مسئلہ کی "اصولی" نوعیت کا تعلق ہے، مجھے افسوس ہے کہ اپنے محترم ساتھی کے نقطۂ نظر سے مجھے اتفاق نہیں میں نے جماعت کے افراد اور اسکے ذمہ داروں سے جو گفتگو اور خط و کتابت کی وہ کسی نجی مسئلہ پر نہیں تھی بلکہ ایک خالص علمی اور دینی مسئلہ میں تھی، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں وہ ایک ایسے مسئلہ پر تھی جو اس سے پہلے بار بار پریس میں آچکا تھا یعنی یہ کہ — "جماعت اسلامی کا تصورِ دین کتاب و سنت اور اسلاف کے تصورِ دین کے مطابق نہیں ہے"۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسے مسئلے میں گفتگو اور خط و کتابت کو شائع کرنے میں قباحت کا سوال کس اصول

کی بنا پر پیدا ہوا۔

۴۔ "اس وقت تک جو تنقیدیں سامنے آئی ہیں وہ اتنی کمزور کیوں ہیں"۔ جب میں اس سوال پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس کا ایک نفسیاتی جواب ملتا ہو۔ اصل میں میرے مخاطبین پہلے سے یہ طے کیے بیٹھے ہیں کہ ان کا فکر لازمی طور پر صحیح ہے اور اسی لیے "تعبیر کی غلطی" لازمی طور پر ایک لغو اور انتہائی غلط کتاب ہو، اپنی اس نفسیات کی بنا پر وہ اس کے دلائل و مباحث پر زیادہ غور نہیں کر پاتے۔ اور اس مفروضہ یقین کی بنا پر کہ یہ کتاب توسرتاپا غلط ہے، جو منھ میں آتا ہے کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے ذہن کا آدمی ہمیشہ غلطی کرتا ہے، ایسا آدمی نہ تو اپنی اس ذمہ داری کو ادا کر پاتا کہ "جب کوئی شخص سخت سے تمھیں ڈرائے تو ٹھہر کر سوچو کہ کہیں میرے اندر واقعی نقص تو نہیں ہے"۔ اور نہ اپنے پڑھنے والوں کو وہ کوئی ٹھوس چیز دے سکتے ہیں۔

جو لوگ میری کتاب پر تنقید کی مہم میں حصہ لے رہے ہیں ان سے میں گزارش کروں گا کہ خدا کے واسطے سمجھنے سے پہلے تنقید شروع نہ کر دیجئے پہلے اصل کتاب کو غور سے پڑھ کر یہ معلوم کیجئے کہ کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہو۔ اس طرح اصل بات کو صحیح طور پر متعین کر کے اس کے اوپر تبصرہ کیجئے تاکہ آپ خدا کے سامنے اپنے فرض سے صحیح طور پر سبکدوش ہو سکیں اور قارئین کو سوچنے کیلئے بھی زیادہ بہتر اور مضبوط مواد دے سکیں۔ اسکے بجائے اگر آپ نے اچھی طرح سمجھے بغیر تنقید شروع کر دی تو غالباً ہر شخص وہی کہنے پر مجبور ہوگا جو اسکو پڑھ کر میری زبان سے نکلا ـــــــ "اگر میرا نقطۂ نظر لغو اور انتہائی غلط ہے تو جو لوگ اس کے مقابلے میں انتہائی صحیح نقطۂ نظر رکھتے ہیں، ان کے پاس میری تردید کے لیے اتنے کمزور دلائل کیوں ہیں"۔

الفرقان وحیدالدین خاں صاحب کا یہ مضمون جو ان کی کتاب "تعبیر کی غلطی" پر کی گئی بعض تنقیدوں کے جواب میں ہو، الفرقان کی گزشتہ اشاعت میں شائع ہونے والے ان کے اسی سلسلہ کے مضمون کا گویا ضمیمہ ہے اس لیے پہلے مضمون کی اشاعت کے بعد اس کا شائع کرنا بھی ہم نے ضروری سمجھا ــــ لیکن ان دونوں کے پڑھنے کے بعد ہمارا خیال ہو کہ اس قسم کے سنجیدہ جواب کا حق یہ ہو کہ وہ انہی جرائد میں شائع ہو جن میں یہ تنقیدیں شائع ہوتی ہیں۔ ہمارا اندازہ ہو کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے وہ جرائد وحیدالدین خاں صاحب کا جواب شائع کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔ اور یہ طریقہ حقیقت کو سمجھنے میں ناظرین کی زیادہ مدد کر سکے گا۔

ایک خط

مولانا حافظ محمد حسن انصاری فیض آبادی، اس ناچیز کے ایک محترم اور عنایت فرما بزرگ ہیں، اور اس حسن ظن کی وجہ سے جس کا یہ عاجز ہرگز مستحق نہیں ہے نہایت عمیق مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ان کے بڑے صاحبزادے محمود حسین مرحوم دماغ کے مریض ہوئے۔ مرض مالیخولیا کی قسم کا تھا، علاج ہوتا رہا لیکن ــــــ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" یہاں تک کہ کئی مہینے اس میں مبتلا رہ کر فیض آباد ہی میں انتقال کر گئے ــــ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ، اور چونکہ مالیخولیا کے مریض تھے اور انتقال بھی اس طرح ہوا جس کے بارے میں یہ شک یا وہم ہو سکتا تھا کہ شاید اس میں ان کے ارادہ اور اقدام کو دخل ہو، اس لیے ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد حسن صاحب انصاری کو اُس رنج اور صدمہ کے علاوہ جو کسی بوڑھے باپ کو اپنے صاحب اولاد سعید فرزند کے انتقال پر قدرتی طور پر ہوتا ہے، خوف خدا اور سچی دینداری کی وجہ سے اس شبہ یا وہم کا بھی بیحد اثر ہوا، بلکہ اُن کے خطوط سے اندازہ ہوتا رہا کہ موت کے صدمے سے بھی زیادہ اثر ان پر اس شک یا وہم کا ہے۔ ناچیز نے ایک خط اسی سلسلہ میں ان کو لکھا تھا، چونکہ ایسے غمزدہ اور مجروح دلوں کے لیے وہ باعث تسکین و تسلی بن سکتا ہے اس لیے الفرقان میں اس کو شائع کرنا مناسب سمجھا گیا، ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں۔

ــــــــــــــ محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترمی مکرمی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

آپ کے خطوط سے بھی معلوم ہوتا رہا اور دوسرے ذرائع سے بھی کہ بھائی محمود مرحوم کے بارہ میں آپ کا وہ خاص تکلیف دہ خیال یا وہم ابھی تک باقی ہے اور برابر آپ کو ستا رہا ہے اور گھلا رہا ہے،

اصل حادثہ کا صدمہ تو بالکل برحق ہے، خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کی وفات پر فرمایا تھا۔

العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی ربنا انا لله وانا الیه راجعون۔

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور میرا دل رنجیدہ و غمزدہ ہے، لیکن زبان تسلیم و تفویض کا وہی کلمہ کہے گی جس سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔ انا لله وانا الیه راجعون۔

اور اللہ کے دوسرے جلیل القدر نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ میں خود قرآن مجید میں ہے کہ اپنے فرزند حضرت یوسف کی جدائی کے صدمہ سے ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ

وابیضت عیناه وهو كظیم۔ (یوسف) روتے روتے ان کی آنکھوں میں سفیدی آگئی تھی۔ اور وہ دم گرفتہ رہتے تھے۔

الغرض اولاد کے ایسے حادثوں پر صدمہ اور غم ہونا اور بے اختیار دل کا اور آنکھوں کا رونا قلب کی رقت و دردمندی کی علامت ہے، اور اس کے برعکس ایسے حوادث سے دل کا متاثر نہ ہونا ایک نامحمود کیفیت اور سنگدلی کی نشانی ہے۔ اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ بھائی محمود جیسے سعادتمند اور صاحب اولاد لخت جگر پر آپ کا صدمہ بالکل برحق ہے، اور چونکہ آپ نے پورے صبر کے ساتھ اس صدمہ کا استقبال کیا ہے اس لیے آپ کے واسطے بلاشبہ "اولئك علیهم صلوات من ربهم ورحمة واولئك هم المهتدون" کی قرآنی بشارت ہے اور انشاء اللہ بے حساب اجر ہے ـــــ لیکن آپ کا یہ وہم کہ اُن کی موت میں اُن کے کسی ارادہ یا اقدام کا بھی کوئی دخل ہو اور اس کی بنا پر آپ کا مسلسل رونا اور گھلنا اور اس شک کی بنا پر ان کے لیے خاص طور سے استغفار کرنا اگرچہ آپ کے لیے باعث ترقیات اور مرحوم کے لیے انشاء اللہ وسیلۂ مغفرت و نجات ہوگا، لیکن میں اپنے اس خیال کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ وہم بالکل بے بنیاد ہے ـــــ کسی مرنے والے کے بارہ میں جب تک ایسی کوئی بات متعین طور سے معلوم

نہ ہو یا کوئی واضح قرینہ نہ ہو اس قسم کے شک یا وہم کو دل میں کیوں جگہ دی جائے ــــ علاوہ ازیں وہ مالیخولیا کے مریض تھے، آخری دفعہ جب آپ اُن کو علاج کے لیے لکھنؤ لائے تھے، اور وہ آپ کے ساتھ میرے پاس بھی آئے تھے تو اُن کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ مالیخولیا کے اثر سے اُنکی عقل کافی ماؤف ہے اور اُن کا ذہنی توازن صحیح نہیں ہے۔ اور اُس کے بعد آپ کے خطوط سے برابر معلوم ہوتا رہا کہ اُن کا مرض برابر ترقی کر رہا ہے، پس بالفرض اگر ایسا ہی ہوا ہو کہ انھوں نے اسی مالیخولیائی کیفیت سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا اقدام کیا ہو جس کے نتیجہ میں ان کی موت کا حادثہ واقع ہوا ہو تو بھی اللہ کے ہاں ان سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے۔

رفع القلم عن ثلثة عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم وعن المعتوہ حتی یفیق ــــ او کما قال علیہ السلام

یعنی تین قسم کے آدمی مرفوع القلم اور غیر مکلّف ہیں۔ ان کا کوئی گناہ لکھا ہی نہیں جاتا نہ اُن سے کسی گناہ پر مواخذہ ہوگا ــــ ایک سوتا ہوا آدمی جب تک سوتا رہے جاگ نہ جائے، دوسرا کمسن بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے، تیسرا دماغ کا وہ مریض جس کی عقل کو مرض نے ماؤف کر دیا ہو جب تک کہ وہ اچھا نہ ہو جائے۔

یعنی ان تین قسم کے آدمیوں سے ان خاص حالات میں اگر کوئی بڑے سے بڑا گناہ بھی ہو جائے (حتی کہ اگر زبان سے کلمۂ کفر بھی نکل جائے) تو ان سے مواخذہ نہیں ہوگا اور عنداللہ ان کو معذور سمجھا جائے گا۔

پس بھائی محمود کے حادثۂ موت کے بارہ میں اگر بالفرض یہ بات معلوم بھی ہوتی کہ اس میں اُن کے ارادہ اور اقدام کو کوئی دخل تھا جب بھی رنج وصدمہ کی بات تو تھی، لیکن آخرت کے نقطۂ نظر سے خاص تشویش کی بات نہیں تھی، مندرجہ بالا مشہور حدیث نبوی اور شریعت کے مسلّمہ اصول کی بنا پر وہ مرفوع القلم ہونے کی وجہ سے معذور سمجھے جاتے، اور ایسے بندوں کے لیے تو اللہ تعالیٰ کا خاص قانون معافی اور رحمت ہی کا ہے، ارحم الراحمین کے بارہ میں اُس کے خلاف وسوسہ کو بھی کیوں دل میں جگہ دی جائے۔

آپ کی تسلی کے لیے ایک بات اور عرض کرتا ہوں ـــــ مخدومنا حاجی عبدالغفور صاحب جو دھیوری دامت برکاتہم سے الفرقان کے ذریعہ غائبانہ واقفیت تو ضرور ہی ہوگی، اور ممکن ہے لکھنؤ میں حضرت کی زیارت بھی کی ہو، ہمارے دور کے خاصان خدا میں سے ہیں، کئی سال ہوئے اُن کے ایک صاحبزادے (بھائی حاجی محمد عثمان مرحوم) کا بھی ایسی ہی حالت میں اور کچھ اسی طرح انتقال ہوا تھا کہ اس میں بھی اس قسم کے شک اور وہم کی گنجائش ہو سکتی تھی، وہ بھی بھائی محمود کی طرح صاحب اولاد بلکہ کثیر الاولاد تھے، قدرتی طور پر حضرت حاجی صاحب مدظلہ کو اُن کے حادثۂ وفات کا بیحد صدمہ ہوا تھا، انہی دنوں میں میرا جودھیور جانا ہوا، میں نے اس حادثہ کے اثر سے حضرت کا جو حال دیکھا اُس سے مجھے تو یقین ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ممدوح کے رفع درجات کا یہ خاص سامان کیا ہے اور اُن کے خاص کیفیت والے استغفار کو صاحبزادہ مرحوم کی انشاء اللہ کامل مغفرت کا وسیلہ بنا دیا ہے، اور ان کی دعاؤں نے مرحوم کی اولاد کے لیے ضروریات زندگی کے دروازے کھلوا دیئے ہیں ـــــ امید ہے کہ انشاء اللہ آپ کے لیے بھی یہ صدمہ دینی ترقیات کا باعث ہوگا، غیر اللہ کے تعلقات کو مضمحل کرکے اللہ کے تعلق کو بڑھائے گا۔ اور آپ کے زخمی دل کا استغفار بھائی محمود مرحوم کی پوری پوری مغفرت کا وسیلہ بنے گا اور آپ کے شکستہ و محزون دل کی دُعائیں ان کی اولاد کے مسائل کو آسان کرا دیں گی ـــــ آپ کی تسلّی ہی کے لیے عرض کرتا ہوں کہ یہ ناچیز بھی یاد آجانے پر مرحوم کے لیے اہتمام سے استغفار اور اُن کے بچوں کے لیے دُعا کرتا ہے۔

آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اس بے بنیاد شک اور وہم کو دل سے نکال دیجیے اور ارحم الراحمین سے مغفرت و رحمت ہی کی امید رکھیے، مشہور حدیث قدسی ہے "انا عند ظن عبدی بی" ـــــ والسلام

دُعاؤں کا محتاج اور طالب

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

اب جبکہ یہ خط الفرقان میں شائع ہو رہا ہے، ناظرین کرام سے گزارش ہو کہ وہ بھی محمود حسین مرحوم کیلئے مغفرت و رحمت کی اور اُن کے والد ماجد مولانا حافظ محمد حسن صاحب انصاری اور دیگر پسماندگان کے لیے اجر و صبر کی اور مرحوم کے اہل و عیال کے لیے اللہ تعالیٰ کے فضل کی دُعا فرمائیں۔

دنیا میں
سب سے بڑا روحانی انقلاب
پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ برپا ہوا تھا
جو لوگ اردو زبان کے ذریعہ
اس تعلیم و ہدایت سے واقف ہونا اور فائدہ اٹھانا چاہیں جس نے یہ انقلاب برپا کیا تھا
ہم انکی خدمت میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ کی تالیف
معارف الحدیث
اعتماد اور یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں
اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ یہ حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ ہے جو دور حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری
سطح کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ مصنف کی خاص کوشش
پوری کتاب میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابہ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے
اس کتاب کے ناظرین کے دلوں پر بھی وہی اثرات کسی درجہ میں پڑیں۔ (دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں)
جلد اول — جس میں ایمان و آخرت سے متعلق احادیث کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت مجلد، غیر مجلد
جلد دوم — جس میں تزکیہ اور اصلاح اخلاق سے متعلق احادیث کی تشریح کی گئی ہے
ملنے کا پتہ
کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ
لکھنؤ

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
ہماری دعوت
محمد منظور نعمانی
عتیق الرحمن سنبھلی
Checked 1969.
Checked 1978

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ ۷ر
ششماہی ۴ر
فی کاپی ..... ۶۰ نئے پیسے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ..... ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک
سالانہ ...... ۱ پونڈ

جلد ۳۱ | بابت ماہ شعبان ۱۳۸۳ھ مطابق جنوری ۱۹۶۴ء | شمارہ ۷

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحات
۱	نگاہِ اوّلیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانی	۹
۳	تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ	مولانا نسیم احمد فریدی	۳۶
۴	دینی تعلیم کیوں	مولوی عبید الرحمٰن صاحب وکیل	۴۵
۵	ہندوستانی حجاج کیلئے میقات	مولینا محمد منظور نعمانی	۵۹

اگر اس دائرہ میں ◌ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں، نئے خریداروں کے لیے بھی یہی طریقہ ہے۔

تاریخ اشاعت: - رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ تک اطلاع آجانی چاہیے۔

دفتر:- الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر، پروپرائٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ حکومت ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین نے مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی کی تجویز واپس لیتے ہوئے پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ جبتک مسلمان ہی کسی ایسی تجویز کو پسند نہ کریں حکومت ان کے پرسنل لا میں تبدیلی کے لیے کوئی اقدام ہرگز نہیں کرے گی۔

وزیر موصوف نے یہ یقین دہانی مسلمانوں کے ساتھ کسی رعایت اور عنایت کے انداز میں نہیں کرائی تھی بلکہ ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے جو دستور کے بعض رہنما اصولوں کے حوالے سے ایسے اقدامات کو حکومت کا حق بلکہ فرض قرار دے رہے تھے موصوف نے کہا تھا کہ

> "جہاں تک اقلیتی فرقوں کا تعلق ہے ان کی پرسنل لا میں اصلاح کی پیشقدمی کا آغاز انھیں کی جانب سے ہونا چاہیئے۔ حکومت ہند کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اقلیتی فرقوں کے معاملہ میں پیش دستی کے مقام پر لا کھڑا کرے"
>
> (قومی آواز ۱۴ر اگست ۱۹۶۳ء)

اس صراحت کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ موجودہ حکومت کے نزدیک اقلیتوں کے پرسنل لا کو ایک تحفظ کا مقام حاصل ہے؟ اور اس صورت میں اس حکومت کے کسی فرد کے لیے یہ کسقدر بے ضابطگی اور کس درجہ غیر ذمہ داری کی بات ہوگی کہ وہ مسلم پرسنل لا یا کسی بھی اقلیت کے شخصی قوانین کے اس تحفظ کو سرِعام چیلنج کرے! لیکن حکومت ہند کے نئے وزیر تعلیم مسٹر محمد علی کریم چھاگلا نے ایک ماہر قانون کی حیثیت سے ذمہ دارانہ شخصیت رکھنے کے باوجود

بھی ارکانِ حکومت کی مشترک ذمہ داری کے اصول کو نہایت افسوسناک طریقہ سے پامال کرتے ہوئے مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں اس تحفظ کو سرعام چیلنج کر ڈالا ہے۔

مستشرقین کی کانگریس منعقدہ نئی دہلی میں مسلم پرسنل لا پر ایک سمپوزیم کے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا سوائے اس کے کوئی مقصد ہی نہیں معلوم ہوتا کہ حکومت ہند نے مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے جس مسئلہ کو اٹھانے کے بعد مسلمانوں کے احتجاج کے نتیجہ میں اس صراحت کے ساتھ لپیٹ کر رکھ دیا تھا کہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان کی شخصی قوانین میں مداخلت نہیں کی جا سکتی مسٹر چھاگلا اس نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے مسئلہ کو ازسرنو زندہ کر دینا چاہتے ہیں۔

سمپوزیم میں پڑھے جانے والے مقالات کی جو رپورٹ اخبارات میں آئی ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس سمپوزیم کو ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی ترمیم اور عدم ترمیم کے مسئلہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ کسی بھی خاص ملک کے سوال سے وسیع تر ایک خالص علمی مذاکرہ تھا جس کے پس منظر میں آج کے عالم اسلام کے اندر پائی جانیوالی یہ اصولی کشمکش کارفرما تھی کہ مسلم پرسنل لا میں کسی ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کا ضابطہ کیا ہو؟ اس خالص علمی، اصولی اور غیر مقامی مذاکرہ میں مسٹر چھاگلا نے بحیثیت صدر اول و آخر جو تقریر فرمائی نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ایک خالص علمی مذاکرہ کو ہندوستان کے ایک خاص سیاسی ذہن کی تائید میں استعمال کرنے کی نہایت ہی ناروا کوشش تھی ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ سمپوزیم میں حصہ لینے والے اہل علم نے بلا کسی احتجاج کے اس کو برداشت کیسے کر لیا۔

بہرحال جناب چھاگلا نے اس سمپوزیم کی افتتاحی تقریر ہی سے اپنی اس قابل اعتراض اور قابل احتجاج کوشش کا آغاز کیا کہ اہل علم کی اس مجلس مذاکرہ کو ہندوستان میں مسلم پرسنل لا پر نظرثانی کے اس مسئلہ کو پھر سے زندہ کرنے کا ذریعہ بنایا جائے جسے حکومت اپنے ہاتھوں سے لپیٹ کر رکھ چکی ہے۔ چنانچہ اخباری رپورٹ کے مطابق موصوف کی تقریر کا آغاز ہندوستانی ریاست کے موجودہ ڈھانچہ کے تعارف سے ہوا۔ جس میں آپنے فرمایا کہ

"یہاں کے رہنے والے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ووٹ کا حق حاصل ہے لہٰذا پارلیمنٹ کے انتخاب میں ان کا بھی حصہ ہے۔ اور اس بنا پر پارلیمنٹ کو ان کے لیے بھی شخصی قوانین بنانے کا پورا حق حاصل ہے" نیز انہوں نے ہندوستانی ریاست کے سیکولرزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہاں جو بھی قانون بنے وہ یکساں طور سے پوری سماج پر حاوی ہونا چاہیئے"

مقالات اور مباحثہ کی جو اخباری رپورٹ ہمارے سامنے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاگلا صاحب کو اپنے خاص مدعا کی تائید اس سے نہیں حاصل ہو سکی، لہٰذا آپ نے اختتامی تقریر میں ایک بار پھر اپنے موقف پر زور دیتے ہوئے اپنے دلائل اور نقطۂ نظر کا اعادہ کیا .... اس سلسلہ میں آپ نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ "پریوی کونسل کے جج مسلم پرسنل لا کے مقدمات کا فیصلہ کرتے رہے ہیں" لہٰذا "ہندوستانی پارلیمنٹ کو مداخلت کا صرف حق ہی نہیں بلکہ سماجی انصاف اور یکجہتی کی خاطر اس کا فرض ہے کہ وہ مداخلت کرے"

مسٹر چھاگلا نے ایک نکتہ خاص طور سے مسلمانوں کے ذہن کو جھنجھوڑنے کے لیے اس تقریر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ان کو غور کرنا چاہیئے کہ تعدد ازدواج کا قانون سماجی انصاف کی ان قدروں کے کسی قدر خلاف ہے جن کا اسلام داعی ہے"۔

مسٹر چھاگلا کی اس تقریر کے ذکر سے ہمارا اصل مقصد صرف یہ سوال اٹھانا تھا کہ جب وہ حکومت جس کے مسٹر چھاگلا اس وقت ایک رکن ہیں، ابھی چند مہینے پہلے مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے سوال پر اپنا یہ نقطۂ نظر پوری صراحت کے ساتھ واضح کر چکی ہے کہ خود مسلمانوں کی مرضی کے بغیر وہ ان کے پرسنل لا کو ہاتھ لگانا صحیح نہیں سمجھتی تو اس حکومت کا رکن رہتے ہوئے مسٹر چھاگلا کے لیے کس طرح یہ بات مناسب تھی کہ وہ برسرعام اس سے مختلف نقطۂ نظر کا اظہار کریں؟ اور پھر اگر ان کے اس طرز عمل پر سربراہ حکومت کی طرف سے مسٹر چھاگلا کو ٹوکا نہیں جاتا ہے تو ہم کیونکر یہ رائے نہ قائم کریں کہ حکومت کی طرف سے جو بیان پارلیمنٹ میں وزیر قانون نے دیا تھا وہ محض دکھاوے کی بات اور وقتی پالیسی تھی؟ — اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہنا چاہتے تھے کہ مسٹر چھاگلا نے اپنے اس انتہائی قابل اعتراض اقدام کے لیے ایک خالص علمی

نوعیت کی مجلس مذاکرہ کو استعمال کرنے کا جواز تکاب کیا وہ بجائے خود قابل اعتراض اور ایک گھٹیا طریق کار کہلانے کے لائق ہے! لیکن مسٹر چھاگلا کی تقریر جب سامنے آگئی ہے تو ضمناً اس کے نکات و دلائل پر تبصرہ بھی شاید بے محل نہ ہو گا۔

اس بات سے بالکل قطع نظر کہ مسٹر چھاگلا کو حکومت ہند کا ایک وزیر ہونے کی حالت میں مسلم پرسنل لا کے مسئلہ پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے تھا یا نہیں ہمیں بڑی حیرت ہے کہ مسٹر چھاگلا نے ایسا ٹیڑھا مسئلہ جس پر ان کی حکومت کو ایک قدم اٹھا دینے کے بعد بھی پیچھے ہی ہٹنے میں معقولیت نظر آئی کیا سوچ کر از سر اٹھانے کی جرأت کی' جبکہ ان کے پاس کوئی پُر مغز بات اور کوئی موثر استدلال اس معاملہ میں نہیں تھا! مسٹر چھاگلا ملک کے ایک نامور آدمی ہیں' ارباب علم و دانش میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اور ایک بلند پایہ ماہر قانون کی حیثیت سے دعویٰ اور دلیل کے رشتوں اور استدلال کی خامی اور پختگی کے شعور میں ایک ممتاز سطح کی توقع ہی ان سے کی جانی چاہیئے۔ لیکن کیسی خلاف توقع اور کس قدر مایوس کن بات ہے کہ ایک دعویٰ وہ انتہائی جزم و یقین بلکہ ساری جذباتی اور ہٹ دھرمی لائی مخالفتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے لہجہ میں کرتے ہیں مگر دلیل کے میدان میں ان کا ذہن اسقدر الجھاؤ' ژولیدگی اور پریشاں فکری کا نمونہ پیش کرتا ہے کہ جیسے دعویٰ اور دلیل کے رشتوں کی نزاکت اور استدلال کی خامی اور پختگی کے فرق سے نابلد کوئی آدمی طبع آزمائی کر رہا ہو۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ہند پارلیمنٹ کو مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کا حق ہے کیونکہ پارلیمنٹ کے ڈھانچے میں پانچ کروڑ مسلمانان ہند کی بھی نمائندگی ہے اس دلیل کا مطلب کیا ہوا؟ یہ کہ پارلیمنٹ کیلئے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا جواز پورے کے پورے پانچ کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کی بنیاد پر نکلتا ہے۔ یعنی یہ اصول تسلیم ہوا کہ اپنے پرسنل لا میں تبدیلی کا اصل حق مسلمانوں ہی کو ہے۔ لیکن دوسرے ہی سانس میں پارلیمنٹ کے اس حق کے لیے سکولرزم کو بنیاد بتا کر فرماتے ہیں کہ پارلیمنٹ کو صرف حق ہی نہیں بلکہ یکجہتی کی خاطر اس کا فرض ہے کہ مداخلت کرے۔

فرمائیے کہ کیا یہ دونوں دلیلیں ایک وقت میں صحیح ہو سکتی ہیں؟ اگر پارلیمنٹ کے حق مداخلت کی بنیاد مسلمانوں کی نمائندگی ہے تو پھر سیکولرزم کا ذکر مہمل۔ اور اگر سیکولرزم اس حق کی بنیاد ہے تو پھر مسلمانوں کی نمائندگی کا فلسفہ لایعنی!۔ افسوس ہمارے ایک نامور جج کو، جس نے سیکڑوں مقدمات میں دعوے اور دلائل کی قسموں کے فیصلے لکھے ہوں گے اتنا بھی شعور نہیں ہو سکا کہ وہ ایک دعوے کیلئے دو متضاد دلیلیں دے کر اچھے خاصے مضحکہ کا سامان کر رہے ہیں۔

اور پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ آپ کی پیش کردہ یہ نظیر ہے کہ "پریوی کونسل کے جج مسلم پرسنل لا کے مقدمات کا فیصلہ کرتے رہے ہیں۔" پہلے تو اس کا ماتم کیجیے کہ آزاد جمہوریہ ہند کا ایک وزیر آزاد ہندوستان کے مسائل میں اس برطانوی قانون اور اقتدار کے دور کی نظیر لاتا ہے جس میں آزادی کا بنیادی انسانی حق مانگنے پہ جیل اور کالے پانی کا فیصلہ صادر ہوتا تھا اور ان فیصلوں کی بنیاد پر گاندھی اور جواہر لال تک نے بار بار جیل کی ہوا کھائی ہے! تو کیا مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں پریوی کونسل کے اختیارات سے دلیل لانے والے صاحب یہ بھی کہیں گے کہ داعیان حریت کے مقدمات میں جو فیصلے ان دنوں صادر ہوتے تھے وہ صحیح تھے؟۔ خیر چھوڑیے اس پہلو کو اور بحیثیت نظیر ذرا غور کیجیے تو اس سے بھی زیادہ ماتم مسٹر چھاگلا کی قانون دانی کا کرنا پڑے گا کہ موصوف مسلم پرسنل لا میں غیر مسلموں کو ترمیم کا اختیار بخشوانے کے لیے نظیر بنا رہے ہیں مسلم پرسنل لا کے مقدمات میں غیر مسلم ججوں کے فیصلے تسلیم کیے جانے کو حالانکہ دونوں باتوں میں کوئی ڈھکا چھپا فرق نہیں بالکل کھلا اور بدیہی فرق ہے۔ ایک جگہ سوال قانون سازی کا ہے اور دوسری جگہ قانون کے ماتحت فیصلہ کا۔

مسٹر چھاگلا اور ان کے ہم ذہن لوگ مسلمانوں کو بدنام کرتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل میں ان کا انداز فکر جذباتی ہوتا ہے مگر مسٹر چھاگلا کے ساتھ یہ بڑی رعایت ہوگی کہ ہم ان کی اس تقریر کو جذباتیت پر مبنی قرار دیں۔ ورنہ پھر کہنا پڑے گا کہ اس تقریر کے پیچھے کوئی ذہنی خلوص نہیں ہے بلکہ کوئی خاص مقصد ہے جس کے حصول کی خاطر اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ حال یا تو کسی مسئلہ میں محض جذباتی فکر رکھنے والے کا ہوتا کہ

اس کی کاوش، استدلال کسی اصولی بنیاد کی پابند نہیں ہوتی بلکہ جس بات سے بھی ذرا سا سہارا ملے اسے دلیل بنا لیتا ہے یا پھر یہ کیفیت اس آدمی کی ہوتی ہے جس کے دعوے میں کسی ذہنی خلوص کے بجائے کسی خاص مقصد کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مسٹر چھاگلا کا اپنی اس تقریر میں (جیسا کہ اوپر کے مختصر سے جائزہ سے بخوبی عیاں ہوتا ہے) بالکل یہی حال ہے کہ ان کے دلائل میں کوئی یکسانیت اور کوئی اصولی ہم آہنگی نہیں ملتی بلکہ استدلال کے منطقی ضابطہ تک کی پابندی مفقود نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ پارلیمنٹ کو مسلمانوں کا نمائندہ ثابت کر کے اس کو یہ حق دلوانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام معاملات میں دخیل ہو۔ اور وہ دوسری طرف محض سیکولرزم کی بنیاد پر دعویٰ کرتے ہیں کہ پارلیمنٹ حقدار ہی نہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ تمام باشندگانِ ہند کو ایک مشترک سماجی ضابطہ کے تحت لائے، حالانکہ یہاں فوراً ہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمنٹ کا یہ فرض مسلّم ہے تو پھر مسلمانوں کی نمائندگی اور عدم نمائندگی کو اس مسئلہ میں کیا دخل رہ جاتا ہے؟ اسی طرح استدلال کے منطقی ضابطہ سے بے نیازی کا نمونہ پریوی کونسل کے فیصلوں کی وہ نظیر ہے جو موصوف نے اس بارے میں پیش فرمائی اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہونچنے کے لیے مجبور ہیں کہ چھاگلا صاحب یا تو مسلم پرسنل لا میں تغیر یعنی اس کے خاتمہ کے مسئلہ میں محض جذباتی ہیں (یعنی ایک ذاتی پسند اور طبعی رجحان کے طور پر ان کے اندر شدید خواہش ہے کہ ہندستان میں مسلمان اپنی معاشرتی انفرادیت کو خیرباد کہہ دیں جس کے لیے مسلم پرسنل لا کا خاتمہ نہایت موثر قدم ہو) یا پھر اس مسئلہ میں جس نقطۂ نظر کا اظہار وہ کر رہے ہیں وہ کسی ذہنی خلوص اور فکری دیانت پر مبنی نہیں بلکہ کوئی ذاتی مقصد اور منفعت اس سے وابستہ ہے۔

ہم مسٹر چھاگلا کی نیت کو الزام دینا پسند نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ یہ ماننا مناسب سمجھتے ہیں کہ ان پر جذباتیت طاری ہے۔ وہ مسئلہ کو اپنے ذہنی رجحان کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور اس لئے انھیں احساس نہیں کہ مسئلہ کس انداز پر گفتگو چاہتا ہے۔ درانحالیکہ اسی تقریر میں انھوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ "نہایت نازک الجھا ہوا بلکہ متنازعہ مسئلہ ہے" اسی کے ساتھ ہمارا خیال ہے کہ وہ ایک اور مشکل میں بھی گرفتار ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان کے نزدیک سیکولرزم کا تصور یہ ہے کہ خالص عبادتی رسوم و اعمال میں تو لوگوں کو اپنے اپنے مذہبی طریقوں کی آزادی

حاصل رہے لیکن اس کے علاوہ جس طرح ملک کی سیاسی زندگی میں کسی مذہبی تفریق و امتیاز کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے اسی طرح معاشرتی زندگی میں بھی جہاں تک قانونی دائرہ کا تعلق ہے کسی مذہبی انفرادیت کو تسلیم نہیں کیا جانا چاہیئے۔

ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ چھاگلا صاحب کا یہ تصور صحیح ہے یا غلط البتہ ہم انھیں توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ملک کے دستور سازوں اور اس دستور پر مبنی حکومت کے ذمہ داروں نے آج تک برابر ملک کے سامنے اپنے سکولرزم کی تشریح سیاسی سکولرزم سے کی ہے جسکو دستور کی ترتیب کے وقت سے لگایئے تو پندرہ سال ورنہ اس دستور کے اصولی خاکہ کے ان اعلانات کے وقت سے لگایا جائے جو کانگریس اپنی تحریک آزادی کے دورمیں کرتی رہی تھی تو پھر اس تشریح کو کم و بیش چالیس سال کا تسلسل حاصل ہو جاتا ہے ایسی صورت میں مسٹر چھاگلا اور ان کے ہم خیالوں کو سوچنا چاہیئے کہ ان کے یا کسی کے لئے بھی اس بات میں کوئی معقولیت اور اس کا کوئی جواز ہے کہ سیکولرازم کا جو تصور کبھی ہندوستانی عوام کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا اور اس کے لئے قطعاً ان کی مرضی حاصل نہیں کی گئی تھی اس کے مخصوص تقاضے یہ کہہ کر عوام پر تھوپنے کی کوشش کی جائے کہ یہ سیکولرزم کا تقاضا ہے؟ اگر مسٹر چھاگلا اس نکتہ پر غور کرلیں تو پھر غالباً ان کی سمجھ میں یہ بات بھی آجائے گی کہ پارلیمنٹ کو مسلمانوں کی نمائندگی کی بنیاد پر بھی اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ ان کی اپنی خواہش کے بغیر ان کے پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت کرے۔

تاخیر کی معذرت

بہت افسوس ہے کہ الفرقان کا یہ شمارہ کامل ایک ماہ کے انتظار کے بعد ناظرین کی خدمت میں پہونچ رہا ہے۔ اور اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کتابت کے معاملہ میں کاتب صاحبان کی معذوریوں نے بے بس بنا دیا ورنہ اس درجہ تاخیر سے خریداروں کی ذہنی کوفت کے علاوہ خود دفتر بعض پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے ——— اس شمارہ میں ناظرین کچھ زیادہ صفحات پائیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ۱۵ جنوری تک بھی پرچہ شائع نہیں ہو سکا تو یکم فروری کو دو ماہ کا مشترک نکالنے کی کوشش شروع کر دی گئی ہے مگر یہ پروگرام بھی کتابت کی دشواری نے پورا نہیں ہونے دیا تو پھر جتنے مضامین کی کتابت وقت کے اندر ہو گئی تھی انتے ہی استثنائی طور پر سب ہی ہدیہ ناظرین کر دینا اچھا معلوم ہوا اب انشاء اللہ آئندہ ماہ کا رسالہ رمضان اور شوال کی مشترک اشاعت کے طور پر شائع ہوگا۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

کتاب الصوم

توحید و رسالت کی شہادت کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اسلام کے عناصر اربعہ ہیں ـــــ وہ حدیثیں اسی سلسلۂ معارف الحدیث کے بالکل شروع میں ذکر کی جاچکی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچوں چیزوں کو اسلام کے ارکان اور بنیادی ستون بتایا ہے۔ ان کے ارکان اور عناصر ہونے کا مطلب جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے یہ ہے کہ اسلام اللہ کی فرمانبرداری والے جس طرز حیات کا نام ہے اس کی تخلیق و تعمیر اور نشو و نما میں ان پانچوں کو خاص الخاص دخل ہے ـــ اس لحاظ سے نماز اور زکوٰۃ کی جو تاثیری خصوصیات ہیں وہ اپنے موقع پر ذکر کی جاچکی ہیں۔ روزہ کی اس تاثیر و خصوصیت کا ذکر خود قرآن مجید میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے ـــــ سورۂ بقرہ میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا اعلان فرمانے کے ساتھ ہی ارشاد فرمایا گیا ہے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" یعنی اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو ـــ یہ تقویٰ اسلام یعنی اللہ کی فرمانبرداری والی زندگی ہی کا دوسرا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو روحانیت اور حیوانیت کا یا دوسرے الفاظ میں کہئے کہ ملکوتیت اور بہیمیت کا نسخہ جامعہ بنایا ہے، اس کی طبیعت اور جبلت میں وہ سارے مادی

اور سفلی تقاضے بھی ہیں جو دوسرے حیوانوں میں ہوتے ہیں، اور اسی کے ساتھ اس کی فطرت میں روحانیت اور ملکوتیت کا وہ نورانی جوہر بھی ہے جو ملاءِ اعلیٰ کی لطیف مخلوق فرشتوں کی خاص دولت ہے۔ انسان کی سعادت کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کا یہ روحانی اور ملکوتی عنصر بہیمی اور حیوانی عنصر پر غالب اور حاوی رہے اور اس کو حدود کا پابند رکھے، اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ بہیمی پہلو روحانی اور ملکوتی پہلو کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا عادی ہو جائے اور اس کے مقابلے میں سرکشی نہ کر سکے ـــــ روزہ کی ریاضت کا خاص مقصد و موضوع یہی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی حیوانیت اور بہیمیت کو اللہ کے احکام کی پابندی اور ایمانی و روحانی تقاضوں کی تابعداری و فرمانبرداری کا خوگر بنایا جائے۔ ـــــ اور چونکہ یہ چیز نبوت و شریعت کے خاص مقاصد میں سے ہے اسلیے پہلی تمام شریعتوں میں بھی روزہ کا حکم رہا ہے، قرآن مجید میں اس اُمت کو روزہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ (البقرہ۔ ع ۲۳)	اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی اُمتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے۔ (روزوں کا یہ حکم تم کو اس لیے دیا گیا ہے) تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

بہر حال روزہ چونکہ انسان کی قوت بہیمی کو اس کی ملکوتی اور روحانی قوت کے تابع رکھنے اور اللہ کے احکام کے مقابلہ میں نفس کی خواہشات اور پیٹ اور شہوت کے تقاضوں کو دبانے کی عادت ڈالنے کا خاص ذریعہ اور وسیلہ ہے اس لیے اگلی اُمتوں کو بھی اس کا حکم دیا گیا تھا، اگرچہ روزوں کی مدت اور بعض دوسرے تفصیلی احکام میں ان اُمتوں کے خاص حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کچھ فرق بھی تھا ـــــ اس آخری اُمت کے لیے جس کا دور دنیا کے آخری دن تک ہے سال میں ایک مہینے کے روزے فرض کیے گئے ہیں اور روزہ کا وقت طلوعِ سحر سے غروبِ آفتاب تک رکھا گیا ہے اور بلاشبہ یہ مدت اور یہ وقت مذکورہ بالا مقصد کے لیے

اس دور کے واسطے مناسب ترین اور نہایت معتدل مدت اور وقت ہے، اس سے کم میں ریاضت اور نفس کی تربیت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، اور اگر اس سے زیادہ رکھا جاتا مثلاً روزہ میں دن کے ساتھ رات بھی شامل کر دی جاتی اور بس سحر کے وقت کھانے پینے کی اجازت ہوتی یا سال میں دو چار مہینے مسلسل روزے رکھنے کا حکم ہوتا تو انسانوں کی اکثریت کے لیے ناقابل برداشت اور صحتوں کے لیے مضر ہوتا۔ بہرحال طلوعِ سحر سے غروبِ آفتاب تک کا وقت اور سال میں ایک مہینہ کی مدت اس دور کے عام انسانوں کے حالات کے لحاظ سے ریاضت و تربیت کے مقصد کے لیے بالکل مناسب اور معتدل ہے۔

پھر اس کے لیے مہینہ وہ مقرر کیا گیا ہے جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا اور جس میں بیحساب برکتوں اور رحمتوں والی رات (لیلۃ القدر) ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ یہی مبارک مہینہ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہو سکتا تھا ــــــ پھر اس مہینہ میں دن کے روزوں کے علاوہ رات میں بھی ایک خاص عبادت کا عمومی اور اجتماعی نظام قائم کیا گیا ہے جو تراویح کی شکل میں امت میں رائج ہے ــــــ دن کے روزوں کے ساتھ ساتھ رات کی تراویح کی برکات مل جانے سے اس مبارک مہینہ کی نورانیت اور تاثیر میں وہ اضافہ ہو جاتا ہے جس کو اپنے اپنے ادراک و احساس کے مطابق ہر وہ بندہ محسوس کرتا ہے جو ان باتوں سے کچھ بھی تعلق اور مناسبت رکھتا ہے۔

ان مختصر تمہیدی اشارات کے بعد رمضان اور روزہ وغیرہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ذیل میں پڑھیے!

ماہِ رمضان کے فضائل و برکات:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ جَهَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَفِيْ رِوَايَةٍ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ۔

ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں۔

(اور ایک روایت میں بجائے "ابواب جنت" کے "ابواب رحمت" کا لفظ ہے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) استاذ الاساتذہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ــــــ اللہ کے صالح اور اطاعت شعار بندے رمضان میں چونکہ طاعات و حسنات میں مشغول و منہمک ہو جاتے ہیں، وہ دنوں کو روزہ رکھ کے ذکر و تلاوت میں گزارتے ہیں اور راتوں کا بڑا حصہ تراویح و تہجد اور دعا و استغفار میں بسر کرتے ہیں اور ان کے انوار و برکات سے متاثر ہو کر عوام مومنین کے قلوب بھی رمضان مبارک میں عبادات اور نیکیوں کی طرف زیادہ راغب اور بہت سے گناہوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں تو اسلام اور ایمان کے حلقے میں سعادت اور تقوے کے اس عمومی رجحان اور نیکی اور عبادت کی اس عام فضا کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ تمام طبائع جن میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے اللہ کی مرضیات کی جانب مائل اور شر و خباثت سے متنفر ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اس ماہ مبارک میں تھوڑے سے عمل خیر کی قیمت بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوسرے دنوں کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھا دی جاتی ہے تو ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور جہنم کے دروازے ان پر بند کر دیئے جاتے ہیں، اور شیاطین ان کو گمراہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہو جاتے ہیں۔

اس تشریح کے مطابق ان تینوں باتوں (یعنی جنت و رحمت کے دروازے کھل جانے، دوزخ کے دروازے بند ہو جانے اور شیاطین کے مقید اور بے بس کر دیے جانے) کا تعلق صرف اُن اہل ایمان سے ہے جو رمضان مبارک میں خیر و سعادت حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے اور رمضان کی رحمتوں اور برکتوں سے مستفید ہونے کے لیے عبادات و

حسنات کو اپنا شغل بناتے ہیں ـــــ باقی رہے وہ کفار اور خدا ناشناس اور وہ خدا فراموش اور غفلت شعار لوگ جو رمضان اور اس کے احکام و برکات سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتے اور نہ اس کے آنے پر ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی بشارتوں کا اُن سے کوئی تعلق نہیں، انھوں نے جب اپنے آپ کو خود ہی محروم کر لیا ہے اور بارہ مہینے شیطان کی پیروی پر وہ مطمئن ہیں تو پھر اللہ کے یہاں بھی ان کے لیے محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ اَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَ مَرَدَةُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَفُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَيُنَادِيْ مُنَادٍ يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ اَقْبِلْ وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذَالِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ ـــــ رواہ الترمذی وابن ماجۃ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنات جکڑ دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے سارے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ بھی کھلا نہیں رہتا، اور جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اس کا کوئی دروازہ بھی بند نہیں کیا جاتا، اور اللہ کا منادی پکارتا ہے کہ اے خیر اور نیکی کے طالب قدم بڑھائے آ اور اے بدی اور بدکرداری کے شائق رُک، آگے نہ آ! اور اللہ کی طرف سے بہت سے (گنہگار) بندوں کو دوزخ سے رہائی دیجاتی ہے (یعنی ان کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے) اور یہ سب رمضان کی ہر رات میں ہوتا ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(**تشریح**) اس حدیث کے ابتدائی حصہ کا مضمون تو وہی ہے جو اس سے پہلی حدیث کا تھا، آخر میں عالم غیب کے منادی کی جس ندا کا ذکر ہے اگرچہ ہم اُس کو اپنے کانوں سے

نہیں سنتے اور نہیں سن سکتے۔ لیکن اس کا یہ اثر اور یہ ظہور ہم اس دنیا میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ رمضان میں عموماً اہلِ ایمان کا رجحان اور میلان خیر و سعادت والے اعمال کی طرف بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ بہت سے غیر محتاط اور آزاد منش عامی مسلمان بھی رمضان میں اپنی روش کو کچھ بدل لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ ملاءِ اعلیٰ کی اُس ندا اور پکار ہی کا ظہور اور اثر ہے۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ وَكَانَ اَجْوَدَ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ كَانَ جِبْرَئِيْلُ يَلْقَاهُ كُلَّ لَيْلَةٍ فِيْ رَمَضَانَ يَعْرِضُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنَ فَاِذَا لَقِيَهُ جِبْرَئِيْلُ كَانَ اَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ ـــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر کی بخشش اور خلق اللہ کی نفع رسانی میں اللہ کے سب بندوں سے فائق تھے اور رمضان مبارک میں آپ کی یہ کریمانہ صفت اور زیادہ ترقی کر جاتی تھی۔ رمضان کی ہر رات میں جبرئیل امین آپ سے ملتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو قرآن مجید سناتے تھے، تو جب روزانہ جبرئیل آپ سے ملتے تو آپ کی اس کریمانہ نفع رسانی اور خیر کی بخشش میں اللہ کی بھیجی ہوئی ہواؤں سے بھی زیادہ تیزی آجاتی۔ اور زور پیدا ہو جاتا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) گویا رمضان مبارک کا مہینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع مبارک کے لیے بہار اور بسط کا اور نشرِ خیر کی صفت میں ترقی کا مہینہ تھا، اور اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ اس مہینہ کی ہر رات میں اللہ کے خاص پیغامبر جبرئیل امین آتے تھے اور آپ اُن کو قرآن مجید سناتے تھے۔

رمضان کی آمد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ:-

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ آخِرِ يَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَّقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَ وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ لَهٗ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْءٌ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَيْسَ كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ ـــــــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا ـــــ اس میں آپ نے فرمایا، "اے لوگو تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ افگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس

مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا۔ اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لیے) افطار کرایا تو اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے ــــــ آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرادے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض یعنی کوثر سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔ (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے۔ (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اور جو آدمی اس مہینے میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف اور کمی کردے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا اور اس کو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے دے گا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس خطبۂ نبوی کا مطلب و مدعا واضح ہے تاہم اس کے چند اجزار کی مزید وضاحت کے لیے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ (۱) اس خطبہ میں ماہ رمضان کی سب سے بڑی اور پہلی عظمت و فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں ایک ایسی رات ہوتی ہے جو ہزار دنوں اور راتوں سے نہیں، بلکہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یہ بات جیسا کہ معلوم ہے قرآن مجید سورۃ القدر میں بھی فرمائی گئی ہے بلکہ اس پوری سورۃ میں اس مبارک رات کی عظمت اور فضیلت ہی کا بیان ہے اور اس رات کی عظمت و اہمیت سمجھنے کیلئے بس یہی بات کافی ہے۔

ایک ہزار مہینوں میں قریباً تیس ہزار راتیں ہوتی ہیں، اس لیلۃ القدر کے ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مطلب یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے اور اُس کے قرب و رضا کے طالب بندے اس ایک رات میں قرب الٰہی کی اتنی مسافت طے کر سکتے ہیں جو دوسری ہزاروں راتوں میں طے نہیں ہو سکتی۔ ہم جس طرح اپنی اس مادی دُنیا میں دیکھتے ہیں کہ تیز رفتار ہوائی جہاز یا راکٹ کے ذریعہ اب ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ میں اس سے زیادہ مسافت طے کی جا سکتی ہے جتنی پرانے زمانے میں سیکڑوں برس میں طے ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح حصول رضائے خداوندی اور قرب الٰہی کے سفر کی رفتار لیلۃ القدر میں اتنی تیز کر دی جاتی ہے کہ جو بات صادق طالبوں کو سیکڑوں مہینوں میں حاصل نہیں ہو سکتی وہ اس مبارک رات میں حاصل ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اور اسی کی روشنی میں حضورؐ کے اس ارشاد کا بھی مطلب سمجھنا چاہیے کہ اس مبارک مہینہ میں جو شخص کسی قسم کی نفلی نیکی کرے گا اس کا ثواب دوسرے زمانہ کی فرض نیکی کے برابر ملے گا، اور فرض نیکی کرنے والے کو دوسرے زمانہ کے ستر فرض ادا کرنے کا ثواب ملے گا ــــــ گویا "لیلۃ القدر" کی خصوصیت تو رمضان مبارک کی ایک مخصوص رات کی خصوصیت ہے۔ لیکن نیکی کا ثواب ستر گنا ملنا یہ رمضان مبارک کے ہر دن اور ہر رات کی برکت اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے اور ان سے مستفید اور متمتع ہونے کی توفیق دے۔

(۲) اس خطبہ میں رمضان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ صبر اور غمخواری کا مہینہ ہے۔

دینی زبان میں صبر کے اصل معنی ہیں اللہ کی رضا کے لیے اپنے نفس کی خواہشوں کو دبانا اور تلخیوں اور ناگواریوں کو جھیلنا، ظاہر ہے کہ روزہ کا اول و آخر بالکل یہی ہے، اسی طرح روزہ رکھ کر ہر روزہ دار کو تجربہ ہوتا ہے کہ فاقہ کیسی تکلیف کی چیز ہے، اس سے اُس کے اندر اُن غربا اور مساکین کی ہمدردی اور غمخواری کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ جو بیچارے ناداری کی وجہ سے فاقوں پر فاقے کرتے ہیں، اس لیے رمضان کا مہینہ بلاشبہ صبر اور غمخواری کا مہینہ ہے۔

(۳) یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اس بابرکت مہینہ میں اہلِ ایمان کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے" ـــــ اس کا تجربہ تو بلا استثنا ہر صاحبِ ایمان روزہ دار کو ہوتا ہے کہ رمضان مبارک میں جتنا اچھا اور جتنی فراغت سے کھانے پینے کو ملتا ہے باقی گیارہ مہینوں میں اتنا نصیب نہیں ہوتا، خواہ اس عالمِ اسباب میں وہ کسی بھی راستے سے آئے، سب اللہ ہی کے حکم سے اور اسی کے فیصلے سے آتا ہے۔

(۴) خطبہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "رمضان کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے، اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا وقت ہے"۔

اس عاجز کے نزدیک اس کی راجح اور دل کو زیادہ لگنے والی توجیہ اور تشریح یہ ہے کہ رمضان کی برکتوں سے مستفید ہونے والے بندے تین طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ اصحابِ صلاح و تقویٰ جو ہمیشہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام رکھتے ہیں اور جب کبھی ان سے کوئی خطا اور لغزش ہو جاتی ہے تو اسی وقت توبہ و استغفار سے اس کی صفائی و تلافی کر لیتے ہیں۔ تو ان بندوں پر تو شروع مہینہ ہی سے بلکہ اس کی پہلی ہی رات سے اللہ کی رحمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے ـــــ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ایسے متقی اور پرہیزگار تو نہیں ہیں لیکن اس لحاظ سے بالکل گئے گزرے بھی نہیں ہیں تو ایسے لوگ جب رمضان کے ابتدائی حصہ میں روزوں اور دوسرے اعمالِ خیر اور توبہ و استغفار کے ذریعہ اپنے حال کو بہتر اور اپنے کو رحمت و مغفرت کے لائق بنا لیتے ہیں تو درمیانی حصہ میں ان کی بھی مغفرت اور معافی کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے ـــــ اور تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے نفسوں پر بہت ظلم کر چکے ہیں اور ان کا حال بڑا ابتر رہا ہے اور اپنی بداعمالیوں سے وہ گویا

دوزخ کے پورے پورے مستحق ہو چکے ہیں وہ بھی جب رمضان کے پہلے اور درمیانی حصہ میں عام مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھ کے اور توبہ و استغفار کر کے اپنی سیاہ کاریوں کی کچھ صفائی اور تلافی کر لیتے ہیں تو اخیر عشرہ میں جو دریائے رحمت کے جوش کا عشرہ ہے اللہ تعالیٰ دوزخ سے ان کی بھی نجات اور رہائی کا فیصلہ فرما دیتا ہے ۔۔۔۔۔ اس تشریح کی بنا پر رمضان مبارک کے ابتدائی حصہ کی رحمتؒ ، درمیانی حصہ کی مغفرتؒ اور آخری حصہ میں جہنم سے آزادی کا تعلق بالترتیب اُمت مسلمہ کے ان مذکورہ بالا تین طبقوں سے ہوگا۔ واللہ اعلم۔

روزہ کی قدر و قیمت اور اس کا صلہ:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ یُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ یَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِیْ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْیَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِیْحِ الْمِسْكِ وَالصِّیَامُ جُنَّةٌ وَاِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ امْرُءٌ صَائِمٌ ۔۔۔۔۔۔ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی فضیلت اور قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آدمی کے ہر اچھے عمل کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھایا جاتا ہے (یعنی اس اُمتِ مرحومہ کے اعمالِ خیر کے متعلق عام قانونِ الٰہی یہی ہے کہ ایک نیکی کا اجر اگلی امتوں کے لحاظ سے کم از کم دس گنا ضرور عطا

ہوگا اور بعض اوقات عمل کرنے والے کے خاص حالات اور اخلاص و خشیت وغیرہ کیفیات کی وجہ سے اس سے بھی بہت زیادہ عطا ہوگا، یہاں تک کہ بعض مقبول بندوں کو اُن کے اعمالِ حسنہ کا اجر سات سو گنا عطا فرمایا جائے گا ۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس عام قانونِ رحمت کا ذکر فرمانے کے بعد فرمایا کہ) مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزہ اس عام قانون سے مستثنیٰ اور بالاتر ہے، وہ بندہ کی طرف سے خاص میرے لیے ایک تحفہ ہے اور میں ہی (جس طرح چاہوں گا) اس کا اجر و ثواب دوں گا۔ میرا بندہ میری رضا کے واسطے اپنی خواہشِ نفس اور اپنا کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے (پس میں خود ہی اپنی مرضی کے مطابق اس کی اس قربانی اور نفس کشی کا صلہ دوں گا) روزہ دار کے لیے دو مسرتیں ہیں۔ ایک افطار کے وقت اور دوسری اپنے مالک و مولیٰ کی بارگاہ میں حضوری اور شرفِ باریابی کے وقت۔ اور قسم ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی بہتر ہے۔ (یعنی انسانوں کے لیے مشک کی خوشبو جتنی اچھی اور جتنی پیاری ہے، اللہ کے ہاں روزہ دار کے منہ کی بو اس سے بھی اچھی ہے) اور روزہ (دنیا میں شیطان و نفس کے حملوں سے بچاؤ کے لیے اور آخرت میں آتشِ دوزخ سے حفاظت کے لیے) ڈھال ہے۔ اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیے کہ وہ بیہودہ اور فحش باتیں نہ بکے اور شور و شغب نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا اس سے گالی گلوج یا جھگڑا ٹنٹا کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے اکثر وضاحت طلب اجزاء کی تشریح ترجمہ کے ضمن میں کر دی گئی ہے۔ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی کا روزہ ہو تو وہ فحش اور گندی باتیں اور شور و شغب بالکل نہ کرے، اور اگر بالفرض کوئی دوسرا اس سے اُلجھے اور گالیاں بکے جب بھی یہ کوئی سخت بات نہ کہے، بلکہ صرف

اتنا کہدے کہ "بھائی میرا روزہ ہے" ___ اس آخری روایت میں اشارہ ہے کہ اس حدیث میں روزہ کی جو خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان کی گئی ہیں یہ انہی روزوں کی ہیں جن میں شہوتِ نفس اور کھانے پینے کے علاوہ گناہوں سے حتیٰ کہ بُری اور ناپسندیدہ باتوں سے بھی پرہیز کیا گیا ہو ___ ایک دوسری حدیث میں (جو عنقریب درج ہوگی) فرمایا گیا ہے کہ "جو شخص روزہ رکھے لیکن بُرے کاموں اور غلط باتوں سے پرہیز نہ کرے تو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی اللہ کو کوئی احتیاج نہیں ہے۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ اِنَّ فِى الْجَنَّةِ بَابًا يُقَالُ لَهُ الرَّيَّانُ يَدْخُلُ مِنْهُ الصَّائِمُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَيْرُهُمْ يُقَالُ اَيْنَ الصَّائِمُوْنَ؟ فَيَقُوْمُوْنَ لَا يَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَيْرُهُمْ فَاِذَا دَخَلُوْا اُغْلِقَ فَلَمْ يَدْخُلْ مِنْهُ اَحَدٌ ___ رواه البخاری ومسلم

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے دروازوں میں ایک خاص دروازہ ہے جس کو "بابُ الرَّیّان" کہا جاتا ہے۔ اس دروازہ سے قیامت کے دن صرف روزہ داروں کا داخلہ ہوگا۔ ان کے سوا کوئی اس دروازہ سے داخل نہیں ہو سکے گا ___ اس دن پکارا جائے گا کہ کدھر ہیں وہ بندے جو اللہ کے لیے روزے رکھا کرتے تھے اور بھوک پیاس کی تکلیف اٹھایا کرتے تھے) وہ اس پکار پر چل پڑیں گے، ان کے سوا کسی اور کا اس دروازہ سے داخلہ نہیں ہو سکے گا، جب وہ روزہ دار اس دروازہ سے جنت میں پہونچ جائیں گے تو یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا، پھر کسی کا اس سے داخلہ نہیں ہو سکے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) روزہ میں جس تکلیف کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے اور جو روزہ دار کی سب سے بڑی قربانی ہے وہ اس کا پیاسا رہنا ہے۔ اس لیے اس کو جو صلہ اور انعام دیا جائے اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور غالب پہلو سیرابی کا ہونا چاہیے۔ اسی

مناسبت سے جنت میں روزہ داروں کے داخلہ کے لیے جو مخصوص دروازہ مقرر کیا گیا ہے اُس کی خاص صفت سیرابی و شادابی ہے۔ رَیَّانَ کے لغوی معنی ہیں پورا پورا سیراب، یہ بھرپور سیرابی تو اس دروازہ کی صفت ہے جس سے روزہ داروں کا داخلہ ہوگا، آگے جنت میں پہونچ کر جو کچھ اللہ تعالیٰ کے انعامات ان پر ہوں گے ان کا علم تو بس اُس اللہ تعالیٰ ہی کو ہے جس کا ارشاد ہے کہ "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ" بندہ کا روزہ بس میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کا صلہ دوں گا۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مُرْنِیْ بِاَمْرٍ یَنْفَعُنِی اللّٰهُ بِهٖ قَالَ عَلَیْكَ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهٗ لَا مِثْلَ لَهٗ ـــــ رواہ النسائی

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کسی عمل کا حکم فرمائیے، جس سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع دے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ روزہ رکھا کرو۔ اس کی مثل کوئی بھی عمل نہیں ہے۔ (سنن نسائی)

(تشریح) نماز، روزہ، صدقہ، حج اور خلق اللہ کی خدمت وغیرہ اعمالِ صالحہ میں یہ بات مشترک ہونے کے باوجود کہ یہ سب تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں ان کی الگ الگ کچھ خاص تاثیرات اور خصوصیات بھی ہیں، جن میں ہر ایک دوسرے سے ممتاز اور منفرد ہیں ـــــ گویا، "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔

ان انفرادی اور امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ "اس کے مثل کوئی عمل نہیں ہے" ـــــ مثلاً نفس کو مغلوب اور مقہور کرنے اور اس کی خواہشوں کو دبانے کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس صفت میں کوئی دوسرا عمل روزہ کے مثل نہیں ہے ـــــ پس حضرت ابو امامہ کی اس حدیث میں روزہ کے بارہ میں جو فرمایا گیا ہے کہ "اس کے مثل کوئی عمل نہیں ہے"۔ اس کی حقیقت یہی سمجھنی چاہیے، نیز ملحوظ رہنا چاہیے کہ ابو امامہ کے خاص حالات میں اُن کے لیے زیادہ نفع مند روزہ ہی تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسی کی ہدایت

فرمائی ۔۔۔۔ اور اسی حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ ابوامامہ نے یہ جواب پانے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ بھی عرض کیا کہ "مجھے کسی عمل کا حکم فرمائیے جس کو میں کیا کروں" تو دونوں دفعہ آپ نے روزہ ہی کی ہدایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ بس روزہ رکھا کرو، اس کے مثل کوئی دوسرا عمل نہیں ہے، یعنی تمہارے خاص حالات میں تم کو اسی سے زیادہ نفع ہوگا واللہ علم۔

روزے اور تراویح باعثِ مغفرت :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ۔۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ رمضان کے روزے ایمان واحتساب کے ساتھ رکھیں گے انکے سب گزشتہ گناہ معاف کردیے جائیں گے اور ایسے ہی جو لوگ ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح وتہجد) پڑھیں گے اُن کے بھی سب پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے، اور اسی طرح جو لوگ شب قدر میں ایمان واحتساب کے ساتھ نوافل پڑھیں گے اُن کے بھی سارے پہلے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں رمضان کے روزوں، اس کی راتوں کے نوافل اور خصوصیت سے شب قدر کے نوافل کو "پچھلے گناہوں کی مغفرت اور معافی کا یقینی وسیلہ بتایا گیا ہے بشرطیکہ یہ روزے اور نوافل ایمان واحتساب کے ساتھ ہوں ۔۔۔ یہ ایمان واحتساب

خاص دینی اصطلاحیں ہیں اور ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو نیک عمل کیا جائے اس کی بنیاد اور اس کا محرک بس اللہ و رسول کو ماننا اور اُن کے وعدہ و وعید پر یقین لانا اور اُن کے بتائے ہوئے اجر و ثواب کی طمع اور امید ہی ہو، کوئی دوسرا جذبہ اور مقصد اس کا محرک نہ ہو۔ اسی ایمان و احتساب سے ہمارے اعمال کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جڑتا ہے، بلکہ یہی ایمان و احتساب ہمارے اعمال کے قلب و رُوح ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو پھر ظاہر کے لحاظ سے بڑے سے بڑے اعمال بھی بے جان اور کھوکھلے ہیں جو خدانخواستہ قیامت کے دن کھوٹے سکے ثابت ہوں گے۔ اور ایمان و احتساب کے ساتھ بندہ کا ایک عمل بھی اللہ کے ہاں اتنا عزیز اور قیمتی ہے کہ اس کے صدقہ اور طفیل میں اس کے برسہا برس کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایمان و احتساب کی یہ صفت اپنے فضل سے نصیب فرمائے۔

روزہ اور قرآن کی شفاعت :-

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَىْ رَبِّ اِنِّىْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ۔

———— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا) روزہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما (اور اس کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرما) اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو رات کے

سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما)، چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا، اور خاص مراحم خسروانہ سے نوازا جائے گا) (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) کیسے خوش نصیب ہیں وہ بندے جن کے حق میں ان کے روزوں کی اور نوافل میں ان کے پڑھے ہوئے قرآن پاک کی سفارش قبول ہوگی، یہ ان کے لیے کیسی مسرت اور فرحت کا وقت ہوگا ۔۔۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس سیاہ کار بندہ کو بھی محض اپنے کرم سے ان خوش بختوں کے ساتھ کرے!۔

رمضان کا ایک روزہ چھوڑنے کا نقصان ناقابلِ تلافی :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَفْطَرَ یَوْمًا مِّنْ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ رُخْصَةٍ وَّلَا مَرَضٍ لَمْ یَقْضِ عَنْهُ صَوْمُ الدَّهْرِ کُلِّهٖ وَاِنْ صَامَهٗ ۔۔۔۔۔ رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی والبخاری فی ترجمۃ باب۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی سفر وغیرہ کی شرعی رخصت کے بغیر اور بیماری (جیسی کسی) عذر کے بغیر رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑدے اگر اس کے بجائے عمر بھر بھی روزے رکھے تو جو چیز فوت ہوگئی وہ پوری ادا نہیں ہوسکتی۔ (مسند احمد جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی ۔۔۔۔ اور صحیح بخاری میں بھی بغیر سند کے ایک ترجمہ باب میں اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے)

(تشریح) حدیث کا مدعا اور مطلب یہ ہے کہ شرعی عذر اور رخصت کے بغیر رمضان کا ایک روزہ دانستہ چھوڑنے سے رمضان مبارک کی خاص برکتوں اور اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص

رحمتوں سے جو محرومی ہوتی ہے، عمر بھر نفل روزے رکھنے سے بھی اس محرومی اور خسران کی تلافی نہیں ہو سکتی، اگرچہ ایک روزے کی قانونی قضا ایک ہی دن کا روزہ ہے، لیکن اس سے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جو روزہ چھوڑنے سے کھویا گیا ـــــ پس جو لوگ بے پروائی کے ساتھ رمضان کے روزے چھوڑتے ہیں وہ سوچیں کہ اپنے کو وہ کتنا نقصان پہونچاتے ہیں۔

روزہ میں معصیتوں سے پرہیز:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلیه وَسَلَّمَ مَنْ لَمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ اَنْ یَدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ ـــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی روزہ رکھتے ہوئے باطل کلام اور باطل کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں روزہ کے مقبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کھانا پینا چھوڑنے کے علاوہ معصیات و منکرات سے بھی زبان و دہن اور دوسرے اعضاء کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی شخص روزہ رکھے اور گناہ کی باتیں اور گناہ والے اعمال کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے روزہ کی کوئی پروا نہیں۔

عشرۂ اخیرہ اور لیلۃ القدر

جس طرح رمضان مبارک کو دوسرے مہینوں کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے اسی طرح اس کا آخری عشرہ پہلے دونوں عشروں سے بہتر ہے اور لیلۃ القدر اکثر و بیشتر

اسی عشرہ میں ہوتی ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت وغیرہ کا اہتمام اس میں اور زیادہ کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِيْ غَيْرِهٖ ۔ ــــــ رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت وغیرہ میں وہ مجاہدہ کرتے اور وہ مشقت اُٹھاتے جو دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ (صحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَاَحْيٰى لَيْلَهٗ وَاَيْقَظَ اَهْلَهٗ ۔

ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رمضان کا عشرۂ اخیرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے اور شب بیداری کرتے (یعنی پوری رات عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے) اور اپنے گھر کے لوگوں (یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے متعلقین) کو بھی جگا دیتے (تاکہ وہ بھی ان راتوں کی برکتوں اور سعادتوں میں حصہ لیں۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ ۔

ــــــ رواہ البخاری

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ شب قدر زیادہ تر عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں سے

کوئی ایک رات ہوتی ہے، یعنی اکیسویں یا تیئسویں یا پچیسویں، یا ستائیسویں یا انتیسویں شب قدر کی اگر اس طرح تعیین کر دی جاتی کہ وہ خاص فلاں رات ہے تو بہت سے لوگ بس اسی رات میں عبادت وغیرہ کا خاص اہتمام کیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس طرح مبہم رکھا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ قرآن شب قدر میں نازل ہوا، اور دوسری جگہ فرمایا گیا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا۔ اس سے اشارہ ملا کہ وہ شب قدر رمضان کی راتوں میں سے کوئی رات تھی ـــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید نشاندہی کے طور پر فرمایا کہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اس کا زیادہ امکان ہے لہذا ان راتوں کا خاص اہتمام کیا جائے ـــــ اس مضمون کی حدیثیں حضرت عائشہ صدیقہ کے علاوہ دوسرے صحابۂ کرام سے بھی مروی ہیں ـــــ اور بعض صحابہ کا خیال تھا کہ شب قدر عموماً رمضان کی ستائیسویں ہی ہوتی ہے۔

عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ قَالَ سَأَلْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ إِنَّ أَخَاكَ ابْنَ مَسْعُودٍ يَقُولُ مَنْ يَقُمِ الْحَوْلَ يُصِبْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَقَالَ رَحِمَهُ اللّٰهُ أَرَادَ أَنْ لَا يَتَّكِلَ النَّاسُ أَمَا إِنَّهُ قَدْ عَلِمَ أَنَّهَا فِي رَمَضَانَ وَ أَنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ وَ أَنَّهَا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ ثُمَّ حَلَفَ لَا يَسْتَثْنِي أَنَّهَا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ فَقُلْتُ بِأَيِّ شَيْءٍ تَقُوْلُ ذَالِكَ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ قَالَ بِالْعَلَامَةِ أَوْ قَالَ بِالْآيَةِ الَّتِي أَخْبَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا تَطْلُعُ يَوْمَئِذٍ لَا شُعَاعَ لَهَا۔ ـــــ رواہ مسلم

زر ابن حبیش جو اکابر تابعین میں سے ہیں بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آپ کے دینی بھائی عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ جو کوئی پورے سال کی راتوں میں کھڑا ہوگا (یعنی ہر رات عبادت کیا کرے گا) اس کو شب قدر نصیب ہو ہی جائے گی (یعنی لیلۃ القدر سال کی کوئی نہ کوئی رات ہوتی ہے۔ پس جو اس کی برکات کا طالب ہو

اُسے چاہیے کہ سال کی ہر رات کو عبادت سے معمور کرلے اس طرح وہ یقینی طور پر شب قدر کی برکات پاسکے گا ــــ زر بن حبیش نے حضرت ابن مسعود کی یہ بات نقل کرکے حضرت ابی بن کعبؓ سے دریافت کیا کہ آپ کا اس بارہ میں کیا ارشاد ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ بھائی ابن مسعود پر خدا کی رحمت ہو ان کا مقصد اس بات سے یہ تھا کہ لوگ (کسی ایک ہی رات کی عبادت پر) قناعت نہ کرلیں ورنہ ان کو یہ بات یقیناً معلوم تھی کہ شب قدر رمضان ہی کے مہینہ میں ہوتی ہے اور اس کے بھی خاص آخری عشرہ ہی میں ہوتی ہے (یعنی اکیسویں سے انتیسویں یا تیسویں تک) اور وہ معین ستائیسوں شب ہے۔ پھر انھوں نے پوری قطعیت کے ساتھ قسم کھا کر کہا کہ وہ بلاشبہ ستائیسویں شب ہی ہوتی ہے (اور اپنے یقین و اطمینان کے اظہار کے لیے قسم کے ساتھ) انھوں نے انشاء اللہ بھی نہیں کہا (زر بن حبیش کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ اے ابوالمنذر! (یہ حضرت اُبَیّ کی کنیت ہے) یہ آپ کس بنا پر فرماتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ میں اس نشانی کی بنا پر کہتا ہوں جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی تھی اور وہ یہ کہ شب قدر کی صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو اس کی شعاع نہیں ہوتی۔

(صحیح مسلم)

(**تشریح**) حضرت اُبَیّ بن کعب کے جواب سے معلوم ہوا کہ انھوں نے جو قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی کہ شب قدر معین طور سے ستائیسویں شب ہی ہوتی ہے، یہ بات انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنی تھی۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو ایک خاص نشانی بتائی تھی انھوں نے چونکہ وہ نشانی عموماً ستائیسویں شب کی صبح ہی کو دیکھی تھی اس لیے یقین کے ساتھ انھوں نے رائے قائم کرلی تھی ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تو یہ فرمایا کہ اس کو آخری عشرہ میں تلاش کرو، اور کبھی فرمایا کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو، کبھی عشرۂ اخیرہ کی پانچ طاق راتوں میں سے چار یا تین راتوں کے لیے فرمایا۔ کسی خاص رات کی تعیین آپ نے نہیں فرمائی، ہاں بہت سے

اصحاب ادراک کا تجربہ یہی ہے کہ وہ زیادہ تر ستائیسویں شب ہی ہوتی ہے ۔۔۔ اس عدم تعیین کی بڑی حکمت یہی ہو کہ طالب بندے مختلف راتوں میں عبادت و ذکر و دعا کا اہتمام کریں. ایسا کرنے والوں کی کامیابی یقینی ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ نَزَلَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ كُبْكُبَةٍ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْ قَاعِدٍ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شب قدر ہوتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں نازل ہوتے ہیں اور ہر اُس بندہ کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں جو کھڑا یا بیٹھا اللہ کے ذکر و عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

شب قدر کی خاص دُعا:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ عَلِمْتُ اَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ مَا اَقُوْلُ فِيْهَا قَالَ قُوْلِيْ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ ۔۔۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے بتائیے کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون رات شب قدر ہے تو میں اس رات اللہ سے کیا عرض کروں اور کیا دُعا مانگوں، آپ نے فرمایا یہ عرض کرو۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ

اے میرے اللہ تو بہت معاف فرمانے والا اور بڑا کرم فرما ہو اور معاف کر دینا تجھے پسند ہو۔ پس تو میری خطائیں معاف فرما دے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس حدیث کی بنا پر بہت سے حضرات کا یہ معمول ہے کہ وہ ہر رات میں یہ دُعا خصوصیت سے کرتے ہیں اور رمضان مبارک کی راتوں میں اور ان میں سے بھی خاص کر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اس دُعا کا اور بھی زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

اعتکاف :-

رمضان مبارک اور بالخصوص اس کے آخری عشرہ کے اعمال میں سے ایک اعتکاف بھی ہے،

اعتکاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر طرف سے یکسو اور سب سے منقطع ہو کر بس اللہ سے لو لگا کے اس کے در پہ یعنی کسی مسجد کے کونہ میں پڑ جائے اور سب سے الگ تنہائی میں اسکی عبادت اور اسی کے ذکر و فکر میں مشغول رہے، یہ خواص بلکہ اخص الخواص کی عبادت ہو، ــــ اس عبادت کے لیے بہترین وقت رمضان مبارک اور خاص کر اس کا آخری عشرہ ہی ہو سکتا تھا اسلیے اسی کو اس کے لیے انتخاب کیا گیا۔

نزولِ قرآن سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت مبارک میں سب سے یکسو اور الگ ہو کر تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کے ذکر و فکر کا جو بیتابانہ جذبہ پیدا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں آپ مسلسل کئی مہینے غارِ حرا میں خلوت گزینی کرتے رہے، یہ گویا آپ کا پہلا اعتکاف تھا اور اس اعتکاف ہی میں آپ کی روحانیت اس مقام تک پہونچ گئی تھی کہ آپ پر قرآن مجید کا نزول شروع ہو جائے۔ چنانچہ حرا کے اس اعتکاف کے آخری ایام ہی میں اللہ کے حاملِ وحی فرشتے جبرئیل سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتیں لے کر نازل ہوئے ــــ تحقیق یہ ہے کہ یہ رمضان مبارک کا مہینہ[1] اور اس کا آخری عشرہ تھا اور وہ رات شب قدر تھی۔ اس لیے بھی اعتکاف کے لیے رمضان مبارک کے آخری عشرہ کا انتخاب کیا گیا۔

---

[1] کما رواہ البیہقی واختارہ ابن اسحاق ــ راجع فتح الباری۔

رُوح کی تربیت و ترقی اور نفسانی قوتوں پر اس کو غالب کرنے کے لیے پورے مہینے رمضان کے روزے تو تمام افرادِ اُمّت پر فرض کیے گئے، گویا کہ اپنے باطن میں ملکوتیت کو غالب اور بہیمیت کو مغلوب کرنے کے لیے اتنا مجاہدہ اور نفسانی خواہشات کی اتنی قربانی تو ہر مسلمان کیلئے لازم کر دی گئی کہ وہ اس پورے محترم اور مقدس مہینے میں اللہ کے حکم کی تعمیل اور اسکی عبادت کی نیت سے دن کو نہ کھاوے، نہ پیوے نہ بیوی سے متمتع ہو، اور اسی کے ساتھ ہر قسم کے گناہوں بلکہ فضول باتوں سے بھی پرہیز کرے اور یہ پورا مہینہ ان پابندیوں کے ساتھ گزارے۔ پس یہ تو رمضان مبارک میں روحانی تربیت و تزکیہ کا عوامی اور کمپلسری نصاب مقرر کیا گیا اور اس سے آگے تعلق باللہ میں ترقی اور ملاء اعلیٰ سے خصوصی مناسبت پیدا کرنے کے لیے اعتکاف رکھا گیا۔ اس اعتکاف میں اللہ کا بندہ سب سے کٹ کے اور سب سے ہٹ کے اپنے مالک و مولا کے آستانے پر اور گویا اسی کے قدموں میں پڑجاتا ہے اسکو یاد کرتا ہے اسی کے دھیان میں رہتا ہے اس کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے، اُس کے حضور میں توبہ و استغفار کرتا ہے اپنے گناہوں اور قصوروں پر روتا ہے اور رحیم و کریم مالک سے رحمت و مغفرت مانگتا ہے، اسکی رضا اور اس کا قرب چاہتا ہے، اسی حال میں اسکے دن گزرتے ہیں اور اسی حال میں اس کی راتیں — ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی بندہ کی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہتمام سے ہر سال رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے تھے۔ بلکہ ایک سال کسی وجہ سے رہ گیا تو اگلے سال آپ نے دو عشروں کا اعتکاف فرمایا — اس تمہید کے بعد اس سلسلے کی حدیثیں پڑھیے!

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهٖ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، وفات تک آپ کا یہ معمول رہا، آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اہتمام سے اعتکاف کرتی رہیں۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) ازواجِ مطہرات اپنے حجروں میں اعتکاف فرماتی تھیں، اور خواتین کیلئے اعتکاف کی جگہ اُن کے گھر کی وہی جگہ ہو جو انھوں نے نماز پڑھنے کی مقرر کر رکھی ہو، اگر گھر میں نماز کی کوئی خاص جگہ مقرر نہ ہو تو اعتکاف کرنے والی خواتین کو ایسی جگہ مقرر کرلینی چاہیے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ فَلَمْ يَعْتَكِفْ عَامًا فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اِعْتَكَفَ عِشْرِيْنَ ـــــــــــ رواه الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے، ایک سال آپ اعتکاف نہیں کرسکے تو اگلے سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) حضرت انس کی اس روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ ایک سال اعتکاف نہ ہوسکنے کی کیا وجہ پیش آئی تھی۔ سنن نسائی اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت ابی بن کعب کی ایک حدیث مروی ہے اس میں تصریح ہے کہ ایک سال رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں آپ کو کوئی سفر کرنا پڑ گیا تھا اس کی وجہ سے اعتکاف نہیں ہوسکا تھا اس لیے اگلے سال آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔

اور صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے کہ جس سال آپ کا وصال ہوا اس سال کے رمضان میں بھی آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا تھا یہ بیس دن کا اعتکاف غالباً اس وجہ سے فرمایا تھا کہ آپ کو یہ اشارہ مل چکا تھا کہ عنقریب آپ کو اس دنیا سے اُٹھا لیا جائے گا اس لیے اعتکاف جیسے اعمال کا شغف بڑھ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَلسُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اَنْ لَا يَعُوْدَ مَرِيْضًا وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً وَلَا يَمَسَّ الْمَرْاَةَ وَلَا يُبَاشِرَهَا وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ اِلَّا لِمَا لَا بُدَّ مِنْهُ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا فِيْ مَسْجِدٍ

جامع ______ رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا کہ معتکف کے لیے شرعی دستور اور ضابطہ یہ ہے کہ وہ نہ مریض کی عیادت کو جائے، نہ نماز جنازہ میں شرکت کے لیے باہر نکلے، نہ عورت سے صحبت کرے، نہ بوس وکنار کرے اور اپنی ضرورتوں کے لیے بھی مسجد سے باہر نہ جائے سوائے اُن حوائج کے جو بالکل ناگزیر ہیں (جیسے پیشاب پاخانہ وغیرہ) اور اعتکاف (روزہ کے ساتھ ہونا چاہیے) بغیر روزہ کے اعتکاف نہیں، اور مسجد جامع میں ہونا چاہیے اس کے سوا نہیں۔

(سنن ابی داؤد)

تشریح، اس سلسلۂ معارف الحدیث میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ صحابۂ کرام میں سے جب کوئی یہ کہے کہ "سنت" یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی مسئلہ یہ ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد یا طرزِ عمل سے جانا ہے اس لیے یہ حدیث مرفوع ہی کے حکم میں ہوتا ہے، اس بنا پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں اعتکاف کے جو مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ نبوی ہدایات ہی کے حکم میں ہیں، اس کے بالکل آخر میں "مسجد جامع" کا جو لفظ ہے اس سے مراد جماعت والی مسجد ہے یعنی ایسی مسجد جس میں پانچوں وقت جماعت پابندی سے ہوتی ہو ــــ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اعتکاف کے لیے روزہ بھی شرط ہے اور جماعت والی مسجد کا ہونا بھی

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الْمُعْتَكِفِ هُوَ يَعْتَكِفُ الذُّنُوْبَ وَيُجْرٰى لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا ______ رواہ ابن ماجۃ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ (اعتکاف کی وجہ سے اور مسجد میں مقید ہو جانے کی وجہ سے) گناہوں سے بند رہتا ہے اور اس کا نیکیوں کا حساب ساری نیکیاں کرنے والے بندے کی طرح

چلتا رہتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) جب بندہ اعتکاف کی نیت سے اپنے کو مسجد میں مقید کر دیتا ہے تو اگرچہ وہ عبادت اور ذکر و تلاوت وغیرہ کے ذریعے اپنی نیکیوں میں خوب اضافہ کرتا ہے لیکن بعض بہت بڑی نیکیوں سے وہ مجبور بھی ہو جاتا ہے، مثلاً وہ بیماروں کی عیادت اور خدمت کو نہیں جا سکتا، جو بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ کسی لاچار، مسکین، یتیم اور بیوہ کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتا، جس کو حدیث میں جہاد کے درجہ کی نیکی کہا گیا ہے، کسی میت کو غسل نہیں دے سکتا، جو اگر ثواب کے لیے اور اخلاص کے ساتھ ہو تو بڑے اجر کا کام ہے، اسی طرح نماز جنازہ کی شرکت کے لیے نہیں نکل سکتا، میت کے ساتھ قبرستان نہیں جا سکتا جس کے ایک ایک قدم پر گناہ معاف ہوتے ہیں اور نیکیاں لکھی جاتی ہیں ـــــ لیکن اس حدیث میں اعتکاف والے کو بشارت سنائی گئی ہے کہ اس کے حساب اور اس کے صحیفۂ اعمال میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ سب نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں جن کے کرنے سے وہ اعتکاف کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔

کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۲۳) خواجہ ابراہیم قبادیانی کے نام۔

اس بیان میں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنی ذات و صفات اور اعمالِ پسندیدہ و ناپسندیدہ کی اطلاع دی ہے، عقل کو اس بارے میں کوئی دخل نہیں ہے۔

تمام حمد و ستائش اللہ کے لیے ہے جس نے ہم پر طرح طرح کی نعمتوں سے انعام فرمایا اور دینِ اسلام کی طرف رہنمائی فرمائی اور ہم کو اُمّتِ سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل فرمایا ——— (واضح ہو کہ) انبیاء علیہم السلام، تمام اہلِ عالم کے لیے رحمت ہیں کیونکہ حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کی خبر انھیں بزرگوں کے ذریعے ہم ناقص عقل اور کوتاہ علم انسانوں کو دی ہے اور اپنے کمالاتِ ذاتیہ و صفاتیہ پر ہماری فہمِ کوتاہ کے مطابق اطلاع بخشی ہے، نیز اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں امتیاز قائم کر کے ہمارے منافع دُنیوی و اُخروی کو ہماری مضرتوں سے ممتاز فرما دیا ——— اگر

ان بزرگوں (انبیاء علیہم السلام) کے وجود شریف کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو انسانی عقلیں اثبات صانع حقیقی میں عاجز ہوجاتیں اور اللہ تعالیٰ کے کمالات کا ادراک کرنے میں ناقص و قاصر ثابت ہوتیں (دیکھو) قدمائے فلاسفہ (حکما یونان) جو اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے تھے ـــــ منکر صانع تھے ـــــ اور چیزوں کو اپنی بیوقوفی کی وجہ سے دہر (زمانے) کی طرف منسوب کرتے تھے ـــــ نمرود بادشاہ کا مجادلہ، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے خالق ارض و سما کے اثبات میں ہوا تھا جو مشہور ہے اور قرآن میں مذکور ہے ـــــ فرعون کمبخت کہتا تھا کہ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرِي (میں اپنے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں جانتا) نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کرکے کہا ہے لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ (اگر تم نے میرے علاوہ کسی کو معبود بنایا تو تم کو ضرور بالضرور قید خانے میں ڈال دوں گا) پھر یہی بدقسمت فرعون اپنے وزیر ہامان سے کہتا ہے ـــــ يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ أَسْبَابَ السَّمٰوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلٰى إِلٰهِ مُوسٰى وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا ـــــ (اے ہامان تو میرے واسطے ایک بلند عمارت بنوا، شاید میں آسمان تک جانے کی راہوں تک پہونچ جاؤں پھر (وہاں جاکر) موسیٰؑ کے خدا کو جھانکوں ـ اور میں تو موسیٰؑ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں)

میرا حاصل کلام یہ ہے کہ محض عقل اس دولت عظمیٰ (توحید) کے اثبات میں قاصر کوتاہ ہے، اور بغیر ہدایت انبیاء علیہم السلام کے دولت خانۂ توحید کا سراغ نہیں مل سکتا ـــــ پے در پے انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری سے جب ان حضرات کی دعوت الی اللہ ـ جو کہ خالق زمین و زماں ہے (اس کی طرف دعوت) شہرت پاگئی اور ان بزرگوں کی بات اونچی اور کلمہ بلند ہوا پھر تو ہر زمانے کے کم عقل جو کہ ثبوت صانع میں تردد و شک رکھتے تھے اپنی بد اعتقادی اور غلطی پر مطلع ہو کر بے اختیار وجود صانع کے قائل ہوگئے اور چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے لگے ـــــ یہ توحید ایک ایسا نور ہے جو انوار انبیاءؑ سے حاصل ہوا ہے اور یہ ایسی نعمت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے دسترخوان سے پڑے کا راہی ہو۔

اللہ کی رحمتیں ہوں ان انبیاءؑ پر قیامت تک بلکہ ابد الآباد تک ـــــ اسی طرح تمام سماعی حقائق، تبلیغ انبیاءؑ کے ذریعے ہم تک پہونچے ہیں، مثلاً وجود صفات کمال واجب تعالے، بعثت انبیاءؑ، عصمت ملائکہ، حشر و نشر، جنت و دوزخ کا وجود، اور جنت میں دائمی عیش و راحت، دوزخ میں دائمی عذاب، اور اس جیسے عقائد جن کو شریعت نے بیان کیا ہے ـ عقل ان باتوں کے ادراک سے قاصر ہے اور ان بزرگوں انبیاء (علیہم السلام) سے سُنے بغیر ان چیزوں کے ثابت کرنے میں عقل ناقص و غیر مستقل ہے ـــــ جس طرح عقل کا راستہ حسِ ظاہری کے راستے سے اونچا ہے کہ جس بات کا ادراک، حواسِ ظاہری سے نہیں ہو سکتا، عقل اس کا ادراک کر لیتی ہے اسی طرح، طریقۂ نبوت، طریقۂ عقل سے بلند و بالا ہے ـ جو بات عقل کے ذریعے سمجھ میں نہیں آتی نبوت کے توسل سے وہ بات سمجھ میں آجاتی ہے ـــــ جو شخص اثبات معرفت حق کے لیے راہ عقل کے اوپر اور کوئی راستہ نہیں مانتا وہ درحقیقت، طریقۂ نبوت کا منکر ہے اور ایک کھلی ہوئی حقیقت کی مخالفت کرتا ہے ـــــ پس وجود انبیاء کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تاکہ وہ ـــــ شکر منعم حقیقی کی طرف جو از روئے عقل واجب ہے ـــــ ہماری رہنمائی کریں ـــــ اور تعظیم منعم حقیقی کا طریقہ ـــــ جو کہ علم و عمل سے تعلق رکھتا ہے، ہم پر ظاہر فرمائیں ـــــ اس لیے کہ جو طریقۂ تعظیم، خود اللہ تعالیٰ کے پاس سے حاصل نہ ہوا ہو وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں مقبول ہونے کے لائق نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ عقل انسانی اس طریقۂ تعظیم کو براہ راست خود معلوم کرنے سے عاجز ہے، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان غیر تعظیم کو تعظیم سمجھ بیٹھتا ہے اور حد سے ہجو کی طرف چل پڑتا ہے ـــــ حق جل مجدہٗ کی تعظیم کا طریقہ حاصل کرنے کا راستہ طریقۂ نبوت پر موقوف اور تبلیغ انبیاءؑ پر منحصر ہے ـــــ رہا اولیاء کا الہام یہ بھی انوار نبوت سے حاصل ہوتا ہے اور یہ الہام متابعت انبیاءؑ کے فیوض و برکات میں سے ہے ـــــ اگر عقل اس معاملہ میں کفایت کرتی تو فلاسفۂ یونان، جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدا و پیشوا قرار دیا ہے ـــــ ضلالت و گمراہی کے میدان میں سرگرداں نہ ہوتے اور حق تعالیٰ کو سب لوگوں سے زیادہ وہی

پہچانتے، لیکن حال یہ ہے کہ ذاتِ وصفاتِ واجبی کے بارے میں سب انسانوں سے زیادہ جاہل یہی فلاسفۂ یونان ہیں کیونکہ انھوں نے حق سبحانہ وتعالیٰ کو بے کار و معطل جانا ہے اور صرف ایک چیز (یعنی عقلِ فعّال) کے علاوہ اور کسی چیز کو اللہ تعالیٰ سے منسوب نہیں کرتے اور عقلِ فعّال بھی ان کے نزدیک اختیاری طور پر نہیں، بس یوں ہی اضطراری طریقہ سے اللہ تعالیٰ سے بن گئی ہے ـــــ یہ عقلِ فعّال انھوں نے اپنی طرف سے تراشی ہے اور وہ تمام حوادث و واقعات کو خالقِ ارض وسما سے بے تعلق رکھ کر ـــــ عقلِ فعّال کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اثر کی نسبت بجائے موثرِ حقیقی (جل مجدہٗ) کے عقلِ فعّال کی طرف کرتے ہیں ـــــ ان فلاسفہ کے نزدیک، معلول، علتِ قریبہ کے اثر کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ علتِ بعیدہ کو معلول کے حاصل ہونے میں مؤثر ہی نہیں جانتے اور اپنی جہالت کے سبب اللہ تعالیٰ کی طرف اشیاء کی نسبت نہ کرنا ہی اللہ تعالیٰ کا کمال تصور کیے ہوئے ہیں۔ اور اس کی تعطیل (بیکاری) کو ہی تعظیم سمجھ رکھا ہے، حالانکہ حضرت حق جل مجدہٗ (قرآن میں) اپنے کو خالقِ سموات وارض کہہ کر سراہتے ہیں اور اپنی مدح ربُّ المشرق والمغرب کہہ کر فرما رہے ہیں ـــــ ان نادانوں کو اپنے زعمِ فاسد میں حق تعالیٰ کی کوئی احتیاج نہیں ہے اور اس ذاتِ اقدس سے نیازمندی کا کوئی تعلق نہیں ہے ـــــ ان کو چاہیے کہ اضطرار و احتیاج کے وقت عقلِ فعّال ہی کی طرف رجوع کریں اور اسی سے اپنی حاجت پوری کرایا کریں کیونکہ وہ تمام معاملات کو اسی کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ ـــــ (مگر عجیب بات ہے کہ) عقلِ فعّال بھی ان فلاسفہ کے گمان میں اضطراری طور پر حوادثِ یومیہ صادر کرتی ہے خود مختار نہیں، لہذا اس بے چاری سے حاجت چاہنا بھی غیر معقول بات ہوگی (اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے) "منکرین کا کوئی بھی ناصر و مددگار نہیں" ـــــ یہ عقلِ فعّال آخر ہوتی کون ہے جو اشیاء کا انتظام کرے اور حوادث اس کی طرف منسوب ہوں ـــــ اس عقلِ فعّال کے نفسِ وجود اور ثبوت ہی میں ہزاروں شبہات موجود ہیں اس لیے کہ عقلِ فعّال کا تحقق وحصول ایسے غلط مقدمات پر موقوف ہے جو فلاسفہ کی ملمع کاری کا بہترین نمونہ ہیں اور جو اصولِ حقۂ اسلامیہ کے قواعد کی

دوسے (قطعی) ناتمام و ناقص ہیں ـــــ کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو اشیاء کو قادر مختار جل مجدہٗ سے بے تعلق قرار دے کر اس طرح کے ایک امرِ موہوم (عقلِ فعّال) کی طرف منسوب کر دے ـــــ بلکہ اشیاء کو بھی اس بات سے انتہائی شرم محسوس ہوتی ہے کہ وہ فلسفی کی من گھڑت عقلِ فعّال کی طرف منسوب ہوں ـــــ اشیاء اپنے نابود ہونے کو پسند کریں گی اور ہرگز اپنے وجود کو نہ چاہیں گی اس بات کے مقابلے میں کہ وجود کی نسبت، سوفسطائی اور فلسفی کے من گھڑت عقلِ فعّال سے کی جائے اور اس طرح وہ قدرتِ قادرِ مختار کی طرف منسوب ہونے کی سعادت سے محروم رہیں ـــــ

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ـــــ (ان منکرین کی زبانوں سے جو بات نکل رہی ہے بڑی سخت ہے۔ یہ محض جھوٹ بول رہے ہیں) ـــــ کفارِ دار الحرب، باوجود بت پرستی، ان فلاسفہ سے اچھے ہیں کہ وہ تنگی و پریشانی میں حضرت حق کے سامنے ہی التجا کرتے ہیں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ایک وسیلۂ شفاعت قرار دیتے ہیں (اگرچہ اُن کی بھی بت پرستی اور بتوں کے ساتھ یہ عقیدہ سراسر لغو و باطل اور شرک ہے) ـــــ یہ بات عجیب تر ہے کہ (ان نادانیوں کے باوجود) ایک جماعت ان نادانوں کو حکماء قرار دیتی ہے اور حکمت کے ساتھ منسوب کرتی ہے حالانکہ ان کے اکثر احکام جھوٹے اور مخالفِ کتاب و سنت ہیں، خصوصاً الٰہیات کے اندر جو کہ بہت ہی اعلیٰ اور روشن مقصد ہے ـــــ

ان نادانوں پر جن کے حصّے میں سراسر جہلِ مرکب آیا ہے، حکماء کا اطلاق آخر کس اعتبار سے کیا جاتا ہے؟ شاید استہزاء اور مذاق کے طور پر ان کو حکماء کہا جاتا ہو، یا جس طرح نابینا کو بینا اور بیوقوف کو عقلمند کہہ دیتے ہیں ان بے حکمتوں کو بھی حکماء کہہ دیا جاتا ہو۔ ـــــ ان بیوقوفوں (حکماء) میں ایک جماعت ایسی ہے جس نے طریقِ انبیاء علیہم السلام کو لازم قرار دیئے بغیر اُن "صوفیہ الہیہ" کی تقلید میں جو کہ ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کے متبع رہے ہیں طریقِ ریاضت و مجاہدہ کو اختیار کیا ہے اور وہ اپنے "صفائے وقت" پر فریفتہ ہو گئے ہیں، نیز اپنے خواب و خیال پر اعتماد کیے ہوئے ہیں اور اپنے "کشوفِ خیالی"

کو اپنا مقتدا بنا بیٹھے ہیں (اس طرح) خود بھی گمراہ ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ہے۔ ان کو پتہ نہیں کہ یہ صفائی جو ان کو حاصل ہے محض صفائے نفس ہے جو گمراہی کی طرف راستہ کھولتی ہے، صفائے قلب ان کو حاصل نہیں ہے جو کہ دریچۂ ہدایت ہے ــــ اس لیے کہ صفائے قلب متابعتِ انبیاء پر موقوف ہے اور تزکیۂ نفس مربوط ہے، صفائے قلب اور نفس پر حکومتِ قلب سے ــــ قلب جو کہ انوارِ الہیہ کے ظہور کا محل ہے اس قلب کی ظلمت کے باوجود جب نفس صفائی پیدا کرلیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے (اندھیرے میں) ایک چراغ جلائیں تاکہ چھپا ہوا دشمن جو گھات لگائے ہوئے ہے (یعنی ابلیس لعین) اس چراغ کی روشنی میں چھاپا مارے اور خوب تاراج و برباد کرے ــــ

الغرض طریق ریاضت و مجاہدہ، نظر و استدلال کی طرح اُس وقت اعتبار و اعتماد پیدا کرتا ہے جب کہ وہ طریق انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے ساتھ ملا ہوا ہو ــــ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے تبلیغ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تائید ان کو حاصل ہے۔ ان بزرگوں (انبیاء علیہم السلام) کا کارخانہ، ملائکۂ معصومین کے نزول کی وجہ سے دشمن لعین (ابلیس) کے کید و مکر سے محفوظ ہوتا ہے۔ آیت قرآنی اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ (بیشک میرے (خاص) بندوں پر اے ابلیس تیرا غلبہ نہیں ہوگا) ان انبیاء کے لیے نقد وقت ہے ــــ دوسروں کو یہ دولت نصیب نہیں ہوئی ہے ــــ اور شیطان لعین کے جال سے رہائی اس وقت تک متصور نہیں جب تک ان بزرگوں کی اتباع نہ کی جائے اور ان کے نقشِ قدم پر نہ چلا جائے ؎[۵]

محال است سعدی کہ راہِ صفا توان رفت جُز در پئے مصطفےٰ

تعجب ہے کہ افلاطون جو کہ فلاسفہ کا سردار ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عہدِ نبوت پائے اور برکاتِ نبوت سے بہرہ ور نہ ہو (سچ ہے) مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (اللہ تعالیٰ جس کے لیے نور مہیا نہ کرے اُس کے لیے کوئی نور نہیں ہے)۔

---

[۵] اے سعدی، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے بغیر راہِ صدق و صفا پر چلنا محال ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ـــــ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ـــــ (البتہ سابق میں ہمارا وعدہ اپنے فرستادہ بندوں کے حق میں صادر ہو چکا ہے کہ بالتحقیق پیغمبر ہی مظفر و منصور ہیں اور ہمارا جو لشکر ہے وہی غالب ہے) ـــــ عجیب معاملہ ہے کہ فلاسفہ کی ناقص عقلیں گویا کہ طریق انبیاء کی جانب ضد میں واقع ہیں مبدا میں بھی اور معاد میں بھی اور اُن فلاسفہ کے احکام، انبیاء علیہم السلام کے احکام کے مخالف ہیں، انھوں نے ایمان باللہ ورست کیا ہے اور نہ ایمان بآخرت ـــــ وہ عالم کو قدیم کہتے ہیں حالانکہ تمام اہل ملت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عالم اپنے اجزاء سمیت حادث ہے، اسی طرح فلاسفہ قیامت میں آسمان کے پھٹنے، ستاروں کے بکھرنے، پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور سمندروں کے مجتمع ہو کر بہہ پڑنے کے قائل نہیں ہیں، حالانکہ قیامت میں ان سب امور کے واقع ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ فلاسفہ حشرِ اجسام کا بھی انکار کرتے ہیں جس سے نصوص قرآنی کا انکار لازم آتا ہے ـــــ فلاسفہ کے متاخرین جنھوں نے اپنے آپ کو زمرۂ اسلام میں داخل کر لیا ہے وہ بھی فلسفہ کے اصول پر اتنے جمے ہوئے ہیں کہ آسمانوں اور ستاروں وغیرہ کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور ان چیزوں کے عدم فنا کا حکم لگاتے ہیں۔ ان کی خوراک ہی یہ ہے کہ نصوصِ قرآنی کی تکذیب اور ضروریاتِ دین کا انکار کریں ـــــ عجیب مومن ہیں کہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں مگر خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں اس کو نہیں مانتے۔ حماقت کی بھی انتہا ہو گئی ـــــ ؎

فلسفہ[ع] چوں اکثرش باشد سفہ پس کل آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است

اس جماعت فلاسفہ نے اپنی عمر کو علم منطق کی تعلیم و تعلم میں صرف کیا ہے وہ علم منطق

ع لفظ فلسفہ کے اکثر حروف س، ف، ہ (سفہ) ہیں جس کے معنی بیوقوفی کے ہیں، پس فلسفہ کا کل بھی سفہ یعنی بیوقوفی ہی ہوگا اس لیے کہ اکثر کو کل کا حکم دیا جاتا ہے ـــــ یعنی اکثر کا اور کل کا حکم ایک ہوتا ہے۔

جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جو خطائے فکری سے محفوظ رکھتا ہے اور اس فن میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں، مگر حال یہ ہے کہ جب یہ لوگ ذات و صفات خداوندی پر پہونچے جو کہ مقصدِ اعلیٰ ہے ــ تو اپنے حواس کھو بیٹھے اور اس آلے کو اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا جس کو خطا سے بچانے والا کہتے تھے اور ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے گمراہی کے بیابان میں رہ گئے ــ بالکل اس طرح کہ جیسے کوئی سپاہی سالہا سال آلاتِ حرب کو تیار کرے اور جب جنگ کا وقت آجائے تو اس کے چھکے چھوٹ جائیں اور وہ اُن ہتھیاروں کو استعمال نہ کر سکے ــ لوگ علوم فلسفی کو مکمل و صحیح اور غلطی و خطا سے محفوظ جانتے ہیں۔ ہم اس کو تسلیم بھی کرلیں تو یہ بات صرف ان علوم میں صادق آئے گی جن میں عقل کو استقلال و دخل خاص ہو، اور ایسے علوم ہماری بحث سے خارج ہیں اور لایعنی و بے فائدہ کے دائرے میں داخل ہیں۔ یہ علوم، آخرت میں جو کہ دائمی ہے ــ کارآمد نہیں ــ اور نجاتِ اُخروی ان سے متعلق نہیں ہے ــ کلام تو ان علوم میں ہو رہا ہے جن کو عقل سمجھنے سے عاجز ہوتی ہے اور جو طریقۂ نبوت سے وابستہ ہیں اور نجاتِ اُخروی اُن سے مربوط ہے ــــ .... الٰہیات میں اور ذات و صفات و افعالِ واجب جلّ سلطانہ میں جو نادانیاں انھوں نے بگھاری ہیں، اور ایمانِ باللہ اور ایمان بیوم آخر میں جو جو مخالفتیں نصوصِ قرآنیہ کی انھوں نے کی ہیں اُن کا تھوڑا سا بیان اوپر گذر چکا ہے ــ رہ گیا علم ہندسہ وغیرہ جو ان فلاسفہ سے یک گونہ مخصوص ہے اگر یہ علم تام و مکمل بھی ہو تو (آخرت میں) کیا کام آئے گا اور کون سا عذاب اور وبالِ آخرت یہ دور کرے گا...... اور جو علم، آخرت میں کام نہ آئے لایعنی ہے ــــ علم منطق جو کہ فکرِ صحیح اور فکرِ سقیم میں امتیاز کرنے کا ایک آلہ ہے اور جس کو خطا سے محفوظ رکھنے والا کہتے ہیں وہ علم منطق جب ان فلاسفہ کے ہی کام نہ آیا اور اس نے مقصدِ اعلیٰ میں اُن کو غلطی و خطا سے نہ نکالا تو پھر دوسروں کے کام کیسے آجائے گا اور دوسروں کو خطا سے رہائی کیسے دے گا؟ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (اے ہمارے رب ہمارے

دلوں کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کرنا اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرمانا، بیشک تو بڑا عطا کرنے والا ہے) بعض لوگ جو کہ علوم فلسفیہ کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور فلسفے کی ملمع کاری پر فریفتہ ہیں وہ اس جماعت فلاسفہ کو حکماء جانتے ہیں اور (نعوذ باللہ) انبیاء علیہم السلام کی مانند سمجھتے ہیں۔ بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ وہ ان کے علوم کاذبہ کو سچا جان کر کہیں شرائع انبیاء پر ان علوم کاذبہ کو ترجیح نہ دے دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقیدۂ بد سے پناہ دے ـــــ ہاں ہاں جب ان کو حکماء جانیں گے اور ان کے علم کو حکمت کہیں گے تو ضرور اس (مذکورۂ بالا) بلا میں گرفتار ہوں گے ـــــ اس لیے کہ حکمت نام ہے کسی چیز کے علم کا جو مطابق نفس الامر ہو۔ اب جو علوم بھی ان حکماء کے علوم کے مخالف ہوں گے وہ لامحالہ (اُن کے گمان میں) نفس الامر سے مطابقت نہ رکھیں گے ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ حکماء اور اُن کے علوم کی تصدیق کرنا انبیاء علیہم السلام اور اُن کے علوم کی تکذیب کرنے کے مرادف ہے اس لیے کہ دونوں علوم ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک کی تصدیق سے دوسرے کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اب جس کا جی چاہے وہ طریقۂ انبیاء کو اختیار کرے اور جماعت حق میں شامل ہو کر اہل نجات میں سے ہو جائے اور جس کا جی چاہے وہ فلسفی بن جائے اور گروہ شیطان میں داخل ہو کر خائب و خاسر ہو جائے، اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا (پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے، بیشک ہم نے کافروں کے لیے آگ طیار کر رکھی ہے جس کے پردے کافروں کا احاطہ کر لیں گے، اگر وہاں وہ کافر فریاد کریں گے تو ایسا پانی پلایا جائے گا جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا اور جو ان کا منہ جھلس دے گا۔ یہ برا پینا ہے اور دوزخ بری آرام گاہ ہے)

وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَالْتَزَمَ مُتَابَعَةَ الْمُصْطَفٰى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

دینی تعلیم کیوں؟

(از جناب مولوی عبید الرحمٰن صاحب وکیل، بستی)

ذیل کا مضمون جناب عبید الرحمٰن صاحب کے ایک غیر مطبوعہ خطبۂ استقبالیہ سے لیا گیا ہے جو موصوف نے ۱۰ر نومبر ۶۲ء کو انجمن تعلیمات دین بستی کی ضلع کانفرنس میں پڑھا تھا —— (ادارہ)

حضرات! اہل بصیرت سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ لے دے کر ایمان ہی ہماری متاع عزیز رہ گئی ہے جسے ہم اللہ۔ رسول۔ کتاب۔ ملائکہ اور آخرت کے معتقداتی و فکری و خلاف کی بدولت اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں اور ملت اسلامیہ کے تاریخی انتشار اور خلافت اسلامیہ کے سیاسی اعتزال اور دینی اضمحلال کے گذشتہ تخمیناً سات سو سالہ مدت طویل میں بھی ہم نے اسلاف کی اس گرانقدر دیانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے بھلے یا بُرے جس طرح بھی بن پڑا ہے ہم نے اس نادر سرمایہ کو اغیار کی ملحدانہ تگ و تاز اور کافرانہ طمطراق کے باوجود ان کے دستبرد سے مامون و محفوظ رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً جو سیلاب بھی آیا ہے اس کا رُخ خود اعتمادی اور پامردی کے ساتھ موڑتے رہے ہیں۔ یہی امتحان ہمارے لئے کیا کم تھا کہ حالات کی ستم ظریفی سے اب ہمارے بلاد اسلامیہ ہی جن کی جانب ہم نے ہمیشہ دینی رہنمائی کے لئے آنکھ اٹھا کر دیکھا گذشتہ چند سالوں سے اپنی اپنی سیاسی آزادیاں حاصل کر کے بجائے آپس میں دینی تعلق کی بنیاد پر متحد و منسلک ہونے کے نہ صرف باہم دست و گریباں نظر آ رہے ہیں بلکہ ان میں سے کچھ تو اپنا نسلی سلسلہ فراعنہ سے استوار کر کے اور بعض اپنا فکری رشتہ لینن اور کارل مارکس سے جوڑ کر ہمارے ملی وقار کو صدمہ پہنچا رہے ہیں اور انتہائی بے غیرتی و بے حمیتی کے ساتھ اسلام کی روحانی اور فکری کم مائیگی کا بھی مظاہرہ کرتے

پھر کہتے ہیں ؎

گر مسلمانی ہمیں ست کہ حافظ دارد　　　وائے گر پس امروز بود فردائے

حضرات! ان ناساعد حالات سے ہمیں ہرگز بددل نہ ہونا چاہیے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے قانون قدرت کے عین مطابق ہے۔ ایسا نہ ہوتا ہی حیرت و استعجاب کی بات ہوتی۔ بنو امیہ کی دور خلافت سے لیکر آج تک کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ جب کبھی مسلمانوں نے اپنا سیاسی عروج تقویٰ و طہارت سے ہٹ کر محض مادی اصولوں پر حاصل کیا ہے تو ان کے معاشرہ میں دینی اضمحلال لازمی طور پر پیدا ہو گیا ہے اور دیکھتے دیکھتے ان کا سیاسی عروج انہیں مادی اصولوں کی راہ سے غائب بھی ہو گیا ہے ہم اسے نہیں بھول سکتے کہ ہمارے بزرگان دین کو جو روح فرسا آلام و مصائب برداشت کرنا پڑے ہیں وہ ایسے ہی نام نہاد مسلمان امراء، سلاطین اور خلفاء کے ہاتھوں برداشت کرنے پڑے ہیں جنکی قہرمانی طاقت کا سرچشمہ طاغوتی عناصر و عوامل سے پاک نہ تھا۔ یہ اور بات ہو کہ ان میں سے سب بدنہاد نہ تھے۔ کچھ نیک طبع بھی گزرے ہیں مگر ان کی انفرادی نیک طبعی ان کی حکومت کی دستوری بے راہ روی و دین کشی کو عملاً متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دین سے ہٹ کر مسلمان کا کوئی وجود ہی صحیح معنوں میں متعین نہیں ہوتا خواہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی شکل میں۔ ہم آج محض جذباتی تعلق کی بناء پر مصر، عراق، شام، ماوراء النہر، ترکی، ایران، مراکش، الجزائر، تیونس اور دیگر ممالک اسلامیہ کے حق میں ندرے دست بدعا رہتے ہیں اور ان کے آرام سے خوش اور ان کی تکلیف سے غمگین ہوتے ہیں کیونکہ اسلامی تاریخ کے درخشندہ کردار جن کے تاریخی کارناموں کے مطالعہ سے نفسیاتی طور پر ہمارے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے انہیں سرزمینوں میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام نام ہے عقائد، اصول و اعمال کے مجموعہ کا نہ کہ شخصیتوں اور ملکوں کا۔ ماسوا انبیاء علیہم السلام کے جن کی شخصیتیں اور بجز مملکت حجاز کے جس کے مخصوص خطہ ہائے ارضی تکوینی و تشریعی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لئے اصل الاصول کا درجہ رکھتے ہیں اور ان سے صرف نظر کر کے اس میں شبہ نہیں کہ دین کے بارے میں ہمارا تصور ناقص و نامکمل رہ جاتا ہو ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ اسلام اور مسلمان مقامی نہیں ہو سکتے۔ ان کی فطرت اور ساخت آفاقی ہے کیونکہ دنیا میں مسلمان ہی تنہا وہ "خیر امت" ہے جو احکم الحاکمین کی ازلی رضا کا رہو اور اسی کی حکومت پوری دنیا اور

ساری بنی نوع انسان پر صحیح دین کے ساتھ قائم کرنے کے لئے ہمیشہ سے کوشاں اور سرگرداں رہی ہو۔ اس مشاہدہ کا دوسرا رُخ بھی ایسا ہی ہمہ گیر ہے اور کلیہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ جب بھی مسلمانوں کی دنیوی حکومتوں کو زوال سے دوچار ہونا پڑا ہے تو دینی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کی حالت نسبتاً بہتر ہوگئی ہو اور اس کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد مستثنیات کو نظر انداز کرتے ہوئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بالعموم اسلامی معاشرہ میں شریعت و حکومت کی باہمی مطابقت کما حقہٗ مشکل ہی سے کبھی ہو پائی۔ دونوں اپنی اپنی الگ الگ راہیں چلتی رہیں۔ تاریخ عالم کا ہر طالب علم جانتا ہو کہ دنیائے عیسائیت میں چرچ (church) اور اسٹیٹ (state) کے اپنے اپنے جُداگانہ تشخص و اصول کار کے باوصف اور بادشاہ و پاپا کی باہمی چشمکوں اور آویزشوں کے باوجود جب کبھی بھی بادشاہ کی بادشاہی کو جھٹکا لگا ہے تو پاپا کی پاپائی بھی سرنگوں ہو ہوگئی ہے حالانکہ منطقی طور پر ایسا ہونا نہیں چاہیئے تھا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ پاپائی میں کبھی داخلی اور روحانی طور پر اتنا دم نہیں رہا کہ وہ بلا حکومتی سہارے کے کھڑی رہ سکتی۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کا دینی معاشرہ اور ان کا تشریعی ڈھانچہ مسلمان سلاطین کی سیاسی ہزیمتوں سے نہ صرف غیر متاثر رہا بلکہ اس کی راہ سے بہت سارے روڑے خود بخود ہٹ گئے۔ یہ محض خوش عقیدگی ہی کی بات نہ ہوگی اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ دین اسلام کی بقاء اور ترقی دنیاوی ارباب اقتدار کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑی گئی بلکہ اسے کائنات کے مقتدرِ اعلیٰ نے اپنے ہی مخفی ہاتھوں میں ہمیشہ رکھا جس کا سامان روز بروز اور لحظہ بلحظہ ان بے شمار غلامانِ مصطفوی کے تقویٰ و تضرع اور تسبیح و تحمید کے ذریعہ بہم پہونچتا رہا ہو جو خیمہ و خرگاہ سے محروم اور خدم و حشم سے عاری ہی رہے ہیں اور اپنا گزران محض نانِ جویں پر کرتے رہے ہیں اور کبھی تو وہ بھی انھیں میسر نہیں ہوئی ہے۔ زمانۂ حاضرہ کا ایک معروف اور نسبتاً غیر متعصب انگریز مفکر ایچ۔ اے۔ آر۔ گب (H. A. R. Gibb) اپنی تازہ ترین کتاب محمڈنزم (Mohammedanism) مصنفہ ۱۹۵۰ء کے نقش ثانی مطبوعہ ۱۹۵۳ء میں "توسیع اسلام" کے باب میں جو کتاب کا پہلا باب ہو صفحہ ۱۹ پر اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے اپنے تحیر کا اظہار حسب ذیل الفاظ میں کرتا ہو:

ترجمہ — "لیکن مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ان کے معاشرہ میں دینی کمزوری نہیں پیدا ہوئی بلکہ جیسا اس سے قبل کہا جا چکا ہو ایک خاصی مدت سے حکومت اور

شریعت اپنی اپنی جدا گانہ راہیں بنا چکی تھیں اور ایسا لگتا ہو کہ گویا مسلمانوں کے سیاسی
زوال نے ان کے دینی معاشرہ کے اندر ایک نئی روح پھونک دی ...."

کم و بیش یہی مشاہدہ علامہ اقبال کا بھی معلوم ہوتا ہے جس کو انہوں نے اپنی نظم "مومن کا زوال"
میں اپنے دلنشیں انداز میں یوں پیش کیا ہے ؎

سبب کچھ اور ہے تو جسکو خود سمجھتا ہے | زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا | قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

صاحبان! کیا کہا جائے؟ خلافت راشدہ کے بعد ہماری تاریخ عروج و زوال کے جن منازل سے گذری ہے اور ہماری معاشرت جن انقلابات سے دوچار ہوتی رہی ہے اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا " شد پریشان خواب من از کثرتِ تعبیر ہا"۔ اس طویل دور مابعد کا ہمارا سارا روحانی، فکری اور تمدنی سرمایہ کتب سیر و تاریخ میں محفوظ ہے جس کے مطالعے سے ایک بات کھل کر سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت رفتہ رفتہ ایسے ہاتھوں میں منتقل ہوتی گئی جو دین کو دنیا کے تابع کرنے کے درپے رہے اور جنھوں نے فرضی دین تعمیر کرنے میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تاکہ ان کی طاقت کو مادی طور پر استحکام حاصل ہو اور جب خود مسلمانوں ہی کے معاشرہ میں دین اور دنیا کا معرکہ چھڑ گیا اور ان کی مادی سرپرستی ایسے دنیا دار سلاطین نے کی جنکو اپنی حکومت اللہ کی حکومت سے زیادہ عزیز رہی تو ہم آج کیوں متحیر ہوں اگر ہماری نظروں میں خوب ناخوب ہو چکا ہے اور قبح نے حسن کا درجہ پالیا ہے غرض کہ سرے سے ہماری اعلیٰ قدریں ہی بدل چکی ہیں ہم ہمیشہ مسیحیت پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے رہے کہ وہاں تو دین و دنیا کی تفریق و تقسیم کرلی گئی۔ دین خدا کے سپرد کر دیا گیا اور دنیا قیصر کے حوالہ ہوگئی چنانچہ ایک کا دوسرے کے معاملہ میں کوئی دخل باقی نہیں رہ گیا لیکن ہمیں اپنے گریبان میں منھ ڈال کر اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہیے کیا یہی سب کچھ ہمارے یہاں رونما نہیں ہوا۔ وہ شیطان جو ان کے گھر میں کودا کیا اس نے ہماری دیواروں پر شیرو نہیں لگایا؟ وہ تو ایک معنیٰ کر کے ہم سے اچھے ہی رہے۔ وہ دنیا چاہتے تھے دنیا ان کو مل گئی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد انہوں نے دین سے لگی لپٹی نہیں رکھی۔ مسیحیت کا عملی طور پر ٹاٹ ہی الٹ دیا اور ایک نیا دین ایجاد کر لیا جس کا نام "تہذیب مغربی" ہے اور وہ ہے نتیجہ قدیم رومائیت۔ یونانیت اور مسیحیت اور جدید افادیت کے

ناجائز اور ناہنجار اختلاط و مواصلت کا اور اس کا کام ہے رات کو دن کرنا۔ عورت کو مرد بنانا مرد کو عورت بنانا۔ داغ دھبوں کو پالش سے چھپانا۔ گرجاؤں اور دیگر عبادت گاہوں کو تفریح گاہوں میں منتقل کرنا۔ بنکوں کی عمارتوں کو عبادت گاہوں کا ظاہری درجہ عطا کرنا۔ سود کھانا۔ لہو ولعب اور مادیات کی تعلیم دینا اور چونکہ فیضان سماوی سے وہ محروم ہے اس لئے اس کے فتوحات ہیں۔ "بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس" اور اس کے کمالات کی حد ہے "برق و بخارات" اس نئی تہذیب کے علمبردار یکسوئی اور صفائی کے ساتھ تاویل و تحریف سے انجیل اور توراۃ کو مسخ کر کے اور خدا۔ رسول اور آخرت کے تصور سے بے نیاز ہو کر ایک طرف شیشہ گری کرتے ہیں اور دوسری طرف بے باکانہ ہالی ووڈ۔ ہائیڈ پارک اور ریویرا (Riviera) کی آرائش و تزئین کرتے اور بے محابا کرسٹائن کیلر کو ساتھ لے کر داد عیش دیتے ہیں۔ امت مسلمہ بھی اگر دین کے قید و بند سے آزاد ہونے کا فیصلہ کر لیتی تو اس کے لئے بھی عرصۂ عام میں دنیاوی ترقی و اقتدار کی راہیں ویسی ہی ہموار ہو جاتیں جیسی کہ موسائیوں۔ عیسائیوں۔ آتش پرستوں اور اصنام پرستوں کے لئے ہو چکی ہیں۔ پھر کیا مشکل تھا کہ ہماری کانفرنس کے معزز مفتتح و صدر بھی اپنی گرانقدر صلاحیتوں کو دین سے موڑ کر سائنسی موشگافیوں میں لگا دیتے اور بلا اس خیال کے کہ ان کے پیچھے چلنے والوں کی تاریک راتوں کی صبح بھی ہوگی یا نہیں اپنے تفنن سے آفتاب کی شعاعوں کو گرفتار کر کے دکھلا دیتے اور یہ بھی ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی کہ ذرات کی مخفی طاقتوں کو خواہ مثبت ہوں یا منفی دریافت کر کے وہ بھی راکٹوں کے خلائی سفر کے ذریعہ چاند پر پہونچ کر وہاں اپنے بود و باش کا بندوبست کر لیتے یا اپنے دنیوی اسلاف کی معروف روایات کو قائم رکھتے ہوئے دوسری ایجادات کر کے دنیائے فکر و دانش میں ایک ہلچل مچا دیتے۔ لیکن ہمارے لئے مجبوری یہ ہے کہ از مہد تا لحد ہم اس ازلی اور ابدی ضابطۂ حیات سے بندھے ہوئے ہیں جو بنفسہٖ کائنات کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور جس کا دوسرا نام ہے قرآن شریف اور یہی وجہ ہے کہ وہ پیر دانا جن کا نام تھا شیخ سعدی علیہ الرحمہ مدتوں پہلے ہم سے سوال کر چکے ہیں ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی

کہ با آسماں نیز پرداختی؟

بزرگوارا ور دوستو! انسان کی تخلیق کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ وہ پیٹ کی خاطر ہاتھ کی صفائی دکھلائے یا اپنے آرام و آسائش کی خاطر زمان و مکاں کو مسخر کرنے کے لئے دماغ کی ورزش کرے اور اس سلسلہ میں قدرت کے رازہائے سربستہ اور اس کی بے پناہ طاقتوں کے جتنے سربمہر ظروف معبود حقیقی نے ازل سے سینت کر رکھ چھوڑے ہیں ان کے سرپوشوں کو ایک ایک کرکے بلا ضرورت الٹتا پھرے اور اپنی نکتہ رسی اور دریافت کے ڈھول پیٹے۔ اس سے تو حیاتِ انسانی کا ایک بہت ہی محدود اور پست تصور سامنے آتا ہے۔ دنیوی علوم و فنون اور ان کی افادیت و ضرورت کی تنقیص مقصود نہیں۔ ان کا بھی حیات انسانی میں ایک مقام ہے لیکن ان کی خیر و برکت لعنت و عذاب میں تبدیل ہو جاتی ہے جب مقتضیات دینیہ سے آزاد ہو کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کی ایجاد اور ایٹمی توانائی کی دریافت ہوتی ہے۔ پھر تو سائنس کی یہ مفید ایجادات اکثر و بیشتر تخریبی ہی مصرف میں لائی جاتی ہیں ریڈیو خبروں اور اطلاعات کی تلبیس کرتا ہے اور غلط ذہن تیار کرتا ہے۔ ایٹمی توانائی سے موت کے ٹھکے تعمیر ہوتے ہیں اور ہوائی جہاز بم گولے برساتا ہے۔ حسد و ہوسناکی اور بغض و عناد کا دیو دنیا کی سیاسی طاقتوں کو کوڑے مار مار کر باہم سرپیکار کر دیتا ہے اور اس ابلیسی جنگ میں لاکھوں اور کروڑوں بے گناہوں کا خون اور تہذیب و تمدن کے بیش بہا آثار کا اتلاف ہوتا ہے اور اللہ کی یہ زمین دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہے۔ چاقو کی افادیت سے انکار نہیں لیکن جراح اس سے نشتر لگا کر خلق اللہ کی خدمت کرتا ہے اور بلوائی اس سے مردم کشی کرتا ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔ طاقت و توانائی کا حاصل کر لینا ہی کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک اسے معروف کا امر اور منکرات کی نہی نہ کرنے میں صرف کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہو اور ہم میں اتنا ذہنی توازن اور تہذیب نفس نہیں ہے کہ حاصل کردہ توانائی کو قابو میں رکھتے ہوئے اسے ممکن جائز مصرف میں لائیں تو اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ ہم ایسی توانائی ہی نہ حاصل کریں اور قدرت کے مخفی خزانوں کو ٹٹولتے نہ پھریں زمانۂ حال کا مفکر اقبال بھی اس معاملہ میں ہمارا ہم خیال ہے ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہو فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہو اس کا آشیانہ

روزی کمانے میں بھی آج کا انسان اپنی روز افزوں ضروریات کی وجہ سے جانور اور مشین کے

مثل ہو کے رہ گیا ہے۔ چوبیس گھنٹے وہ فکر معاش میں پریشاں و سرگرداں رہتا ہے لیکن اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ غیر مسلموں کی دُنیا ہم سے اس لئے بہتر ہے کہ وہ دینِ اسلام کے مکلف نہیں قدرت کے خالص تکوینی اصولوں کے ماتحت وہ پلتے اور کھوتے ہیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہو کہ ہم باوجود مسلمان ہونے کے اللہ کی رضا جوئی سے بے نیاز ہو کر "بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر" والی حالت کے ساتھ دنیا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ محنت زیادہ اور حاصل کم کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں نہ دین ہی کی برکت میسر آتی ہو اور نہ دنیا ہی کی ثمرات ہی ہمارے ہاتھ لگتے ہیں۔

برادرانِ ملت! بات یہ نہیں ہے کہ دُنیا چھوڑ دی جائے بلکہ سوال صرف تقدیم و تاخیر یا اوّلیت و ثانویت کا ہو ہمیں اپنا صحیح راستہ مسلمان رہتے ہوئے متعین کرنا ہے اور ایک بار ہمیشہ کے لئے طے کر لینا ہے کہ ہماری دُنیا وہ دُنیا ہرگز نہیں ہو سکتی جو غیر مسلموں کی ہو۔ نہ ہماری قدریں وہ قدریں ہو سکتی ہیں جو دوسروں کی ہیں اور نہ سود و زیاں کے ناپنے اور تولنے کا وہ ترازو اور پیمانہ ہی ہمارا ہو سکتا ہو جو اغیار کا ہے۔ ہم دنیا کو دین ہی کی راہ سے پا سکتے تھے لیکن ہماری شومئی قسمت کہ دین کو ثانوی درجہ دے کر ہم نے اپنی دُنیا بھی کھو دی ہے۔ آج ہم للچائی ہوئی نظروں سے دوسروں کی چیزوں کی طرف دیکھتے ہیں کیونکہ دین کی جیتے میں ڈال دینے والی طاقت ہم سے ہماری ہی غفلتوں کی بدولت زائل ہو چکی ہے اور مدتوں کی بیگانگی کے باعث ہم اسے بھول چکے ہیں۔ اپنے ملحدانہ یا کافرانہ طرزِ فکر سے ہم یہ تصور نہیں کر پاتے کہ مسلمانوں نے اپنے دین ہی کے بل بوتے پر اسی باد و خاک اور آتش و آب کی دُنیا میں رہ کر وہ کر دکھایا ہے جو انھیں کا طرۂ امتیاز تھا اور جس کو آج بھی عقل کی راہ سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہو
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس کی تصدیق نہ صرف تاریخ کی کتابیں کرتی ہیں بلکہ خود قرآن پاک کرتا ہو۔ افسوس کہ ہمارے مسلمان مؤرخین اور مستشرقین نے بھی اسلام کی عظمت کا جب بھی ذکر کیا ہے تو شوکت میں ان کے ادب و فلسفہ۔ ان کی تعمیر و مصوری اور ان کے ظرف و لباس ہی کو یا اسی نوعیت کے خالص فکری و فنی نمونوں ہی کو پیش کر سکے ہیں۔ جس عہد کو مسلمانوں کا عہدِ زریں قرار دیا ہو وہ خلیفہ

ہارون الرشید کا عہد ٹھہرا ہو اور جن مسلمانوں کو مثال میں کھڑا کر سکے ہیں وہ ابو نصر فارابی۔ بو علی سینا۔ الکندی۔ ابن رشد۔ ابن باجا۔ ابن طفیل اور ابن العربی جیسے حکماء اور مفکرین ہی کی شخصیتیں نکلی ہیں چنانچہ انھیں کی حکایتوں کو خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا دیئے ہیں۔ وہ بیچارے اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ ایسے فنون و علوم اور ایسے مفکرین بلکہ کبھی کبھار ان سے بھی بہتر غیر مسلموں کے یہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن جو خصائل محمودہ غیروں کے یہاں کہیں کسی زمانہ میں بھی نہیں ملتے ہیں وہ رہے ہیں مسلمانوں کے معاملات و عبادات، ان کا تقویٰ و طہارت۔ حلم و عفو۔ ایثار و خطر پسندی، عدل و رحم، خشیت الٰہی و عشق رسول اور جذبۂ شہادت و جہاد اور جن عالی مرتبہ انسانوں کی نظیر دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈ ھنے سے بھی نہ ملے گی وہ رہے ہیں پیغمبر اسلام کے اصحاب کرام۔ تابعین و تبع تابعین۔ صالحین و مجاہدین اور اولیاء و اقطاب جن سے ان کی پوری تاریخ بھری پڑی ہو اور جنھوں نے زمین پر ہی نہیں بلکہ کائنات کے عناصر پر حکومت کی ہے، لیکن انھیں لائق اعتناء و تذکرہ نہیں سمجھا گیا بلکہ ژرف نگہی کے فقدان کے باعث ان خصائل حسنہ کو فرسودہ اور آؤٹ آف ڈیٹ (out of date) تصور کیا گیا اور دین سے بے بہرہ ہونے کے نتیجہ میں ان عظیم شخصیتوں کو مجہولیت اور بیکاری کا نمونہ قرار دیا گیا۔ ہم اس موقع پر دنیا کے اس عظیم ترین انسان کو جو حقیقتاً سرور کائنات اور فخر موجودات تھا اور جس کی ذات گرامی موازنہ و مقابلہ سے بالاتر ہے اپنے دعویٰ کی دلیل میں سامنے لانے سے ادباً گریز کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اور جدید کتب خانوں میں دین بیزاری ہی کا سبق پڑھا اور مادیوں کی غلط تربیت و تعلیم کے نتیجہ میں اور مادہ پرستانہ تہذیب کے ذہنوں پر مستولی ہونے کے باعث یہ خیال عقیدہ کے طور پر راسخ ہو گیا کہ اسلام کو جو کچھ دنیا کو دینا تھا وہ دے چکا۔ اس کی افادیت عرصہ ہوا ختم ہو چکی اور ہم محض اپنی روایات پرستانہ ذہنیت سے اسے ابتک ڈھوئے چلے جا رہے ہیں۔ اسلام اور اسلامی طرز معاشرت کی نسبت ذہنوں میں شدید احساس کمتری پیدا ہو چکا ہو اور دین کے معاملہ میں ہمارا رویہ بالکل انفعالی ہو کر رہ گیا ہے۔ آخر یہ کہاں کی دانائی تھی کہ نہ تو ہم نے یکسو ہو کر اغیار کی طرح دنیا ہی کو اپنایا اور نہ روح دین ہی سے آشنا ہو سکے؟ نہ تو وہ روشن دماغی اور جرأت رندانہ ہی ہم اپنے اندر پیدا کر سکے جو بجلی کے قمقمے روشن کرتی ہے۔ فضائے آسمانی میں

انسانوں کو تیرنا سکھاتی ہے اور بستی جیسے پسماندہ اور بے نام و نشان گوشۂ ارضی میں ہمارے لئے بے رشتہ و تعلق لندن اور نیویارک جیسے دور دراز مراکز تمدن سے رسل و رسائل کی راہیں کھولتی ہے۔ اور نہ اس روشن ضمیری اور عبدیت و سپردگی ہی کو ہم اپنا شعار بنا سکے جس نے ہر امتحان کے موقع پر ہماری قلت کو کثرت پر اور ناتوانی کو توانائی پر غالب کیا ہے۔ فرشتوں کی فوجوں کو ہماری اعانت میں بروقت ضرورت غیب سے لا کھڑا کیا ہے۔ چڑیوں کی چونچوں سے گرائی ہوئی نازک اور بے وزن کنکریوں سے ہاتھیوں کو کچلوا کر چبائی ہوئی گھاس کے مانند کر دیا ہے۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے پانی کو چشم زدن میں پھاڑ کر ہمارے لئے راہ بنا دی ہے۔ براہ راست آسمان سے من و سلویٰ کا ہمارے لئے نزول کروایا ہے۔ شیر دل کو روباہ کرکے انکو اپنی پیٹھوں پر لکڑی کے بوجھ لادنے پر مجبور کیا ہو اور اگر شہ کونین کی بزرگی اور برتری کی بات درمیان میں آپڑی ہے تو پھر کسی صاحب پیغمبر سے نہیں بلکہ شہ کونین ہی کے ایک صاحب کرامت امتی کے "قم باذن اللہ" یہ کیا "قم باذنی" کی ایک ضرب سے پرانی قبر کے گڑے ہوئے مردے کو بھی اٹھ کھڑا کروایا ہے۔ غرضکہ ہماری ہر پاکیزہ خواہش کے احترام اور ہر جائز ارادہ کی تکمیل میں قدرت نے اپنا اٹل قانون بدل ڈالا ہو۔ فاصلہ کی دوری مختصر ہو گئی ہے اور وقت کی رفتار رک گئی ہے۔ آتش اپنے سوز۔ آب اپنے نم۔ خاک اپنے آرام اور باد اپنے دم سے دستکش ہو ہو گئی ہے۔ ملحدین کو ان تاریخی اور قرآنی مثالوں کو ضعیف الاعتقادی کے لطائف قرار دینے کا حق نہیں پہونچتا ہے جبکہ ان کی منطق سحر و طلسم کے روزمرہ کے ٹھوس نتائج اور محسوس اثرات کی بھی کوئی معقول توجیہ پیش کرنے سے آج تک قاصر ہو اور علیٰ ہذا القیاس کفار و مشرکین کو بھی یہ رتبہ نہیں حاصل ہے کہ وہ خود ٹونوں اور ٹوٹکوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ٹونا اور ٹوٹکا کرنے والوں کے خالق کی قدرت و گیرائی سے انکار کر سکیں۔ افسوس اس پر آتا ہو کہ جی کھول کے ہم دنیا سے بھی نہیں لپٹ سکے رہا دین جو ہماری حیات ملی کا سرچشمہ ہے سو ہم اپنے شکوک و شبہات اور شریعت و طریقت کی کھینچا تانی میں اس سے بھی آنکھ مچولی ہی کھیلتے رہ گئے۔ کفر و ایمان کے قدیمی قصہ میں اور اگر خوش قسمتی سے ہم نے اس قضیہ کو طے بھی کر لیا تو علم و معرفت کی اسلامی نزاع میں ہمارے ذہنی انتشار و تذبذب کی سچی تصویریں علی الترتیب مرزا غالب اور علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل اشعار میں پیش کیں ہیں جنکی معنویت اور صداقت سے

انکار ممکن نہیں ؎

غالب: ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اقبال: اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

سبحان اللہ! غالب جیسے رند مشرب اور بادہ پرست مسلمان شاعر کے دل میں بھی ہماری طویل معاشرتی ابتری کے باوجود والدین ہی کے راسخ کیے ہوئے ایمان کی ایک کھٹک باقی رہ گئی ہے جو بالآخر اس کا دامن پکڑتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایمان ہی کی ایک رمق ہو جو اسکی زبان سے بھی کہلوا کے رہتی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کا کرشمہ ہو ؎

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

کاش کہ یہی ایک نکتہ دل و دماغ کی پوری رضا و رغبت اور تیاری و مستعدی کے ساتھ ذہن نشین کر لیتے کہ ذرہ باوجود اپنی تو دریافت حرارت اور توانائی کے مجبور محض ہو اور آفتاب باوصف اپنی معروف تپش و تابناکی کے تابع قانون خداوندی ہو اور دونوں میں سے کوئی بھی قابل پرستش نہیں بلکہ لائق حمد و ثنا وہ ذات باری تعالیٰ ہے جس کو سورہ فاتحہ میں رب العالمین کہا گیا اور جس نے سورۂ طٰہٰ میں نبی آخر الزماں کو کفار کے دنیاوی مال و متاع اور ان کی ظاہر افوقیت کی بے بضاعتی و بے ثباتی اور برخلاف اس کے مومنوں کی پرہیزگاری کی نیک انجامی ذہن نشین کرانے اور عبادت کی راہ سے ہی خوشی حاصل کرنے اور روزی کے معاملہ میں مطلق پریشان نہ ہونے بلکہ طمانیت و توکل رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کس شفقت اور سادگی کے ساتھ مخاطب فرمایا ہے:

"سو جب عذاب کا آنا یقینی ہے تو آپ ان کی کفر آمیز باتوں پر صبر کیجیے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے۔ آفتاب کے طلوع و غروب سے پہلے اوقات شب میں اور دن کے اول اور آخر میں تسبیح کیا کیجیے تاکہ آپ اس سے خوش ہوں اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے بہرہ ور کر رکھا ہے کہ وہ محض دنیوی زندگی کی رونق ہو

اور آپ کے رب کا عطیہ جو آخرت میں ملے گا بدرجہا بہتر اور دیرپا ہے اپنے متعلقین کو یعنی اہل خاندان کو اور مومنین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیے اور خود بھی اسکے پابند رہیے۔ ہم آپ سے اور دوسروں سے معاش کموانا نہیں چاہتے۔ معاش تو آپکو ہم دینگے اور بہتر انجام تو پرہیز گاری ہی کا ہے۔"

یہی تھی وہ روح اسلام جسے ہم کھو چکے ہیں۔ اغیار لے کر خوش ہوتے تھے۔ ہم دے کر مطمئن ہوتے تھے۔ لوگ دنیا سمیٹتے تھے اور ہم خالی الذہن ہو کر عبادت میں وقت گذارتے تھے چنانچہ جب تک ذکر و شغل کا آلۂ دینی چراغ ہمارے ہاتھوں میں رہا اس وقت تک اس کی برکتوں سے فیضان سماوی کا سایہ ہمارے سروں پر رہا جس کی بدولت دنیاوی فتح و کامرانی بھی ہمارے قدم چومتی تھی حتیٰ کہ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپیں بحر ظلمات کی موجوں سے بھی آشنا رہیں اور اس طور پر کہ انھیں پایاب کر کر کے دکھا دیا ہے ؎

خیال یار کبھی ذکر یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

لیکن جب سے یہ متاعِ بے بہا اپنی کور بصری و مردہ ذوقی سے ہم کھو بیٹھے اور اس حقیقتِ روزگار کے اسوۂ حسنہ کو فراموش کر کے پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے لگے جس نے اپنی انسانیت کو الوہیت میں ہمہ تن غرق کر کے اپنا سایہ بھی زمین پر نہ اترنے دیا اس وقت سے مایوسی و محرومی ہی ہمارے حصہ کی چیز ہو کر رہ گئی ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

تف ہو سود و زیاں کے اس جدید معیار پر جو ہمارے اینٹ پتھر کے گھروں کو تو مزین و منور کر دیتا ہے لیکن دل کی بے بہا بستی کو ویران و تاریک ہی رکھتا ہے۔ ہم سے آسمان پر چلتی تو لگوا تا ہے لیکن امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کا راز نہیں بتاتا۔ کیا اب بھی کسی دلیل و برہان سے قائل کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ دین کی راہ سے اخوت و مساوات کا جو پیغام عرب کے ایک بوریہ نشین آمی نے دنیا کو دیا اسنے اپنی قبولیت سے ایک حبشی کو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عظیم مرتبہ

عطا کر دیا لیکن جب دین سے صرف نظر کر کے محض سیاسی اصولوں پر یہی پیغام فرانس کے ایک متمدن مفکر نے دیا تو وہ زبانی نعروں اور کھوکھلے نعروں سے آگے بڑھ کر ہماری زندگی کی گہرائیوں میں آج تک نہ اتر سکا اور اگر کسی مصلح یا حکمراں نے کالے گورے یا چھوٹے بڑے کا فرق مٹانے کی مخلصانہ جسارت کی تو اس کا وہی اندوہناک انجام ہوا جو ابھی ابھی امریکہ کے صدر مسٹر کینیڈی جیسے شریف انسان کا ہوا ہے۔

معزز مہمانان و محترم اکابرین! نہ تو یہ مناسب موقع تھا اور نہ اپنے رہنماؤں کی موجودگی میں ہمارا منصب ہی کہ ہم دین جیسے اہم اور مشکل مسئلہ پر لب کشائی کی جسارت کرتے۔ اس کے عروج و زوال کی تاریخی حیثیت سے تصویر پیش کرتے اور اس کے صحیح خد و خال کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرتے لیکن جو سمع خراشی ہم نے کی ہے اس کے پیچھے بس ایک ہی جذبہ کارفرما تھا اور وہ یہ کہ آج کے ناسازگار ماحول میں دینی تعلیمی تحریک کی ضرورت اور اس کے مطالبات اپنی پوری شدت اور افادیت کے ساتھ ابھر کر ہمارے سامنے آجائیں اور ہمارا دل و دماغ گواہی دینے لگ جائے کہ ہاں آج اگر کوئی کام لپیٹ کر کر ڈالنے کا ہو جس کے نہ کرنے کی سزا مستقبل قریب ہی میں خفت و خجالت کے سوا اور کچھ نہ ہوگی تو وہ ہے اپنے مرنے سے پہلے اپنی موجودہ نسلوں کو مسلمان بنائے رکھنا اور مرتے وقت وراثت میں بجائے مال و زر کے اپنی سعی و جہد سے ایک ایسا صالح اور پائدار نظام تربیت و تعلیم چھوڑ جانا جو ہمارے نہ رہنے پر بھی ہماری آنے والی نسلوں کی دینی تربیت کا ضامن ثابت ہوتا کہ اگر ہم واقعی کسی درجہ میں بھی مسلمان ہیں اور روز آخرت کا عقیدہ بھی ہمارا جزو ایمان ہے تو سوال و جواب کے وقت ہم اللہ تعالیٰ سے کہہ سکیں کہ اگر ہمارے ماں باپ نے ہمیں دیندار رکھنے کی فکر کی تو ہم نے بھی اپنے زمانہ کی مخصوص مشکلات کا حتی الوسع مقابلہ کرتے ہوئے اپنی اولاد کو مومن بنائے رکھا اور اس کا بھی معقول انتظام کر آئے تھے کہ ہماری نسل میں حالات کے دباؤ سے آئندہ چل کر کافر و مشرک یا مرتد نہ نمودار ہوں اور نہ ہمارے گھرانے کا "السلام علیکم" سلام کرنے کے خرافاتی طریقوں میں تبدیل ہو جائے گو ایرانی اور مغل تہذیب کے ملے جلے اثرات ہمیں کشاں کشاں "آداب"، "بندگی" اور "کورنش" تک تو لے ہی آئے ہیں۔

ہماری نظروں میں دینی تعلیمی تحریک کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم ایک طرف سرکاری جبریہ تعلیم حکومت اتر پردیش اور اس کے محکمہ تعلیم کی جارحانہ لسانی پالیسی اور غیر ایماندارانہ نصابی ہم اور مرکزی حکومت کے تمدنی اور ثقافتی شبخون پر نظر کرتے ہیں اور دوسری جانب اقتصادی بدحالی کے دباؤ کی وجہ سے اپنوں میں سے بعضوں کے مداہنت آمیز اور تملق صنعت اقدامات کو دیکھتے ہیں۔ ملاحظہ تو کیجئے کس کس طرح ہم پر مشق ستم کی جارہی ہو۔ یہ یک دہل ہندی کا تسلط اس طور پر ہو رہا ہے کہ اردو اپنے گھر اور اپنے ہی حلقہ سے نکالی جارہی ہے اور اس بیدردی کے ساتھ اس غریب کو دفتر تو دفتر اسکولوں میں بھی کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ کرپلانی کمیٹی نے اسلامی مکتبوں اور مکتب کمیٹیوں کی جس طور پر بیخ کنی کی ہو اور لسانی فارمولا میں فارمولا کی منشاء کے صریحی خلاف خواہ مخواہ سنسکرت کو ٹھونس کر جو ناروا سلوک اردو کے ساتھ برتا ہے وہ ایک سیکولر نظام حکومت کے دامن پر بڑا ہی بدنما دھبہ ہو۔ اردو والوں نے اردو کی بحالی کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے۔ اتنی بڑی دستخطی مہم سر کر ڈالی لیکن ہمارے ارباب بست و کشاد میں سے کسی کے سر پر جوں نہیں رینگی۔ مسلسل چیخ پکار کے بعد اسکولوں کے ہدایت نامے اور گشتیاں چٹھیاں اردو کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے اور اردو والوں کی کٹی ہوئی زبان پر پھاہا رکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے بھیجی جاتی ہیں لیکن محکمہ تعلیم کے منتظمین کی تنگ نظری، بیجا ضد، اور عدم تعاون اور بالآخر خود حکومت کی چشم پوشی کے آگے کسی کی چلنے نہیں پاتی۔ نتیجہ یہ ہو کہ ہماری ایک نسل کی نسل جس کی مادری زبان اردو ہو نفسیاتی طور پر مفلوج اور اپاہج اور ذہنی طور پر کج فہم بے مصرف اور بزدل ہوتی جارہی ہے اور یہ کسی ایک فرقہ کا نہیں بلکہ پوری ہندستانی قوم کا زیاں ہے۔ حالیہ اردو کانونشن لکھنؤ میں جناب آنند نرائن ملا سابق جج عدالت العالیہ الہ آباد کا صدارتی خطبہ اس باب میں حکومت اتر پردیش اور اسکی تحتی انتظامیہ کی شرمناک دھاندلی اور بد دیانتی پر ایک ملامتی دستاویز ہے۔ دینی تعلیمی تحریک اردو میں اس معنی کر کے دلچسپی رکھتی ہو کہ مسلمانوں کا سارا دینی اور تمدنی سرمایہ اس زبان میں منتقل و محفوظ ہو چکا ہے اور اب یہی ایک زبان رہ گئی ہے جس کے توسط سے ہندستانی مسلمانوں اور ان کے بچوں کو اپنے دین اور اپنے اسلاف کے کارناموں کا کما حقہ علم

ہوسکتا ہے۔ آج کل کے اسکولوں اور کالجوں کی مروجہ تعلیم نہ صرف یہ کہ مسلمان بچوں کو دین کی تعلیم سے بے بہرہ رکھتی ہے بلکہ دیانتداری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو اسی نتیجہ پر پہونچا جاسکتا ہے کہ انھیں بے دین بھی کر ڈالتی ہے۔ حقیقت میں مسلمان اپنے دینی لوازمات کے ساتھ ایک پہیلی ہو کر رہ گیا ہے جس کو بوجھنے کی ہمارے ملک میں صدیوں کے رہن سہن کے باوجود کوئی پرخلوص کوشش نہیں کی گئی بلکہ وہ اپنے بھائیوں کے ہاتھوں طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں ہی کا شکار ہوتا رہا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب اسکی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اور باہمی بے اعتمادی کا ازالہ ہوگا۔ بہر حال بہ حالت موجودہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے بجز اس کے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے ہی قائم کئے ہوئے مکاتب و مدارس میں اور اپنے ہی تیار کردہ نصاب تعلیم کے ذریعہ انکی عمر کی اس ابتدائی منزل میں جبکہ ان کے ذہنوں کی سادہ لوح پر ہر نقش نقش کالحجر ہو جاتا ہو کوئی اور نشان پڑنے کے پہلے دین کی بات سے آشنا کر دیں اور انکی سادہ لوح پر دین ہی کا نقش مرتسم کر دیں تاکہ بہر حال وہ نقش مرتے دم تک قائم رہے۔

(بقیہ مضمون میقات صلا)

حضرت مولانا شیر محمد صاحب مہاجر دامت فیوضہم کی عبارت ختم ہوئی، امید ہے کہ اہل علم اور اصحاب فتویٰ ممدوح کی اس تحقیق سے اتفاق فرمائیں گے ـــــ یہ بات الفرقان میں پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ مفتی پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند) اور ہندستان کے اکابر علماء میں سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے اس عاجز نے اس مسئلہ میں رجوع کیا تو ان دونوں حضرات نے بھی اس بارہ میں اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا کہ ہندستان یا پاکستان سے جانے والے حجاج کے لیے سمندر میں احرام باندھنا ضروری نہیں، جدّہ پہونچ کر احرام باندھنا بھی صحیح ہے۔

ہندوستانی حجاج کیلئے میقات

از محمد منظور نعمانی

سطور ذیل میں اہل ہند کے میقات کے بارہ میں جو کچھ عرض کرنا ہے اسکو سمجھنے کے لئے پہلے میقات کی حقیقت معلوم کرلینی چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو اپنا مقدس بیت اور اہل ایمان کا قبلہ قرار دیکر اس کی تعظیم و تکریم اہل ایمان کے لئے لازمی اور ضروری قرار دی ہے اور جو مسلمان وہاں پہونچنے کے ضروری وسائل رکھتے ہوں ان پر عمر میں ایک دفعہ وہاں پہونچ کر حج کرنا فرض کیا گیا ہے، اس کعبۃ اللہ کا طول و عرض اور رقبہ معین اور محدود ہے، اور وہ وہی ہے جس پر کعبہ کی غلاف پوش موجودہ مربع عمارت کھڑی ہے۔ اس کے ارد گرد مسجد حرام ہے یہ گویا کعبۃ اللہ کا چوطرفہ صحن ہے، اور اسی نسبت سے اس کے خاص احکام اور فضائل ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا رقبہ بہت چھوٹا تھا صرف اتنا جتنا کہ اب مطاف کا دائرہ ہے۔ آپ کے بعد اس میں وقتاً فوقتاً توسیع ہوتی رہی۔ آخری توسیع ہمارے زمانہ میں سعودی حکومت نے کی ہے۔ اور اسکے مطابق تعمیر کا کام ابھی جاری ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق مسجد حرام کے رقبہ میں قیامت تک جتنا بھی اضافہ کیا جائے گا وہ سب کعبۃ اللہ کے صحن ہی میں اضافہ ہوگا اور اس کے وہی فضائل اور احکام ہوں گے جو کتاب و سنت میں مسجد حرام کے بتائے گئے ہیں۔

پھر اس کعبہ اور مسجد حرام کے ارد گرد شہر مکہ ہے جس کو بلد اللہ الحرام کہا جاتا ہے پھر اس شہر مکہ کے چاروں طرف کئی کئی میل تک کی زمین کو حرم قرار دیا گیا ہے،

اور اس کی حدیں معین کی گئی ہیں، یہ حدیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقرر کی تھیں بعد میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں ان کی تجدید فرمائی۔ ان حدوں کا فاصلہ کعبہ مکرمہ اور مسجد حرام سے یکساں نہیں ہے بلکہ مختلف ہے یعنی کسی سمت میں حرم کی حد مسجد حرام سے دس میل کے قریب ہے، کسی سمت میں نو میل کے قریب ہے، کسی سمت میں سات میل اور کسی سمت میں صرف تین میل ہے، ان حدوں پر خطوط کھینچنے سے ایک طویل وعریض مخمّس علاقہ بنتا ہے، اس پورے علاقے کو اللہ تعالیٰ نے حَرَم یعنی واجب الاحترام قرار دیا ہے، اور اس کے خاص احکام ہیں مثلاً یہ کہ اس میں کسی جانور کا شکار نہیں کیا جا سکتا، کھڑے درختوں کی لکڑی نہیں کاٹی جا سکتی، ہری گھاس نہیں چھیلی یا اکھاڑی جا سکتی، وغیرہ وغیرہ اس علاقہ کی یہ عظمت و حرمت اور اس کے یہ احکام دراصل بیت اللہ ہی کی نسبت سے ہیں اور یہ سب کچھ دراصل اسی کا ادب واحترام ہے۔

پھر اس حرم کی حدوں سے بہت دور بیسوں پچاسوں میل دور مختلف سمتوں میں کچھ خاص مقامات مقرر کئے گئے ہیں اور حکم دیا گیا کہ جو لوگ ان مقامات سے باہر رہنے والے ہیں وہ جب حج یا عمرہ کے لئے آئیں (بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی غرض سے بھی مکہ مکرمہ آئیں) تو ان کو احرام بند ہو کے ان مقامات سے آگے بڑھنا چاہئے بغیر احرام کے ایک قدم آگے بڑھنا بھی ان کے لئے جائز نہیں ——— یہی مقامات **میقات** کہلاتے ہیں۔

یہ پانچ مقامات ہیں جو پانچ سمتوں سے مکہ معظمہ کی طرف آنے والوں کے لئے **میقات** قرار دئیے گئے ہیں انکے نام یہ ہیں۔ ذوالحُلَیفہ، جُحفہ، ذاتُ عِرق، قَرنُ المنازل، یَلَمْلَم۔

ذُوالحُلَیفہ، مدینہ طیبہ کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، یہ مدینہ سے صرف ۵-۶ میل ہے اور مکہ معظمہ سے سب سے زیادہ بعید میقات یہی ہے، قریباً دو سو میل کے فاصلہ پر ہے[1]۔

جُحفہ، یہ شام وغیرہ مغربی علاقوں سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، موجودہ

---

[1] بلکہ آج کل والے راستہ سے قریباً ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر ہے۔

رابغ کے قریب یہ ایک معروف بستی تھی، اب اس نام کی کوئی بستی موجود نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہو کہ اس کا محل وقوع رابغ کے قریب تھا جو مکہ معظمہ سے قریباً سو میل کے فاصلے پر بجانب مغرب ساحل کے قریب ہے۔

ذاتِ عِرق، یہ عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہو، مکہ معظمہ سے شمال مشرق میں عراق جانے والے راستے پر واقع ہے مسافت مکہ معظمہ سے ۵۰ میل کے قریب ہو گی۔

قَرنُ المَنَازِل۔ یہ نجد کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے۔ مکہ معظمہ سے قریبا تیس پینتیس میل مشرق میں نجد جانے والے راستہ پر ایک پہاڑی ہے۔

یَلَمْلَمْ۔ یہ یمن کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، یہ تہامہ کی پہاڑیوں میں سے ایک معروف پہاڑی ہے جو مکہ معظمہ سے قریبًا چالیس میل جنوب مشرق میں یمن سے مکہ آنے والے راستہ پر پڑتی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان پانچوں راستوں سے آنے والے حجاج کے لئے ان پانچ مقامات کو صراحت اور تعیین کے ساتھ میقات قرار دیا ہے۔ فقہائے امت کا اس پر اتفاق اور اجماع ہو کہ جو شخص حج یا عمرہ کے لئے ان مقامات میں سے کسی مقام کی طرف سے آئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ احرام باندھ کے اس مقام سے آگے بڑھے، اگر بغیر احرام کے ایک قدم بھی آگے بڑھے گا تو بے ادبی کا مرتکب ہو گا، اور اگر کوئی شخص ایسے علاقے سے آئے کہ اس کے راستہ میں ان مقامات میں سے کوئی مقام بھی نہ پڑے تو وہ کہیں نہ کہیں ان کی محاذات سے ضرور گذرے گا، اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس مقام محاذات سے آگے بڑھنے سے پہلے احرام باندھ لے، اور اگر بالفرض اس کو مقام محاذات کا پتہ نہ چل سکے یعنی کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اس کے راستہ میں میقات کی محاذات کہاں ہوتی ہے تو اس صورت میں فقہاء نے اس کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ مکہ معظمہ سے دو منزل پہلے (یعنی قریبًا ۳۰۔ ۳۵ میل پہلے) احرام باندھ لے۔ یہ ہے مسئلہ کی اصولی نوعیت۔

اس تمہید کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ قدیم زمانہ میں جب حج کا سفر بادبانی کشتیوں سے کیا جاتا تھا تو اہل ہند عموماً علاقہ یمن سے پہلے کی بندرگاہوں مسقط، مکلا، وغیرہ پر اترتے تھے اور آگے یمن کے راستہ سے مکہ معظمہ جاتے تھے، اسلئے ان کو یلملم سے احرام باندھنا ضروری ہوتا تھا کیونکہ علاقہ یمن سے آنے والوں کے لئے وہی میقات ہے لیکن اب بحری دخانی جہاز جو حجاج کو لیکر جاتے ہیں وہ سیدھے جدہ جاکر لنگر انداز ہوتے ہیں، اس لئے نہ تو یلملم ان کے راستہ میں آتا ہے اور نہ اس کی محاذات کے خط سے ان کو گزرنا پڑتا ہے، اس لئے جدہ سے پہلے سمندر میں احرام کے ضروری ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ــــ لیکن عمل یہ جاری ہے کہ جدہ پہونچنے سے قریباً ایک دن رات پہلے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ پہلے جہاز کے کپتان کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ فلاں وقت جہاز یلملم پہاڑی کے سامنے سے گزرے گا لہٰذا حجاج اس سے پہلے احرام باندھ لیں، حجاج عام طور سے اس اعلان کے مطابق عمل کرتے ہیں، خود اس عاجز نے بھی اپنے بحری سفروں میں اسی پر عمل کیا، لیکن یہ کھٹک ہمیشہ رہی کہ یلملم کے سامنے سے گزرنے کا کیا مطلب ہے، اگر مطلب یہ ہو کہ دوربین جیسے آلات کے ذریعہ اس جگہ سے یلملم پہاڑی نظر آتی ہے جو وہاں سے یقیناً پچاسوں میل کے فاصلہ پر ہوتی ہے، تو اس نظر آنے کا مسئلہ محاذات سے کوئی تعلق نہیں اور اگر مطلب یہ ہے کہ اس جگہ سے پہاڑی تک سیدھا خط کھینچا جا سکتا ہے تو ایسا سیدھا خط ہر جگہ سے کھینچا جا سکتا ہے بہرحال اس عاجز کے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال رہا، اگرچہ سب کی طرح عمل خود بھی اسی پر کرتا رہا، اور اس لئے عمل کرتا رہا کہ یہاں سے احرام باندھنا ضروری ہو یا نہ ہو لیکن اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں بلکہ اگر کوئی شخص اس سے بھی پہلے بمبئی یا کراچی میں جہاز پر سوار ہوتے ہی احرام باندھ لے یا اپنے گھر ہی سے احرام باندھ کے چلے تو اس کا احرام بھی صحیح ہوگا، بلکہ اگر وہ احرام کی پابندیاں نباہنے پر قادر ہے تو فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اس کے لئے یہی افضل ہے اور بعض صحابہ کرام سے ایسا کرنا ثابت بھی ہے۔

الغرض ہندوستانی جہاز کپتان کے اعلان پر سمندر میں جس جگہ سے احرام باندھتے ہیں وہاں سے احرام کے صحیح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، ہاں غور طلب یہ ہے کہ اس جگہ سے احرام باندھنا ضروری ہے یا نہیں؟ ——— اب سے چودہ سال پہلے ۱۳۶۹ھ کے الفرقان کے "حج نمبر" میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے کہ "اہل ہند کے لئے سمندر میں احرام باندھنا ضروری ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی بلکہ جدّہ پہونچکر احرام باندھنا بھی ان کے لئے صحیح ہونا چاہیئے"، حضرات اہل علم اور اصحاب فتویٰ کو توجہ دلائی تھی کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کر کے وہ ذہنوں کی صفائی اور یکسوئی کا سامان فراہم کریں ——— مولانا مرحوم کی اس تحریر کے مطالعہ کے بعد سے برابر اس کا انتظار رہا کہ حج کے مسائل و مناسک پر جن علماء کرام کی نظر وسیع اور عمیق ہے وہ اس مسئلہ پر تفصیلی اور تحقیقی روشنی ڈال کر تشفی کا سامان کریں۔

گذشتہ سال ۱۳۸۲ھ کے حج کے موقع پر جب حجاز مقدس حاضری نصیب ہوئی تو جیسا کہ اسی الفرقان کے کسی شمارہ میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے بعد فراغ حج مدینہ طیبہ میں حضرت مولینا شیر محمد صاحب سندھی مہاجر مدنی کی بھی زیارت کی توفیق ملی، ممدوح سے واقفیت رکھنے والے اکابر علماء کا اس پر گویا اتفاق ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں ممدوح بالخصوص حج کے مسائل و مناسک کے امام اور مرجع ہیں، ان کی تصنیف "عمدۃ المناسک" (جو الفرقان کے اسی سائز کے پانچسو سے زیادہ صفحات پر ہے) اس موضوع پر نہایت محققانہ جامع اور مستند ترین کتاب ہے اس میں موصوف نے اہل ہند کے میقات کے اس مسئلے پر بھی بڑی تحقیق اور تفصیل سے کلام فرمایا ہے، اس کے علاوہ جب اس ناچیز نے ممدوح سے یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اپنی کتاب کا یہ مقام کھول کے اور حرمین شریفین کا ایک مطبوعہ تفصیلی نقشہ (خریطۃ الحرمین الشریفین) سامنے رکھ کے بہت تفصیل سے مسئلے پر روشنی ڈالی اور جو کچھ فرمایا گویا اس کو نقشہ میں دکھا دیا، حضرت مولانا ممدوح کی تحقیق کا حاصل یہی ہے کہ ہندوستان و پاکستان سے جدّہ آنے والے جہازوں کے راستہ میں نہ کوئی **میقات** آتا ہے نہ کسی میقات سے وہ محاذات ہوتی ہے جو شرعاً معتبر ہو

اس لئے اس راستہ سے آنیوالے حجاج کے لئے سمندر میں کسی جگہ بھی احرام باندھنا ، ضروری نہیں یہ جدہ پہونچکر بھی احرام باندھ سکتے ہیں۔ ممدوح نے یہ بھی ذکر فرمایا اور اپنی کتاب میں بھی نقل فرمایا ہے کہ ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری قدس سرہٗ مہاجر مدنی اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی بعض تحریروں میں اس رائے کا اظہار فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی حجاج جدہ پہونچکر بھی احرام باندھ سکتے ہیں۔

مولانا ممدوح نے اس مسئلہ کو سمجھانے کے لئے اپنی کتاب کے پورے ایک صفحہ پر حَرَمؔ حِلؔ اور مَوَاقِیتؔ کا ایک نقشہ بھی دیا ہے، ناظرین کو اس مسئلہ کے سمجھنے میں اس نقشہ سے بہت مدد ملے گی اس لئے اس کو بھی ہم بجنسہٖ نقل کرینگے۔

آگے ہم اس مسئلے کے بارے میں مولانا ممدوح کی اصل عبارت بھی ان کی کتاب سے نقل کریں گے، لیکن اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ میقات کی حقیقت سمجھانے کے لئے اس مضمون کی تمہید میں جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کو آپنے سمجھ لیا ہو اور وہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہو۔ ہم وہاں ذکر کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کی جو حدیں مقرر کی ہیں ان کو خطوط کے ذریعہ گھیرنے سے ایک مخمّس بنتا ہے (اس کو آپ نقشہ میں دیکھ سکتے ہیں) یہ پورا علاقہ حرم ہے اور یہ خاصا طویل و عریض علاقہ ہے ۔۔۔ پھر حرم کی ان سرحدوں سے بیسیوں پچاسوں میل دور (بلکہ مدینہ طیبہ کی جانب تو تقریباً دو سو میل دور) پانچ مقامات کو میقات مقرر کیا گیا ہے، جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، ان مقامات کو خطوط سے گھیرنے سے بھی سینکڑوں میل طویل و عریض ایک مخمّس علاقہ ہی بنتا ہے (اس کو بھی آپ نقشہ سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں) اس کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ حدود حرم سے باہر یا کہہ لیا جائے کہ حدود حرم کو گھیرنے والے خطوط سے باہر مواقیت تک اور مواقیت کو احاطہ کرنے والے خطوط تک جو درمیانی علاقہ ہے اس کو فقہی اصطلاح میں حِلؔ اور اور حِلِّ صَغِیْر کہا جاتا ہے۔ (مثلاً مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ کی سمت تنعیم تک حرم ہے

اور وہاں سے ذوالحلیفہ تک قریباً دُس میل کا جو علاقہ ہے وہ حِل ہے اور مواقیت سے باہر کی ساری دنیا کو آفاق اور حِل کے باہر کہا جاتا ہے۔ پس جو لوگ حدود حرم سے باہر اور مواقیت کے حدود کے اندر رہتے ہیں (یعنی حِل میں رہتے ہیں) اُن کے لئے تو حکم یہ ہے کہ وہ حج یا عمرہ کو جائیں تو حرم میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھ لیں، مثلاً جو لوگ مکہ کے شمال میں تنعیم اور ذوالحلیفہ کے درمیان کہیں رہتے ہیں ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ تنعیم سے احرام ضرور باندھ لیں، اور جو لوگ میقاتوں کی حدود کے باہر آفاق میں رہتے ہیں ان کو حکم ہے کہ وہ ان میقاتوں سے آگے بڑھنے سے پہلے احرام بندھ جائیں یعنی علاقہ حِل میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھ لیں۔ پس جو لوگ ان پانچوں میقاتوں میں سے کسی میقات سے گذر کے آئیں ان کا مسئلہ تو سیدھا ہے کہ وہ اس مقام سے آگے بڑھنے سے پہلے احرام باندھ لیں اور جن کے راستہ میں کوئی میقات نہ پڑے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس خط کو عبور کرنے سے پہلے احرام باندھ لیں جو ایک میقات سے دوسرے قریبی میقات تک پہونچ کر حِل اور آفاق کے درمیان کا خط فاصل بنتا ہے، یہی خط دراصل میقات کی محاذات کا خط ہے جب تک آدمی اس خط سے باہر ہے آفاق کے علاقہ میں ہے، جب اس کے اندر قدم رکھے گا تو حِل کی سرحد میں داخل ہو جائے گا اور آفاقی کے لئے احرام کے بغیر حِل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ——— اور اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جو شخص کسی ایسے راستے سے آئے جس میں کوئی میقات نہیں پڑتا اور اس کو اس کا بھی ٹھیک پتہ نہیں کہ حِل کی حد یعنی محاذات کا خط اس کے راستہ میں کہاں آتا ہے تو اس کے لئے حکم ہے کہ وہ مکہ معظمہ سے دو منزل پہلے احرام باندھ لے۔

حضرت مولانا بشیر محمد صاحب نے اپنی کتاب "عمدۃ المناسک" میں جو کچھ اس بارہ میں لکھا ہے اس کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے ——— مولانا کی زبان اور کتاب کی عبارت عام فہم اور واضح نہ ہونے کی وجہ سے عام ناظرین کے لئے اس کا سمجھنا مشکل ہوتا اس لئے متعلقہ اصطلاحات **حرم، حِل، آفاق، میقات**

محاذات، وغیرہ کی تشریح بھی کر دی گئی اور موصوف کی تحقیق کا حاصل بھی پہلے لکھ دیا گیا، امید ہے کہ اس کے بعد عام ناظرین کے لئے بھی ممدوح کی عبارت کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

مولانا ممدوح نے اس ناچیز سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کی کتاب میں سے کچھ شائع کیا جائے تو اس عبارت کو عام فہم کرنے کے لئے اس میں حسب ضرورت ترمیم کر دی جائے۔ چنانچہ آگے ممدوح کی کتاب کا جو اقتباس درج کیا جا رہا ہے اس میں مولانا کے حسب الحکم کہیں کہیں معنوی لفظی ترمیم بھی اس عاجز نے اس ضرورت کے تحت کر دی ہے،

مولانا نے مسئلہ سمجھانے کے لئے حرم، حل، اور مواقیت کا جو نقشہ اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اس کی بھی نقل پیش کی جا رہی ہے۔ اس کے بارہ میں یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ یہ نقشہ پیمائشی نہیں ہے اور نہ فنی باریکیوں کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد بس مسئلہ کو سمجھانا ہے اور یہ مقصد اس سے پورا ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ناظرین کرام نقشہ اور مسئلہ کی تحقیق میں مولانا ممدوح کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

اہل ہند و پاکستان کے میقات کے بارہ میں حضرت مولانا شیر محمد صاحب مہاجر مدنی کی تحقیق	مولانا ممدوح اپنی تصنیف ——— "عمدۃ المناسک" میں لکھتے ہیں.

"ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بمبئی یا کراچی سے جب سمندر کے راستہ سے جہاز میں سوار ہو کر حج کو آتے ہیں تو ان کو حقیقت میں خاص کسی میقات یا ان کی محاذ سے گزرنا نہیں ہوتا اور جہاز سمندر میں حدِّ آفاق ہی میں سے گزرتا ہے اور وہ یلملم سے بہت دور باہر باہر آگے آفاق ہی میں جاتا ہے اور یلملم تہامہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑی ہے جو مکہ مکرمہ کے قریب واقع ہے اس لئے جہاز یا کشتی کا اگرچہ سمندر کے ساحل ہی سے آنا ہو مگر یلملم سے آگے حدِ حِل میں بڑھ جانا ممکن ہی نہیں ——— اور یہ جو حج کے بعض رسالوں میں لکھتے ہیں کہ "اس صورت میں ہم کو
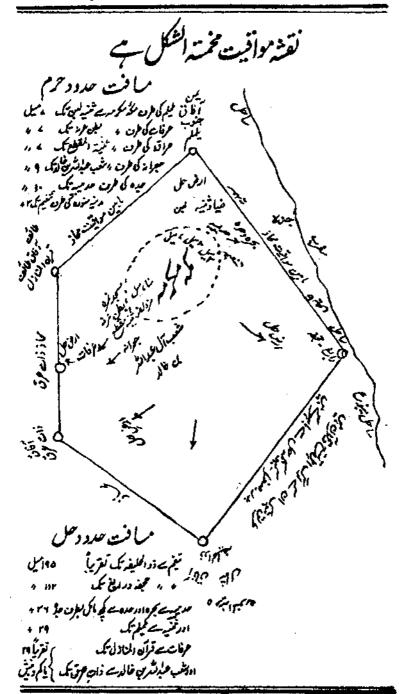
میقات کے محاذ کا علم نہیں ہو سکتا اور چونکہ کپتان اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں اس لیے ان کا قول معتبر نہیں"۔ سو یہ اور بات ہے (اس کا مسئلہ سے کوئی خاص تعلق نہیں) کیونکہ اس معاملہ میں کسی کے قول کے معتبر یا نامعتبر ہونے کا سوال اس وقت پیدا ہو گا جبکہ حجاج عین میقات یا اس کے محاذ سے حل کی طرف بڑھنے لگیں اور ان کو میقات یا محاذ معلوم نہ ہو اس وقت میں جاننے والے مسلمان کا قول معتبر ہو گا اور غیر مسلم کا معتبر نہ ہو گا، لیکن یہاں تو صورت یہ ہے کہ جہاز کا میقات یا محاذ میقات سے نہ گزرنا یقینی طور پر معلوم ہے کیونکہ یلملم پہاڑی جہاز کے راستے سے پچاسوں میل دور یمن کے ملک سے بھی آگے مکۂ معظمہ کے قریب دو منزل کے فاصلہ پر واقع ہے اس لیے سمندر میں جہاز کا گزر نہ تو یلملم پہاڑی سے ہوتا ہے اور نہ اُس محاذات سے جو شرعاً معتبر ہے، کیونکہ سمندر میں کسی جگہ بھی وہ محاذات نہیں ہوتی، لہذا کپتان یا اس کے سوا کوئی اور یلملم کے سامنے ہونے کی خبر دیتا ہے تو اس کی وجہ سے حجاج پر احرام باندھنا لازم نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں کا تجاوز میقات معتبر نہیں ہے اگرچہ وہاں سے میقات کا آمنا سامنا ہونا صحیح طریق سے یقینی معلوم ہو جائے، اس لیے کہ مابین جہاز اور میقات کے بہت سی مسافت ہے وہ سب آفاق یعنی حلّ کبیر ہی میں داخل ہے، اور اس محاذ سے آگے آفاق میں بڑھنا تجاوز نہ کہا جائے گا، اور ممنوع اور حرام تجاوز وہ ہے کہ میقات یا محاذ میقات سے بڑھ کر آگے حلّ صغیر میں جو کہ میقات اور حرم کے بیچ میں کی زمین ہے) اس میں بلا احرام داخل ہو، ...... (الغرض ہند وسندھ کے لوگوں کو سمندر میں کسی جگہ بھی احرام باندھنا ضروری نہیں کیونکہ سمندر سارا آفاق میں ہے) اور ہندوسندھ کے لوگوں کے لیے جو یلملم میقات مشہور ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے زمانہ میں کشتیوں سے سمندر کے ساحل سے آتے تھے اور ساحل کے بندروں مثلاً مُسقط و مُکلّا وغیرہ ٹھہرتے ہوئے ملک یمن کے قریب آکر اترتے تھے اور اس سے آگے جب یلملم پر آتے تھے تو وہاں

سے احرام باندھتے تھے، اُس زمانہ میں یا اب بھی خشکی کے راستہ سے یمن کی طرف سے جو لوگ آتے ہیں تو اب بھی اسی طرح یلملم سے احرام باندھ کر آگے حِل میں داخل ہوتے ہیں۔"

(عمدۃ المناسک صفحہ ۶۱)

اسی سلسلے میں آگے اہلِ ہند و پاکستان کے لیے جہاز سے اُتر کر جدّہ میں احرام باندھنے کا ذکر کرنے کے بعد مولانا ممدوح نے لکھا ہے کہ

"جدّہ اگرچہ خود میقاتِ معینہ میں سے نہیں ہے اور نہ کسی میقات یا اس کے محاذ کے اندر واقع ہے، پس جو حاجی بحری راستے سے اس طرف سے آئیں جو کسی میقاتِ معینہ یا اس کے محاذ کے اندر حِل میں داخل نہ ہوتا ہوا آیا ہو، جیسے یہ جہاز آتا ہے تو یہ لوگ جدّہ ہی سے احرام باندھ لیں کہ یہ مکہ مکرمہ سے دو منزل دور ہے جیسا روایات سے معلوم ہوگا۔

پھر مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے لکھتے ہیں۔

"جاننا چاہیے کہ مکہ مکرمہ کے چوگرد حدِّ حرم ہے، اس حد کے باہر حِل شروع ہوتی ہے مواقیت تک۔ پس ایک میقات سے دوسرے میقات کے محاذ میں جو لکیریں نقشہ میں دیکھو گے یہ آفاق اور حِل کے بیچ میں حدِ فاصل ہے، باہر آفاق اور اندر حِل ہے۔ پس باہر آفاق سے آنے والوں کو میقات یا ان کے محاذ کی لکیروں سے اندر بلا احرام آنا حرام ہے[1]۔

---

[1] مناسک حج سے متعلق علامہ ملا آخون جان مرغینانی مہاجر کا رسالہ جو اپنے موضوع پر بہترین اور مستند ترین کتابوں میں سے ہے اور ملا علی قاری کی شرح مناسک کے حاشیہ میں جس کا جابجا حوالہ ہے اس کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"قال اصحابنا من المواقیت الی حد الحرم مکان واحد الا ان المواقیت لہا احکام خاصۃ فی حق الآفاقی بان لا یجوزھا بلا احرام لتعظیم البیت واجلالہ کما فی المشاھد فتحصل من ذالک ان حرم الحرم ای المواقیت مثل الحرم محیط بما فی جوفہ مثل الخطوط الممدۃ

(باقی برصفحہ آئندہ)

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ سمندر میں آنے والے حاجیوں کا جہاز جب جدّہ میں آکر لنگر ڈالتا ہے تو (سمندری راستہ میں) کسی بھی جگہ یلملم یا کسی اور میقات یا اس کے محاذ سے آگے نہیں گزرتا اور نہ سمندر کی خلیج کہیں ابین میقاتین یا اس کے محاذ میں واقع ہے بلکہ سب مواقیت مع محاذ کے خشکی میں واقع ہیں۔ پس جہاز آفاق ہی میں آکر جدحل سے گویا باہر ہی اترتا ہے تو ان حاجیوں پر اسی محاذ سے احرام باندھنا واجب ہوگا جو یلملم اور جُحفہ کے درمیان محاذ کی لکیر ہے جو نقشہ سے معلوم ہوگی۔ ص ۶۴

اس کے بعد ص ۶۵ پر لکھتے ہیں :-

یہ یقینی بات ہے کہ جو بحری راستے سے جدّہ سے آئے تو اس کو سمندر میں میقات یا اس کے محاذ سے نہیں گزرنا پڑتا جیسا کہ نقشہ میں معلوم ہوگا اسلئے سب کتابوں میں یہی لکھتے ہیں کہ جس کو کسی میقات یا محاذ سے گزرنا نہ پڑے اور اس کو میقات یا محاذ کے ہوتے ہوئے ان کا علم نہ ہو تو وہ دو منزل مکۂ مکرمہ سے پہلے سے احرام باندھ لے اور اس کے لیے جدّہ کی مثال دیتے ہیں۔...... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ نے بھی یہی فرمایا ہے، امداد الفتاویٰ کے حصہ خامسہ کے صفحہ ۱۰۱ پر حضرت کی تحریر درج ہے ـــــ سوال یہ کیا گیا ہے کہ حج بدل کا احرام کہاں سے باندھا جائے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ گزشتہ

بین النقاط فکما ان النقاط مواقیت فکذ الک الخطوط بینہا والا لما زالدخول الی الحرم بلا احرام من بین المیقاتین ویؤیدکون الکل حرم الحرم مافی البحر العمیق وامداد الفتاح وغیرھما جما قالوا فی حکمتہ کون المواقیت متفاوتۃ قرباً وبُعداً من انہ اھبط اللّٰہ الحجر الاسود من الجنۃ ووضع مکانہ اضاء اطراف الحرم فکل مکان وصل الیہ ضوءہ صار میقاتاً۔» ـــــ انتہی من رسالۃ علامہ واملا آخون جان مرغینانی

حاشیہ عمدۃ المناسک ص ۶۳

تو جواب میں فرمایا کہ حج بدل کا احرام جدہ سے ہوگا۔ مناسک علی قاری میں عبارت موجود ہے "وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر" (لباب صفحہ ۵۶) اور یہ ظاہر ہے کہ اہل ہند کے لیے یلملم کی میقات کسی معتبر طریقہ سے معلوم نہیں ہوتی لہٰذا جدہ بھی ان کے لیے میقات ہے۔ ۷ ار شعبان ۱۳۲۲ھ تصدیق شدہ حضرت ممدوح قدس سرہ .....

اسی طرح رسالہ "حقیقت حج" میں مولوی منظور علی صاحب نے بھی لکھا ہے جس پر بہت سے علماء کرام اور خصوصاً مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تصدیق ہے۔ "میقات یلملم پر ایک بحث" کا عنوان قائم کر کے اس میں لکھتے ہیں۔

یلملم سے احرام باندھنے کا ایک اصلاح طلب مسئلہ ہے جس پر اس وقت تک کچھ غور نہیں کیا گیا، یمن کی طرف سے براہِ خشکی آنے والوں کے لیے مقام یلملم میقات ہے جس کو "جبل سعدیہ" کہتے ہیں جو کہ مکہ مکرمہ سے ۳۶ میل جانب جنوب مشرق میں واقع ہے اور کنارہ سمندر سے اسی قدر دور ہے۔ یہ مقام یمن والوں کے لیے تو بہتر ہے مگر جو ہندوستان یا جاوا سے براہِ سمندر آویں یا دیگر راستوں سے آنے والوں کے واسطے ہر جانب سے مقرر شدہ میقات یا ان کے درمیان سے احرام باندھنا چاہیے، یہ تمام میقات خشکی کے راستہ پر ہیں۔ اگر کوئی خشکی کے راستہ سے جائے تو وہ میقات کی حدود کے پہونچنے پر احرام باندھ سکتا ہے، ہندوستان والوں کو جہاز پر سمندر میں ایسے مقام پر احرام باندھنا پڑتا ہے جہاں سے نہ تو یلملم کی پہاڑی نظر آتی ہے اور نہ وہاں سے کوئی بندرگاہ ہی قریب ہے۔ سیدھ کے معنی یہ نہیں جیسے کہ اس وقت تک کی سیدھ لی جاتی ہے حالانکہ جہاز وہاں سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر ہوتا ہے۔ حد میقات یلملم سے (جدہ سے آگے گزرتی ہوئی) رابغ اور رابغ سے ذوالحلیفہ تک چلی گئی ہے۔ صفحہ ۶۵-۶۶-۶۷

باقی صفحہ ۵۸ پر

رمضان المبارک میں روزے رکھ کر آپ اپنے
ذہن، جسم اور رُوح کو پاکیزگی اور تزکیۂ نفس
کے ذریعے ایک نیا احساس عطا کرتے ہیں
سحری کے وقت آپ قوت اور توانائی کے لیے سنکارا
استعمال کیجیے۔ سنکارا کے استعمال سے آپ تمام دن روزہ کی
تھکاوٹ، پیاس اور عام نقاہت سے محفوظ رہیں گے۔ غروبِ آفتاب
کے وقت، جب آپ کا تمام خاندان افطار کے لیے جمع ہو
اس وقت بھی سنکارا استعمال کیجیے، جو جڑی بوٹیوں اور وٹامنز
کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے اور آپ کو روزہ کی دن بھر کی ماندگی
سے نجات دلا کر نئی توانائی اور قوت بخشتا ہے
سنکارا ہر روز استعمال کیجیے
سنکارا
دہلی ، کانپور ، پٹنہ

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
ہماری دعوت
مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

اس شمارہ کی قیمت ایک روپیہ

جلد ۳۱	بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۸۳ھ مطابق فروری و مارچ ۱۹۶۴ء	شمارہ ۹-۱۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے! براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں! یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

ــــ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۳۱ مارچ تک پہونچ جانا چاہئے۔

پاکستان کے خریدار: ــ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس خوبا بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت: ــ رسالہ انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں، ان کی اطلاع ۳۰ تاریخ کے اندر آنی چاہئے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

مقام اشاعت: ــ دفتر ماہنامہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

—— محمد منظور نعمانی

کلکتہ کے فساد نے ایک دفعہ پھر ہندوستان کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیا ہے اور اپنے مستقبل کے بارہ میں غور و فکر کا ایک نیا سلسلہ ان میں شروع ہو گیا ہے ——— اس غور و فکر اور سوچنے سمجھنے کا ایک انداز تو وہ ہو سکتا ہے جو انسانوں کے ان گروہوں اور طبقوں کا ہوتا ہے جو وحی و نبوت کی روشنی سے محروم ہوتے ہیں اور اُن کے دل اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی قدرت کی کارفرمائیوں اور اس کے مقرر کئے ہوئے قانونِ مکافات و مجازات پر ایمان و یقین سے خالی ہوتے ہیں، وہ صرف ظاہری اسباب اور مادی تدابیر ہی کو جانتے ہیں۔ اس لئے جب وہ ایسے حالات سے دوچار ہوتے ہیں جن سے مثلاً ہندوستان کے ہم مسلمان دوچار ہیں تو وہ صرف ظاہری سیاسی تدابیر اور مادی اسباب و عوامل کے نقطۂ نظر ہی سے غور کرتے ہیں اور ان کا سارا غور و فکر اور تمامتر کوشش اور جد و جہد اسی لائن پر اور اسی دائرہ میں ہوتی ہے ——— اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے عالمِ اسباب بنایا ہے اور اس میں ظاہری تدبیروں اور اسبابی کوششوں کے بھی نتائج نکلتے ہیں۔

بہرحال سوچنے کا ایک انداز اور ایک طریقہ وحی و نبوت کی روشنی سے محروم اور خدا سے ناآشنا مادہ پرستوں اور صرف ظاہری اسباب و تدابیر کی کارفرمائی پر یقین رکھنے والوں کا ہے۔ اور دوسرا طریقہ صاحب وحی و کتاب انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کا ہے وہ ظاہری سلسلۂ اسباب و تدابیر کی نفی نہیں کرتے،

لیکن اس عالم میں اصل عامل اور متصرف وہ اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیت اور اس کے ارادہ کو مانتے ہیں اور اس کے مقرر کئے ہوئے قانون مکافات پر بھی ایمان رکھتے ہیں ــــ یعنی وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بھی کارفرما ہے کہ جو قوم خدا کی بندگی کے صحیح راستہ پر چل کے اور اچھے اعمال و اخلاق اختیار کر کے اپنے مقصد زندگی کو پورا کرے گی اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی برکتوں سے نوازے گا اور اس کو عزت اور عافیت کی زندگی دے گا، اور اس کے برعکس جو قوم (بالخصوص اللہ و رسول سے تعلق ظاہر کرنے والی کوئی قوم) اگر خدا پرستی کے بجائے نفس پرستی اور بداعمالی و بداخلاقی کی روش اختیار کرے گی تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنی دی ہوئی نعمتیں بھی چھین لے گا اور وہ دنیا میں ذلت کے عذاب میں مبتلا کی جائے گی (جیسا کہ قرآن مجید نے جابجا بنی اسرائیل کا حال بیان کیا ہے ــــ

بہرحال قوموں کے عروج و زوال، ترقی و انحطاط اور اُن کے اچھے برے حالات پر غور کرنے کا دوسرا طریقہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کا ہے۔ یہ حضرات جیسا کہ عرض کیا گیا ظاہری اسباب و تدابیر کی نفی نہیں کرتے لیکن بنیادی اہمیت ایمان اور اعمال و اخلاق کو دیتے ہیں ــــ

اس اشاعت میں اس ورق کے بعد ہی رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک اہم مضمون شائع کیا جا رہا ہے، یہ مضمون دراصل اس ایمانی طرزِ فکر کی بنیاد پر ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے ایک پیغام اور ایک دعوتِ فکر و عمل ہے ــــ ہماری گزارش ہے کہ مسلمانوں میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے گی ــــ امید ہے کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے اس کو مستقل پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جائے گا۔

ناظرین کو معلوم ہے کہ قریباً دس سال سے الفرقان کی ادارت اور ترتیب و تیاری کی پوری ذمہ داری مولوی عتیق الرحمن سلمہ اللہ تعالیٰ سنبھالے ہوئے تھے اور میں اس طرف سے بالکل فارغ اور سبکدوش تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ قریباً سال سوا سال سے ان کی صحت کی خرابی کا سلسلہ جاری ہے ــــ اس مدت میں وہ صاحبِ فراش بہت کم رہے، زیادہ دن اس حال میں گزرے کہ وہ چلتے پھرتے تھے اور کچھ تھوڑے سے معالجین کی رائے یہ تھی کہ وہ دماغی کام بالکل نہ کریں لیکن وہ کچھ لکھ پڑھ بھی لیتے تھے۔

دسمبر جنوری میں ان کی صحت زیادہ قابل اطمینان اور بہتر رہی، اسی لئے رمضان کے روزے قضا کرنے پر بھی وہ تیار نہ ہوئے۔ شعبان کا شمارہ ــــ جو شروع فروری (وسط رمضان) میں شائع ہو سکا تھا ــــ اس کی ترتیب و تیاری کا کام انھوں نے ہی کیا ــــ چودہ رمضان کو میں کلکتہ چلا گیا تھا، اور ایک ہفتہ کے بعد ۲۲ کو میری واپسی ہوئی۔ اسی دوران میں الفرقان ۱۶ رمضان کو تیار ہو کر ۱۷ کو روانہ ہو سکا۔ رسالہ کی روانگی کے دن دفتری کام بہت زیادہ ہوتا ہے، وہ افطار کے بعد تک اس میں شریک و منہمک رہے ــــ تراویح کے بعد اُن پر ضعفِ قلب کا ایک سخت قسم کا دورہ پڑا، پھر تین تین چار چار دن کے فاصلے سے دو تین دورے اور اسی قسم کے ہوئے، ان دوروں کے نتیجہ میں اتنا ضعف پیدا ہو گیا کہ بات کرنا مشکل ہوتا تھا اور نماز بھی اشاروں سے پڑھی جا سکتی تھی ــــ یہ سب کچھ رمضان کے آخری دو ہفتوں میں ہوا، اس کے بعد سے اب تک الحمد للہ دورہ نہیں ہوا ہے اور حالت کافی بہتر ہے ــــ ناظرین کرام سے دعائے صحت کی درخواست ہے اور اسی لئے ان کی علالت کی کیفیت تفصیل سے لکھ دی گئی ہے ــــ

احباب مخلصین بھی بس دعا ہی فرمائیں، اسی کی احتیاج ہے اور اسی سے انشاء اللہ اُن کو نفع ہو گا ــــ

دریافت حال کے لئے جواب طلب خطوط لکھنا اس ناچیز کے کام میں اضافہ کا باعث ہو گا۔

مسلمانانِ ہند سے

کچھ صاف صاف باتیں

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

مولینا سید ابوالحسن علی ندوی

ساری دنیا کے مسلمانوں کے حالات نے اس بات کی شدید ضرورت پیدا کردی ہے کہ ان سے بغیر رو رعایت اور بغیر کسی اشارہ کنایہ کے کچھ صاف صاف باتیں کی جائیں، یہی ان کے ساتھ سب سے بڑا اخلاص اور سب سے بڑی ہمدردی ہے، اور اسی میں اپنی اور تمام مسلمانوں کی حفاظت و سلامتی کا راز مضمر ہے یہ فریضہ ہر جگہ اور ہر زبان میں ادا ہونا چاہیئے لیکن بہت سی سہولتوں کی بنا پر اس وقت روئے سخن ہندستانی مسلمانوں کی طرف ہے، جن کے تازہ حالات نے انکو ایک طرف اپنے حالات کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے، دوسری طرف ان میں حقائق و واقعات پر غور کرنے کی نئی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو گئی ہے مزید برآں خاص سیاسی و خارجی حالات نے ان کی صورت حال کچھ ایسی بنا دی ہے کہ ان کیلئے دین کی کھلی راہ اختیار کرنے اور نصرت الہٰی کے سایہ کے نیچے آنے کے سوا کوئی راہ نہیں ہے۔ قرآن مجید کے معجزانہ الفاظ میں ان کی صحیح تصویر یہ ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ وَ ضَاقَتۡ عَلَیۡہِمۡ اَنۡفُسُہُمۡ وَ ظَنُّوۡۤا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّاۤ اِلَیۡہِ

(التوبہ ع ۱۴)

(یہاں تک کہ جب زمین اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی طبیعتیں گھٹنے لگیں اور وہ گمان کرنے لگے کہ اللہ سے صرف اللہ ہی کے دامن رحمت میں پناہ ہے)

ایک ذی ہوش صاحب ضمیر غیور اور جری قوم کی طرح ہمیں اپنے گرد و پیش کے حالات کا پورا جائزہ لینا چاہیئے، اس سلسلے میں جو غلطی ملک کی جمہوری اور نا مذہبی حکومت کی طرف سے یا جو کوتاہی قومی اور ملکی اداروں سے ہو رہی ہو، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے پوری طاقت اور صفائی کے ساتھ اس پر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں کسی بدگمانی یا رشتہ دوانی سے نہیں ڈرنا چاہیئے کہ یہی سچی حب الوطنی ہے۔ جمہوریتیں اسی طرح بنتی اور پھلتی پھولتی ہیں اور ملکوں کی سلامتی اور خوشحالی کا راز اسی میں مضمر ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اسی کی ہے کہ کسی کی راضی و ناراضی اور ذاتی یا گروہی مصلحتوں سے بالکل بے پروا ہو کر سچی اور بے لاگ بات کہی جائے ہمارا اللہ سے عہد ہے کہ اس سلسلہ میں ہم کسی منفعت پرستی یا مصلحت شناسی سے کام نہیں لیں گے اور خواہ ہماری آواز کیسی ہی "صدا بصحرا" ثابت ہو، ہم یہ آواز بلند کرتے رہیں گے

لیکن کوہ صفا کی صاف گوئی کی تقلید اور رہنمائی میں (جب ایک صبح دنیا کے سب سے سچے انسان کی آواز پر "مکہ" کی وادی کے بسنے والے اس انتظار و اضطراب میں جمع ہو گئے تھے کہ کسی بیرونی خطرہ اور حملہ اور دشمن کی اطلاع دی جائے گی، لیکن ان کو بتایا گیا کہ دشمن ان کے باہر نہیں ان کے اندر ہے اور سب سے بڑا خطرہ وہ ہے جو ان کے غلط طرز زندگی کے نتیجے میں ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے) اس کی ضرورت ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو خود اپنے حالات کا جائزہ لینے پر آمادہ اور اس خطرہ سے ہوشیار کیا جائے جو ان پر سایہ فگن ہے، اس سلسلہ میں عقائد اور اعمال و اخلاق سے لے کر ملی فرائض، اجتماعی

ذمہ داریوں اور قوموں کے عروج و زوال کے الٰہی و قرآنی اصولوں اور قوانین کے جائزہ کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کے لئے اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کافی ہیں، یہاں کسی تفصیل کا موقع نہیں ہر چند باتیں جو قرآن کے محدود مطالعہ کے نتیجے میں نظر میں آئیں لکھی جاتی ہیں حالات کی تبدیلی اور حقیقی حفاظت و نصرت کے لیے ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

(۱) قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی ایسی قوم جو خدا کے پیغمبر پر ایمان لا چکی ہو اور اس کو آسمانی کتاب دی جا چکی ہو مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہو جائے تو وہ خدا کی رحمت و نصرت سے دور اور ذلت و بے عزتی کا شکار ہو جاتی ہے، سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے صاف فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ۝ (الاعراف ع ۷)

(جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اسی دنیوی زندگی ہی میں پڑے گی، ہم افترا پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں)

دوسری طرف توحید کامل پر صاف صاف عزت و سربلندی، دین کے غلبہ و استحکام اور امن و حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (النور ع ۷)

(تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے لئے قوت دیگا اور ان کے اس خوف کے بعد اسکو مبدّل با من کرے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں اور جو شخص اس وعدہ کے بعد ناشکری کرے گا تو یہ لوگ بے حکم ہیں)

نزول قرآن کے بعد جن لوگوں (صحابہ کرام) نے سب سے پہلے اور سب سے مکمل طریقہ پر اس شرط کو پورا کیا، ان کے متعلق غیر مبہم الفاظ میں شہادت دی گئی اور تاریخ نے سر جھکا کر اس کی تصدیق کی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (الانفال ع ۱۶)

(اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم قلیل تھے زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے، اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم شکر کرو ———— (سورہ انفال ع ۴)

یہ حقیقت خواہ کتنی تلخ ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لئے نامانوس ہو مگر بہر حال حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں بہت سے مشرکانہ عقائد و اعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کے اعتراف کے لیے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرات کی ضرورت ہے، اگر شرک کی کوئی حقیقت ہے اور وہ عنقا کی طرح کوئی خیالی اور فرضی چیز نہیں اور اگر قوموں اور ملتوں کے لئے ایک ہی میزان عدل اور ایک ہی پیمانہ ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان (خواہ احول سے متاثر ہو کر خواہ علم اور صحیح تبلیغ کی کمی کی وجہ سے) اس ذہنی گمراہی اور عملی بے راہ روی میں مبتلا

ہو گئے ہیں جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے" اگر کسی کو اس میں شبہہ ہو یا وہ کسی خیالی دنیا میں رہتا ہو تو کسی "مرجع خلائق" مزار پر جا کر اور کسی عرس میں شریک ہو کر دیکھ لے، یا ان عقائد و خیالات کو سننے کی کوشش کرے جو بکثرت عوام اور کہیں کہیں خواص نے اولیاء کرام بزرگان دین اور اپنے سلسلہ کے مشائخ کے متعلق قائم کر رکھے ہیں کہ "صفت خلق" (پیدا کرنے کی طاقت) "ایجاد عالم" اور تشکل سے ایک دو صفتوں کے علاوہ صفات و افعال الٰہی میں سے کون سی صفت اور کونسا فعل و تصرف ہے جو انھوں نے ان بزرگوں سے منسوب نہیں کر رکھا ہے اور سجدہ سے لے کر دعا و استعانت تک کون سا معاملہ (جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے) نہیں ہے جو انھوں نے ان کے ساتھ روا نہیں رکھا ہے، قرآن مجید ہاتھ میں لے کر کسی بڑی بستی یا خوش اعتقادی کے کسی غالی مرکز میں چلے جایئے اندیشہ ہے کہ آپ کی زبان سے بھی بے اختیار قرآن کے یہ الفاظ نہ نکل جائیں کہ

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ

(اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں)

(یوسف ع ۵)

ایسی حالت میں خالص قرآن کی روشنی میں حفاظت اور نصرت و تائید الٰہی کی کیا امید کی جا سکتی ہے اور رہنمایان قوم کی خارجی تدبیریں کیا کارگر ہو سکتی ہیں؟ جب کہ امن و حفاظت تک کے لئے اس کی شرط کی گئی ہے کہ

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا		(النور ع ۷)

(بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شریک نہ کریں) (۱۲)

اس سلسلہ میں علماء و واعظین و واقفین حال کا جو فرض ہے وہ محتاج بیان نہیں، اور اس فرض کے "فرض کفایہ" کے درجہ میں بھی باقی نہ رہنے سے جس عمومی باز پرس اور مواخذہ کا خطرہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

(۲) دنیا میں جس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون طبعی جاری و ساری ہے ہزاروں برس سے آگ جلاتی ہے، پانی بجھاتا ہے، سنکھیا کام تمام کرتی ہے اور تریاق زہر کے اثر کو دور کرتا ہے

دوائیں، غذائیں، قوت، تعداد، اسلحہ، محنت، تنظیم اور زندگی گزارنے اور کامیابی حاصل کرنے کے آزمودہ اور معروف طریقے بحکم الٰہی اپنا اثر رکھتے ہیں، اسی طرح اس کا ایک اخلاقی قانونِ مکافات بھی ہے، اچھے برے اخلاق و اعمال افراد اور قوموں کی زندگی میں اپنا اثر اور خاصیتیں رکھتے ہیں قرآن مجید نے اقوام سابقہ کے تذکرہ میں ان کی تاثیر اور ان کے نتائج کا واضح طریقہ پر ذکر کیا ہے، اور ان افراد اور اقوام کا انجام بتایا ہے جنھوں نے ان اخلاق و اعمال کا مظاہرہ کیا، قومِ ہود، قومِ صالح، قومِ لوط، اور قومِ شعیب کا حال دیکھ لینا کافی ہے، جن کے خاص امراض اور احوال و اخلاق ذکر کر کی نشاندہی کی گئی ہے، اور ان کے ان اعمال و اخلاق کا انجام بتایا گیا ہے، حدیث شریف میں خاص خاص اخلاق و اعمال کا انجام اور دنیا وی زندگی میں ان کے اثرات اور خاصیتوں کا بہت صاف الفاظ میں تذکرہ ہے، کسی پر بے برکتی، کسی پر امراض اور پریشانیوں کی کثرت، کسی پر کثرتِ اموات، کسی پر ذلت و خواری، اور کسی پر بزدلی و مرعوبیت کا اعلان کیا گیا ہے، اس "طبِ نبوی" کا مطالعہ اس دور میں خاص طور پر بہت ضروری اور مفید ہے اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کے ترک پر اطلاع دی گئی ہے کہ دعائیں تک مقبول نہیں ہوں گی، اس کے برخلاف توبہ و انابت کی عمومی فضا پر آئے ہوئے عذاب کے ٹل جانے کی خبر دی گئی ہے[1] فسادِ عقیدہ و فسادِ اعمال و اخلاق کے علاوہ مسلمانوں میں

---

[1] سورۂ یونس (رکوع ۱۰) میں ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ۝

ترجمہ: کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ یقین لاتی پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر یونس کی قوم جب یقین لائے ہٹا دیا ہم نے ان سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں اور کام چلایا ان کا ایک وقت تک۔

ایک بڑی تعداد نفاق عملی واخلاقی میں اور خواص وقائدین کی ایک تعداد نفاق اعتقادی تک میں مبتلا ہے، ایک بڑی تعداد فرائض کی تارک "حتی کہ اسلام کے رکن اعظم نماز سے غافل اور مستقل و علانیہ تارک صلوٰۃ ہے۔ ضرورت ہے کہ تمام سیاسی و اجتماعی تدبیروں کے ساتھ (اور حقیقتاً ان سے بیشتر اور ان سے زیادہ) اصلاح اعمال و اخلاق اور فرائض و ارکان دین کی پابندی کی دعوت دی جائے اور "جزاء الاعمال" کے اس الٰہی قانون کی روشنی میں خصوصیت کے ساتھ ان اخلاقی امراض اور عملی فسادات سے ملت کو ڈرایا جائے؟ جو بڑے مہیب اجتماعی و عمومی نتائج رکھتے ہیں، اور جن کے لئے قرآن و حدیث میں نص صریح موجود ہے اور بدقسمتی سے بہت سے مسلمان ان میں مبتلا ہیں۔

(۳) ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے اور ملی و اجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دوررس ہیں وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف و فضول خرچی، شہرت اور عزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر و فاقہ، اضطرار و اضطراب اور ان افسوس ناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے جس میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، تقریب شادی کی محافل و مجالس (زبان اور حلال و حرام کے معین حدود و احکام میں خواہ اس کے لیے حرمت کا کوئی صریح فتویٰ اور کوئی لرزہ خیز لفظ نہ ملے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکیم و عادل ذات اور اس کی ربوبیت و رحمت عامہ کی صفات کے لئے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول اور زمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو، جاں بلب مریض دوا اور برہنہ تن شریف مرد اور عورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں، کہیں کسی بیوہ کے چولھے پر توا اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ ہو، ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں پچاس پچاس ہزار اور ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا جائے، شریعت کی روح، دین کے مزاج اور انسانی و اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی طرح اس کا جواز نہیں نکل سکتا، کہ جب ہزاروں لاکھوں

افراد کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہو رہی ہوں لاکھوں افراد کو قوت لایموت حاصل نہ ہو اور وہ جسم و جاں کا رشتہ بھی قائم نہ رکھ سکتے ہوں۔ ملت کے لاکھوں بچے فیس اور کتابوں اور ضروری مصارف کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہوں، ہزاروں ادارے جو ملت کے لیے روح کا حکم رکھتے ہیں اور بیسیوں منصوبے جن کی تکمیل کے بغیر اس ملت کا وجود مشکوک اور ان کا مستقبل تاریک ہے، موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں، ہمارے اہل ثروت تجار اور ذی حیثیت لوگ اپنی اولاد کی شادیوں، خوشی کی تقریبوں اور "رسومات" کی تکمیل میں پانی کی طرح روپیہ بہائیں، اس زمانہ میں بہت سے تغیرات و انقلابات اور علم و ترقی کے باوجود مسرفانہ و شاہانہ شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا، البتہ بعض جگہ انھوں نے جدید (ماڈرن) طرز اختیار کر لیا ہے اور سیاسی مصالح و مقاصد بھی کہیں کہیں ان سے وابستہ ہو گئے ہیں آج بھی ہماری بہت سی برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائد شہر میں ان تقریبات پر جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں سے بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں مگر انھوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے اور اس میں اچھے اچھے لوگ

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ (کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا الٰہ و معبود بنا لیا ہے)

اور بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ ——— (ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ایک راستہ پر اور ہم انھیں کے نقش قدم پر ٹھیک ہیں)۔ کا مصداق ہیں۔

حقیقتاً اس سلسلہ میں بہت سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ان فرائض و تقریبات کا تخیل و مفہوم بھی بدلنے کی ضرورت ہے اسکے خلاف اعلان جنگ اور اعلان بغاوت کی ضرورت ہے، اس بات کو صاف طریقہ پر واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لیے غضب الٰہی کا موجب اور ملت کے لیے وبال و ادبار کا باعث ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ

کی رحیم و حکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس جھوٹے نام و نمود اور اس عارضی رونق و زینت یا کام و دہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کی جائے جو سینکڑوں ضرورت مندوں کے کام آسکتی تھی، ان کے سامنے یہ واقعہ آنا چاہیئے کہ مدینہ طیبہ کی محدود و مختصر آبادی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نکاح کرتے ہیں اور اس ذات گرامی کو اطلاع بھی نہیں ہوتی جس کی شرکت و موجودگی ہر بزم کے لئے باعث فخر و زینت تھی، خصوصاً ایک جلیل القدر صحابی اور مہاجر کے کاشانہ کا چراغ طور تھی جس نے ابھی ابھی اس نئے شہر میں قدم رکھا تھا اور جس کے سارے تعلقات اسی مہاجر برادری سے قائم تھے، اور یہ سب اسی ذات کے طفیل تھے جس سے ازدواجی زندگی کا یہ طریقہ اور اس کے احکام معلوم ہوئے تھے، آج دور دراز کے عزیزوں اور دوستوں کو وہاں تک کہ ان ملکوں سے جہاں پاسپورٹ اور ویزا ہے) مدعو کیا جاتا ہے، اور حضرت عبدالرحمٰن کی شادی کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت ہوتی ہے جب ان کے کپڑوں پر خوشبو کا نشان ملاحظہ فرمایا جاتا ہے، پوچھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شادی کرلی ہے، اس وقت ولیمہ کے لئے ہدایت ہوتی ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان حوصلہ مندیوں پر جن کا ان مواقع پر اظہار کیا جاتا ہے ہمارا ذمہ دار طبقہ اپنی پوری ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرے اور کم سے کم ان کا مقاطعہ کرکے ہمت افزائی اور تعاون علی الاثم والعدوان سے بچا جائے، ان "حوصلہ مند" حضرات کو بھی سوچنا چاہیئے کہ ہندستان کے موجودہ حالات، مسلمانوں کی معاشی پستی اور بدحالی، بلکہ فلاکت و ہلاکت کے دور میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ کوئی ایک فرد اپنے یہاں کی کسی ایک تقریب پر اتنے مصارف کردے جس سے ایک برادری کی پرورش یا ایک مکمل ادارہ کا انصرام ہو سکتا ہے ان کو آخرت کے مواخذہ اور حساب سے بھی ڈرنا چاہیئے جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا اور افراد و ملت کی ان شدید ضروریات کی موجودگی میں اس "دریا دلی" کا جواز پیش کرنا ہوگا جو اپنی ذات تک محدود تھی۔

(۴) قرآن مجید سے یہ بات صاف طریقہ پر ثابت ہوتی ہے کہ امت کے ملی اور اجتماعی

تقاضوں اور دین کی حفاظت و اشاعت کے مطالبہ اور اس کی ضرورتوں میں اپنا مال صرف کرنے سے آنکھیں بند کرکے افراد کا اپنے ذاتی کاروبار اور اپنی معاشی ترقی و استحکام کی فکر اور کوشش میں انہماک صریح خودکشی کے مرادف ہے' اور جو جماعت یہ غلط راستہ اختیار کرتی ہے وہ اپنے ہاتھوں ہلاکت کے غار میں گرتی ہے اور اس شاخ پر تیشہ چلاتی ہے جس پر اس کا آشیانہ ہے بلکہ کھلے لفظوں میں وہ اپنے ہاتھوں "زہرناب" کا پیالہ پیتی ہے۔

قرآن مجید کے صاف لفظ ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ)

(اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں)

اس آیت کے محرم راز میزبان نبوت حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے انھوں نے قسطنطنیہ کے محاصرہ میں ان لوگوں کو ٹوکا جو اس سے دین کے راستہ میں قربانی اور خطرہ میں پڑنے کی مخالفت نکالتے تھے' اور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس آیت کی رو سے جو کسی دینی مقصد کے لئے اپنی جان پر کھیل جائے یا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلے وہ خودکشی کا مرتکب، انھوں نے فرمایا کہ یہ آیت ہم انصار کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جب ایک عرصہ کی مالی قربانیوں اور عملی سرفروشیوں کے بعد اسلام کے قدم مدینہ میں جم گئے اور اسلام کے سپاہی اور مجاہد پیدا ہو گئے تو ہم نے سوچا کہ اب کچھ روز کے لئے ہم اسلام کی نصرت اور خدمت (اور گویا اس سلسلے کے بے پایاں مصارف سے) عارضی رخصت لے کر کچھ عرصہ کے لئے اپنے ذاتی کاروبار' باغات' زراعت اور ان تجارتوں کو سنبھال لیں اور ان کی دیکھ بھال میں ہمہ تن مشغول ہو جائیں جو ہماری تبلیغی اور مجاہدانہ سرگرمیوں اور روز و شب کی مشغولیت کی وجہ سے سخت متاثر ہوئی تھیں' اور ان پر کاری ضرب پڑی تھی' حضرات انصار کے دل میں یہ وسوسہ بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ اسلام کی خدمت اور اس کی راہ میں قربانیوں سے مستقل طور پر سبکدوشی اور آزادی حاصل کرلیں' انہوں نے محض وقتی طور پر عارضی رخصت اور اجازت لینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ان صریح اور دو ٹوک شدید الفاظوں میں ان کی تنبیہ کی گئی' اور بتلا دیا گیا کہ دین و ملت کی مدد سے (عارضی) دست کشی اور انفرادی سرسبزی اور بہبود کا خیالی منصوبہ بھی کھلی خودکشی کے مرادف ہے' اس

سے غیر مشتبہ طریقے پر یہ ثابت ہو گیا کہ افراد کا وجود ملت سے ہے اور ملت ہی کی حفاظت و استحکام میں ان کی حفاظت و استحکام کا راز مضمر ہے، جس طرح پتوں کی سرسبزی و شادابی درخت سے وابستہ ہے، درخت سے جدا ہونے کے بعد کسی خارجی کوشش اور کسی بڑی سے بڑی ذہانت اور صنعت سے بھی ان کو سرسبز و شاداب نہیں رکھا جا سکتا اسی طرح ملت کے افراد کی زندگی اور اس کا نمو و ارتقاء بھی ملت ہی سے مربوط ہے، اور ہر دور میں ان کے لیے پیام ازلی اور قانون زندگی یہی ہے کہ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

افراد موج ہیں اور ملت ایک رواں دریا، دریا کے بغیر موجوں کا تصور بھی ممکن نہیں ہے

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اسی طرح ملت اسلامیہ کے افراد کسی ملک میں ملت سے کٹ کر اور اسکے ملی اور اجتماعی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض انفرادی خوشحالی، معاشی ترقی، ذاتی سرمایہ اور حصول ذاتی منصب و اعزاز و شخصی حفاظت و ضمانت پر کبھی زندہ و محفوظ اور باعزت و باوقار نہیں رہ سکتے، ملت کے کھلے ہوئے اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل سے افراد کا پہلو تہی کرنا اور ان کے بارہ میں تغافل سے کام لینا اور اپنے ذاتی کاروبار کی ترقی اور اپنے محدود خاندانوں کی بہبود و آسائش پر اپنی تمام توجہ مرکوز کر لینا اور اپنی خیالی جنت میں مست رہنا اور اسی کو حقیقی مسرت و کامیابی سمجھنا اپنے حق میں کانٹے بونا اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے ممالک اسلامیہ کی پوری تاریخ اور مسلمانوں کا سابق طرز عمل اس اعلان کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے جس نسل یا ملک کے مسلمانوں سے یہ غلطی ہوئی اور انھوں نے اس کوتاہ نظری اور کوتاہ اندیشی سے کام لیا وہ حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے اور ان کی زندگی کا تار پود بکھر کر رہ گیا۔ اندلس، بخارا اور سمرقند کی تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایک فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہے ہیں، یہاں ملت اسلامیہ ہندیہ کی بقا کے لئے ایک بڑی پرعزم لیکن دانشمندانہ جدوجہد کی ضرورت ہے

یہاں مسلمانوں کے ملی وجود، ان کی اجتماعی شخصیت و انفرادیت کی بقا کے لیے کچھ کاموں کی تکمیل ضروری ہے، وہ اس ملک میں مسلمان کی حیثیت سے رہیں، محفوظ ہوں، باعزت ہوں، موثر اور فیصلہ کن ہوں، اپنی خصوصیات کے مالک ہوں، اپنے پیغام کے حامل ہوں، انسانیت اور اس ملک کے لیے مفید و مبارک ثابت ہوں، حالات اور تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہو سکیں، زمانہ اور ایک ترقی کرنے والے ملک کے قافلہ کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں، بلکہ ضرورت ہو تو ان کی رہنمائی اور کارواں سالاری کا فرض بھی انجام دے سکیں، قیادت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال سکیں، اور اس ملک کو مہیب خطرہ اور مہلک زوال سے بچا سکیں، اس کے لیے چند تعلیمی و تعمیری کوششوں اور تحریکوں اور عظیم اداروں اور فکری مرکزوں کی ضرورت ہے، ان تحریکوں اور اداروں کا وجود اور ان کا استحکام و ترقی اس ملت کے وجود کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو ہوا و پانی ایک زندہ انسان کے لیے، اگر یہ تحریکیں اور ادارے سرسبز توانا اور رو بترقی ہیں تو ملت کا وجود محفوظ، اس کا مستقبل روشن اور ملک میں اس کا مقام معین ہے کسی اکثریت یا فرقے کا تعصب و تنگ نظری یا حکومت کی کمزوری و جانبداری اس کے وجود کو ختم یا اس کے مستقبل کو تاریک نہیں بنا سکتی، اور کوئی بڑے سے بڑا فرقہ وارانہ فساد اس کی قسمت پر مہر نہیں لگا سکتا۔

لیکن اگر اس ملت کے افراد اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر میں ہمہ تن مشغول و منہمک ہیں اس کے متمول اور باستطاعت افراد ملی تقاضوں اور ضرورتوں سے غافل ہیں، وہ اپنی "خواہشات" اور "حوصلے" پورے کر رہے ہیں، پر تو بے دریغ اور شاہانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ روپیہ صرف کر سکتے ہیں لیکن احیاء و بقائے ملت کی تحریکیں اور ادارے سرمایہ کی کمی کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں یا وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کا حال وہ ہے جو شاعر نے اپنے دردمند دل کے متعلق کہا ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے	دل ہے گویا چراغ مفلس کا

تو پھر یہ افراد (خواہ سرمایہ کے لحاظ سے قارون وقت ہوں) ہر وقت خطرہ

سے دوچار ہیں، اللہ کی نگاہ میں ان کی پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں، حالات کی کوئی خفیف سی تبدیلی، اور واقعات کی کوئی ہلکی سی لہر بھی ان کے ان چھوٹے چھوٹے مصنوعی حصاروں کو ریت کی دیواروں کی طرح بہا کر لے جائے گی، اور کسی دن جب ان کی آنکھ کھلے گی تو ان کو نظر آئے گا کہ وہ دفعتاً ہر چیز سے محروم ہوگئے ہیں، اور ایک تن آسان خدا فراموش اور فرض ناآشنا قوم کی طرح ان کا حال بھی یہی ہوگا۔

فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ
(الشّعْب)

(تو ان پر آیا اللہ (کا عذاب) ایسی جگہ سے کہ ان کو گمان بھی نہ تھا اور اللہ نے ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب)

ہندوستان کی یہی صورت حال ان لوگوں کو (جن کی سنت اللہ اور آئین الٰہی پر ذرا بھی نظر ہے) لرزہ بر اندام کئے ہوئے ہے، ہندوستانی مسلمان ساری سیاسی تبدیلیوں اور معاشی انقلاب کے باوجود اب بھی اتنے سرمایہ کے مالک ہیں کہ یہاں احیاء و بقاء اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کی ہر تحریک اور یہاں کے مرکزی دینی و تعلیمی ادارے بخوبی چل سکتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے ان کو مالی بحران سے دوچار ہونے کی ضرورت نہیں نہ اپنے اصلاحی و تعمیری پروگرام میں اختصار یا التوا کی ضرورت ہے، لیکن کتنی تحریکیں ہیں جن کی کامیابی کے بغیر مسلمانوں کا تعلیمی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، کتنے ادارے ہیں جن کے بغیر مستقبل میں مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا ممکن نہ ہوگا کہ

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

کتنے مرکز ہیں جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نوجوانوں کو ذہنی و تہذیبی ارتداد سے (جو سیلاب کی طرح آرہا ہے) بچانے میں مدد دے سکتے ہیں، نوجوانوں کے ذہن میں اسلام اور اس کے مستقبل پر اعتماد (جس کو مغربی تعلیم و افکار نے متزلزل کر دیا ہے) بحال کر سکتے ہیں، مستشرقین مغرب کے پھیلائے ہوئے زہر کے لیے (جو ان سب

دماغوں کو مسموم کر رہا ہے جن کے ہاتھ میں مسلم ممالک کی قیادت ہے) تریاق مہیا کر سکتے ہیں۔ اور ان کا علمی محاسبہ کر کے ان کو بے اثر بنا سکتے ہیں، کتنے مرکز ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اسلام کے ابدی قانون اور زندگی کے رواں دواں قافلہ کے درمیان رفاقت و مطابقت پیدا کر سکتے ہیں، اور اس طبقہ کو جو واقعات و حقائق سے دو چار ہے نئی رہنمائی نیا اعتماد اور نیا ایمان عطا کر سکتے ہیں، اور اس کام کو دوبارہ جاری کر سکتے ہیں جو متکلمین اسلام نے اپنے اپنے وقت میں انجام دیا۔ کتنے افراد و ادارے ہیں جو مغربی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی بولیوں میں اسلام اور قرآن و سیرت نبوی کا تعارف کرا سکتے ہیں اور ان سب سعید روحوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں جو حق کی جویا اور جمال جہاں آرائے نبوی کے نادیدہ عاشق ہیں، زیر تعلیم مسلمان نوجوانوں کی حفاظت و تربیت کے لئے کتنے منصوبے ہیں جو ان کو الحاد و فساد کا لقمۂ تر بننے سے بچا سکتے ہیں اور ان کے اندر ایمان کی چنگاری کی حفاظت کر سکتے ہیں، لیکن یہ سب تحریکیں اور ادارے یا تو وسائل کے فقدان کی وجہ سے ایک "خواب شیریں" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے یا اگر کہیں وجود میں آ گئے ہیں تو جیسا کہ عرض کیا گیا "مفلس کے چراغ" کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

دنیا میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کسی ملک میں پانچ کروڑ کی ایک اقلیت پائی جاتی ہو۔ جن میں لاکھوں کی تعداد میں بڑے سرمایہ دار اور لاکھوں کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات موجود ہوں، سیاسی حالات اور پچھلی تاریخ نے اسکے گرد تعصبات اور غلط فہمیوں کا جال پھیلا دیا ہو۔ سیاسی جماعتوں کی مصلحتوں اور تنگ نظر فرقہ پرستی نے اسکو کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہو، ہر وقت اس کے متعلق بڑی سے بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کا امکان ہو وہ اگر مظلوم و معصوم ہو تو اس کو ظالم و خونخوار ثابت کرنا، وہ اگر اپنی حفاظت خود اختیاری کا فرض بھی انجام نہ دے تب بھی اس کو دست درازی اور فتنہ گستری کا مجرم ٹھہرانا۔ وہ اگر مقتول ہو تو اس کو قاتل گردانا آسان ہو، اس کا مخالف پریس ہر وقت رائی کو پربت اور افسانے

کو حقیقت بنا سکے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس "ملت" کے پاس کوئی طاقتور پریس نہ ہو، اس برعظیم کے طول و عرض میں اس کا ایک بھی انگریزی روزنامہ نہ ہو، ہندی میں اس کی آواز پہونچانی مشکل ہو، ملک کے ذمہ دار و صاحب اختیار حلقے اور ارباب حکومت تک (ان کی مانوس زبان میں) حرف شکایت تک پہونچانا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا بھی ممکن نہ ہو، لیکن ہر طریقہ سے اس ملت کی خوشحالی کا اظہار ہوتا ہو اور معاشی منصوبوں سے لے کر دینی شعبوں اور خیراتی کاموں تک وہ اپنی زندگی اور اولوالعزمی کا ثبوت دیتی رہتی ہو دینی جذبہ اور سیاسی شعور سے قطع نظر اس ملت کی عقل عام (common sence) کے متعلق کیا کہا جائیگا

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے   ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

پھر اس ملت کو کسی دوسرے فرقہ کسی جماعت یا حکومت کی شکایت کرنے کا کیا حق ہے اور کسی بڑے سے بڑے واقعہ پر چیں بجبیں ہونے کا کیا موقع ہے؟

ملک کے کسی گوشہ میں فرقہ وارانہ فساد کا ہو جانا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اس پر جتنی توجہ کی جائے کم ہے مظلوم و متاثر مسلمانوں کی ہر قسم کی امداد صرف دینی بلکہ اخلاقی و انسانی فرض ہے مسلمان اپنا پیٹ کاٹ کر اور اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی اگر اس فساد زدہ علاقہ کی مدد کریں تو بیجا نہیں، جبل پور اور کلکتہ کے لئے ہندستانی مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ ادائے فرض اور احساس فرض کی معمولی مثال ہے جس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے جو کچھ ہوا وہ کم ہے اس سے کہیں زیادہ حمیت دینی اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔

لیکن یہ بات خواہ اس وقت کیسی ہی بے محل بھی جائے بہر حال حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ فساد زدہ علاقوں کی امداد کہیں خدانخواستہ ایک "سالانہ عرس" نہ بن جائے کہ جس میں مسلمانوں کی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں معروف ہو کر رہ جائیں ہمیں اس صورت حال کو کسی حال میں گوارا نہیں کرنا چاہیئے اور اس کو روایت نہیں بننے دینا چاہیئے، وہ ملت بڑی قابل رحم اور بڑی بدقسمت ہے

جو ایک طرف مجروح و مظلوم ہو دوسری طرف ملت کے سارے وسائل اس کی چارہ سازی میں صرف ہوں ایک طرف زخم لگے دوسری طرف سے مرہم لاکر رکھا جائے، یہ ملت ہرگز اس مسلسل عمل جراحی اور مسلسل مرہم گری کے لیے پیدا نہیں ہوئی، فسادات کے سلسلہ کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے لئے ملت کے حالات میں مستقل تبدیلی کی ضرورت ہے ان ناکوں کو بند کرنے کی ضرورت ہے جن سے یہ فسادات ملت کے حصار میں داخل ہوتے ہیں، یہ ناکے بیرونی سے زیادہ اندرونی ہیں، ایسی فضا اور صورت حال کے پیدا کرنے کے لئے کہ فسادات کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے احیاء و بقاء اسلام اور حفاظت مسلمین کی ٹھوس، تعمیری، انقلاب انگیز اور مستقل و مسلسل تحریکوں اور اداروں کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تحریکیں فروغ نہ پائیں گی اور اتنی طاقتور و موثر نہ بن جائیں گی کہ سپر کا کام دے سکیں اس وقت تک یہ سلسلہ بند نہیں ہوگا۔

قریبی واقعات نے پھر ایک بار اس کا موقع پیدا کر دیا ہے کہ ہندستان کے مسلمان پوری صورت حال کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں موجودہ واقعات کے حقیقی اسباب تلاش کریں اور ان کے مستقل انسداد و ازالہ کے طریقوں پر غور کریں اور سطحی و وقتی و جذباتی طریقوں کے بجائے اللہ کی کتاب سے رہنمائی حاصل کر کے صحیح طریق علاج اختیار کریں، مسلمانوں کا طریق فکر و نظر عام اقوام عالم کی طرح نہیں ہو سکتا نہ ان کی بیماریاں اور مصائب و پریشانیاں عام ملل و اقوام کی طرح محض تکوینی و طبعی ہیں نہ ان کا علاج محض طبعی و تکوینی ہے اس ملت کے بگاڑ کا سبب اور اس کی پریشانیوں کا سرچشمہ بھی الگ ہے اور اس کے انسداد کے طریقے بھی الگ۔

فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا
بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ

معارف الحدیث

(مسلسل)

رویتِ ہلال۔

شریعت اسلامی نے خاص اعمال و عبادات کے لئے جو مخصوص اوقات یا دن یا زمانے مقرر کئے ہیں ان کی تعیین میں اس بات کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے کہ اُس وقت یا دن یا اس زمانے کا جاننا پہچاننا کسی علم یا فلسفے پر یا کسی آلہ کے استعمال پر موقوف نہ ہو بلکہ ایک عامی اور بے پڑھا دیہاتی آدمی بھی مشاہدہ سے اس کو جان سکے۔ اسی لئے نماز اور روزے کے اوقات سورج کے حساب سے مقرر کئے گئے۔ مثلاً فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک کا مقرر کیا گیا، ظہر کا وقت سورج کے نصف النہار سے ڈھل جانے کے بعد سے ایک مثل یا دو مثل سایہ ہو جانے تک اور عصر کا وقت اس کے بعد سے غروب آفتاب تک کا رکھا گیا ہے اسی طرح مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد سے شفق کے رہنے تک اور عشاء کا شفق کے غائب ہو جانے کے بعد بتایا گیا۔ ایسا ہی روزہ کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کا رکھا گیا ہے ____ ظاہر ہے کہ ان اوقات کے جاننے کے لئے کسی علم یا فلسفہ کی اور کسی آلہ کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر آدمی اپنے مشاہدہ سے ان کو جان سکتا ہے۔ اور جس طرح عوام کی سہولت کے پیش نظر نماز اور روزے کے ان اوقات کے لئے سورج کے طلوع و غروب اور اتار چڑھاؤ کو معیار اور نشان قرار دیا گیا ہے اسی طرح زکوٰۃ اور حج اور روزہ وغیرہ اُن اعمال اور عبادات کے لئے جن کا تعلق مہینے یا سال سے ہے چاند کو معیار قرار دیا گیا۔ اور بجائے شمسی سال اور مہینوں کے قمری سال اور مہینوں کا اعتبار کیا گیا۔ کیونکہ عوام اپنے مشاہدہ

سے قمری مہینوں ہی کو جان سکتے ہیں۔ شمسی مہینوں کے آغاز پر کوئی ایسی علامت آسمان یا زمین پر ظاہر نہیں ہوتی جس کو دیکھ کر ہر عامی آدمی سمجھ سکے کہ اب پہلا مہینہ ختم ہو کر دوسرا مہینہ شروع ہو گیا، ہاں قمری مہینوں کا آغاز چونکہ چاند نکلنے سے ہوتا ہے، اس لئے ایک ان پڑھ دیہاتی بھی آسمان پر نیا چاند دیکھ کر جان لیتا ہے کہ پچھلا مہینہ ختم ہو کر اب اگلا مہینہ شروع ہو گیا۔

بہرحال شریعت اسلامی نے مہینے اور سال کے سلسلہ میں نظام قمری کا جو اعتبار کیا ہے اس کی ایک خاص حکمت عوام کی یہ سہولت بھی ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم سنایا تو یہ بھی بتایا کہ رمضان کے شروع یا ختم کا ضابطہ اور معیار کیا ہے۔ آپؐ نے بتایا کہ شعبان کے ۲۹ دن پورے ہونے کے بعد اگر چاند نظر آجائے تو رمضان کے روزے شروع کر دو اور اگر ۲۹ دیں کو چاند نظر نہ آئے تو مہینہ کے تیس دن پورے کرکے روزے شروع کرو، اور اسی طرح رمضان کے روزے ۲۹ یا ۳۰ رکھو — پھر آپؐ نے مختلف موقعوں پر رویت ہلال کے متعلق اور سب ضروری ہدایات دیں — اس تمہید کے بعد مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھئے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ ذَكَرَ رَمَضَانَ فَقَالَ لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ اُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهٗ —

— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے ایک موقع پر رمضان کا ذکر فرمایا اس سلسلہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ رمضان کا روزہ اس وقت تک مت رکھو جب تک کہ چاند نہ دیکھ لو اور روزوں کا سلسلہ ختم نہ کرو۔ جب تک کہ شوال کا چاند نہ دیکھ لو، اور اگر (۲۹) کو چاند دکھائی نہ دے تو اس کا حساب پورا کرو (یعنی مہینہ کو ۳۰ دن کا سمجھو)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوْا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلٰثِيْنَ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزے چھوڑ دو، اور اگر (۲۹ تاریخ کو) چاند دکھائی نہ دے تو شعبان کی ۳۰ کی گنتی پوری کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح ۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان کے شروع ہونے اور ختم ہونے کا دار مدار رویتِ ہلال یعنی چاند دکھائی دینے پر ہے — صرف کسی حساب یا قرینہ قیاس کی بنا پر اس کا حکم نہیں لگایا جا سکتا — پھر رویت ہلال کے ثبوت کی ایک شکل تو یہ ہے کہ خود ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھا ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے نے دیکھ کے ہم کو بتایا ہو، اور وہ ہمارے نزدیک قابل اعتبار ہو، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بھی کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپؐ نے کسی دیکھنے والے کی اطلاع اور شہادت پر رویت ہلال کو مان لیا۔ اور روزہ رکھنے یا عید کرنے کا حکم دیدیا۔ جیسا کہ آگے درج ہونے والی بعض احادیث سے معلوم ہوگا۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْصُوْا هِلَالَ شَعْبَانَ لِرَمَضَانَ۔

رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رمضان کے لحاظ سے شعبان کے چاند کو خوب اچھی طرح گنو۔

جامع ترمذی

تشریح ۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان کے پیش نظر شعبان کا چاند دیکھنے کا بھی خاص اہتمام کیا جائے اور اس کی تاریخیں یاد رکھنے کی خاص فکر اور کوشش کی جائے،

اور جب ۲۹ دن پورے ہو جائیں تو رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَفَّظُ مِنْ شَعْبَانَ مَالَا يَتَحَفَّظُ مِنْ غَيْرِهِ ثُمَّ يَصُوْمُ لِرُؤْيَةِ رَمَضَانَ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْهِ عَدَّ ثَلٰثِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ صَامَ ــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان کے دن اور اس کی تاریخیں جتنے اہتمام سے یاد رکھتے تھے اتنے اہتمام سے کسی دوسرے مہینے کی تاریخیں یاد نہیں رکھتے تھے پھر رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھتے تھے۔ اور اگر (۲۹ شعبان کو) چاند دکھائی نہ دیتا تو ۳۰ دن کی شمار پورا کرکے پھر روزے رکھتے تھے۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح ۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان مبارک کے اہتمام کی وجہ سے شعبان کا چاند دیکھنے اور اس کی تاریخیں یاد رکھنے کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ پھر اگر ۲۹ شعبان کو رمضان کا چاند نظر آجاتا تو رمضان کے روزے رکھنے شروع فرماتے تھے اور اگر نظر نہ آتا تو شعبان کے ۳۰ دن پورے کرکے روزے رکھتے تھے۔

خبر اور شہادت سے چاند کا ثبوت:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ رَأَيْتُ الْهِلَالَ يَعْنِيْ هِلَالَ رَمَضَانَ فَقَالَ اَتَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَتَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ قَالَ نَعَمْ قَالَ يَا بِلَالُ اَذِّنْ فِي النَّاسِ اَنْ يَّصُوْمُوْا غَدًا ــــ

(رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بتایا کہ میں نے

آج چاند دیکھا ہے (یعنی رمضان کا چاند) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا، کیا تم "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت دیتے ہو؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں میں "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت دیتا ہوں، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، اور کیا تم "محمد رسول اللہ" کی شہادت دیتے ہو؟ اس نے کہا ہاں میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں (یعنی میں توحید و رسالت پر ایمان رکھتا ہوں، مسلمان ہوں) اس تصدیق کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اس کا اعلان کر دو کہ کل سے روزے رکھیں۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

تشریح :- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رویت ہلال کی شہادت یا اطلاع قبول کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شہادت یا اطلاع دینے والا صاحب ایمان ہو۔ کیونکہ وہی اس کی نزاکت اور اہمیت کو اور اس کی بھاری ذمہ داری کو محسوس کر سکتا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ فَاَخْبَرْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنِّي رَاَيْتُهُ فَصَامَ وَاَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ ——

(رواہ ابو داؤد والدارمی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں نے رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کی (لیکن عام طور سے لوگ دیکھ نہیں سکے) تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بھی روزے رکھیں۔

(سنن ابی داؤد۔ مسند دارمی)

تشریح :- ان دونوں حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا چاند ثابت

ہونے کے لئے صرف ایک مسلمان کی شہادت اور اطلاع بھی کافی ہو سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رح کے مشہور قول کے مطابق ایک آدمی کی شہادت اس صورت میں کافی ہوتی ہے جبکہ مطلع صاف نہ ہو، ابر یا غبار وغیرہ کا اثر ہو یا وہ شخص بستی کے باہر سے یا کسی بلند علاقہ سے آیا ہو، لیکن اگر مطلع بالکل صاف ہو اور چاند دیکھنے والا آدمی باہر سے یا کسی بلند مقام سے بھی نہ آیا ہو۔ بلکہ اس بستی ہی میں چاند دیکھنے کا دعویٰ کرے جس میں باوجود کوشش کے اور کسی نے چاند دیکھا ہو تو ایسی صورت میں اس کی شہادت پر چاند ہو جانے کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس صورت میں دیکھنے والے اتنے آدمی ہونے چاہئیں جن کی شہادت پر اطمینان ہو جائے۔ امام ابو حنیفہ رح کا مشہور قول یہی ہے لیکن ایک روایت امام صاحب سے یہ بھی ہے کہ رمضان کے چاند کے ثبوت کے لئے ایک دیندار اور قابل اعتبار مسلمان کی شہادت بہر حال کافی ہے اور اکثر دوسرے ائمہ کا مسلک بھی یہی ہے۔

یہ جو کچھ ذکر کیا گیا اس کا تعلق رمضان کے چاند سے ہے۔ لیکن عید کے چاند کے ثبوت کے لئے جمہور ائمہ کے نزدیک کم سے کم دو دیندار اور قابل اعتبار مسلمانوں کی شہادت ضروری ہے۔ دارقطنی اور طبرانی نے اپنی اپنی سند کے ساتھ عکرمہ تابعی سے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ مدینہ کے حاکم کے سامنے ایک آدمی نے رمضان کا چاند دیکھنے کی شہادت دی، اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دونوں مدینہ میں موجود تھے۔ والیٔ مدینہ نے ان دونوں بزرگوں کی طرف رجوع کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس ایک آدمی کی شہادت قبول کر لی جائے اور رمضان ہونے کا اعلان کر دیا جائے اور ساتھ ہی فرمایا کہ

إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجَازَ شَهَادَةَ وَاحِدٍ عَلٰى رُؤْيَةِ هِلَالِ رَمَضَانَ وَكَانَ لَا يُجِيْزُ شَهَادَةَ الْاِفْطَارِ اِلَّا بِشَهَادَةِ رَجُلَيْنِ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رویت ہلال رمضان کی ایک آدمی کی شہادت کو بھی کافی مانا ہے اور عید کے چاند کی شہادت دو آدمیوں سے کم کی آپ کافی

نہیں قرار دیتے تھے۔

رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ رکھنے کی ممانعت:-

شریعت اسلامیہ میں پورے رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں اور جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کا چاند دیکھنے کا خاص اہتمام کیا جائے بلکہ اس مقصد سے شعبان کا چاند دیکھنے کا بھی خصوصی اہتمام کیا جائے تاکہ کسی دھوکہ یا غفلت سے رمضان کا کوئی روزہ چھوٹ نہ جائے، لیکن حدود شریعت کی حفاظت کے لئے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کے ایک دو دن پہلے سے روزے نہ رکھے جائیں، اگر عبادت کے شوقین ایسا کریں گے تو خطرہ ہے کہ بے چارے ناواقف عوام اسی کو شریعت کا حکم اور مسئلہ سمجھنے لگیں۔ اس لئے اس کی ممانعت فرمادی گئی۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَتَقَدَّمَنَّ اَحَدُکُمْ رَمَضَانَ بِصَوْمِ یَوْمٍ اَوْ یَوْمَیْنِ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ رَجُلٌ کَانَ یَصُوْمُ صَوْمًا فَلْیَصُمْ ذٰلِکَ الْیَوْمَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی رمضان کے ایک دو دن پہلے سے روزے نہ رکھے الا یہ کہ اتفاق سے وہ دن پڑ جائے جس میں روزہ رکھنے کا کسی آدمی کا معمول ہو تو وہ شخص اپنے معمول کے مطابق اس دن بھی روزہ رکھ سکتا ہے (مثلاً ایک آدمی کا معمول ہے کہ وہ ہر جمعرات یا پیر کو روزہ رکھتا ہے تو اگر ۲۹۔ ۳۰ شعبان کو جمعرات یا پیر پڑ جائے تو اس آدمی کو اس دن روزہ رکھنے کی اجازت ہے۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ قَالَ مَنْ صَامَ الْیَوْمَ الَّذِیْ یُشَکُّ فِیْهِ فَقَدْ عَصٰی اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ——— رواہ ابوداؤد، والترمذی، والنسائی، وابن ماجہ والدارمی

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ جس
آدمی نے شک والے دن کا روزہ رکھا اس نے پیغمبر خدا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم
کی نافرمانی کی ــــــــ

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

تشریح :ــ "شک والے دن" سے مراد وہ دن ہے جس کے بارہ میں شک ہو کہ یہ شاید رمضان کا دن ہو۔ مثلاً ۲۹ شعبان کو مطلع پر ابر یا غبار ہوا اور چاند نظر نہ آئے تو اگلے دن کے بارہ میں شک ہوتا ہے کہ شاید آج چاند ہو چکا ہو اور غبار یا ابر کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو اور اس لحاظ سے کل رمضان کا دن ہو ــــ تو شریعت میں اس شک اور وہم کا اعتبار نہیں ہے اور اس کی بنا پر اس دن روزہ رکھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور جیسا کہ اوپر درج ہونے والی بعض احادیث سے معلوم ہو چکا ایسی صورت میں شعبان کے ۳۰ دن پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔

سحور اور افطار کے بارہ میں ہدایات :ــ

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَکَۃً ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے ــــ

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تشریح:ــ سحری میں برکت کا ایک ظاہری اور عمومی پہلو تو یہ ہے اس کی وجہ سے روزہ دار کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور روزہ رکھنا زیادہ ضعف کا باعث اور زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اور دوسرا ایمانی اور دینی پہلو یہ کہ اگر سحری کھانے کا رواج نہ رہے یا امت کے اکابر اور خواص سحری نہ کھائیں تو اسکا خطرہ ہے کہ عوام اسی کو شریعت کا حکم یا کم از کم اولیٰ و افضل سمجھنے لگیں اور اس طرح شریعت کے عزوہ میں فرق پڑ جائے۔ اگلی امتوں میں اسی طرح تحریفات ہوئی ہیں۔ تو سحری کی ایک برکت اور اس کا ایک بڑا دینی فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ اس قسم کی تحریفات سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔ اور اس لئے وہ اللہ کو محبوب اور اس کی رضا و رحمت کا باعث ہے ــــ مسند احمد میں حضرت ابوسعید

خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ـــــ

اَلسَّحُوْرُ بَرَكَةٌ فَلَا تَدَعُوْهُ وَلَوْ اَنْ يَّجْرَعَ اَحَدُكُمْ جُرْعَةً مِّنْ مَّاءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الْمُتَسَحِّرِيْنَ

سحری میں برکت ہے اسے ہرگز نہ چھوڑو، اگر کچھ نہیں تو اس وقت پانی کا ایک گھونٹ ہی پی لیا جائے کیونکہ سحری کھانے پینے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے، اور فرشتے ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصْلُ مَا بَيْنَ صِيَامِنَا وَصِيَامِ اَهْلِ الْكِتَابِ اَكْلَةُ السَّحَرِ ـــــ رواہ مسلم

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق کرنے والی چیز سحری کھانا ہے۔　(صحیح مسلم)

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کے ہاں روزوں کے لئے سحری نہیں ہے اور ہمارے ہاں سحری کھانے کا حکم ہے۔ اس لئے اس فرق اور امتیاز کو عملاً بھی قائم رکھنا چاہیئے۔ اور اللہ کی اس نعمت کا کہ اس نے ہم کو یہ سہولت بخشی، شکر ادا کرنا چاہیئے۔

افطار میں تعجیل اور سحری میں تاخیر کا حکم۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَحَبُّ عِبَادِيْ اِلَيَّ اَعْجَلُهُمْ فِطْرًا۔

(رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے بندوں میں مجھے وہ بندہ زیادہ محبوب ہے جو روزہ کے افطار میں جلدی کرے (یعنی غروب آفتاب کے بعد بالکل دیر نہ کرے) ـــــ　(جامع ترمذی)

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ ــــــ

ـــــــــــــ رواه البخاری و مسلم

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تک میری امت کے لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے وہ اچھے حال میں رہیں گے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح :۔ اسی مضمون کی حدیث مسند احمد میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس میں "مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ" کے آگے "وَ اَخَّرُوا السُّحُوْرَ" بھی ہے یعنی اس امت کے حالات اس وقت تک اچھے رہیں گے جب تک کہ افطار میں تاخیر نہ کرنا بلکہ جلدی کرنا اور سحری میں جلدی نہ کرنا بلکہ تاخیر کرنا اس کا طریقہ اور طرز عمل رہے گا ـــــ اس کا راز یہ ہے کہ افطار میں جلدی کرنا اور سحری میں تاخیر کرنا شریعت کا حکم اور اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اور اس میں عام بندگان خدا کے لئے سہولت اور آسانی بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نگاہ کرم کا ایک مستقل وسیلہ ہے۔ اس لئے امت جب تک اس پر عامل رہے گی وہ اللہ تعالیٰ کی نظر کرم کی مستحق رہے گی اور اس کے حالات اچھے رہیں گے اور اس کے برعکس افطار میں تاخیر اور سحری میں جلدی کرنے میں چونکہ اللہ کے تمام بندوں کے لئے مشقت ہے اور یہ ایک طرح کی بدعت اور یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے اس لئے وہ اس امت کے لئے بجائے رضا اور رحمت کے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔ اس واسطے جب امت اس طریقہ کو اپنائے گی تو اللہ تعالیٰ کی نظر کرم سے محروم ہو گی اور اس کے حالات بگڑ جائیں گے۔ افطار میں جلدی کا مطلب یہ ہے کہ جب آفتاب غروب ہونے کا یقین ہو جائے تو پھر تاخیر نہ کی جائے، اور اسی طرح سحری میں تاخیر کا مطلب یہ ہے کہ صبح صادق سے بہت پہلے سحری نہ کھائی جائے، بلکہ جب صبح صادق کا وقت قریب ہو تو اس وقت کھایا پیا جائے، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اور دستور تھا۔

عَنْ اَنَسٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ تَسَحَّرْنَا مَعَ رَسُوْلِ

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ قُلْتُ کَمْ کَمْ کَانَ بَیْنَ الْاَذَانِ وَالسَّحُوْرِ قَالَ قَدْرُ خَمْسِیْنَ اٰیَۃً۔

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر (جلد ہی) آپؐ نماز فجر کے لئے کھڑے ہو گئے۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ سحری کھانے اور فجر کی اذان کے درمیان کتنا وقفہ رہا ہوگا؟ انھوں نے فرمایا پچاس آیتوں کی تلاوت کے بقدر ۔۔۔۔۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح:۔ صحت مخارج اور قواعد قرأت کے لحاظ کے ساتھ پچاس آیات کی تلاوت میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت صرف ہوتا ہے، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سحری اور اذان فجر کے درمیان صرف چار پانچ منٹ کا فصل تھا۔

صوم وصال کی ممانعت:۔

"صوم وصال" یہ ہے کہ بغیر افطار و سحری کے مسلسل روزے رکھے جائیں اور دنوں کی طرح راتیں بھی بلا کھائے پئے گذریں چونکہ اس طرح کے روزے سخت مشقت اور ضعف کا باعث ہوتے ہیں اور اس کا قوی خطرہ ہوتا ہے کہ آدمی اتنا کمزور ہو جائے کہ دوسرے فرائض اور دوسری ذمہ داریوں کو ادا نہ کر سکے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس طرح روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال چونکہ یہ تھا کہ اس طرح روزے رکھنے سے آپؐ کی صحت اور توانائی میں کوئی خاص فرق نہیں آتا تھا لہٰذا آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی غیر مادی غذا اور روحانی قوت ملتی رہتی تھی اس لئے آپ خود ایسے روزے رکھتے تھے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِی الصَّوْمِ فَقَالَ لَہٗ رَجُلٌ اِنَّکَ تُوَاصِلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ وَاَیُّکُمْ مِثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ ــــــ

ــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے لوگوں کو منع فرمایا، تو ایک صحابی نے آپؐ سے عرض کیا کہ حضرت آپؐ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں، آپؐ نے فرمایا تم میں سے کون میری طرح ہے۔ (یعنی اس بارہ میں میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہے جو دوسروں کے ساتھ نہیں ہے اور وہ یہ ہے) میری رات اس طرح گزرتی ہے کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ (یعنی مجھے عالم غیب سے غذا ملتی ہے اس لئے اس معاملہ میں اپنے کو مجھ پر قیاس نہ کرو۔)

(صحیح بخاری و مسلم)

تشریح :- اس مضمون کی حدیثیں الفاظ کے خفیف فرق کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انسؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی مروی ہیں۔ ان تمام روایات سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس ممانعت کا مقصد اور منشا یہی تھا کہ اللہ کے بندے مشقت اور تکلیف میں مبتلا نہ ہوں اور ان کی صحتوں کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں تو یہ بات اور زیادہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ رَحْمَۃً لَّھُمْ ــــــ (بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترحم اور شفقت کی بنا پر صوم وصال سے منع فرمایا۔ اور آگے درج ہونے والی حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث سے معلوم ہوگا کہ آپؐ نے صوم وصال کا شوق رکھنے والوں کو سحر تک کے وصال کی اجازت بھی دیدی تھی۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی

اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تُوَاصِلُوْا فَاَیُّکُمْ اَرَادَ اَنْ یُّوَاصِلَ فَلْیُوَاصِلْ حَتَّی السَّحَرِ قَالُوْا فَاِنَّکَ تُوَاصِلُ یَا رَسُوْلَ اللہِ قَالَ لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ اِنِّیْ اَبِیْتُ لِیْ مُطْعِمٌ یُّطْعِمُنِیْ وَسَاقٍ یَسْقِیْنِیْ ـــــ

(رواہ البخاری)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ تم لوگ صوم وصال نہ رکھو اور جو کوئی (اپنے شوق اور دل کے داعیہ اور جذبہ کی بنا پر) صوم وصال رکھنا ہی چاہے تو وہ بس سحر تک رکھے (یعنی سحر سے سحر تک قریباً ۲۴ گھنٹے کا) بعض صحابہ نے عرض کیا کہ آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ (اس معاملہ میں) میرا حال تمہارا سا نہیں ہے، میں اس طرح رات گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے ـــــ

(صحیح بخاری)

(تشریح) ان حدیثوں میں صوم وصال کی راتوں میں اللہ تعالیٰ کے کھلانے اور پلانے کا جو ذکر ہے اس کی کوئی وضاحت اور خاص صورت احادیث سے معلوم نہیں ہوتی، بعض حضرات نے اس کو یہ سمجھا ہے کہ آپؐ کو صوم وصال میں خاص کر رات کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کا جو خاص الخاص قرب حاصل ہوتا تھا اس سے آپؐ کی روح اور قلب کو وہ طاقت اور توانائی ملتی تھی جو کھانے پینے کے قائم مقام ہو جاتی تھی۔ اسی کی تعبیر روحانی غذا سے بھی کی جا سکتی ہے ـــــ اور بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ صوم وصال کی راتوں میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت اور عالم غیب کے ماکولات و مشروبات کھلائے پلائے جاتے تھے ـــــ اس ناچیز کے نزدیک پہلی بات زیادہ دل کو لگنے والی ہے ـــــ واللہ تعالیٰ اعلم۔

افطار کے لئے کیا چیز بہتر ہے۔

عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ صَائِمًا فَلْيُفْطِرْ عَلَى التَّمْرِ فَإِنْ لَمْ يَجِدِ التَّمْرَ فَعَلَى الْمَاءِ فَإِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ ــــــ رواہ احمد وابو داؤد والترمذی وابن ماجہ والدارمی

حضرت سلمان بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ کھجور سے افطار کرے اگر کھجور نہ پائے تو پھر پانی ہی سے افطار کرلے اس لئے کہ پانی کو اللہ تعالیٰ نے طہور بنایا ہے۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(تشریح) اہل عرب خاص طور سے اہل مدینہ کے لئے کھجور بہترین غذا تھی اور سہل الحصول اور ارزاں بھی تھی کہ غربا اور فقرار بھی اس کو کھاتے تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے افطار کی ترغیب دی اور جس کو بروقت کھجور بھی نہ ملے اس کو پانی سے افطار کی ترغیب دی اور اس کی یہ مبارک خصوصیت بتائی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو طہور قرار دیا ہے۔ اس سے افطار کرنے میں ظاہر و باطن کی طہارت کی نیک فال بھی ہے۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْطِرُ قَبْلَ أَنْ يُّصَلِّيَ عَلَى رُطَبَاتٍ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ رُطَبَاتٌ فَتُمَيْرَاتٌ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تُمَيْرَاتٌ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَّاءٍ ــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز سے پہلے چند تر کھجوروں سے روزہ افطار فرماتے تھے۔ اگر تر کھجوریں بروقت موجود نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے افطار فرماتے تھے اور اگر خشک کھجوریں بھی نہ ہوتیں تو چند گھونٹ پانی پی لیتے تھے۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

افطار کی دعا:۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ زُهْرَةَ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أَفْطَرَ قَالَ اللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ ــــــ رواہ ابو داؤد

معاذ بن زہرہ تابعی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار فرماتے تھے تو کہتے تھے، اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ ــــ

اے اللہ میں نے تیرے ہی واسطے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق سے افطار کیا ــــ (سنن ابی داؤد)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَفْطَرَ قَالَ ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ــــــ رواہ ابو داؤد

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار فرماتے تھے تو کہتے تھے ــــ "پیاس چلی گئی اور رگیں (جو سوکھ گئی تھیں وہ) تر ہو گئیں اور خدا نے چاہا تو اجر و ثواب قائم ہو گیا۔

(سنن ابی داؤد)

تشریح : ــ یعنی پیاس اور خشکی کی جو تکلیف ہم نے کچھ دیر اٹھائی وہ تو افطار کرتے ہی ختم ہو گئی۔ اب نہ پیاس باقی ہے اور نہ رگوں میں خشکی اور ان شاء اللہ آخرت کا نہ ختم ہونے والا ثواب ثابت و قائم ہو گیا ــــ یہ اللہ کے حضور میں آپ کا شکر بھی ہے اور دوسروں کو تعلیم و تلقین بھی کہ روزہ داروں کا احساس اور اذعان یہ ہونا چاہئے ــــ مندرجہ بالا دونوں دعاؤں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افطار کے بعد یہ کلمات کہتے تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم افطار کے وقت دعا کرتے تھے يَا وَاسِعَ الْفَضْلِ اغْفِرْ لِيْ ــــ اے وسیع فضل و کرم والے مالک میری مغفرت فرما

روزہ افطار کرانے کا ثواب : ــ

عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى

اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا اَوْ جَهَّزَ غَازِيًا فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ ـــــــ

رواہ البیہقی فی شعب الایمان و رواہ محی السنۃ فی شرح السنۃ

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا یا کسی مجاہد کو جہاد کا سامان دیا (مثلاً اسلحہ وغیرہ) تو اس کو روزہ دار اور مجاہد کے مثل ہی ثواب ملے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی و شرح السنۃ للبغوی)

تشریح:۔ اللہ تعالیٰ کے کریمانہ قوانین میں سے یہ بھی ایک قانون ہے کہ کسی نیک عمل کی ترغیب دینے والے اور اس میں مدد دینے والے کو بھی اس عمل کے کرنے والے کا سا ثواب عطا فرماتے ہیں ـــــ جو نا حقیقت شناس اللہ تعالیٰ کی شان کرم سے آشنا نہیں ہیں انہی کو اس طرح کی بشارتوں میں شکوک و شبہات ہوتے ہیں ـ اللّٰھم اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ ـ

مسافرت میں روزہ :۔

قرآن مجید سورۂ بقرہ میں جس جگہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا اعلان کیا گیا ہے وہیں مریضوں اور مسافروں کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ سفر اور بیماری کے بعد اپنے روزے پورے کریں اور وہیں بتا دیا گیا ہے کہ یہ اجازت اور رخصت بندوں کی سہولت اور آسانی کے لئے دی گئی ہے۔

ارشاد ہے ـــــ

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ	اور جو تم میں سے رمضان کا مہینہ پائے
فَلْيَصُمْهُ ط وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا	تو وہ اس پورے مہینے کے روزے
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ	رکھے اور جو مریض ہو یا سفر میں ہو
اَيَّامٍ اُخَرَ ط يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ	تو اس کے ذمہ دوسرے دنوں میں

اَلْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۔ (البقرہ ع ۲۳) رمضان کے دنوں کی گنتی پوری کرنا ہے اللہ کو تمہارے لئے سہولت اور آسانی منظور ہے وہ تمہارے واسطے دشواری نہیں چاہتا۔

اس آیت سے خود معلوم ہو گیا کہ یہ رخصت بندوں کی سہولت اور آسانی کے لئے اور تنگی اور دشواری سے ان کو بچانے کے لئے دی گئی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص سفر میں ہونے کے باوجود روزہ میں اپنے لئے کوئی خاص تکلیف اور دشواری محسوس نہ کرے تو وہ روزے رکھ سکتا ہے اور چاہے تو رخصت پر عمل کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل چونکہ امت کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے۔ اس لئے آپ نے کبھی سفر میں روزے رکھے اور کبھی قضا کئے تاکہ امتی اپنے حالات کے مطابق جس طریقہ پر چاہیں عمل کر سکیں ـــــــ اس سلسلہ کے آپ کے ارشادات اور طرز عمل سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھنے سے اگر دوسرے ضروری کاموں کا حرج اور نقصان ہوتا ہو تو روزہ قضا کرنا بہتر ہے۔ اور اگر ایسی بات نہ ہو تو پھر روزہ رکھنا بہتر ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو الْاَسْلَمِيَّ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصُوْمُ فِى السَّفَرِ ـــــ وَكَانَ كَثِيْرَ الصِّيَامِ ـــــ فَقَالَ اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَاِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حمزہ بن عمرو اسلمی نے ـــــ جو بہت روزے رکھا کرتے تھے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں سفر میں روزے رکھ لیا کروں ـــ؟ آپ نے فرمایا کہ چاہو تو رکھو اور چاہو نہ رکھو ۔ (صحیح بخاری ومسلم)

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ إِلَى مَكَّةَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ عُسْفَانَ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَرَفَعَهُ إِلَى يَدِهٖ لِيَرَاهُ النَّاسُ فَأَفْطَرَ حَتّٰى قَدِمَ مَكَّةَ وَذَالِكَ فِي رَمَضَانَ ـــ فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ قَدْ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَفْطَرَ فَمَنْ شَاءَ صَامَ وَمَنْ شَاءَ أَفْطَرَ ـــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ میں آپؐ برابر روزے رکھتے رہے یہاں تک کہ آپؐ مقام عسفان تک پہونچ گئے (وہاں سے آپؐ نے روزے رکھنے چھوڑ دئے۔ اور سب پر یہ بات واضح کر دینے کے لئے) آپؐ نے پانی منگوایا پھر آپؐ نے اس پانی کو ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا تاکہ سب لوگ دیکھ لیں (اس کے بعد آپؐ نے اس کو پیا) پھر مکہ پہنچنے تک آپؐ نے روزے نہیں رکھے اور یہ سب ماہ رمضان میں پیش آیا ـــــ تو ابن عباسؓ (اسی بنا پر) کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں روزے رکھے بھی ہیں اور قضا بھی کئے ہیں تو (گنجائش ہے) کہ جس کا جی چاہے سفر میں روزے رکھے اور جس کا جی چاہے قضا کرے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں مکہ کے جس سفر کا ذکر ہے یہ فتح مکہ والا سفر تھا جو رمضان ۸ھ میں ہوا تھا۔ اس میں آپؐ شروع میں روزے رکھتے رہے جب مقام عسفان پہ پہنچے (جو مکہ معظمہ سے قریباً ۳۵-۳۶ میل پہلے ایک چشمہ پڑتا تھا) اور وہاں سے مکہ صرف دو منزل رہ گیا۔ اور اس کا امکان پیدا ہو گیا کہ قریبی وقت میں کوئی مزاحمت یا معرکہ پیش آجائے تو آپؐ نے مناسب سمجھا کہ روزے نہ رکھے جائیں اس لئے آپؐ نے روزہ قضا کر دیا۔ اور سب کو دکھا

کے پانی پیا تاکہ کسی کے لئے روزہ قضا کرنا گراں نہ ہو ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ جب تک روزہ قضا کرنے میں کوئی ایسی مصلحت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے، اسی لئے آپؐ نے عسفان تک برابر روزے رکھے، اگر بغیر کسی خاص مصلحت کے بھی سفر میں روزہ قضا کرنا ہی افضل ہوتا تو آپؐ شروع سفر ہی سے قضا کرتے۔

اسی واقعہ کے بارہ میں حضرت جابر کی بھی ایک روایت صحیح مسلم میں ہے، اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس طرح بالا علان روزہ قضا کرنے اور سب کو دکھا کر پانی پینے کے بعد بھی روزے جاری رکھے، جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بات آئی تو آپؐ نے فرمایا کہ "یہ لوگ خطا کار اور گنہگار ہیں" (کیونکہ انھوں نے منشاء نبوی کے ظاہر ہونے کے بعد اس کی خلاف ورزی کی۔ اگرچہ نادانستہ اور غلط فہمی سے کی لیکن "حسنات الابرار سیأت المقربین۔"

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ن الْخُدْرِیِّ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِسِتَّ عَشَرَۃَ مَضَتْ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ فَمِنَّا مَنْ صَامَ وَمِنَّا مَنْ اَفْطَرَ فَلَمْ یَعِبِ الصَّائِمُ عَلَی الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَی الصَّائِمِ ــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم جہاد کے لئے چلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سولھویں رمضان کو، تو ہم میں سے بعض نے روزے رکھے اور بعض نے رخصت سفر کی بنا پر قضا کئے تو نہ تو روزے رکھنے والوں نے قضا کرنے والوں پر اعتراض کیا اور نہ قضا کرنے والوں نے روزے رکھنے والوں پر اعتراض کیا۔ (یعنی ہر ایک نے دوسرے کے طرزِ عمل کو جائز اور شریعت کے مطابق سمجھا۔) (صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی السَّفَرِ فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلًا

فِیْ یَوْمٍ حَارٍّ فَسَقَطَ الصَّوَّامُوْنَ وَقَامَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوْا الْاَبْنِیَةَ وَسَقَوُا الرِّکَابَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَھَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْیَوْمَ بِالْاَجْرِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو ہم میں سے بعض روزے رکھتے تھے اور بعض روزے قضا کرتے تھے تو ایک دن چونکہ سخت گرمی تھی ہم ایک منزل پر اترے تو روزے رکھنے والے تو گر گئے اور پڑ گئے اور جو روزے قضا کرنے والے تھے وہ اٹھے، انھوں نے سب کے لئے خیمے لگائے اور سب کی سواریوں کو یعنی سواری کے اونٹوں کو پانی پلایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج روزے قضا کرنے والے ثواب مار لے گئے۔ یعنی انھوں نے ثواب زیادہ کما لیا۔ ———

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفَرٍ فَرَاٰی زِحَامًا وَرَجُلًا قَدْ ظُلِّلَ عَلَیْہِ فَقَالَ مَا ھٰذَا؟ قَالُوْا صَائِمٌ فَقَالَ لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِی السَّفَرِ ———

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے۔ آپ نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی اور ایک آدمی کو دیکھا جس پر سایہ کیا گیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ صاحب روزہ دار ہیں (ان کی حالت غیر ہو رہی ہے اس لئے یہ سایہ کیا جا رہا ہے اور لوگ جمع ہو گئے ہیں) آپ نے فرمایا سفر کی حالت میں یہ روزہ تو کوئی نیکی کا

کام نہیں ہے۔		(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ جب سفر میں اللہ تعالیٰ نے روزہ قضا کرنے کی رخصت اور اجازت دی ہے اور میں خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں تو پھر مسلمانوں میں سے کسی کا ایسے حال میں روزہ رکھنا کہ خود بھی گر جائیں اور دوسرے لوگ بھی ان کی دیکھ بھال میں لگ جائیں کوئی نیکی کی بات نہیں ہے، ایسی حالت میں تو رخصت پر عمل کر کے روزہ قضا کرنا فرض ہی ہے اور اسی میں اللہ کی رضا ہے۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دین		خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

فرض روزوں کی قضا۔

عَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا قَالَتْ لِعَائِشَةَ مَا بَالُ الْحَائِضِ تَقْضِي الصَّوْمَ وَلَا تَقْضِي الصَّلٰوةَ قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ يُصِيْبُنَا ذٰلِكَ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلٰوةِ ــــــــ رواہ مسلم

معاذہ عدویہ (جو ایک تابعی خاتون ہیں) وہ بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ ایام حیض میں جو روزے قضا ہوتے ہیں اُن کی تو قضا کی جاتی ہے اور جو نمازیں قضا ہوتی ہیں ان کی قضا نہیں پڑھی جاتی؟ اُم المومنینؓ نے فرمایا کہ (بس اللہ و رسول کا حکم ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب ہم اس میں مبتلا ہوتے تھے (اور اس کی وجہ سے ان دنوں میں روزہ نماز کچھ نہیں کر سکتے تھے) تو ہم کو اُن دنوں کے قضا شدہ روزے رکھنے کا تو حکم دیا جاتا تھا اور قضا نمازیں پڑھنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

(صحیح مسلم)

نفس کی خواہش سے بلا عذر شرعی فرض روزہ توڑنے کا کفارہ :۔

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ

اللّٰہِ ھَلَکْتُ قَالَ وَمَا لَکَ قَالَ وَقَعْتُ عَلٰی اِمْرَأَتِیْ وَ
اَنَا صَائِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
ھَلْ تَجِدُ رَقَبَۃً تُعْتِقُھَا قَالَ لَا قَالَ فَھَلْ تَسْتَطِیْعُ
اَنْ تَصُوْمَ شَھْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ قَالَ لَا قَالَ ھَلْ تَجِدُ
اِطْعَامَ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا قَالَ لَا۔ قَالَ اِجْلِسْ وَمَکَثَ
النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَیْنَا نَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ اُتِیَ
النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِعَرَقٍ فِیْہِ تَمْرٌ وَالْعَرَقُ
الْمِکْتَلُ الضَّخْمُ) قَالَ اَیْنَ السَّائِلُ قَالَ اَنَا قَالَ خُذْ
ھٰذَا فَتَصَدَّقْ بِہٖ فَقَالَ الرَّجُلُ اَعَلٰی اَفْقَرَ مِنِّیْ یَا
رَسُوْلَ اللّٰہِ فَوَاللّٰہِ مَا بَیْنَ لَابَتَیْھَا (یُرِیْدُ الْحَرَّتَیْنِ)
اَھْلُ بَیْتٍ اَفْقَرُ مِنْ اَھْلِ بَیْتِیْ فَضَحِکَ النَّبِیُّ صَلَّی
اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی بَدَتْ اَنْیَابُہٗ ثُمَّ قَالَ اَطْعِمْہُ
اَھْلَکَ

روا ہ البخاری و مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن جبکہ ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ہلاک ہو گیا (یعنی میں ایک ایسا کام کر بیٹھا ہوں جس نے مجھے ہلاک و برباد کر دیا ہے) آپؐ نے فرمایا کیا ہو گیا؟ اس آدمی نے کہا میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے صحبت کر لی (دوسری روایت میں ہے کہ یہ رمضان کا واقعہ ہے)۔ آپؐ نے فرمایا تو کیا تمہارے پاس اور تمہاری ملکیت میں کوئی غلام ہے جس کو تم اس غلطی کے کفارہ میں آزاد کر سکو؟ اس آدمی نے کہا کہ نہیں! آپؐ نے فرمایا تو پھر کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھو، اس نے عرض کیا کہ یہ بھی میرے بس کی بات نہیں! آپؐ نے فرمایا تو کیا تمہارے پاس اتنا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکو؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے اس کی بھی

مقدرت نہیں ـــــــ آپؐ نے فرمایا تو بیٹھے رہو (شاید اللہ تعالیٰ کوئی سبیل تمہارے لئے پیدا کرے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی وہیں تشریف فرما رہے اور ہم لوگ بھی ابھی وہیں حاضر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھجوروں کا ایک بہت بڑا بورا آیا، آپؐ نے پکارا کہ مسئلہ پوچھنے والا وہ آدمی کدھر ہے؟ اس آدمی نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں! آپؐ نے فرمایا اس بورے کو لے لو اور اپنی طرف سے) صدقہ کردو، اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ایسے شخص پر صدقہ کروں جو مجھ سے زیادہ حاجتمند ہو؟ خدا کی قسم مدینہ کی دونوں طرف کی پتھریلی زمین کے درمیان (یعنی مدینہ کی پوری بستی میں) کسی گھر کے لوگ بھی میرے گھر والوں سے زیادہ حاجتمند نہیں ہیں، (اس کی اس بات پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (خلاف عادت) ایسی ہنسی آئی کہ آپؐ کے دائیں بائیں کنارے والے دانت (کچلیاں) بھی ظاہر ہو گئیں (حالانکہ عادت مبارکہ صرف تبسم کی تھی) پھر آپؐ نے اس آدمی سے فرمایا اچھا یہ کھجوریں اپنے اہل وعیال ہی کو کھلادو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی رمضان کے روزہ میں نفس کی خواہش سے ایسی غلطی کر بیٹھے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یعنی مقدرت ہو تو غلام آزاد کرے اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو متواتر دو مہینے کے روزے رکھے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ـــ جمہور ائمہ و فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے، البتہ اس میں ائمہ کی رائے میں اختلاف ہو گیا ہے کہ یہ کفارہ کیا صرف اسی صورت میں واجب ہوگا جبکہ کسی نے رمضان کے روزہ میں جماع کیا ہو یا اس صورت میں بھی واجب ہوگا جب کسی نے دانستہ کچھ کھا پی کے روزہ توڑ ڈالا ہو، حضرت امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ کفارہ صرف جماع والی صورت کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے وہ جماع ہی کا ہے ـــ لیکن امام ابو حنیفہ اور امام مالک اور سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک وغیرہ ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ کفارہ دراصل رمضان کے روزہ کی بے حرمتی کا ہے اور اس جرم کی سزا ہے کہ اس نے اپنے نفس کی خواہش کے مقابلہ میں رمضان کے روزہ کا احترام نہیں کیا اور اس کو توڑ ڈالا۔ اور یہ جرم دونوں صورتوں میں یکساں ہے اس لئے اگر کسی نے

دانستہ کھا پی کے روزہ توڑا تو اس پر بھی یہ کفارہ واجب ہوگا۔

اس واقعہ میں ایک عجیب وغریب بات یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن صاحب واقعہ صحابی کو کھجوروں کا جو بورا اس لئے عنایت فرمایا تھا کہ مساکین پر صدقہ کر کے وہ اپنا کفارہ ادا کریں، اُن کے اس کہنے پر کہ مدینہ بھر میں مجھ سے اور میرے اہل وعیال سے زیادہ حاجتمند کوئی بھی نہیں ہے۔ آپؐ نے اس کے بارے میں ان کو اجازت دیدی کہ اس کو اپنے ہی کام میں لے آئیں ــــــ اس کے بارہ میں جمہور ائمہ کی رائے یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح اُن کا کفارہ ادا ہو گیا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وقتی ضرورت اور حاجتمندی کا لحاظ کر کے اُن کھجوروں کو اپنے خرچ میں لے آنے کی ان کو اُس وقت اجازت دیدی اور کفارہ ان کے ذمہ واجب رہا ــــــ اور مسئلہ یہی ہے کہ اگر رمضان کا روزہ کوئی ایسا آدمی اس طرح توڑ ڈالے جو نہ تو فی الوقت غلام آزاد کر سکتا ہو، نہ دو مہینے متواتر روزے رکھ سکتا ہو اور نہ افلاس وغربت کی وجہ سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہو تو کفارہ اس کے ذمہ واجب رہے گا، وہ اس کی ادائیگی کی نیت رکھے اور جب کبھی اس کو استطاعت ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ــــــ اور امام زہری وغیرہ بعض ائمہ کی رائے یہ ہے کہ عام شرعی قانون اور مسئلہ تو یہی ہے لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کے ساتھ ایک طرح کا استثنائی معاملہ کیا اور ان کا کفارہ اسی طرح ادا ہو گیا۔ یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی میں کسی قدر اختصار کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ بعض علمائے کبار نے (جن کو ہمارے اساتذہ اور شیوخ نے دیکھا ہے) ابوہریرہ والی اس حدیث کی شرح دو جلدوں میں لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ اس حدیث سے ایک ہزار علمی فائدے اور نکتے پیدا ہوتے ہیں۔

کن چیزوں سے روزہ خراب نہیں ہوتا۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارہ میں شبہ ہو سکتا ہے کہ ان سے روزہ ٹوٹ

جاتا ہوگا یا اس میں کچھ خرابی آجاتی ہوگی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات یا عمل سے واضح فرمادیا ہے کہ ان چیزوں سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آتی ـــــ اس سلسلہ کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ فَاَكَلَ اَوْشَرِبَ فَلْيُتِمَّ صَوْمَهٗ فَاِنَّمَا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ ـــــ

ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھالیا یا پی لیا تو (اس سے اس کا روزہ نہیں ٹوٹا اس لئے) وہ قاعدہ کے مطابق اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اس کو اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے (اس نے خود ارادہ کرکے) روزہ نہیں توڑا ہے اس لئے اس کا روزہ علیٰ حالہ ہے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ لَا يُفَطِّرْنَ الصَّائِمَ اَلْحِجَامَةُ وَالْقَيْئُ وَالْاِحْتِلَامُ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان تین چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا ـــــ پچھنے لگوانا، اور قے ہوجانا اور احتلام ـــــ (جامع ترمذی)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُبَاشَرَةِ لِلصَّائِمِ فَرَخَّصَ لَهٗ وَاَتَاهُ اٰخَرُ فَسَاَلَهٗ فَنَهَاهُ فَاِذَا الَّذِیْ رَخَّصَ لَهٗ شَيْخٌ وَاِذَا الَّذِیْ نَهَاهُ شَابٌّ ـــــ

رواہ ابوداؤد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے روزہ کی حالت میں بیوی کیساتھ لپٹنے چمٹنے کے بارہ میں سوال کیا (کہ اس کی گنجائش ہے یا نہیں) آپؐ نے اُن کو بتایا کہ گنجائش ہے اور دوسرے ایک صاحب نے آکر آپؐ سے یہی سوال کیا، تو آپؐ نے ان کو ممانعت فرمادی (اور اجازت نہیں دی) تو جن کو آپؐ نے گنجائش بتلائی تھی، وہ بوڑھی عمر کے آدمی تھے اور جن کو ممانعت فرمائی وہ جوان تھے۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) فرق کی وجہ ظاہر ہے، جوان آدمی کے لئے چونکہ اس کا قوی خطرہ ہوتا ہے کہ نفس کی خواہش اس پر غالب آجائے اور وہ روزہ خراب کر بیٹھے اسلئے آپؐ نے جوان سائل کو اجازت نہیں دی اور بوڑھا آدمی چونکہ اس خطرہ سے نسبتاً مامون ہوتا ہے اس لئے بوڑھے سائل کو آپؐ نے رخصت اور گنجائش بتلادی۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِشْتَكَيْتُ عَيْنِيَ اَفَاَكْتَحِلُ وَاَنَا صَائِمٌ قَالَ نَعَمْ ــــــ رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ میری آنکھ میں تکلیف ہے تو کیا میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگا سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں لگا سکتے ہو ــــــ

(جامع ترمذی)

(تشریح) معلوم ہوا کہ آنکھ میں سرمہ یا کسی دوا کے لگانے سے روزہ پر اثر نہیں پڑتا۔

عَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَا اُحْصِي يَتَسَوَّكُ وَهُوَ صَائِمٌ ــــــ

ــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت عامر بن ربیعہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی دفعہ کہ

بیں شمار بھی نہیں کرسکتا، روزہ کی حالت میں مسواک کرتے ہوئے دیکھا ہے ــــ

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقَدْ رَأَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ یُصُبُّ عَلٰی رَأْسِہِ الْمَاءَ وَھُوَ صَائِمٌ مِنَ الْعَطْشِ اَوْ مِنَ الْحَرِّ ــــــــ (رواہ مالک وابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام عرج میں دیکھا آپؐ روزہ سے تھے اور پیاس یا گرمی کی (شدت) کی وجہ سے سر مبارک پر پانی بہا رہے تھے ــــــــ

(مؤطا امام مالک، سنن ابی داؤد)

(تشریح) معلوم ہوا کہ روزہ کی حالت میں پیاس یا گرمی کی شدت کم کرنے کے لئے سر پہ پانی ڈالنا اور اس قسم کی دوسری تدابیر کرنا جائز ہے اور یہ روزہ کی روح کے بھی خلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس طرح کے بعض اعمال اس لئے بھی کرتے تھے کہ اس طرز عمل سے اپنی عاجزی ظاہر ہوتی ہے جو بندگی کی روح ہے ــــ نیز امت کے لئے آپؐ سہولت کا نمونہ قائم کرنا چاہتے تھے، ــــ اللہ کی رحمتیں ہوں آپؐ پر اور اس کا سلام۔

عَرج، مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے تین منزل پر ایک آباد موضع تھا اس لئے یہ واقعہ کسی سفر کا ہے، ہو سکتا ہے کہ فتح مکہ والے سفر ہی کا ہو جو رمضان مبارک میں ہوا تھا اور آپؐ نے مقام عُسفان پہنچنے تک برابر روزے رکھے تھے ــــ

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ھَشَشْتُ فَقَبَّلْتُ وَاَنَا صَائِمٌ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَنَعْتُ الْیَوْمَ اَمْرًا عَظِیْمًا قَبَّلْتُ وَاَنَا صَائِمٌ قَالَ اَرَأَیْتَ لَوْ مَضْمَضْتَ مِنَ الْمَاءِ وَاَنْتَ صَائِمٌ قُلْتُ لَا بَاسَ قَالَ فَمَہْ ! ــــ (رواہ ابوداؤد)

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب

رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ (روزہ کی حالت میں) میرے اندر سخت تقاضا اور جذبہ پیدا ہوا، اور میں نے (اپنی بیوی کا) بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آج مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا، میں نے روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیا، آپؐ نے فرمایا بتاؤ اگر تم پانی منہ میں لے کر کلی کر و. (تو کیا اس سے تمہارے روزہ میں خرابی آئے گی؟) میں نے عرض کیا اس سے تو کوئی خرابی نہ آئے گی، آپؐ نے فرمایا تو پھر (خالی بوسہ لینے سے کیا ہوا ــــــ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب سے صرف یہ جزئی مسئلہ ہی نہیں معلوم ہوا کہ خالی بوسہ لینے سے روزہ میں خرابی نہیں آتی بلکہ ایک اصول اور قاعدہ کلیہ معلوم ہو گیا اور وہ یہ کہ دراصل روزہ کو توڑنے والی چیز کھانا پینا اور جماع ہے اور جس طرح کھانے پینے کی کسی چیز کا صرف منہ میں رکھنا (جو کھانے پینے کا گویا مقدمہ اور دیباچہ ہوتا ہے) روزہ کو نہیں توڑتا۔ اسی طرح بوس وکنار وغیرہ (جو جماع کے صرف مقدمات ہوتے ہیں) روزہ کو خراب نہیں کرتے ــــــ ہاں جس آدمی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ خواہش اور تقاضے سے مغلوب ہو کر کہیں جماع میں مبتلا نہ ہو جائے اس کو اس قسم کی باتوں سے روزہ میں پورا پرہیز کرنا چاہئے ــــــ جیسا کہ اوپر کی بعض حدیثوں سے معلوم ہو چکا۔

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

اپنی تقصیرات پر نظر کرنا چاہیئے کہ جناب قدس خداوندی میں ہر ساعت واقع ہوتی رہتی ہیں (پھر بھی) اللہ تعالیٰ ان تقصیرات کے مواخذے میں تعجیل نہیں فرماتا اور رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا ہے ــــــ تصحیح عقائد اور احکام فقہیہ کی ادائیگی کے بعد اپنے اوقات کو ذکر الٰہی میں مستغرق رکھنا چاہیئے اور جس طریقے پر ذکر کو اخذ کیا ہے اسی طرح ذکر کرنا چاہیئے۔ ذکر کے منافی جو چیز بھی ہو اس کو اپنا دشمن سمجھ کر اس سے اجتناب لازم ہے۔

ہر چہ جز ذکر خدائے احسن است　　　گر شکر خوردن بود جاں کندن است[1]

تم سے تمہاری حاضری کے موقع پر کہدیا گیا ہے کہ امور شرعیہ میں جتنی احتیاط مدنظر رکھی جائے گی مشغولیٔ ذکر میں افزائش ہو گی اور اگر احکام شرعیہ میں کوتاہی کروگی تو ذکر کی حلاوت برباد کردوگی ــــــ وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اَعْلَمُ

---

[1] خداوند قدوس کی یاد کے سوا جو کچھ ہے اگر مٹھائی کھانا بھی ہے تو بس جان برباد کرنا ہے۔ ۱۲

تجلیات مجدّد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۲۴) ملا مراد کشمیؒ عہ کے نام [آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام کی دینی عظمت اور ان کی باہمی محبت و مودت کے بیان میں]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ——— مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ عہ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الیٰ قولہ تعالیٰ) لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ———
(سورۃ الفتح)

عہ آپ میر محمد نعمان اکبرآبادیؒ کے مریدین میں سے تھے۔

عہ ترجمہ ——— محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے پیغمبر ہیں اور ان کے جو ساتھی ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ اے مخاطب تو ان کو دیکھتا ہے (بقیہ صفحہ آئندہ)

حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے ان آیتوں میں تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اُن کی باہمی کمالِ مہربانی و محبت پر فرمائی ہے اس لئے کہ رَحِیْم جو کہ رُحَمَاءُ کا واحد ہے اپنے اندر انتہائی مہربانی کے معنی رکھتا ہے ـــــ پھر چونکہ رَحِیْم صفت مشبہ ہے اس لئے استمرار و دوام پر بھی اس کی دلالت ہے (اس بنا پر) ضروری ہے کہ ان کی باہمی مہربانی ہر زمانہ میں صفت استمرار و دوام پر ہو، خواہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا زمانہ ہو۔ خواہ آپؐ کی وفات کے بعد کا زمانہ ـــــــــ نیز ضروری ہے کہ جو باتیں بھی کہ بیگانگی و نامہربانی ہیں وہ بھی ان بزرگوں سے دائمی طور پر منفی ہوں اور باہمی بغض، کینہ، حسد اور عداوت بھی ان اکابرین سے استمرار و دوام کے طور پر منتفی ہونے چاہئیں ـــــــ جب تمام صحابہؓ (عمومی طور پر) اس پسندیدہ صفت (مہربانی و محبت) کے ساتھ موصوف ہوئے جیسا کہ کلمۂ وَالَّذِیْنَ کا یہی تقاضا ہے ــــ کیونکہ اَلَّذِیْن عموم و استغراق کے صیغوں میں سے ہے ـــــ تو پھر کیا کہنا ہے اکابر صحابہؓ کا وہ تو اس صفت میں (اور بھی)

(بقیہ صفحہ گذشتہ) رکوع کرنیوالا اور سجدہ کرنے والا (یعنی اکثر اوقات نماز میں مشغول رہنے والا) وہ طلب کرتے ہیں خداوند تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی اللہ کے ساتھ ان کے سچے تعلق اور بندگی کا نشان ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے اثر سے۔ یہ جو مذکور ہوا ہے ان کی صفت [illegible] ت میں۔ اور ان کی صفت انجیل میں یہ ہے کہ وہ مانند ایک کھیتی کے ہیں کہ اس نے اپنا نرم و نازک انکھوا نکالا پھر اس میں [illegible] توانائی اور سختی آئی پھر وہ موٹی اور مضبوط ہو گئی پھر وہ اپنے تنوں پر قائم ہو گئی۔ خوشی ہوتی ہے اس سے کسانوں کو ـــــ اصحاب محمدؐ کی اس ترقی اور فروغ کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ کفار کے دل ان کی وجہ سے جلتے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان کے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے اچھے اعمال کئے ہیں مغفرت اور اجر عظیم کا ـــــ

اتم و اکمل ہوں گے ——

اسی بنا پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں) فرمایا ہے —— اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْ بَکْرٍ (میری امت میں ابوبکر سب سے زیادہ مہربان اور درد مند ہیں میری امت کے) —— اور حضرت فاروق اعظمؓ کی شان میں آپؐ نے فرمایا ہے —— لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ —— (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے) یعنی وہ لوازم و کمالا جو نبوت میں درکار ہیں وہ سب حضرت عمرؓ اپنے اندر رکھتے ہیں لیکن چونکہ منصب نبوت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا۔ اس لئے حضرت عمرؓ منصب نبوت کی دولت سے مشرف نہ ہوئے —— لوازم نبوت میں سے ایک لازمہ خلق خدا پر کمال شفقت و مہربانی بھی ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اور وہ رذائل جو کہ منافی شفقت و مہربانی ہیں۔ اور رذائم اخلاق میں سے ہیں مثلاً حسد اور بغض و عداوت۔ (یہ اخلاق بد) اس جماعت صحابہؓ کے حق میں کیسے متصور ہو سکتے ہیں جن کو براہ راست) صحبت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہے —— یہ صحابہؓ تو تمام امت محمدیہ میں —— جو کہ خیر الامم ہے —— بہترین امت ہیں اور اس بات میں اسکے —— جو کہ تمام ادیان کی ناسخ ہے —— سابق ترین ہی صحابہ ہیں۔ ان کا زمانہ (بارشاد آنحضرتؐ) بہترین زمانہ ہے —— ان کے پیغمبر (جن کو انھوں نے براہ راست حالت ایمان میں دیکھا اور جن کی صحبت اٹھائی) —— تمام انبیاء و مرسلین میں افضل ہیں —— اگر (خدانخواستہ) صحابہ کرامؓ اُن مکروہ صفات کے ساتھ موصوف ہوں جن کے اتصاف سے اس امت کا ادنیٰ فرد بھی عار و شرم رکھتا ہے —— تو پھر یہ اس امت کے بہترین کیسے قرار پائیں گے؟ اور یہ امت کس طریقے سے خیر الامم ہوگی؟ نیز ایمان لانے میں سبقت اور مال و جان کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی اولیت سے ان صحابہؓ کو کیا فضیلت حاصل ہو سکے گی؟ خیریتِ قرن (زمانہ) کی کیا تاثیر مانی جائے گی اور فضیلتِ صحبت خیر البشر صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا اثر ثابت ہوگا؟ —— جو جماعت

اس امت کے اولیاء کی صحبت میں زندگی گزارتی ہے وہ بھی ان خراب عادات سے نجات پالیتی ہے ــــ پھر جس جماعت نے افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اقدس میں اپنی عمر گزاری ہو اور تائید و نصرت دین محمدی کی خاطر اپنے مالوں اور جانوں کی قربانی کی ہو ان حضرات کے حق میں ان ذمائم (حسد وبغض وغیرہ) کا کیا توہم ہوسکتا ہے؟

ہاں اگر عیاذاً باللہ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور تاثیر صحبت کا کوئی منکر ہو اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو ایک ولی امت کی صحبت سے بھی ناقص تو سمجھے (تو وہ صحابہؓ کے اندر ذمائم کا توہم کرسکتا ہے) ــــــــ یہ بات مُسَلَّم ہے کہ کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہونچ سکتا۔ پھر نبی کے مرتبے کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ ــــ شیخ شبلی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے ــــــ "جس نے اصحاب رسول اللہ کی تعظیم نہ کی وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان نہیں لایا۔" ....

مکتوب (۲۵) ملّا طاہر کے نام

[ذکر اور علاوہ تکرار کے آثار اور ان کی وجہ سے ترقی درجات کا بیان]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اس راہ کے مبتدی طالب کے لئے بغیر ذکر کے چارہ نہیں، اس لئے کہ اس کی ترقی ذکر ہی سے متعلق ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ذکر کو کسی شیخ کامل و مکمل سے حاصل کیا ہو، اگر یہ شرط ملحوظ نہ رہی تو بسا اوقات وہ ذکر، "اورادِ ابرار" کے قبیل سے ہوگا، جس کا ثواب تو ملے گا مگر وہ ذریعۂ قرب نہ بن سکے گا۔ اور اس مقام تک نہ پہنچا سکے گا جہاں اس کے ذریعہ مقربین پہنچ جاتے ہیں۔ ــــ ویسے (شاذ و نادر طور پر) یہ ہوسکتا ہے کہ فضل خداوندی کسی شیخ کے توسط کے بغیر بھی کسی طالب کی ترتیب فرمادے اور تکرار ذکر اس کو مُقرّب بنا دے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر تکرار ذکر کے اس کو مراتب قرب سے مشرف فرمادے اور اپنے اولیا میں شامل کرلے ــــ لیکن یہ شرط (شیخ کامل) اکثر کے لحاظ سے ہے اور حکمت و عادت خداوندی کے موافق ہے ــــــ جب فضلِ خداوندی سے وہ معاملہ جو ذکر سے وابستہ ہے

مکمل ہو جاتا ہے اور ہوائے نفسانی کے جھوٹے معبودوں سے رہائی میسر آ جاتی ہے نیز نفس امارہ، نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اُس وقت ذکر سے ترقی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ذکر "اوراد ابرار" کا حکم رکھتا ہے ـــــ اُس وقت تو مراتبِ قربِ تلاوتِ قرآن اور ادائے نماز بطول قراءت سے حاصل ہوتے ہیں، پہلے جو ذکر کرنے سے حاصل ہوتا تھا، اب وہ تلاوت قرآن سے حاصل ہوتا ہے خصوصاً جبکہ تلاوتِ قرآن، نماز کے اندر ہو ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ انتہاء میں ذکر اُس تلاوتِ قرآن کا حکم پیدا کر لیتا ہے۔ جو ابتداء میں کی جاتی تھی اور جو (زیادہ سے زیادہ) از قبیل "اورادِ ابرار" تھی۔ اور تلاوت اس ذکر کا حکم پیدا کر لیتی ہے جو کہ ابتداء و توسط میں مقربات میں سے تھا ـــــ عجیب معاملہ ہے کہ اس وقت (انتہاء میں) اگر ذکر کی تکرار بعنوان قراءتِ قرآن ہو یعنی "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" سے ذکر شروع ہو تو اس سے وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے جو تلاوت قرآن سے میسر ہوتا ہے .... ہر عمل کا ایک موقع اور ایک موسم ہے اگر اس کو موقع و موسم میں اس کو کیا جائے تو حسن و ملاحت پیدا کرتا ہے اور اس موقع و موسم میں ادا نہ کیا جائے تو بسا اوقات وہ خطا بن جاتا ہے اگرچہ نیک عمل ہو قراءت فاتحہ کو دیکھو۔ تشہد کے موقع پر سورہ فاتحہ پڑھنی خطا ہے، اگرچہ سورۂ فاتحہ امّ الکتاب ہے ـــــ بس راہنما مرشد اس راہ میں ضروریات سے ہوا اور اس کی تعلیم و ہدایت بھی اہم مہمات سے ہوئی .... وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔

مکتوب (۲۷) ملا علی کشمی کے نام

[بندے کو چاہیے کہ اپنی مراد سے بالکلیہ دست بردار ہو کر اپنے مولائے حقیقی کی مراد پر راضی رہے نیز مرض ذاتی و مرض عرضی کا بیان]

بندے کو چاہیئے کہ اس کی مراد سوائے مولائے حقیقی جل سلطانہٗ کے اور کوئی نہ ہو اور سوائے مراد مولا کے مراد بندہ کچھ نہ ہو، اگر ایسا نہیں تو وہ بندگی سے اپنے کو باہر نکال لے گا۔ اور (مولائے حقیقی کی) قید غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کر لے گا ـــــ جو بندہ اپنی مرادات میں گرفتار ہے اور اپنے ہوا و ہوس پر فریفتہ ہے وہ اپنے نفس کا بندہ ہے اور اطاعت شیطان لعین میں لگا ہوا ہے۔ یہ دولت (کہ کوئی مراد بجز مولائے حقیقی کے باقی نہ رہے)

حصول ولایتِ خاصہ سے متعلق ہے۔ اور ولایتِ خاصہ، فنائے اتم اور بقائے اکمل سے وابستہ ہے ــــــــــ

اگر سوال کیا جائے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آرزوئیں اور خواہشیں کاملین سے بھی ظہور میں آتی ہیں اور مطالب متعددہ کے حصول کی آرزوئیں ان بزرگوں سے بھی محسوس ہوتی ہیں ــــــ (چنانچہ) امام انبیاء و سلطان اولیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام (کھانے پینے میں) شہد و شیرینی کو پسند فرماتے تھے اور ہدایتِ اُمت کی جو حرص آپؐ کو تھی وہ قرآن مجید سے ظاہر ہے، اس طرح کی آرزوؤں کی بقا ان بزرگوں میں کیوں تھی؟ ــــــ جواب یہ ہے کہ بعض خواہشات کا صدور طبیعت سے ہوتا ہے ــــ جب تک طبیعت باقی ہے خواہشیں قائم ہیں ــ گرمی کے وقت طبیعت بے اختیار، سردی کی طرف مائل ہوتی ہے اور سردی کے وقت گرمی کی رغبت ہوتی ہے ــــــ اس قسم کی خواہشیں منافی عبودیت اور ہوائے نفس کی گرفتاری کا سبب نہیں ہیں اس لئے کہ ضروریاتِ طبیعت دائرہ تکلیف سے خارج اور ہوائے نفس امارہ سے باہر ہیں ــــــ خواہشات نفس کا تعلق) یا فضولِ مباح (زائد از ضرورت) سے ہے یا مشتبہ سے یا حرام سے، اور جو ضروری ہے اس سے نفس کا کوئی تعلق نہیں ہے ــــ پس گرفتاری و بدکرداری پیدا ہوتی ہے، فضولیاتِ افعال سے اگرچہ از قسم مباح ہو اس لئے کہ فضولِ مباح (زائد از ضرورت) کا حرام سے پڑوس کا تعلق ہے ۔ اگر بندہ اپنے لعین دشمن شیطان کے بہکانے سے فضولِ مباح سے آگے قدم رکھے گا تو ایک دن محرمات میں گرے گا ــــــ پس مباحِ ضروری پر اقتصار ضروری ہوا کہ اگر اس مقام سے لغزش ہوئی تو (زیادہ سے زیادہ) فضولِ مباح میں آکر گرے گا اور اگر فضول مباحات میں مقام ممکن ہے تو لغزش قدم واقع ہونے پر ناچار محرمات میں گر پڑے گا ــــــ بعض خواہشات ایسی ہیں کہ ان کا حصول خارج سے ہوتا ہے .... اور خارج یا واعظِ حضرت رحمٰن ہے جو کہ القائے خیرات کرتا ہے اس لئے کہ (حدیث کی روسے) ہر مومن کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک واعظ موجود ہے۔ ــــــ یا وہ خارج شیطان ہے کہ اس کا القاء، شر اور عداوت ہے ــــــ (قرآن مجید

میں ارشاد فرمایا گیا ہے) شیطان وعدہ کرتا ہے ان سے (اپنے متبعین سے) اور ان کو آرزوؤں میں مبتلا کرتا ہے اور شیطان ان سے نہیں وعدہ کرتا ہے مگر دھوکے کا ــــــ

سکوتِ قلعہ گوالیار کے زمانے میں ایک دن فقیر فجر کی نماز کے بعد بطریق سکوت ــــ کہ اس طریقہ علیہ کا قاعدہ ہے ــــــ بیٹھا تھا، یکایک آرزو ہائے بے فائدہ کے ہجوم نے بے حلاوت کر دیا اور جمعیت خاطر سے باز رکھا، ایک لمحہ کے بعد جب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے جمعیت خاطر حاصل ہوئی تو دیکھا کہ وہ آرزوئیں بادل کے ٹکڑوں کی طرح باہر آ گئیں اور انقا کرنے والے کے ساتھ ساتھ چلی گئیں نیز خانہ قلب کو خالی کر گئیں اس وقت معلوم ہوا کہ یہ خواہشات، باہر سے آئی تھیں اندر سے نہیں ابھری تھیں (اندر سے ابھرتیں تو) اس صورت میں وہ منافی بندگی تھیں ــــــ بالجملہ ہر وہ فساد جس کا منشا اور مولد نفس امارہ ہے ــــ مرض ذاتی، سمّ قاتل اور منافی مقام بندگی ہے اور ہر وہ فساد جو باہر سے آئے اگرچہ القائے شیطانی ہو عارضی امراض سے ہے جو معمولی علاج سے زائل ہو سکتا ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (بیشک شیطان کا مکر کمزور ہے) ہمارا نفس ہمارے لئے بڑی بلا ہے اور ہمارا دشمن جانی ہمارا ہی برا ساتھی ہے ــــــ باہر کا دشمن اسی کی مدد سے ہم پر غلبہ پاتا ہے۔ وہ اسی نفس کی اعانت سے ہم کو ہمارے مقام سے ہٹاتا ہے۔ جاہل ترین شئے نفس امارہ ہے جو اپنا ہی بدخواہ ہے، اس کا نصب العین خود کو ہلاک کرنا ہے اور اس کی بڑی تمنا حضرت رحمٰن کی معصیت کرنا ہے جو کہ اس کا اور اس کی نعمتوں کا مالک ہے ــــــ نیز اطاعت شیطان، نفس امارہ کو مطلوب ہے۔ وہ شیطان جو کہ اس کا دشمن جانی ہے ــــــ جاننا چاہئے کہ مرض ذاتی اور مرضِ عارضی نیز فساد داخلی اور فساد خارجی کے درمیان تمیز کرنا بہت دشوار ہے ــــــ اس خوف سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ناقص اپنے زعم باطل کی بنا پر خود کو کامل سمجھ کر اپنے مرضِ ذاتی کو مرض عارضی سمجھ بیٹھے۔ میں اس راز کے لکھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا اور اس حقیقت کا اظہار مناسب نہیں سمجھتا تھا ــــــ ... سترہ برس کے قریب ہو گئے ہیں ... اور فساد ذاتی کو فساد عارضی سے مخلوط کئے ہوئے تھا ــــ اب حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے حق کو

باطل سے جدا کر کے دکھا دیا اور مرضِ ذاتی کو مرض عارضی سے تمیز کرا دیا ــــ اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اِس نعمت پر اور اس کی تمام نعمتوں پر ــــ

اس قسم کے اسرار کے اظہار کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ کوئی کوتاہ نظر کسی کامل کو آرزوہائے بیرونی کے وجود کی بنا پر ناقص نہ سمجھ لے اور اس کی برکات سے محروم نہ رہے ــــ دولتِ تصدیقِ انبیاءؑ سے کفار کی محرومی کا سبب ــــ انبیاء کے اندر اس قسم کی صفات کا موجود ہونا ہی تھا ــــ (قرآن مجید میں ہے) فَقَالُوْا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا ــــ (کافروں نے تعجب سے کہا کہ کیا ایک بشر ہم کو ہدایت کرتا ہے پس انھوں نے انکار کیا) ــــ اور یہ جو بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ عارف کو اس کی مرادات و خواہشات کے زائل ہونے کے بعد صاحب ارادہ کر دیتا ہے اور اختیار اس کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ اس بات کی تفصیل پھر کبھی بعنایتِ خداوندی کی جائے گی۔ یہ وقت اس تفصیل کی مساعدت نہیں کرتا ــــ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَالْتَزَمَ مُتَابَعَةَ الْمُصْطَفٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ من الصلوٰت و التسليمات اَتَمُّهَا وَاَكْمَلُهَا۔

مکتوب (۴۹) سیادت پناہ میر محب اللہ مانک پوری کے نام ــــ

[فہم بعضِ کلماتِ قرآنی کے بیان میں]

سابق میں جبکہ قصورِ فہم کے باعث بعض کلمات قرآنی میں مجھے شبہ و تردد پیدا ہوتا تھا اور ان میں تطبیق میں عاجز رہتا تھا۔ اُس وقت وسوسوں کے رفع کرنے کے لئے بعنایت خداوندی اس سے بہتر علاج نہیں پاتا تھا کہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا تھا کہ ان کلمات قرآنی کو تو کلام خداوندی تسلیم کرتا اور ان پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ایمان نہیں رکھتا تو تو کافر ہے اور بحث سے خارج ہے اور اگر ایمان رکھتا ہے تو پھر یہ شک تیری سمجھ کا قصور ہے۔ نظم قرآنی میں کوئی نقص نہیں وہ اس خالق ارض و سمٰوٰت کا کلام ہے جو عقول و ادراکات

کا موجب ہے۔ چونکہ بفضلِ خداوندی کلامِ ربانی کی حقانیت پر ایمان حاصل تھا۔ اس لئے وہ وسوسہ اس تدبیر سے مضمحل اور ناپید ہو جاتا تھا اور شک وشبہ سے نجات مل جاتی تھی ——— اس زمانے میں اللہ کے فضل سے کامیابی یہاں تک حاصل ہوئی ہے کہ نظمِ قرآنی میں جو مقام، قصورِ ادراک کی بنا پر گنجائش تردد وشبہ رکھتا ہے وہی مقام قرآن پر زیادتِ ایمان کا باعث اور وہ شبہ ظہورِ اعجازِ فرقان کا ذریعہ بن گیا ہے ——— (اب) اس دشوار مقام کو شاخہائے اعجاز سے تصور کرتا ہوں اور اس اشکال کو کمالِ بلاغت و فصاحتِ قرآن پر محمول کرتا ہوں، ایسی فصاحت وبلاغت کہ بشر اس کے فہم سے عاجز ہے ——— جس قدر ایمان قرآن کے (بعض مقامات) نہ سمجھنے میں حاصل ہوتا ہے، اتنا سمجھنے میں نہیں حاصل ہوتا اس لئے کہ نہ سمجھنے میں اعجاز کی طرف وہ راستہ کھلا ہوا ہے جو سمجھنے کی صورت میں نہیں ——— سبحان اللہ کیا عجیب بات ہے) یہی نہ سمجھنا ایک جماعت کے لئے ضلالت کی طرف لے جاتا ہے اور کلامِ حق تعالیٰ کے انکار تک پہونچاتا ہے اور بعض کے حق میں یہی نہ سمجھنا قرآن پر کمالِ ایمان کا سبب بن جاتا ہے اور ہدایت کے راستے پر لاتا ہے۔[عہ]

——— يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ———

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۔

——— والسلام ———

مکتوب (۳۱) ملا بدرالدین کے نام [عالم ارواح، عالم مثال اور عالم اجساد کی تحقیق میں]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ———

——— تم نے لکھا تھا کہ روح، بدن کے تعلق سے پہلے عالم مثال میں تھی اور مفارقتِ بدن کے بعد پھر عالم مثال میں جائے گی پس عذاب قبر عالم مثال میں ہوگا۔ جیسا کہ عالم مثال کے اندر خواب میں درد وتکلیف کا احساس کیا جاتا ہے ——— یہ بھی لکھا تھا کہ یہ بات بہت سی شاخیں رکھتی ہے اگر اس کو قبول کر لیا جائے تو اس سے بہت سے مسائل فرعیہ بر آمد

عہ بہت سوں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے۔

ہوں گے ــــــ جاننا چاہئے کہ اس قسم کے خیالات سچائی سے کم حصہ پائے ہوئے ہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خیالات تم کو غلط راستے پر ڈال دیں ــــ چند کلمات، ضرورت کی بنا پر باوجود موانع کے اس بحث کی تحقیق میں لکھے جاتے ہیں ــــ وَاللّٰہُ سُبْحَانَہُ الْھَادِیْ اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ (اللہ تعالیٰ ہی سیدھے راستے کا ہدایت کرنے والا ہے)

برادرم، عالم ممکنات کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں (۱) عالم ارواح (۲) عالم مثال (۳) عالم اجساد ـ عالم مثال کو برزخ بھی کہتے ہیں ـ یہ عالم مثال یا برزخ، عالم ارواح اور عالم اجساد کے درمیان ہے، نیز کہا گیا ہے کہ عالم مثال باقی دونوں عالم کے معانی و حقائق کے لئے ایک آئینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجساد و ارواح کے معانی و حقائق عالم مثال میں لطیف شکلوں کے اندر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اس عالم مثال میں ہر معنی و حقیقت کے مناسب ایک جداگانہ صورت و ہیئت ہے ـ عالم مثال فی حد ذاتہٖ صورتوں، ہیئتوں اور شکلوں کو اپنے اندر نہیں رکھتا صورتیں اور شکلیں دوسرے عالم سے منعکس ہو کر اس میں ظہور پذیر ہوتی ہیں جیسے آئینہ ہوتا ہے کہ اپنی ذات سے وہ کوئی صورت اپنے اندر لئے ہوئے نہیں ہے اس میں جو صورت موجود ہے وہ باہر سے آئی ہوئی ہے ــــــ جب یہ بات معلوم ہو گئی تو جاننا چاہئے کہ روح، بدن کے تعلق سے پہلے اپنے عالم (عالم ارواح میں تھی) جو کہ عالم مثال کے اوپر ہے اور تعلق بدن کے بعد اگر روح نیچے اتری ہے تو عالم اجساد میں علاقۂ جسمی کی وجہ سے اتری ہے۔ (غرضکہ) اس کو عالم مثال سے کوئی واسطہ نہیں ہے نہ تعلق بدن سے پہلے نہ تعلق بدن کے بعد ــــــ اس سے زیادہ یہ نہیں کہ بعض اوقات بتوفیق خداوندی وہ اپنے بعض حالات کو عالم مثال کے آئینے میں مطالعہ کر لیتی ہے اور اس کو اپنے احوال کا حسن و قبح، عالم مثال سے معلوم ہو جاتا ہے، چنانچہ کشف و خواب میں یہ حقیقت واضح ہے .... بعد از مفارقت بدن اگر روح، علوی ہے تو اوپر کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور سفلی ہے تو پستی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ الغرض عالم مثال سے اس کو کوئی سروکار نہیں ــــــ عالم مثال تو "از برائے دیدن" (دیکھنے کے لئے) ہے نہ کہ "از برائے بودن" (رہنے کے لئے) روح کے رہنے کی جگہ یا تو عالم ارواح ہے یا عالم اجساد۔ عالم مثال کی حیثیت ان ہر دو عالم کیلئے آئینے کی ہے اس سے

زیادہ نہیں جیساکہ اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے ــــــ اور خواب کے اندر جو تکلیف عالم مثال میں محسوس ہوتی ہے وہ اس عقوبت و سزا کی ایک صورت و شکل ہے جس کا مستحق دیکھنے والا ہوتا ہے ــــ تنبیہ کیلئے یہ بات اس پر ظاہر کردی جاتی ہے ــ عذاب قبر اس قبیل سے نہیں ہے وہ تو حقیقت عقوبت ہے صورت عقوبت نہیں ہے ــ نیز وہ تکلیف جو خواب میں محسوس ہوتی ہے اگر بالفرض اپنے اندر حقیقت بھی رکھتی ہو تو وہ دنیوی تکلیفوں کی قسم سے ہوگی اور عذاب قبر، عالم عذاب اُخروی سے ہے ــــ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے ــــــ کیونکہ عذاب دنیوی کی عذاب اُخروی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں پناہ بخدا ــــــ آتش دوزخ کی اگر ایک چنگاری دنیا میں آجائے تو ساری دنیا کو بالکلیہ سوختہ اور نابود کردے ــــــ عذاب قبر کو خواب کی طرح ماننا صورت عذاب اور حقیقت عذاب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہے ــــــ اور یہ اشتباہ یوں بھی پیدا ہوتا ہے کہ عذاب دنیا اور عذاب آخرت کی مجانست و مماثلت کا توہم ہوجاتا ہے حالانکہ یہ بات باطل ہے اور کیسی کچھ باطل بالکل کھلی ہوئی باطل ـ

اگر یہ سوال ہو کہ اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح کا قبض کرنا جس طرح موت میں ہوتا ہے خواب میں بھی ہوتا ہے پھر ایک کی (یعنی خواب کی) تکلیف کو دنیا کی تکلیفوں میں شمار کرنا اور دوسرے کی (یعنی موت کی) تکلیف کو عذاب ہائے آخرت سے کہنا کس وجہ سے ہے؟ ــــ جواب یہ ہے کہ توفیٔ نوم، اس طرح کی ہے جیسے کوئی اپنے وطن مالوف سے شوق و رغبت کے ساتھ سیر و تماشا کے لئے کہیں باہر جائے تاکہ فرحت و سرور حاصل کرے اور پھر شاداں و فرحاں اپنے وطن کی طرف واپس ہوجائے ــــــ اُس کی (توفیٔ نوم کی) سیرگاہ، عالم مثال ہے جس میں عجائب ملک و ملکوت ہیں ــــــ لیکن توفیٔ موت ایسی نہیں ہے وہاں تو وطن مالوف کا انہدام اور بنائے معمور کی تخریب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ توفیٔ نوم میں محنت و کلفت

عــہ خدائے تعالیٰ قبض ارواح کرتا ہے ان نفسوں کی موت کے وقت اور وہ نفس جو ابھی مرا نہیں ہے اُس کو نیند کی حالت میں قبض کرتا ہے ـ

حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ فرح و سرور کو متضمن ہوتی ہے برخلاف توفی موت کے اُس میں شدت و کلفت ہے پس متوفائے نومی کا وطن، دنیا ہوتا ہے اُس سے جو معاملہ ہوگا معاملات دنیا سے ہوگا۔ اور متوفائے موتی اپنے وطنِ مالوف کی تخریب کے بعد آخرت کی طرف انتقال کرتا ہے اس کا معاملہ معاملات اُخروی سے ہو گیا ——— "مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ" (جو مرگیا اُس کی قیامت قائم ہوگئی) اس حدیث کو تم نے سنا ہوگا ——— خبردار ——— کشوفِ خیالی اور ظہور مثالی کی وجہ سے اہل سنت وجماعت کے اعتقادات کو ہاتھ سے نہ دینا اور اپنے خواب وخیال پر مغرور نہ ہو جانا۔ نجات اس فرقۂ ناجیہ کی متابعت کے بغیر متصور نہیں ——— اگر آرزوئے نجات رکھتے ہو تو خوشِ طبعی کی باتیں چھوڑ کر جان و دل سے بزرگانِ اہل سنت وجماعت کے اتباع کی کوشش کرو خبر کرنا شرط ہے ——— قاصد کی ذمہ داری پیغام پہونچانے کی ہے اور بس ——— تمہاری عبارت کے "انبساط" نے مجھ کو اس توہم میں ڈالدیا کہ اس کا بڑا امکان ہے کہ یہ تخیلات تم کو اکابر اہل سنت کی تقلید سے باہر اور اپنے ذاتی کشف کا تابع کر دیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ سبحانہ منها وَمِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ——— شیطان دشمن قوی ہے، خبردار ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو صراط مستقیم اور شاہراہ حق سے ہٹا کر (تنگ) گلیوں میں ڈالدے ——— ہم سے جدا ہوئے تمہیں ایک سال بھی نہیں گزرا پھر یہ کیا ہو گیا؟ وہ احتیاطیں کدھر گئیں جو تم التزام متابعتِ سنت و اہل سنت میں کیا کرتے تھے اور نجات کا دارومدار ان بزرگوں کی تقلید میں سمجھا کرتے تھے۔ شاید اُن سب باتوں کو فراموش کر دیا جو اپنے متخیلات کو اپنا مقتدیٰ بنالیا اور شاخیں نکالنی شروع کر دیں ——— ہماری ملاقات بحیثیت ظاہر بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ بس اب (خود) اس طرح زندگی گزارو کہ رشتۂ امید نجات نہ ٹوٹنے پائے ———

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ———

والسّلام علیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدیٰ

مکتوب (۴۴) والدہ میر محمد امین

(یعنی زوجۂ خواجہ میر محمد نعمان اکبرآبادیؒ) کے نام [ذکر الٰہی کی ترغیب اور اجتناب از محبت دنیا کی نصیحت]

نصیحت جو کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اوّل علمائے اہل سنت و جماعت ——— جو کہ فرقۂ ناجیہ ہیں ——— کی آراء کے مطابق، تصحیح عقائد ہو بعد از تصحیح عقائد احکام فقہیہ کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ضروری ہے ——— (شریعت کی طرف سے) جس کا حکم دیا گیا ہے اُس کی بجا آوری اور جس سے باز رکھا گیا ہے۔ اس سے اجتناب کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ——— پانچ وقت کی نماز بغیر سستی و نقصان کے اس کے شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اور تعدیل ارکان کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کی جائے ——— سونا چاندی نصاب کے مطابق ہو تو ادائے زکوٰۃ بھی ضروری ہے ——— امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے عورتوں کے زیور میں بھی زکوٰۃ دینے کو فرمایا ہے ——— اپنے اوقات کو لہو و لعب میں صرف نہ کرنا چاہئے اور لایعنی امور میں عمر گرامی کو ضائع نہ کیا جائے ——— چہ جائے کہ ان امور میں زندگانی صرف کی جائے جن کے کرنے سے (بہت زیادہ) منع کیا گیا ہے اور جو (صریح طور پر) ممنوعات شرعیہ میں سے ہیں ——— سرود و نغمہ کی طرف رغبت نہ کرنی چاہئے اور نہ اس کی لذت پر فریفتہ ہوا جائے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسا زہر ہے جو شہد اور شکر میں ملا ہوا ہے ——— غیبت اور چغلخوری سے اپنے کو محفوظ رکھیں اس لئے کہ شرعی وعیدیں ان ہر دو بد اخلاقیوں کے ارتکاب پر وارد ہوئی ہیں۔ جھوٹ بولنے اور بہتان باندھنے سے بھی اجتناب ضروری ہے اس لئے کہ یہ دونوں خراب عادتیں تمام ادیان میں حرام ہیں اور ان کے مرتکبین کیلئے بہت سی وعیدیں وارد ہوئی ہیں ——— مخلوق کے عیبوں اور گناہوں کو دبانا اور چھپانا اور ان کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنا عزائم امور (کارہائے ہمت) سے ہے۔ غلاموں، کنیزوں، اور نوکروں پر شفقت اور مہربانی کی جائے اور (خدمت کی انجام دہی میں) ان کی تقصیرات میں مواخذہ نہ کرنا چاہئے۔ موقع بے موقع ان بیچاروں کو مارنا، برا بھلا کہنا اور تکلیف و اذیت پہونچانا ——— غیر مناسب بات ہے۔

(باقی بر ص ۴۸)

علم کافی نہیں

از جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڈھ)

(یہ مقالہ بزم سلیمانی (دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی ایک مجلس میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو پڑھا گیا)

"پچاس سونے والے بہہ گئے" ــــــ یہ خبر ایک مرتبہ اخبار میں چھپی۔ خبر میں ایک مقام پر بارش اور طوفان کی تفصیلات بتائی گئی تھیں اور اس ضمن میں کہا گیا تھا کہ پانی ریلوے لائن کے اوپر تک پہونچ گیا اور پچاس سونے والے بہہ گئے۔

یہ خبر کچھ عجیب سی تھی۔ ذہن نے جاننا چاہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ انگریزی اخبار دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اصل میں خبر تھی "پچاس سلیپر بہہ گئے" یہی لفظ اردو اخبار میں ترجمہ کی غلطی سے "سونے والے" بن گیا۔ سلیپر (SLEEPER) کے لفظی معنی بیشک سونے والے کے بھی ہیں۔ مگر اس خبر میں ظاہر ہے کہ یہ لفظ ریلوے لائن میں استعمال ہونے والے اس لکڑی کے کندے کے لئے تھا جس کے اوپر لوہے کی پٹریاں بچھائی جاتی ہیں۔ نہ کہ سونے والے آدمی کے لئے۔

اس قسم کی غلطیاں کتنی ہی بار آپکے سامنے آئی ہوں گی۔ ان غلطیوں کا سبب ہمیشہ علم کی کمی ہوتا ہے اور ان سے بچنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ آدمی علم حاصل کرلے۔ مگر غلطیوں کی ایک اور قسم، اس سے زیادہ سنگین قسم ہے جس کا تعلق علم سے نہیں معرفت سے ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کے لئے صرف صاحب علم ہونا کافی نہیں بلکہ حقیقت آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو شخص معرفت کی دولت سے محروم ہو وہ محض علم کی بدولت ان غلطیوں سے مامون نہیں ہوسکتا۔ معرفت کیا چیز ہے اور علم اور معرفت میں کیا فرق ہے، یہ ایک نہایت نازک سوال ہے

اجمالی طور پر ہم میں سے ہر شخص اس فرق کو سمجھتا ہے، مگر متعین تعریف کرنی ہو تو کسی ایک تعریف پر سب کا اتفاق حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تاہم سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم کا مطلب ہے جاننا اور معرفت کا مطلب ہے پہچاننا۔ مثال کے طور پر "واشنگٹن ایک شہر ہے" یہ ہم سب لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اگر کسی روز یہ واقعہ پیش آئے کہ ایک شخص رات کے وقت بے خبر سو رہا ہو اور اسی حالت میں کسی تیز رفتار سواری کے ذریعہ آہستگی کے ساتھ اس کو لے جاکر دور کے ایک مقام پر اس طرح اتار دیا جائے کہ جب آنکھ کھلے تو وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی شہر میں پائے، تو اسکے لئے یہ سمجھنا یقیناً ناممکن ہوگا کہ یہ واشنگٹن ہے جہاں وہ اس وقت اپنے آپ کو پا رہا ہے۔ اس کے برعکس یہی واقعہ اگر اپنے جانے پہچانے شہر میں پیش آئے تو ہم میں سے ہر شخص پہلی نظر میں سمجھ جائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ —— اس مثال میں آپ جاننے اور پہچاننے یا علم اور معرفت کا فرق بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔

معرفت علم کی روشنی ہے۔ آنکھ اور روشنی میں جو نسبت ہے وہی نسبت علم اور معرفت میں ہے اگر سرے سے روشنی نہ ہو تو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر روشنی موجود ہو مگر کم ہو، تو اسی کے بقدر کم دکھائی دے گا جتنا روشنی میں کمی ہے۔ اس اعتبار سے معرفت حاصل ہونے اور معرفت حاصل نہ ہونے کے ہزار درجے بن جاتے ہیں۔ میں چند مثالوں سے اسکو واضح کروں گا۔

ا۔ کیڑے مکوڑے (INSECTS) ہماری ایک جانی بوجھی حقیقت ہیں۔ یہ نہایت کثرت سے انڈے بچے کرتے ہیں اور ان کے اندر بڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بھڑ کو اگر مسلسل زندہ رہنے اور نشو ونما پانے کا موقع ملے تو وہ شیر کی مانند جسامت حاصل کر سکتی ہے۔ غور کیجیے کہ اس قسم کے کیڑوں کی ہزاروں صورتیں اگر شیر اور بھیڑیے کی طرح بڑی ہو کر چلنا پھرنا شروع کر دیں تو زمین پر انسان کے لئے زندگی گذارنا کس قدر مشکل ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیڑے مکوڑے اُس قسم کے پھیپھڑے نہیں رکھتے جیسے کہ آدمی رکھتا ہے۔ وہ خاص طرح کی ہوائی نالیوں (AIR-TUBES) کے ذریعہ سانس لیتے ہیں۔ جب کیڑے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی یہ سانس کی نالیاں ان کے بڑھتے ہوئے جسم کی نسبت سے نہیں بڑھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا، زیادہ بڑا نہیں ہونے

پاتا۔ بڑھنے پر یہ حد بندی ان کو شیر اور بھیڑیے کی جسامت حاصل کرنے سے روکے رہتی ہے۔ اگر یہ قدرتی روک موجود نہ ہوتا تو زمین پر انسان کے لئے قیام کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اگر دل کے اندر ایمان کی معرفت موجود ہو تو یہ واقعہ خدا کے وجود پر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے، وہ اس کے لئے خدا کی گواہی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عیسائی عالم کریسی ماریسن (CRESSY MORRISON) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عالم فطرت کا یہ نظم و نسق (ECONOMY) ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی اعلیٰ ذہن کام کر رہا ہے، کیونکہ:

ONLY INFINITE WISDOM COULD HAVE FORESEEN AND PREPARED WITH SUCH ASTUTE HUSBANDRY

یعنی صرف لامحدود عقل اتنے زیرک انتظام کو پیشگی تصور میں لا سکتی تھی اور اس کا اہتمام کر سکتی تھی (ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۰ء)

مگر معرفت سے محروم ذہن کے لئے یہی واقعہ بالکل برعکس مفہوم کا حامل بن گیا۔ جولین ہکسلے (J. HUXLEY) اس زمانے کا بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس کی ایک کتاب ہے۔ MAN IN THE MODERN WORLD یعنی انسان دور جدید میں۔ اس کتاب کے ایک حصے میں اس نے ارتقاء کے ذیل میں مذکورہ بالا واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور کیڑے مکوڑے کے فرق کو سمجھنے کے لئے کسی ارادۂ الٰہی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیڑے اور انسان دونوں ہی بعض سادہ اور ابتدائی جرثومۂ حیات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ انسان کو مخصوص اسباب سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع ملا ہے اس لئے وہ ذہن و دماغ رکھنے والی ہستی بن گیا۔ اور کیڑے مکوڑوں کو بعض مانع اسباب نے یہ مواقع فراہم نہیں کئے، اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ لکھتا ہے:

"کیا چیز تھی جس نے کیڑوں کو ترقی کرنے سے روک دیا۔ اس کا جواب کیڑے جسد کے سانس لینے کے طریقے (BREATHING MECHANISM) میں چھپا ہوا ہے۔ زمینی کیڑوں نے سانس لینے کیلئے ہوائی ٹیوب کا طریقہ اپنایا ہے جس کو حیاتیاتی اصطلاح میں (TRACHEAE) کہتے ہیں۔ اندر جا کر اس نالی کی نہایت چھوٹی چھوٹی شاخیں

ہو جاتی ہیں جن کو صرف خوردبین کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی نالیاں گیسوں کو جسم کے اندر نسیج (TISSES) تک لے جاتی ہیں اور واپس لاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسان اور دیگر جانداروں میں دہرا طریقہ پایا جاتا ہے یعنی گیسیں پھیپھڑے سے ہوکر خون کی نالیوں تک پہونچتی ہیں۔ گیسوں کے نفوذ و انتشار کا قانون کچھ ایسا ہے کہ نالیوں کے ذریعہ سانس لینا چھوٹے کیڑوں کیلئے تو بہت آسان رہتا ہے۔ مگر جسامت کے بڑھنے کے ساتھ وہ مشکل ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ چوہیا کے بقدر جسامت حاصل کرنے سے پہلے ہی یہ نالی ناقابل استعمال ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا کبھی دوسرے ریڑھ دار جانوروں کے لحاظ سے اوسط درجہ کی جسامت بھی حاصل نہ کر سکا۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہی سبب اس بات کا بھی ہے کہ کوئی کیڑا کبھی ذہین نہیں بنا ایک خاص جسامت میں محدود ہونے کی وجہ سے کیڑوں کو بہت کم اعصابی ریشے درکار ہوتے ہیں۔ جبکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ اب چونکہ کیڑے اس درجہ کی جسامت تک نہیں پہونچتے، اس لئے وہ اعلیٰ ذہانت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

دیکھئے۔ ایک ہی واقعہ کا علم ایک شخص کے لئے کائنات میں ایک ذہین تخلیقی ارادے کی موجودگی کا ثبوت بن گیا اور اسی واقعہ سے دوسرے شخص نے یہ پہلو نکال لیا کہ موجودات کی توجیہہ کے لئے کسی تخلیقی ارادے کو ماننے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے بغیر ہی ہم تمام موجودات کی توجیہہ کر سکتے ہیں۔ علم کی حد تک دونوں شخص یکساں ہیں مگر معرفت کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔

۲۔ انجیل کا ایک فقرہ ہے:

"تم زمین کے نمک ہو لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا اسکے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے۔"

متی ۵: ۱۳

اس فقرے میں دراصل بنی اسرائیل کے آخری نبی نے یہود کو مخاطب کرکے فرمایا ہو کہ تم صاحب کتاب ہونے کی وجہ اہل دنیا کے لئے روشنی کا ذریعہ تھے تمھاری حیثیت ہادی اور رہنما کی تھی۔ مگر تم نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنا مقام کھو دیا اور اس طرح خود ہی اپنے کو اس کا مستحق بنالیا کہ دوسروں سے تمھیں ذلیل کیا جائے۔

مگر اس قانون الٰہی کو نہ جاننے کی وجہ سے ایک امریکی ماہر کیمیا (ELMER W. MAURER) نے اس کی عجیب وغریب تاویل کی ہو۔ وہ ایک کیمیا داں ہو۔ اس لئے اس نے علم کیمیا کی روشنی میں اسکو دیکھا تو اس کا ذہن ایک اور ہی سمت چلا گیا۔ وہ لکھتا ہو کہ تحقیق کے بعد میں اصل راز کو پاگیا":

"وہ یہ کہ رومی ارض مقدس کے رہنے والوں سے نمک بطور محصول وصول کرتے۔ اہل فلسطین کو نمک کی سب سے زیادہ یافت بحیرۂ مردار یا بحیرہ نمک سے ہوتی۔ یہ محصول اتنے ظالمانہ تھے کہ لوگ نمک میں ریت وغیرہ کی آمیزش کرنے پر مجبور رہتے۔ حکومت اس نمک کو پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں ڈال دیتی۔ جب نمک پانی میں گھل جاتا تو نمکین پانی اوپر سے نکال لیا جاتا اور ملاوٹی مادہ ناقابل تحلیل ہونے کی وجہ سے تہ نشیں ہو کر حوض میں رہ جاتا۔ اس طرح نمک نے اپنا ذائقہ کھو دیا تھا۔ وہ اب نمک باقی نہیں رہا تھا، وہ اسی قابل تھا کہ پاؤں کے نیچے روندا جائے"

وہ مزید لکھتا ہو:

"یہی ایک طریقہ نہیں تھا جس سے نمک اپنا ذائقہ کھو دیتا۔ بحیرۂ مردار (DEAD SEA) کی سطح کا پانی دیگر اجزا کے ساتھ ۱۳ فی صد سوڈیم کلورائڈ، ۱۳ فی صد کیلشیم کلورائڈ اور ۴۰ فی صد میگنیشیم کلورائڈ رکھتا ہو۔ کیلشیم اور میگنیشیم کلورائڈ ہوا سے پانی جذب کرنے کی خاصیت رکھتے ہیں اور اس بنا پر جب نمک کے ساتھ شامل ہوتے ہیں تو اسے تحلیل کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ناخوشگوار آمیزہ تیار ہو جاتا ہو۔ رواج تھا کہ وہ لوگ اس قسم کے نمک کے لئے بڑے بڑے ذخائر ان گھروں میں محفوظ کر لیتے جن کا فرش مٹی کا ہوتا۔ بعض اوقات زمین کے ساتھ نمک کی جو تہیں بیٹھ جاتیں، وہ کمی

کی وجہ سے خراب ہو جاتیں۔ چونکہ یہ ذخیرہ نمک ملا ہوا ہونے کی وجہ سے زرخیز زمینوں کے لئے مضر ہوتا تھا اس لئے کوئی شخص بھی اسے کھیت میں پھینکنے کی اجازت نہ دیتا، اس بنا پر اسے صرف گلیوں ہی میں پھینکا جاتا جہاں چلنے والے لوگ اسے اپنے پاؤں کے نیچے روندتے۔"

THE EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE

Edited by JOHN CLOVER MONSMA

(N.Y. 1958) P. 205

انجیل کے فقرے کی یہ توجیہ ظاہر ہے کہ لال بجھکڑ کی روایتی کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ نہ تو بجائے خود صحیح ہے اور نہ وہ متعلقہ فقرے پر کسی طرح منطبق ہوتی۔ مگر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے ایسی بچکانہ غلطی کا ارتکاب صرف اس لئے کیا کہ اس نے سائنس کا علم تو حاصل کیا تھا مگر دین کی حقیقتوں سے وہ ناآشنا تھا۔ وہ اس نمک سے واقف تھا جو علم کیمیا میں زیر بحث آتا ہے اور لیبارٹری میں جس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ "نمک" کی ایک اور قسم ہے جس سے دل و دماغ کو چاشنی حاصل ہوتی ہے۔ جس سے زندگی میں خدا پرستی کا ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔ "نمک" کا لفظ دیکھ کر اس کا ذہن کیمیائی نمک کی طرف چلا گیا اور اپنے معروف نمک کے مطابق اس نے ایک تشریح کر ڈالی۔

اس کے باوجود اس کیمیادان کو اپنے تصور پر اس قدر یقین ہے کہ وہ اس کے بعد لکھتا ہے:

"یہ صرف ایک نمونہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بائبل اپنی جزوی تفصیلات تک میں سائنسی طور پر بالکل صحیح ہے۔" (صفحہ ۲۰۵)

۳۔ ایک صاحب جو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری رکھتے ہیں، انھوں نے ریسرچ میں اپنے مقالہ کے لئے اسلام کے معاشی نظریات (THE ECONOMIC DOCTRINES OF ISLAM) کا عنوان لیا۔ ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اپنے مقالے کے ایک حصے کو پُر کرنے کے لئے انھیں یہ معلوم کرنا تھا کہ

اسلام نے پیدائش دولت کے کن وسائل کی طرف اپنے پیروؤں کو متوجہ کیا ہو۔ اس مقصد سے انھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں تو بالکل لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا کا معاملہ ہے۔ پیدائش دولت کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس کی طرف انھیں کتاب الٰہی میں "اشارہ" نہ مل گیا ہو۔

اس حیرت انگیز انکشاف کی بنیاد کیا تھی، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن میں موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کے جو واقعات ہیں، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہو جب فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا:

فاوقد لی یاھامان علی الطین فاجعل لی صرحا لعلی اطلع الی الٰہ موسیٰ (قصص) — اے ہامان! مٹی کے گارے کو جلا اور میرے لئے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں

اس آیت کو پڑھتے ہی موصوف اچھل پڑے۔ انھوں نے کہا، یہ تو ترابیاتی صنعت (CERAMIC INDUSTRIES) کی تعلیم ہو۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس فقرے کا ترابیاتی صنعتوں کے قائم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو صرف فرعون کے تمرد کو بتا رہا ہو جو اس نے خدا کے نبی کے سامنے ظاہر کیا۔

اسی طرح جہاں کہیں کوئی ایک لفظ مل گیا، خواہ وہ جس سیاق میں بھی آیا ہو، انھوں نے فوراً اس سے ایک معاشی مفہوم نکال لیا ——— ومامن دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ (انعام) ان کے نزدیک مرغبانی اور پرندپروری کی تعلیم دینے والی آیت تھی، واوحی ربک الی النحل (نحل) شہد کی مکھیاں پالنے اور شہد کی تجارت کرنے کے ہم معنی تھا، ولباسھم فیھا حریر میں کرم پروری اور سلک انڈسٹری کی طرف اشارہ تھا، واصنع الفلک (ہود) جہاز سازی کا کارخانہ قائم کرنے کا پیغام تھا، وحلوا اساور من فضۃ (دہر) میں زیور سازی کی صنعت کی ہمت افزائی کی گئی تھی۔ اسی طرح محض "سرسری فہرست بندی" میں انھوں نے سو سے بھی زائد ایسی مصنوعات کا پتہ لگایا تھا جن کی طرف قرآن میں "اشارے" کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس جوش میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ قرآن سے جن صنعتی کاموں کی فہرست وہ بنا رہے ہیں، اس میں اصنام،

تماثیل، خمر اور صوامع جیسی چیزیں بھی شامل ہیں۔

مختلف قسم کی صنعتوں کو قائم کرنے اور ان کو فروغ دینے کے بارے میں اس قرآنی استدلال کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کو عربی الفاظ کے معانی کا علم تو تھا مگر قرآن کی حکمت سے وہ آشنا نہیں تھے۔ اس لئے انھیں محسوس نہیں ہوا کہ جن آیات کے حوالے سے وہ اپنا استدلال کھڑا کر رہے ہیں، ان آیات کا صنعت و تجارت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ استدلال صریح طور پر قرآن کی روح کو مجروح کر رہا ہے۔

آپ کو یہ سن کر مزید حیرت ہوگی کہ ایک مخصوص حلقہ میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کے ایک پروفیسر نے اس کو عظیم تصنیف (GREAT WORK) سے تعبیر کیا۔ اور کیمبرج یونیورسٹی کے انگریز پروفیسر MR. KRENKO نے لکھا:

"The work is a Diligent and Scientific Study"

یعنی یہ تصنیف محنت اور علمی مطالعہ کا ایک نمونہ ہے۔

۷۔ مشہور حدیث جبریل کا ایک فقرہ ہے:

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک[1]

کئی سال پہلے کی بات ہے، ایک شخص نے مجھ سے اس فقرہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں کسی قسم کی "رویت" کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کی بندگی یہ سمجھ کر کی جائے کہ خدا جو علیم و بصیر ہے، وہ یقیناً ہم کو دیکھ رہا ہوگا۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے دیکھ نہیں رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

---

[1] یہی مفہوم بعض دوسری روایات میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:
ان تخشی اللہ کانک تراہ (تم اللہ سے اس طرح ڈرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو) ۔ البخاری، الجلد الثانی

"جو لوگ حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں، انھوں نے خدا کو نہیں دیکھا، اگر وہ دیکھتے تو ایسا ترجمہ نہ کرتے" ـــــ یہ میرا جواب تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص خدا کا عینی مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کا مشاہدہ صرف آخرت میں ممکن ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہو کہ بندہ جب خدا کی یاد اور اس سے خوف و محبت کے جذبات میں غرق ہوتا ہو تو اس پر شہود و رویت کی سی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کو ایسا محسوس ہوتا ہو گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہو۔

ہمارے اور خدا کے درمیان محض ایک نظریاتی نسبت نہیں ہے بلکہ ایک گہرا فطری اور نفسیاتی ربط ہے۔ عام انسانوں میں یہ ربط چھپا رہتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دیتے ہیں، ان کا یہ ربط اسی طرح ابھر آتا ہے جیسے دوسری فطری صلاحیتیں نکاس کا راستہ پانے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور ایسا نہ ہو تو دبی پڑی رہتی ہیں۔ بندہ جب اپنے آپ کو بالکل خدا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تو خدا بھی اس کے انتہائی قریب آ جاتا ہے، خالق اور مخلوق کے درمیان جو امکانی ربط ہو وہ بالفعل قائم ہو جاتا ہے۔ اس وقت خدا کا تصور آدمی کی فکر و نظر میں اس طرح سما جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کو خدا کی یاد دلانے والی بن جاتی ہے۔ اس پر ایسے لمحات گزرتے ہیں جب خدا کے سوا اور کوئی چیز اس کے سامنے نہیں ہوتی وہ شوق اور اشتیاق کے شدید جذبات کے ساتھ خدا کی طرف لپکنے لگتا ہے۔ اس کو ایسی کیفیت سے بھری ہوئی دعائیں نصیب ہوتی ہیں جیسے کہ وہ عین اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہو۔ اسکو ایسے سجدے نصیب ہوتے ہیں جب ایسا محسوس ہوتا ہو کہ اس نے اپنا سر اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے اور اس کے آگے زمین پر پڑا ہوا ہے، اس کو ایسے اعمال کی توفیق ملتی ہے گویا کہ وہ عین خدا کے حضور میں ہے اور اس کی خوشنودی کے لئے سرگرم ہے ـــــ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب بندگی اپنے انتہائی معراج پر پہونچ جاتی ہو۔ اس وقت بندہ جسمانی اعتبار سے خدا سے دور ہونے کے باوجود، اپنے احساس کے اعتبار سے خدا کے قریب ہو جاتا ہے، نہ دیکھنے کے باوجود وہ خدا کو دیکھنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہو کہ اس حدیث میں عبادت کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔ پہلا اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بندے کے قلب و روح پر خدا کا خیال اس طرح چھا جائے کہ اس پر حضوری

کی کیفیت طاری ہونے لگے، اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اس تصور کو جمائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اسی تصور کے تحت خدا کی عبادت کرے۔ اسی لئے حدیث کے پہلے ٹکڑے میں "رؤیت" کی نسبت بندے کی طرف کی گئی ہے اور دوسرے ٹکڑے میں رؤیت کی نسبت خدا کی طرف۔ اس اعتبار سے فقرے کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کیا ہے۔ انھوں نے اس حدیث میں عبادت کے "دو مراتب" مراد لئے ہیں۔ ایک "اعلیٰ" اور دوسرا اس سے "فروتر"۔ "مرتبہ اعلیٰ یہ کہ بندہ ــــ در مشاہدۂ معبود و حضور ذات اقدس وے مستغرق باشد" اور اس سے فروتر مرتبہ "آگاہ بودن است از نظر الٰہی و علم وے تعالیٰ بحال بندہ"۔ اس کے بعد انہوں نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

احسان عبادت کردن است خدا تعالیٰ را چناں کہ گویا می بینی اورا، پس اگر نیستی تو بایں حال کہ گویا می بینی اورا، عبادت کن اورا بایں صفت کہ حاضر باشی از یں کہ می بیند وے ترا دریں صورت اشعۃ اللمعات، جلد اول صفحہ ۳۵	احسان کا مطلب خدا کی عبادت اس طرح کرنا ہے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تمھاری یہ کیفیت نہ ہو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، تو تم اس طرح عبادت کرو کہ یہ خیال تمھارے ذہن میں موجود رہے کہ خدا تم کو عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

اشار فی الجواب الی حالتین: ارفعھا ان یغلب علیہ مشاھدۃ الحق بقلبہ حتی کانہ یراہ بعینہ ...... والثانیۃ ان یستحضر ان الحق مطلع علیہ یری کل ما یعمل فتح الباری، جلد اول صفحہ ۱۱۱	"احسان کیا ہے" کے سوال کا جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے اس میں دو حالتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ ان میں بلند حالت یہ ہے کہ عابد کے دل پر مشاہدۂ حق کا اس قدر غلبہ ہو گویا کہ وہ اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ رہا ہو۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس خیال کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے کہ خدا اس سے باخبر ہے اور وہ اس کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اوپر جو چند مثالیں میں نے دیں، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کے ساتھ معرفت کس قدر ضروری ہے۔ اگر معرفت یا دوسرے لفظوں میں اشیاء کی پہچان نہ پیدا ہوئی ہو اور آدمی کو ان حقیقتوں سے آشنا ہونے کا موقع نہ ملا ہو تو محض علم کافی نہیں ہو سکتا۔ ظاہری معلومات رکھنے کے باوجود آدمی طرح طرح کی بے خبری میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے مگر نہیں دیکھتا، وہ پڑھتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔

علم حقیقت میں وہی علم ہے جس کے ساتھ معرفت کی گہرائیاں شامل ہوں۔ جس نے "غم" کا لفظ ڈکشنری میں دیکھا ہو، مگر اس کو تڑپنا نصیب نہیں ہوا، وہ غم کا مطلب نہیں جانتا، ایسا شخص بس ترجمہ کرنے والی مشین ہے جو ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں دہرا دیتی ہے، مگر نہیں جانتی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ جس نے کتاب الٰہی میں لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ پڑھا، مگر قرآن نے خود اس کے اوپر نازل ہو کر اس کے دل کے ٹکڑے نہیں کئے، وہ نہیں جانتا کہ اس آیت میں کون سی حقیقت بتائی گئی ہے۔ جس نے اسلام کے معاشی قوانین پر عبور حاصل کر لیا، مگر اس پر ابھی ایسا معاشی واقعہ نہیں گزرا کہ وہ ایک صاحب حاجت کو اپنی جیب کے پیسے دے، اور دوسری طرف اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں والذین یؤتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ کی تفسیر جھلک رہی ہو، اس وقت تک وہ اسلام کی معاشیات سے بے خبر ہے۔ جس نے نماز کے مسائل جان لئے مگر نماز سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی نہیں ہوئیں، نماز اس کے لئے خدا سے سرگوشی نہیں بنی، وہ ابھی نماز سے نا آشنا ہے۔ جس نے حدیث کی کتابیں ختم کر ڈالیں، مگر اس کے آنسوؤں نے کتاب کے اوراق نم نہیں کئے، وہ حدیث کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ جس کو دنیا نے اسلام کے مقرر کا خطاب دیا ہے، اس کی تقریر اس وقت تک اسلامی تقریر نہیں بنتی جب تک وہ خدا سے دعاؤں اور التجاؤں کے نتیجے میں نہ ابلی ہو۔ جس کو لوگ اسلام کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہوں، اس کی تصنیف اس وقت تک اسلامی تصنیف نہیں ہے جب تک اس پر یہ حالت نہ گزری ہو کہ وہ بے قرار ہو کر سجدے میں سر رکھدے اور کہے کہ خدایا! تو میرا قلم بن جا جس سے میں لکھوں، تو میرا دماغ بن جا جس سے میں سوچوں۔

جاننے والو! جانو، کیوں کہ تم ابھی نہیں جانتے، پڑھنے والو! پڑھو، کیوں کہ تم نے ابھی نہیں پڑھا۔

امت مسلمہ کا مقام و منصب

اُس کا

موجودہ مرض اور علاج

(از :- مولانا محمد تقی امینی)

یہ مقالہ مولانا موصوف نے ایک ملی اجتماع میں پڑھنے کے لئے لکھا تھا لیکن بعض اہم مصروفیتوں کی وجہ سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے سفر نہیں کیا جا سکا، اس لئے نہ وہ وہاں پڑھا جا سکا اور نہ اس کی اشاعت کی نوبت آئی۔ اب اس کا تمہیدی حصہ جو اس اجتماع کی خصوصیات سے متعلق تھا حذف کر کے اس کو ہدیۂ ناظرین الفرقان کیا جا رہا ہے۔

ایڈیٹر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کے نام سے جس نئی قوم کی تنظیم فرمائی تھی وہ نہ رنگ و نسل کی بنیاد پر تھی اور نہ زبان و وطن کی بنیاد پر۔

اس سے آپؐ کا مقصد نہ کھانے پینے والی قوموں میں ایک اور قوم کا اضافہ تھا اور نہ بھوکی ننگی آبادی میں ایک اور آبادی کو بڑھانا تھا۔

بلکہ اس امت کی یہ نئی تشکیل و تنظیم محض اس لئے تھی کہ زندگی میں نورانی صفات پیدا کرے اور اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ سسکتی ہوئی انسانیت اور دکھ کی ماری دنیا پر یہ واضح کر دے کہ

اگر اس کو جام حیات کی تلاش ہے اور نسخۂ شفا کی ضرورت ہے تو یہ اسی راستہ پر چلنے سے حاصل ہو سکتے ہیں جس پر یہ چل رہی ہے۔

رسول اللہ کی زندگی اس کے لئے نمونہ تھی اور یہ ساری دنیا کے لئے نمونہ بن کر آئی تھی جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۱۴۱ (پ۲)

اسی طرح ہم نے تمہیں نہایت معتدل امت بنایا تاکہ تمام انسانوں کے لئے (سچائی) کی شہادت دینے والے تم ہو اور تمہارے لئے اللہ کا رسول شہادت دینے والا ہو

اس نمونہ والی جماعت کو جو کچھ حاصل ہوا وہ بھی سن لیجئے۔

ایک طرف اس کا دل اللہ کی جلوہ گاہ بنا۔

لا یسعنی الا قلب مومن (الحدیث)

میری سمائی بجز قلب مومن کے اور کہیں نہیں ہو سکتی ہے۔

اس کی نگاہ میں اللہ کا نور سمایا۔

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ۔

(الحدیث)

مومن کی فراست سے ہوشیار رہو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

اس کی زندگی میں اللہ کی صفات کا "پرتو" پڑا۔

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ۔ (الحدیث)

اللہ جیسے اخلاق پیدا کرو۔

اور دوسری طرف اللہ نے اپنے وعدہ کے مطابق صلاحیت و کارکردگی کی بنا پر وہ سب کچھ عطا فرمایا جو زیادہ سے زیادہ کسی قوم کو کبھی دیا گیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سو سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اس نئی قوم نے مشرق میں سندھ و چینی ترکستان تک اور مغرب میں ہسپانیہ تک اپنے انتظام میں لے لیا۔

علوم و فنون کی ترقی کے لحاظ سے مدتوں ساری دنیا پر اپنی فوقیت و برتری کا سکہ چلایا اور ذہنی و دماغی لحاظ سے صدیوں ایسی حکومت کی کہ اپنے پاور ہاؤس سے پرانی دنیا کے تینوں براعظموں کو روشنی پہونچاتی رہی (امریکہ کی دریافت بعد میں ہوئی ہے)

نمود اس کی، نمود تیری، نمود اس کی
خدا کو تو آشکار کر دے، خدا تجھے آشکار کر دے

لیکن آج یہ وہی قوم ہے جس کا دل غبار آلود اور آنکھیں بے نور ہیں۔ جسکا دماغ جامد اور بازو شل ہیں۔ اس کی زندگی کا قافلہ لٹ چکا ہے اور کوئی خبر لینے والا نہیں ہے۔ اس پر فلاکت وادبار مسلط ہے اور کوئی آگاہ کرنے والا نہیں ہے، وہ موت کی نیند سو رہی ہے اور کوئی جگانے والا نہیں ہے۔ وہ خواب و خیال کی دنیا میں گم ہے اور کوئی احساس دلانے والا نہیں ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

حضرات! اس صورت حال سے سرسری نہ گذر جایئے بلکہ اس کا حل اس ماہر طبیب (رسول اللہؐ) کی تعلیم میں تلاش کیجئے، جو مردہ قوموں کو زندہ کرنے اور بیمار قوموں کو شفا دینے کے لئے آیا تھا۔ اور وہی دوا اور غذا استعمال کیجئے جو وحی الٰہی کی روشنی میں مریض کے مزاج کی رعایت اور موسم کی حرارت و برودت کے لحاظ سے تجویز کی گئی تھی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک ایسا دور آئے گا کہ دنیا کی دوسری قومیں امت مسلمہ پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے کے برتن میں "تر نوالہ" کیلئے بھوکوں کے ہاتھ پڑتے ہیں۔ صحابہ کرام نے سوال کیا یا رسول اللہ کیا ہم لوگ اس وقت تعداد میں تھوڑے ہوں گے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا "نہیں" بلکہ تم لوگ زیادہ ہوگے لیکن "جھاگ" کی طرح بے وزن ہو جاؤگے۔

صحابہؓ نے پوچھا ہماری یہ حالت کیوں ہو جائے گی؟ آپؐ نے فرمایا، تم میں "وَهْن" پیدا ہو جائے گا، سوال کیا گیا وَمَا الْوَهْنُ (وہن کیا چیز ہے) آپ نے فرمایا۔

حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ [1]

(دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری ۔)

یعنی تمہیں دنیا سے رغبت ومحبت پیدا ہو جائے گی جس سے عزم وہمت اور ایثار وقربانی کے کام نہ ہو سکے پائیں گے اور موت سے ناگواری اور کراہیت پیدا ہونے لگے گی جس کی بنا پر اعلاء کلمۃ اللہ اور حق کی سربلندی کی راہ میں جانبازی کا جوہر باقی نہیں رہے گا۔

امت مسلمہ کے مرض کی یہ تشخیص ایسے "طبیب" کی ہے جس کے پرواز کی ابتدا وہاں سے ہوتی تھی جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے۔ اور تجویز وتشخیص کے ہر مرحلہ میں وہ کائنات کے خالق و مالک سے رہنمائی حاصل کرتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس میں نہ غلطی کا احتمال ہو سکتا اور نہ ہوا وہوس کے دخل انداز ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم)

آپؐ جو بولتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے۔ اپنی خواہش سے آپؐ کچھ نہیں بولتے ہیں۔

مذکورہ تشخیص سے اس مغالطے میں پڑنے کی گنجائش نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدانخواستہ امت مسلمہ کو تارک الدنیا بنا کر بھوکوں اور ننگوں کی ایک "کالونی" آباد کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ مذہب اسلام کی غلط ترجمانی سے کبھی اس کا شبہ ہوتا ہے۔ آپؐ کا مقصد دنیا سے بے رغبت بنا کر عزم وشجاعت اور اقدام کے جذبات کو ابھارنا تھا تاکہ اہل دنیا دیکھ لیں کہ جس کو انھوں نے اپنی توجہات کا مرکز سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس با مقصد جماعت کی نظر میں اس قابل بھی نہیں ہے کہ وہ اس کو منہ لگائے اور اپنے دل میں جگہ دے بلکہ اس کا مطمح نظر اور نصب العین اس سے بہت بلند ہے۔

کیا اتنی موٹی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جس مکان کا مکین دنیا کا خالق و مالک ہو دنیا خود اس کے گرد چکر لگانے اور اس کے پاس رہنے میں اپنی عزت وسعادت سمجھے گی اس کا احسان

---

[1] ابو داؤد بیہقی ۔ مشکوٰۃ باب تغیر الناس ۔

نہ ہوگا کہ وہ ہمارے پاس آئی ہے بلکہ ہمارا احسان ہوگا کہ ہم نے اس کو اپنے پاس جگہ دی۔

غرض ترک دنیا اور شے ہے اور دنیا سے بے رغبتی اس سے بالکل مختلف شئی ہے کسی عارفؒ نے اس حقیقت کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد
اگر دارد برائے دوست دارد

محترم حضرات! مرض کی طرف ٹھیک نشاندہی ہو جانے کے بعد اب اس کے علاج کی طرف توجہ دیجئے۔ باہر کی کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جس حاذق طبیبؐ نے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے اسی نے مزاج کی مناسبت سے گرمی سردی کا لحاظ کرکے آپ کے لئے نسخۂ شفا بھی مہیا کیا ہے۔ اس کو استعمال کیجئے اور پھر دیکھئے کس طرح مردہ جسم میں جان پڑتی ہے۔؟

پہلے نسخہ کو سمجھ لیجئے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (پ۱۳)

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا تو اپنی سمائی کے مطابق وادیاں بہہ نکلیں۔ اور میل کچیل سے جھاگ بن بن کر پانی کی سطح پر اٹھا تو سیلاب کی رو اسے بہا لے گئی اور اسی طرح کا جھاگ (میل کچیل) اس وقت بھی اٹھتا ہے جب لوگ زیور یا کوئی اور چیز بنانے کے لئے دھاتوں کو آگ میں تپاتے ہیں، حق اور باطل کے معاملہ کی مثال ایسی ہی سمجھو جو اللہ بیان کر دیتا ہے بس (میل کچیل کا) جھاگ (تو کسی کام کا نہیں ہوتا) رائیگاں جاتا ہے اور جس چیز میں انسان

کے لئے نفع ہوتا ہے وہ زمین میں رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ (لوگوں کی سمجھ بوجھ کے لئے) مثالیں بیان کر دیتا ہے۔

پانی، سونا، چاندی اور دوسری دھاتیں چونکہ انسانوں کے کام آنے والی اور نفع دینے والی چیزیں ہیں اس لئے وہ باقی رہتی ہیں اور اوپر آئی ہوئی "جھاگ" چونکہ غیر نافع اور بے سود ہے اس لئے وہ فنا ہو جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ دنیا میں مجموعی حیثیت سے جو نافع ہوتا ہے اس کو پائداری حاصل ہوتی ہے اور جو غیر نافع ہوتا ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے (بقائے انفع کا یہی مطلب ہے)

اس کے بعد قرآن حکیم نے وہ اعمال و اخلاق گنائے ہیں جن سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہونچتا ہے اور یہ اشارہ کیا ہے کہ قیام و بقا کا اصل سنگ بنیاد انہی اعمال و اخلاق پر رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اخلاق ہی کی شان ایسی ہے جس میں مالک تعالےٰ کی نیابت کا رنگ پایا جاتا ہے اور جو قوم اپنی زندگی میں نیابت کی شان پیدا کرے گی اسی کو کائنات کی امانت سپرد ہوگی اور وہی حقیقی معنوں میں اللہ کی مخلوق کے لئے نافع بنے گی۔

جن اخلاقی اوصاف کا تذکرہ قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر ملتا ہے ان کی تفصیل یہ ہے ——

اطاعت حق، ضمیر کی آزادی، شجاعت و بہادری، سچائی، انصاف، رحم، رواداری، ایفائے عہد، امانت و دیانت، عفو و درگذر، دشمن سے اچھا برتاؤ، مساوات، ایثار و قربانی توکل و اعتماد، اطمینان و خودداری۔ شیریں کلامی۔ میانہ روی۔ عزم و استقلال، امید و پیش بینی۔ احتساب نفس، ذمہ داری کا احساس، ہر کام میں ایمانداری، حیا و شرافت، عفت و پاک دامنی، محبت و مروت، صبر و ثبات۔ اخلاص و بے نفسی، نیکی سے الفت اور برائیوں سے نفرت، بے غرضی کے ساتھ دوسروں کی خدمت کا جذبہ وغیرہ۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وحی الٰہی جس قسم کا اخلاق قوم میں پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اور جس پر وہ ترقی کی بنیاد رکھتی ہے اس کی حیثیت اس اخلاق جیسی نہیں ہے جو قومی ترقی و سربلندی کے لئے صرف قومی پیمانہ پر اپنایا جاتا ہے کہ اس کا اثر صرف اپنی قوم کے دائرہ تک محدود ہوتا

ہے اور دوسری قوموں کے لئے وحشت و بربریت کا مظاہرہ بدستور جاری رہتا ہے۔ بلکہ یہ اخلاق عالمگیر افادیت اور عمومی رحمت پر مبنی ہونے کے ساتھ اس نظریہ کے ماتحت ہے کہ۔

الخلق کلھم عیال للّٰہ۔　　کل مخلوق اللہ کی عیال ہے۔

(الحدیث)

النّاس کلھم اخوۃ۔　　تمام لوگ بھائی بھائی ہیں۔

(الحدیث)

یہ اخلاق روحانی ضرورت اور ایمانی تقاضوں کے طور پر اپنایا جاتا ہے اور ربانیت الٰہی کی شان پیدا کرتا ہے اور قومی اخلاق مصلحت اور پالیسی اور قومی عصبیت و منافرت کے پیمانہ پر قبول کیا جاتا ہے اور دوسروں سے نفرت و حقارت کی تخم ریزی کرتا ہے۔ اِس کی بنیاد خدا پرستی و روحانی پاکیزگی پر ہوتی ہے اور اُس کی بنیاد قوم پرستی و وطن پرستی پر رکھی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں کی وسعت و گہرائی میں کس قدر فرق ہوگا؟ اور دونوں کی افادیت میں کتنا نمایاں تفاوت ہوگا؟——

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری "مردنی و شکستگی" کو دور کرنے کے لئے اور قیام بقاء کی جدوجہد میں کامیاب بنانے کے لئے جو نسخہ مہیا فرمایا ہے اس میں انھیں اعمال و اخلاق کو مرکزیت حاصل ہے جن کے ذریعہ ہم اللہ کی مخلوق کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکیں اور ہمارے اندر ایثار و قربانی کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ خود کو فنا کر کے دوسروں کے بقاء کا سامان فراہم کریں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی　　تم کمال نیکی نہیں حاصل کر سکتے ہو
تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ　　یہاں تک کہ اپنی محبوب ترین چیزیں خرچ کرو

بدقسمتی سے بلند و بانگ دعووں کے باوجود عرصہ سے مذہب کی نمائندگی جس قسم کی ہو رہی ہے اس میں وہی اعمال و اخلاق نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ جن کا تعلق "نافع" بننے اور رہنانے سے ہے اور جو قیام و بقاء کے لئے ناگزیر ہیں۔

اس دور میں اگر واقعی مذہب کی خدمت کرنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس کی افادیت وصلاحیت کے پہلو کو عملاً اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ وہ اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو واپس لانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اور پھر اس کے ماننے والوں کا جو حشر ہوگا وہ حقیقت بیں نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ دراصل دنیا ایک باغ ہے اور مالک کے سامنے باغ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کا ایک نقشہ اور خاکہ ہے۔ مالک کو ایک ایسے باغباں کی تلاش ہے کہ جس نے اس نقشہ کے مطابق باغ کو مفید بنانے کی مشق کی ہو، جب تک ایسا باغباں نہ ملے گا عارضی طور پر حسب حیثیت وصلاحیت باغ کی سپردگی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اگر منشار کے مطابق باغباں مل جائے گا تو حق صاحب حق تک پہونچانے میں تامل نہ ہوگا۔

حقیقی مذہب میں مالک کی منشار کے مطابق باغ کی بناوٹ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اب یہ مذہب کے ماننے والوں کا کام ہے کہ باغبانی کی صحیح تربیت حاصل کر کے اس منشاء کو پورا کریں اور مالک کے روبرو اس انداز سے پیش ہوں کہ وہ اپنے وعدہ واعلان کے مطابق خوش آمدید کہنے میں مسرت محسوس کرے۔

"باغ" کو مقصود نہ بنائیں بلکہ منشار کے مطابق باغبانی کے فرائض انجام دے کر اس کو مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھیں۔ اگر بالفرض قیام و بقار کی جدوجہد میں باغبانی یا باغ کو مقصود بنا لیا گیا تو زندگی کی تربیت نہ ہو سکے گی اور آزمائش کی کسوٹی پر آنے کے بعد ہی اندر کی اصل حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اپنے فرائض ادا کرنے اور اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسئلہ اجتہاد کا ایک تحلیلی جائزہ

اور

مستقبل میں اس کا کردار

از ــــــ استاذ مصطفیٰ احمد الزرقاء (دمشق)
ترجمہ ــــــ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی فقہ میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اجتہاد نے اس خلاء کو پر کیا، اور اس طرح شریعت محمدی کی خدمت میں اس نے اپنا بہترین کردار ادا کیا۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو قرآن کریم کی کئی سو آیتیں اور اسی طرح کئی سو حدیثیں احکام سے متعلق موجود تھیں۔ قرآن و حدیث کے یہ نصوص اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں تھے، مگر ان میں عمومیت، لچک اور مسائل کا استیعاب، ان کی علت کا بیان اور شریعت کے بنیادی اور اہم اصول کا اثبات کچھ اس طرح پایا جاتا تھا کہ ان سے فقہ اسلامی اور اجتہاد کے لئے قواعد اور قانونی نظریات و احکام کے مستنبط کرنے میں بڑی مدد ملی بلکہ وہ اجتہاد کے لئے ایک بہترین بنیادی پتھر ثابت ہوئے ــــــ

مثال کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیت۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ‏ اے ایمان والو اپنے عہدوں اور قول و قرار کو پورا کرو۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد۔

لا ضرر ولا ضرار۔ نہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ ضرر کا مقابلہ ضرر پہنچا کے کیا جائے

"ضرار" کا مطلب یہ ہے کہ ضرر کا مقابلہ ضرر سے کیا جائے، یعنی اگر کسی نے کسی کا کوئی مال تلف کر دیا تو اس کے مقابل میں ضرر پہونچانے والے کے مال کو تلف نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کے عوض میں تلف شدہ مال کا بدل جو اس کے برابر ہو دلوایا جائے گا۔ اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے یہ تین دور ایسے گذرے ہیں جن میں مجتہدین و فقہاء جزیرۂ عرب اور دوسرے تمام مفتوح اسلامی ملکوں میں بکثرت موجود تھے۔ اور احکام و مسائل کے استنباط کرنے، نصوص کے سمجھنے اور ان پر نئے حالات کو منطبق کرنے میں ان تمام مجتہدین کے کچھ خاص اصول و نظریات تھے جو کبھی ایک دوسرے سے متفق اور کبھی مختلف ہوتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں ادوار میں جتنے مجتہدین اور فقہاء پیدا ہوئے تقریباً اتنے ہی اجتہادی مذاہب بھی سامنے آئے۔ اس لئے کہ ہر مجتہد کا ایک مسلک تھا جو شرعی مسائل میں اس کے فقہی نظریات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یعنی ہر مذہب شریعت کے تمام مباحث و مسائل میں ایک مکمل شرعی قانون کا حامل ہوتا تھا۔

ان فقہی مذاہب میں بعض مذاہب کے ماننے والے جب مفقود ہو گئے تو عملی دنیا میں ان مذاہب کا بھی خاتمہ ہو گیا اور بجز کچھ متفرق مسائل کے جو فقہی اختلافات کی کتابوں میں نقل کئے جاتے ہیں ان مذاہب میں سے کچھ بھی باقی نہیں ہے لیکن جن مذاہب کے ماننے والے زیادہ پائے گئے اور انھوں نے اپنے مذاہب کے اماموں سے جو کچھ سنا اور سیکھا تھا اس کو محفوظ رکھا اور اس کو مدون کیا اور اس کو حسب ضرورت پھیلا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تو لوگوں نے اس کو پوری عقیدت سے سیکھا، اور ان مذاہب کو دوام حاصل ہوا۔ اور نسلاً بعد نسلٍ ان کی تدوین و توسیع ہوتی رہی، میری مراد ان سے مذاہب اربعہ ہیں۔

پھر یوں جوں ان اجتہادی مذاہب کو استقرار و کمال حاصل ہوتا گیا اور ان کی فقہی تصنیفات بڑھتی گئیں اور زمانے کے ساتھ بتدریج مسلمانوں کی بڑی تعداد شریعت اور لغت کے ان علوم میں کمال اور تبحر حاصل کرنے سے دور ہوتی گئی جن سے اجتہاد کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ ان مذاہب اربعہ کے مقلدین اور ان کے ماننے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ اور عباسی دور کے عروج کے بعد سے عالم اسلام کے تمام اقطار میں انہی مذاہب میں سے کسی ایک کو سیادت و برتری حاصل ہوتی رہی اور اسی کے قاضی اور مفتی رہے۔

رفتہ رفتہ ان مذاہب اربعہ میں ان کے اکابر علماء کی کوششوں سے تفریع و تخریج اور تصنیفات کا سلسلہ بڑھتا رہا اور وہ اس حد پر پہونچ گیا کہ ان مذاہب کے متبعین نے دیکھا کہ بقدر ضرورت یہ کام انجام پا گیا اور اجتہاد مطلق کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ بہت ہی نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ تو اس بات کا اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں جمہور امت کی قوت تمیز اتنی مدھم نہ پڑ جائے کہ وہ اجتہاد کی صلاحیت اور اس کے شرائط کو نہ سمجھ سکے اور نا اہل بھی ان کے سامنے اجتہاد کا دعوی کر کے انھیں دھوکے میں ڈال سکیں اور ان کے دین میں خلل اور فساد پیدا کر دیں۔ اسی اندیشہ کے ماتحت ان مذاہب کے علماء نے چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد مطلق کا دروازہ بند کئے جانے کا فتوی دے دیا۔

لیکن ان مذاہب کے اصول کے ضمن میں اجتہاد مقید کا سلسلہ جاری رہا اور بڑے بڑے علماء مختلف زمانوں میں اپنے اصول فقہ کے مطابق نئے مسائل کے اجتہادی حل پیش کرتے رہے۔ جن میں وہ زیادہ تر اپنے مذاہب کے مسائل پر قیاس یا استحسان یا مصالح مرسلہ کے اصول سے استدلال و استناد کرتے رہے۔

چنانچہ اسی طریقہ سے پانچویں صدی ہجری میں سود کی مشکلات سے نجات پانے کے لئے مذہب حنفی میں بیع وفا کے احکام جاری کئے گئے۔ اسی طرح بعض مذاہب کے متاخرین فقہاء نے ایسے قرضدار کے وقف اور اس کے تمام تصرفات مالی کے عدم نفاذ کا فتوی دیا جس کا قرض اس کے تمام املاک و اموال پر حاوی ہو، جب تک کہ قرضخواہ اس بات پر راضی نہ ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرضدار اس طریقہ سے وقف یا ہبہ کو حیلہ بنا کر قرضخواہ سے اپنے اموال و املاک کو بچانے کی کوشش نہ کرے۔ ایسے استحسانی مسائل کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

لیکن یہ اجتہاد مقید بھی صلاحیتوں کے انحطاط اور علمی سطح کے گرنے کی وجہ سے زمانے کے ساتھ ساتھ مدھم پڑتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ اسلامی اپنے اس آخری دور میں کسی بھی نئی بحث اور نئے مسائل کے بیان کرنے سے قاصر رہی، اور محض پرانے مسائل و مباحث کا حفظ و تکرار بن کر رہ گئی اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ بہت سے علماء اور فقہاء نے فقہ کی تعلیم میں مذہبی آراء و احکام کی دلیلوں سے بحث کرنا بھی ایک ناپسندیدہ امر تصور کیا۔

ادھر عثمانی دور کے اواخر سے یہ بات دیکھی جا رہی ہے کہ عالم اسلام کے ارباب حکومت یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلامی شریعت اور فقہ ملک کی اس لازمی قانون سازی کے سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے جو ہمہ دم بدلنے والے اور تغیر پذیر عصری تقاضوں کی تنظیم کے لئے ضروری ہے، اسی خیال کے ماتحت انھوں نے بلا تکلف غیر اسلامی قوانین کو اپنانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں فقہ اسلامی بے اعتنائی کا شکار ہو گئی۔ اور تمام طبقوں میں وہ علم و عمل دونوں لحاظ سے دفن ہو کر رہ گئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نتیجہ کے آثار ابن قیمؒ کے زمانے ہی میں ظاہر ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" اور "اعلام الموقعین" میں ایک وسیع نفسیاتی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس گفتگو میں اہل مذاہب کے جمود اور شریعت کے سرچشموں اور اس کے وسیع آفاق کو تنگ کرنے پر تنقید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اہل مذاہب کی اس تنگ نظری نے سربراہان حکومت، امراء اور بادشاہوں کو وقتی اور غیر اسلامی قوانین کے نافذ کرنے پر مجبور کیا، اس لئے کہ فقہی احکام کو انھوں نے اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ وہ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ تنگ نظری شریعت میں نہیں ہے بلکہ خود اہل مذاہب تنگ نظر ہیں۔

اب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اجتہاد کے دروازے کا بند کرنا ایک بڑا سانحہ تھا جو اسلامی شریعت اور اس کی فقہ کے ساتھ پیش آیا۔

اجتہاد کے دروازے کو بند کرنا دراصل کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے جب تک کہ اسلام اپنی خصوصیات کے ساتھ قائم ہے، یہاں تک کہ مذاہب اربعہ کے بالغ النظر متاخر علماء اپنی کتابوں

میں یہ تصریح کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کے مرتبہ کو پہونچ گیا بایں طور کہ اس کے تمام شرائط اور صلاحیتیں اس کے اندر موجود ہیں تو اس کے لئے کسی خاص مذہب کی تقلید کرنا روا نہیں ہے لیکن عملاً یہ لوگ بھی کسی کے لئے اس طریقہ تک پہونچنا تسلیم نہیں کرتے۔

یعنی اجتہاد کے دروازے کو کھولنا ان کے نزدیک ممنوع نہیں ہے۔ البتہ اس کے قفل کی کنجی ان کی نظر میں مفقود ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے جلیل الشان شافعی المسلک فقیہ علامہ عزالدین بن عبد السلام کہتے ہیں کہ ـــــ

"لوگوں نے اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے پر کئی طرح سے کلام کیا ہے، حالانکہ یہ سارے اقوال لغو ہیں، صحیح یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا نیا مسئلہ پیش آتا ہے جس کے متعلق کوئی نص صریح موجود نہیں ہے یا اس میں اسلاف کے مابین اختلاف ہے تو اس مسئلہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہتا ہے تو بلا شبہ وہ بکواس ہے۔ [۱]

اس مسئلہ پر منصفانہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے بلکہ اجتہاد موقوف ہو گیا ہے۔ ہم ایک تحلیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں جو ماضی میں اجتہاد کے مزاج و کردار اور اس کی نوعیت پر مشتمل ہے۔

ماضی میں اجتہاد کی نوعیت اور اس کا مزاج۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اجتہاد کا امتیازی وصف شوریٰ تھا۔ یعنی مشورہ سے مسائل کو حل کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سارے قانون اور سیاسی اہم مسائل میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کرتے تھے اور ان مسائل کے سیاسی اور شرعی حل کے سلسلہ میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ وہ لوگ قرآن کریم کی آیت شوریٰ کی رہنمائی میں جو تمام امور میں شوریٰ کی ہدایت

---

[۱] رسالۃ الاجتہاد والتقلید ـــ از شیخ عبدالوہاب الخلاف ص ۱۲

دیتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرتے تھے جو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے جب کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے متعلق کوئی نص صریح کتاب و سنت میں موجود نہ ہو تو وہ کیا کریں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اہل علم کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرو۔ اور کسی ایک فرد کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

پھر بعد کی صدیوں میں اجتہاد انفرادی ہو گیا۔ یعنی ہر مجتہد اپنے اجتہاد میں خود اپنی مستقل رائے رکھنے لگا۔ وہ اپنی فہم و فراست کے مطابق مسائل کا استنباط کرتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرام اسلامی فتوحات کے بعد مختلف ملکوں میں پھیل گئے، جس کی وجہ سے ان کا اکٹھا ہونا اور آپس میں مشورہ کرنا بہت دشوار ہو گیا۔

اجتہاد کے ماضی پر غور کرتے ہوئے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں لوگ چونکہ اسلام سے نئے نئے متعارف ہوئے تھے اور اس کا اثر ان کے دلوں پر بالکل تازہ تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تیسری صدی میں برابر تعلیم و تعلم اور روایت کے ذریعہ لوگوں تک منتقل ہوتی رہیں، اس لئے ایک بہت بڑی تعداد قرآن و حدیث کے مطالعہ اور تفقہ فی الدین نیز عربی زبان سیکھنے میں اپنی زندگی وقف کئے ہوئے تھی اور وہ اس میدان میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لئے انتہائی محنتیں کرتے تھے، اور پوری پوری عمریں علم کی تحصیل میں گزار دیتے تھے۔ اس لئے علماء میں اہل و نااہل اور اجتہاد کے حقدار اور ناحق دار اور مدعی کے قابل و ناقابل کا پہچانا جانا اس زمانہ میں آسان تھا، لیکن زمانہ جوں جوں گذرتا گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد جو مشعل اسلام اور مینارۂ نور تھا۔ دور ہوتا گیا۔ اور عالم و غیر عالم کے درمیان بہت کم تفاوت باقی رہ گیا۔ اور لوگوں کی صلاحیتوں اور ان کی علمی استعداد میں کمی واقع ہوگئی تو چوتھی صدی ہجری میں اہل مذاہب کو اس بات کا اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ایسے لوگ نہ پیدا ہو جائیں جو اجتہاد کا جھوٹا دعویٰ کر کے گمراہی اور دین میں تحریف و بدعات کے پیدا ہونے اور پھیلنے کا موجب بنیں اور شریعت کے اصول و قواعد میں فساد برپا کریں، اسی بناء پر انھوں نے اس زمانے میں رائج مذاہب اربعہ کے مسائل و مباحث

کو ضرورت کے لئے کافی سمجھتے ہوئے اجتہاد کا دروازہ بند ہوجانے کا فتویٰ صادر کیا۔

ماضی میں اجتہاد کے مزاج اور اس کے کام کے اس مختصر تجزیہ کی روشنی میں ہم آسانی کیساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انفرادی اجتہاد کا کام جو فقہ اسلامی کی تاسیس کے ابتدائی دور میں اس زمانہ کے مجتہدین کے ہاتھوں انجام پایا۔ وہ اس امت کے لئے بڑے خیر کا باعث بنا اس لئے کہ اس کی وجہ سے امت کے عزائم بلند ہوئے، اس کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اور اساطین علم وفقہ نے شریعت کے نصوص وقواعد کی روشنی میں قانونی نظریات کی تاسیس اور قواعد کے استنباط میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں پوری محنتیں کیں، جس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ تھا کہ فقہی مسائل ومباحث کا ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آگیا جس میں اصول ونظریات اور جزئی احکام سبھی کچھ موجود تھا۔ اس ذخیرہ نے ہمیشہ کے لئے ایک ایسا فقہی سرچشمہ عطا کیا جس کی مثال کسی قوم اور امت میں نہیں مل سکتی اور اگر یہ انفرادی اجتہاد ابتدائی تین صدیوں میں نہ انجام پاتا تو اتنے بڑے فقہی سرمایہ کا وجود بالکل ناممکن تھا۔

پھر یہ بھی ایک بہت بڑی مصلحت تھی کہ اس کے بعد انفرادی اجتہاد کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ تاکہ اس کی وجہ سے جو اندیشے پیدا ہو گئے تھے، وہ دور ہو جائیں اور فقہ وشریعت کا معاملہ افراتفری اور لاقانونیت کا شکار ہو کر نہ رہ جائے۔ البتہ غلطی صرف یہ ہو گئی کہ اجتہاد کو مطلقاً موقوف کر دیا گیا۔ جو شریعت اور فقہ اسلامی پر تنگ نظری اور جمود کے الزام کا باعث بنا، اس لئے یہ ضروری تھا کہ اجتہاد کی اس لاقانونیت کو دفع کرنے کے لئے اجتہاد کی حرمت کا فتویٰ نہ دیا جاتا۔ بلکہ اس کو افراد کے ہاتھوں سے لے کر جماعت کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا جاتا۔ اور اس کی تنظیم کی جاتی۔ اجتہاد کا یہی وہ کردار ہے جو مستقبل میں لازمی طور پر اس کو انجام دینا ہوگا۔

مستقبل میں اجتہاد کا کردار۔

اجتہاد کے بارے میں ماضی کی تاریخ اور اس کی غلطیوں کو جان لینے کے بعد مستقبل میں اجتہاد کا واجبی کردار بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اگر ماضی میں انفرادی اجتہاد ماضی کی ایک ضرورت تھی تو آج انفرادی اجتہاد ایک بہت

بڑا اثر رہے ۔ اس لئے کہ چوتھی صدی ہجری میں انفرادی اجتہاد کی وجہ سے جن خطرات کے واقع ہونے کا اندیشہ تھا وہ آج نہ صرف موجود ہیں بلکہ اب وہ ایک امر واقع بن چکا ہے۔

چنانچہ دین کی سوداگری کرنے والے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو خوب پڑھے لکھے ہیں بلکہ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو علم و مطالعہ اور تحریر و تقریر میں شاید صالح اور متقی علماءِ دین کے مقابلہ میں بھی فائق ہوں — آج ازہر کے فضلاء میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے ایسی ایسی کتابیں اور فتاویٰ شائع کئے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ انھوں نے اپنا علم و دانش دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں بیچ ڈالا ہے۔ اور وہ اسلام کی اس طرح بیخ کنی کر رہے ہیں کہ اس کے کھلے دشمن اتنا نہیں کر سکتے تھے۔ علم دین کے یہ تاجر بلاشبہ دین سے خارج ہو چکے ہیں زیادہ منافق اور خائن ہیں جو اجتہاد اور آزادیٔ رائے کی آڑ لے کر دین کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ اور اپنے اس کاروبار کے ذریعہ وہ دنیا کے بڑے بڑے منافع اٹھا رہے ہیں اور دولت کما رہے ہیں اور اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کی طرف سے بالکل بے پروا ہیں۔

پس ان حالات میں اگر ہم چاہتے ہیں کہ شریعت اور فقہ اسلامی میں اس اجتہاد کے ذریعہ روح اور زندگی پیدا ہو جس کا جاری رہنا امت میں شرعاً ضروری ہے، اور جو وقتی مسائل کے شرعی حل تلاش کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور جس کے بغیر اب شریعت کے وقار کو بچایا نہیں جا سکتا تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم اجتہاد کے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھیں، یعنی انفرادی اجتہاد سے قطع نظر کر کے اجتماعی اجتہاد کو رائج کریں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اجتہاد کا صحیح مزاج اور اس کا وہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں موجود تھا ——

اس وقت اس اجتماعی اجتہاد کو بروئے کار لانے کا طریقہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مجلس قائم کی جائے بالکل اسی طرز پر جس پر علمی اور ادبی اکاڈیمیاں قائم ہوتی ہیں، اور اس کے لئے ہر اسلامی ملک سے ایسے راسخ العلم اور بالغ نظر مشاہیر علماء منتخب کئے جائیں جو ایک طرف شریعت کے علوم اور وقتی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوں، اور دوسری طرف سیرت و تقویٰ کا ایک پاکیزہ نمونہ ہوں ——

ان علماء و فقہا کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے چند ایسے ماہرین بھی ہونے چاہئیں جن کے دین پر بھی پورا اعتماد کیا جا سکتا ہو، اور جو ضروری عصری علوم مثلاً اقتصادیات، اجتماعیات، قانون اور طب میں ایسی دست گاہ رکھتے ہوں کہ علماء اور فقہا کو اپنی فنی مہارت کی وجہ سے صائب مشورے دے سکیں، اور ان کے کام میں پوری مدد کر سکیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ فقہ اسلامی کی اس مجلس کے ممبران اس اہم ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے بالکل یکسو اور فارغ ہوں ان کے پاس ایک وسیع لائبریری ہو ان کو معقول وظائف اور تنخواہوں کے ذریعہ فکر معاش سے بالکل فارغ کر دیا جائے تاکہ اجتہادی مسائل پر غور کرنے کے لئے اور نئے نئے مسائل اور عصری مشکلات میں اسلام کے موقف کو معلوم کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو وقف کر دیں اور بالکل یکسو ہو کر اس ذمہ داری کو انجام دے سکیں۔ ان کو اپنے مباحث کے لئے ایک مجلہ کی بھی ضرورت ہوگی اور فقہ کی ایک انسائکلوپیڈیا یا ڈکشنری کے طرز پر مرتب کرنی ہوگی جس طرح قانونی انسائکلوپیڈیا مرتب ہوتی ہیں۔ اسی طرح حروف تہجی کے اعتبار سے فقہ کی امہات الکتب اور مصادر و مراجع کی ایک فہرست تیار کرنی ہوگی تاکہ کام کرنے والوں کے لئے مراجعت آسان ہو۔

اس منصوبہ کے لئے ایک وسیع بجٹ بنانا پڑے گا۔ اور بہت بڑا سرمایہ فراہم کرنا ہوگا جس کو صرف دو طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ایک مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے عوامی چندہ سے، اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ باہمی انتشار و تفرق اور عامۃ المسلمین میں دینی شعور کی کمی اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام سے بے تعلقی اور دینی بے حسی کی وجہ سے اس میں کامیابی کا بہت کم امکان ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایک اسلامی حکومت یا متعدد اسلامی حکومتیں مل کر اس ذمہ داری کو قبول کریں اور اس کو اپنے بجٹ کی ایک مد بنائیں۔

اس قسم کی ایک فقہی مجلس قائم کرنے کا فیصلہ دو اسلامی کانفرنسوں میں جو

کراچی میں ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئی تھیں ہو ابھی تھا۔ اور میں بھی ان دونوں کانفرنسوں میں شریک تھا لیکن افسوس کہ وہ تجویز کاغذی ہی رہی۔ ہماری اسلامی حکومتیں ہر کام میں بے دریغ روپیہ صرف کر سکتی ہیں لیکن اسلام کی کسی صحیح خدمت کے لیے ان کو کچھ صرف کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون ہ

قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني وان هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله

چاند کے بارہ میں ریڈیو کی خبر

[مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر]

اس سال ہندوستان کے بہت سے مقامات پر یہ واقعہ پیش آیا کہ ۲۹ رمضان کو چاند نظر نہیں آیا لیکن دو ڈھائی گھنٹے کے بعد دہلی اور مختلف صوبوں کے ریڈیو اسٹیشنوں نے بتایا کہ فلاں فلاں علاقوں اور شہروں میں (مثلاً کلکتہ، حیدرآباد اور مدراس میں) چاند دیکھا گیا ہے اور کل ان مقامات پر عید ہے۔ اس کی بنا پر بہت سے مقامات پر مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا۔ ایک طبقہ نے ریڈیو کی خبر کو قابل اعتبار مان کر شنبہ کو عید کرنی چاہی، دوسروں نے اس کو کافی نہیں سمجھا اور انھوں نے شنبہ کو روزہ رکھنا ضروری سمجھا بعض مقامات پر اس اختلاف کے نتیجہ میں دو دو عیدیں ہوئیں اور سخت خلفشار پیدا ہوا ——— کئی جگہوں سے اس سلسلہ میں دفتر الفرقان سے بھی استفسار کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے دینی اور علمی حلقے ایسے مسائل کے بارہ میں بھی جن سے ہر سال سابقہ پڑتا ہے کوئی ایسا اجتماعی فیصلہ نہیں کر سکے جس سے اس قسم کے اختلافات کا کچھ سدباب ہو سکتا ——— عوام کا حال بھی یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ان چیزوں کو علماء پر چھوڑ دیں خود ہی فیصلے کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ کی وہ کوششیں — ہمارے علم میں ہیں جو امارت شرعیہ صوبہ بہار اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ہوئی ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ مجلس تحقیقات شرعیہ (جو اس قسم کے مسائل ہی کے حل کے لئے قائم ہوئی ہے) اس وقت جن مسائل پر غور کر رہی ہے ان میں یہ

مسئلہ بھی شامل ہے ۔۔۔۔ خدا کرے کہ ان سب حضرات کے تجربہ میں اور سب کے اشتراک و تعاون سے ایسے اجتماعی فیصلے سامنے آئیں جو اجتماعیت کے وزن کی وجہ سے اس قسم کے اختلافات کے انسداد میں مؤثر ہوں۔

اب سے قریباً ۲۵ برس پہلے بھی بالکل اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا جس طرح کا اس سال پیش آیا اور بہت سی جگہوں پر دو دو عیدیں ہوئی تھیں، اس وقت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم سے بھی اس بارہ میں استفسار کیا گیا تھا، مولانا نے جو جواب دیا تھا وہ ضلع مونگیر (بہار) کے ایک صاحب مولوی مسعود الحسن صاحب) کے پاس محفوظ تھا، کچھ عرصہ ہوا موصوف نے وہ الفرقان میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا ان کے شکریہ کے ساتھ وہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (انشاء اللہ آئندہ اس مسئلہ پر الفرقان میں کچھ تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ کوئی اور صاحب علم تحریر فرمائیں تو الفرقان کے صفحات حاضر ہیں)۔۔۔۔

مولانا گیلانی مرحوم کا جواب بہت مختصر اور اصولی ہے۔ لیکن اس میں وہ بات پوری طرح آ گئی ہے جو اس مسئلہ پر غور کرنے والے اہل علم کے لئے بنیاد کا کام دے سکتی ہے ۔۔۔۔ مولانا کے جواب کی بنیاد اس تنقیح پر ہے کہ "ریڈیو کی خبر کا رویت ہلال کی "شہادت" یا "قاضی کا فیصلہ" نہیں ہے، بلکہ وہ رویت ہلال کے بارہ میں مسلمانوں کے فیصلہ کی خبر اور اس کی نشانی ہے اور اس سے ظن غالب" حاصل ہو جاتا ہے ۔۔۔۔ اس لئے "شہادت" اور "حکم قاضی" کی شرائط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔۔۔۔

مولانا نے جس سوال کا یہ جواب لکھا تھا وہ خود جواب سے سمجھا جا سکتا ہے۔

الجواب

(۱) ریڈیو سے خبر چاند کے طلوع یا عدم طلوع کی نہیں دی جاتی۔ بلکہ مسلمانوں کے فیصلہ کی خبر دی جاتی ہے۔ مثلاً دلی کے مسلمانوں میں طے ہو گیا کہ عید کا چاند دیکھا گیا، عید کی نماز کل ہوگی،

پس یہ خبر مسلمانوں کے فیصلہ کی ہے نہ کہ رویت ہلال کی۔

(۴) خبروں پر اعتماد کرنے کا فقہ میں بھی وہی طریقہ لکھا ہے جو فطرت کا اقتضا ہے اور جو عام طور پر مروج ہے، قبلہ کی جہت کا پتہ مسافر کو اگر نہ چلے تو لکھا ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم کے متعلق بھی مسئلہ یہی ہے کہ ———

اخبارہ فیما هو من امر الديانات مالم يغلب على الظن صدقه۔ (شامی ص۴۲۱ ج۱)

دینی معاملات میں اس وقت تک (غیر مسلم کی خبر پر بھروسہ نہ کیا جائے گا جب تک کہ اس کے سچے ہونے کا گمان غالب نہ ہو۔

مطلب جس کا یہی ہے کہ ظن غالب اگر غیر مسلم آدمی کی اطلاع سے پیدا ہو تو اس کی خبر پر بھی بھروسہ کرکے اسی سمت کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ لینی چاہیئے جسے قبلہ کی سمت غیر مسلم آدمی کی اطلاع میں قرار دیا گیا ہو۔

اب اس سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ ریڈیو اور تار وغیرہ کی خبروں پر لوگ کاروبار کرتے ہیں، کسی کے مرنے کی خبر ملتی ہے تو عام طور پر یہی احساس پیدا ہوتا ہے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ تار ملتا ہے کہ فلاں عزیز آپ کا بیمار ہے آپ روانہ ہوجاتے ہیں، روپیہ خرچ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ ظن ریڈیو اور تار کی خبروں سے پیدا ہوتا ہے بلکہ غلبۂ ظن کے لئے آدمی کا بھی ہونا فقہاء کے نزدیک ضروری نہیں۔ شامی کا مشہور مسئلہ ہے کہ ـــ

يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع او رؤية القناديل من المصر لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل۔ (شامی ص۱۲۵ ج۲)

شہر سے توپوں کی آواز آئے یا قندیلوں کی روشنی دکھائی دے[1] تو دیہات والوں پر روزہ رکھنا واجب ہوجاتا ہے کیونکہ توپ کی آواز یا قندیلوں کی روشنی کھلی ہوئی علامت ہے جس سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے اور ظن غالب ایسی دلیل ہے جس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

[1] دستور تھا کہ چاند کی رویت ثابت ہوجانے پر مصر وغیرہ مرکزی شہروں میں توپیں داغی تھیں اور بلند میناروں پر قندیلیں روشن کی جاتی تھیں، دیہات والوں کیلئے ان توپوں کی آوازوں کا سننا اور قندیلوں کا دیکھنا فقہاء کے نزدیک ثبوت رمضان

بہر حال ریڈیو یا تار وغیرہ کی خبروں سے "ظن غالب" کسی وجہ سے اگر نہ پیدا ہوتا ہو تو اس وقت بلاشبہ اعتماد نہ کرنا چاہئے لیکن جب تک لوگ ریڈیو اور تار کی خبروں پر اعتماد کر رہے ہیں صرف اس خبر پر کہ "فلاں جگہ کے مسلمانوں نے کیا فیصلہ رویت ہلال، یا نماز عید کے متعلق کیا" محض اس پر اعتماد نہ کرنا بظاہر فقہی جزئیات کے خلاف ہے ــــــ فقط

فقیر سید مناظر احسن گیلانی غفر اللہ لہ ولمن ربّاہ

۲۸ر جولائی ۳۳ء

سوانح حضرت مولینا عبد القادر رائپوری رح

(از مولینا سید ابو الحسن علی ندوی)

اس دور کے عارف ربانی، شیخ المشائخ حضرت رائپوری (۶۲ء) کے مفصل حالات زندگی، اوصاف و خصوصیات، مجاہدات و ریاضات، ہدایت و ارشاد کا دلآویز تذکرہ جس کے مطالعہ میں آپ انشاء اللہ بزرگوں کی صحبت کا اثر پائیں گے۔ صفحات ۳۲۴۔ مجلد مع گرد پوش، عمدہ کاغذ و طباعت ۵ روپیہ (-/-/5)

اعلان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

مطابق فارم ۴ رول ۸

مقام اشاعت	کچہری روڈ لکھنؤ
وقفہ اشاعت	ماہانہ
پرنٹر پبلشر اڈیٹر و مالک کا نام	محمد منظور نعمانی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ

میں (منظور نعمانی) تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اندراجات میرے علم اور یقین کی حد تک بالکل درست ہیں ــــ منظور نعمانی (پرنٹر و پبلشر)

قابل مطالعہ کتابیں

رحمۃ للعالمین :- از- قاضی سلیمان منصور پوری
مکمل مجلد دو جلدوں میں -/۲۰
رسول اللہ کی سیاسی زندگی - از ڈاکٹر حمید اللہ -/۸
اسلام (اس کا آغاز اور ارتقا) از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
حضرت ابوبکر و فاروق اعظم (از ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مجلد) آ ۹
دونوں ایک جلد میں ۶/۷۵
تاریخ الخلفاء (از علامہ سیوطی مترجمہ اقبال الدین احمد
خلفائے راشدین سے مصر کے فاطمی خلفا تک کے دور کی
مکمل تاریخ قیمت -/۱۲
ائمۂ اربعہ (از رئیس احمد جعفری) چاروں اماموں
کی سوانح حیات اور اجتہادی خدمات مجلد -/۱۰
حیات امام ابن القیم بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب
قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبدالعظیم کے قلم سے، مترجمہ
سید رشید احمد ارشد -/۱۲
فقہ الاسلام - از حسن احمد الخطیب مترجمہ ایضاً ارشد
صاحب :- فقہ اسلامی کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ
اور دور جدید کے پس منظر میں اصول شریعت پر گفتگو
مجلد -/۱۲
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (مکمل) -/۲۱
فتاویٰ رشیدیہ (یعنی مولانا گنگوہی کے فتاویٰ
کا مجموعہ -/۸
تذکرۃ الرشید :- حضرت مولانا گنگوہی رح کی مکمل
سوانح حیات ۲ جلد -/۸
سوانح قاسمی :- حضرت مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم
دیوبند کی مکمل سوانح حیات از مولانا گیلانی مرحوم
۳ جلد، مجلد -/۱۵

حیات انور :- حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری
کی سوانح حیات -/۴
نقش حیات :- حضرت مولانا سید حسین احمد
مدنی کی خود نوشت سوانح حیات مکمل (دو جلدوں
میں) غیر مجلد ۸/۵۰، مجلد ۱۰/۵۰
مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول -/۶
جلد دوم -/۶ جلد سوم ۴/۵۰
ارشادات مولانا مدنی ۳/۵۰
مکتوبات سلیمانی (مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی)
مجلد -/۵

مولانا دریابادی کی تفسیری کتابیں

قصص و مسائل -/۲
قرآنی شخصیتیں ۲/۲۵
حیوانات قرآنی -/۲
جغرافیہ قرآنی ۱/۲۵
بشریت انبیاء (قرآن مجید کی روشنی میں) ۲/۲۵
کتاب الصلوٰۃ - (از مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی)
جس میں نماز کی اہمیت و خصوصیات، پر قرآن مجید
کی ایک سو آیات اور احادیث نبوی اور اقوال ائمہ
سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجلد ۲/۵۰

مجلس تحقیقات و نشریات کی کتابیں

مقالات سیرت - از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ۴/۵۰
طوفان سے ساحل تک - از محمد اسد لیوپولڈ -/۵
اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر -
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۴/۵۰
ہندوستانی مسلمان - از مولانا ندوی -/۳

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ (یوپی)

11 MAY 19
ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
ہماری دعوت
از ادارہ الفرقان
مسئول
محمد منظور نعمانی
مدیر
عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
اعزازی خریداروں سے
۱۵/-
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ
قیمت فی کاپی
۶۰ نئے پیسے

جلد ۳۱ | بابتہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق اپریل و مئی ۱۹۶۴ء | شمارہ ۱۱-۱۲

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۳ مئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ "سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں" اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہمکو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اسکی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

پہلے یہ سطریں ملاحظہ فرما لیجئے

مولوی عتیق الرحمٰن کی علالت کی وجہ سے جس کا سلسلہ قریباً سوا سال سے قائم ہے "الفرقان" کے نظام پر بہت زیادہ اثر پڑا کیونکہ اسکی ترتیب تیاری اور اشاعت کے ذمہ دار قریباً دس سال سے وہی تھے۔ راقم سطور تھوڑا بہت بوجھ اٹھا سکتا تھا لیکن مسلمانانِ ہند کے موجودہ حالات کی وجہ سے دوڑ دھوپ اور سفروں کا کئی مہینے سے تانتا بندھا ہوا ہے اور وہ سکون و اطمینان بالکل ہی مفقود ہے جو اس قسم کے کاموں کے لیے ضروری ہے تاہم انہی حالات میں اس سے پہلا شمارہ مرتب کیا تھا جو رمضان و شوال کا مشترکہ تھا اور یہ شمارہ بھی اسی بھاگ دوڑ کے درمیان مرتب ہوا ہے جو ذیقعدہ و ذی الحجہ کا مشترکہ شمارہ ہے ـــ ان دونوں شماروں میں ظاہر و باطن اور صورت و معنی کے لحاظ سے جو کمی رہی جس کا شاید سب سے زیادہ راقم سطور کو احساس ہو اسکے لیے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا، یہی غنیمت ہے کہ یہ شمارے شائع ہو گئے اور الفرقان کی اکتیسویں جلد جو ذی الحجہ پر مکمل ہو جانی چاہیئے تھی اس شمارہ پر ذی الحجہ ہی میں کسی طرح مکمل ہو گئی ـــ اب اگلے شمارہ سے انشاء اللہ بتیسویں جلد شروع ہو گی۔

مولوی عتیق الرحمٰن کی صحت بفضلہ تعالیٰ اب پہلے سے بہتر ہے۔ اور امید ہے کہ چند روز کے بعد وہ الفرقان کا کام اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے۔ ایک بہت اچھے صاحب علم اور صاحب قلم کا کچھ وقت بھی الفرقان کے لیے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو امید ہے کہ انشاء اللہ ظاہر و باطن ہر حیثیت سے اسکو مزید بہتر اور زیادہ مفید بنایا جا سکے گا۔

حال ہی میں الفرقان کو ایک اچھے منیجر بھی مل گئے ہیں جن سے امید ہے کہ دفتری کاموں میں سستی اور بے قاعدگی کی وجہ سے جس قسم کی زحمتیں اور شکایتیں خریداروں کو پیدا ہوتی تھیں انشاء اللہ ان میں بہت کمی ہو جائے گی۔

محمد منظور نعمانی

شرحِ چندہ کے سلسلہ میں بعض تبدیلیاں

گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے قیمتوں اور اجرتوں میں جو اضافہ ملک میں ہوا ہے اور آئندہ کیلئے بعض متعلق اخراجات کا جو اضافہ ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا ہے اسکو پورا کرنے کیلئے الفرقان کے چندہ کے سلسلہ میں ہم نے مندرجہ ذیل تبدیلیوں کا مجبوراً فیصلہ کیا ہے:

(۱) اسوقت ہندوستان کی طرح پاکستان کیلئے بھی سالانہ چندہ چھ روپے ہے۔ لیکن پاکستان سے چندہ کی رقوم چونکہ بینک کے ذریعہ منتقل ہوتی ہیں اور بینک کمیشن کے علاوہ اس سلسلہ میں دفتر الفرقان کو بعض اور اخراجات بھی ادا کرنا پڑتے ہیں جنکے بعد الفرقان کو پانچ روپے کے قریب بچتا ہے اسلئے آئندہ سال ۱۳۶۷ھ کے شروع سے پاکستان کے لیے چندہ سات روپے کر دیا گیا ہے لہذا پاکستانی احباب آئندہ سال کا چندہ سات روپے روانہ فرمائیں۔

(۲) ششماہی چندہ جو اب تک دونوں ملکوں کیلئے تین روپے تھا ہندوستان کیلئے ساڑھے تین اور پاکستان کیلئے چار کر دیا گیا ہے۔

(۳) ششماہی کے لیے رسالہ وی۔ پی نہیں کیا جائے گا، اس کا چندہ دستی یا منی آرڈر پیشگی آنا چاہیے۔

(۴) جو حضرات وعدہ پر رسالہ جاری کراتے ہیں ان کو صرف ایک مہینہ کی مہلت دی جائے گی۔ دوسرے مہینے کا پرچہ اطلاع دے کر وی۔ پی روانہ کیا جائے گا۔

ہمارے پاکستانی خریدار

"ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ لاہور" کو چندہ بھیجنے کے بعد صرف سادہ کارڈ سے اس کی اطلاع ہم کو دے دیں ڈاکخانہ کی ابتدائی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

منیجر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اولیں

محمد منظور نعمانی

اسلامی ممالک، خاص کر بعض عرب ملکوں میں جو حکومتی تبدیلیاں پچھلے چند سالوں میں ہوئیں، وہ زیادہ تر خونی انقلابات کی شکل میں ہوئیں، اور ان میں سے بعض میں تو ایسی سفاکی اور بربریت کے مظاہرے ہوئے جن کو دنیا بھر کے مسلمانوں نے اپنے لیے باعث رسوائی سمجھا، کیونکہ جن ملکوں میں وہ ہوئے اور جو لوگ ان کے ذمہ دار تھے وہ بدقسمتی سے اپنے کو اسلام سے منسوب کرتے تھے۔

عرصہ کے بعد ایک اسلامی عرب ملک (سعودی عرب) میں حکومت کی ایک ایسی تبدیلی کی روداد سامنے آئی ہے جو صرف خوشگوار ہی نہیں بلکہ اس دور فساد میں نہایت مسرت بخش اور لائق فخر بھی ہے —— اس تبدیلی کی اجمالی اطلاع تو اپنے ملک کے اخبارات میں پہلے ہی شائع ہو چکی ہے، لیکن تفصیلی حال بعد میں سعودی عرب کے اخبارات سے معلوم ہوا، جس میں اہل دین کے لیے مسرت اور شکر کا اور زیادہ سامان ہے۔

ملک حجاز و نجد شاہ سعود اور اُن کے بھائی امیر فیصل کے درمیان (جن کی حیثیت وزیر اعظم کی تھی) اقتدار کی جو کشمکش عرصہ سے چل رہی تھی واقفین اس سے باخبر ہیں، اب سے دو سال پہلے شوال ۱۳۸۱ھ میں شاہ سعود نے ایک فرمان کے ذریعہ عارضی طور پر اپنے اختیارات امیر فیصل کی طرف منتقل کر دیئے تھے اور اُس وقت سے حکومت کا کاروبار گویا وہی چلا رہے تھے —— اِدھر کچھ عرصہ سے شاہ سعود کے بعض لڑکوں اور حکومت سے تعلق رکھنے والے

بعض عناصر نے یہ کوشش شروع کر رکھی تھی کہ ملک پھر سے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیں، اور اس کے بالمقابل شاہی خاندان کے بعض دوسرے افراد اور وزراء اور اہل حکومت کا ایک بڑا عنصر شاہ سعود کی مسلسل علالت وغیرہ کے باعث ملک اور اہل ملک کی مصلحت کے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتا تھا کہ سارے اختیارات اور ملک کا سارا کاروبار امیر فیصل ہی سے متعلق رہے، خواہ ضابطہ کے "ملک" شاہ سعود ہی رہیں۔

پچھلے چند مہینوں میں یہ کشمکش کافی بڑھ گئی تھی، اور اس کا خطرہ تھا کہ خدانخواستہ یہ کسی خون ریز خانہ جنگی کی شکل اختیار نہ کرلے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ملک اور اہل ملک پر رحم فرمایا، اور دونوں فریقوں کو نیکی کی توفیق دی۔ ملک کے اکابر علماء نے مسئلہ اپنے ہاتھ میں لیا، پہلے گزشتہ شعبان میں ان حضرات نے ایک درمیانی حل نکالا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ درمیانی حل اختلاف کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تو ذیقعدہ میں پھر مجلس علماء نے اس پر غور کیا اور ایک دوسری فیصلہ کن قرارداد مرتب کی یا یوں کہا جائے کہ ایک فتویٰ جاری کیا (جو سعودی عرب کے اخبارات میں فتوے ہی کے عنوان سے شائع ہوا ہے) اور اسی کے مطابق فیصلہ ہو کر اس کشمکش کا الحمد للہ خاتمہ ہو گیا۔

ہم ذیل میں اس فتوے کا پورا متن پیش کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الامین۔ وبعد

جلالۃ الملک سعود اور ان کے بھائی امیر فیصل کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کے بارے میں غور کرنے کے لیے اب سے تین مہینے پہلے شعبان ۱۳۸۳ھ میں ہم جمع ہوئے تھے اور اس وقت کافی غور و خوض کے بعد ہم نے اس کے بارہ میں ۹ر شعبان کو ایک قرارداد تیار کی تھی اور ہمیں امید تھی کہ اس سے یہ اختلافات حل ہو جائیں گے لیکن معلوم ہوا کہ ہماری وہ تجویز اختلافات کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی، اور چونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اختلافات

کی یہ خلیج اور زیادہ وسیع ہو کر خدانخواستہ کسی بڑے شر اور فتنہ کی شکل اختیار کر سکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ملک کا نظام اور امن و امان درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی ایسا حل سوچیں جس سے اس اختلاف کے قطعی خاتمہ کی توقع ہو۔ بنا بریں ہم دستخط کنندگان نے کئی نشستوں میں اس مسئلہ پر غور کیا اور تازہ صورت حال اور جلالۃ الملک کی خرابیٔ صحت اور اس حالت کا پورا جائزہ لیا جس کی وجہ سے اب حکومت کے اہم معاملات کا بوجھ اٹھانے کی ان میں طاقت نہیں رہی ہے اور وہ ان کا حق ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے مصلحت عامہ کے تقاضہ سے ہم سب مندرجۂ ذیل فیصلہ پر متفق ہوئے ہیں۔

(۱) جلالۃ الملک سعود حسب سابق "شاہ" رہیں گے اور اس حیثیت سے ان کا وہی احترام و اکرام کیا جائے گا جو اب تک کیا جاتا رہا ہے۔

(۲) امیر فیصل (جو ولی عہد اور رئیس مجلس وزراء ہیں) ملک کی موجودگی اور عدم موجودگی میں حکومت کے تمام داخلی و خارجی معاملات کے ذمہ دار اور مختار ہوں گے۔ اور وہ کسی معاملہ میں ملک کے سامنے جواب دہ نہ ہوں گے اور نہ کسی بات کے لیے ملک کی طرف رجوع کرنے کی ان کو ضرورت ہوگی

ہم نے یہ فیصلہ اُن نصوص شرعیہ کی رہنمائی اور پیروی میں کیا ہے جن میں مصالح عامہ کی رعایت و نگہداشت کا حکم ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دُعا ہے کہ وہ اُمتِ مسلمہ کے دین کی حفاظت فرمائے۔ اور اپنی مرضیات پر اتحاد و اتفاق اور اشتراک عمل کی توفیق دے۔ اور اس کے حکمراں طبقہ کو اس راہ کی طرف رہنمائی فرمائے جس میں اُمت کی صلاح و فلاح ہو۔ وصلّی اللہ علیٰ نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

اس فتوے پر سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ محمد ابن ابراہیم اور گیارہ دوسرے اکابر و مشاہیر علماء نجد کے دستخط ہیں، یہ گویا سعودی عرب کی مجلس علماء کا فیصلہ اور متفقہ فتویٰ ہے جو ۱۶ ذیقعدہ کو جاری ہوا تھا ________

اگلے دن ۱۷ ذیقعدہ کو مجلس وزراء نے اس فتوے کی بنیاد پر اور اسی کا حوالہ دیتے ہوئے اسی کے مطابق قرارداد پاس کی اور اس طرح خوبصورتی اور خوشگواری کے ساتھ یہ کشمکش الحمدللہ ختم ہو گئی ــــ خدا کرے اس کے بعد کوئی ایسی خبر نہ آئے جو اس خوشی کو مکدر کرے۔

جنوری میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے دوسرے مقامات کے مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹی تھی۔ ابھی وہاں کے ہزاروں یتیموں، بیواؤں اور لاکھوں مصیبت کے ماروں کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے اور تباہ شدہ مظلوموں کی امداد بحالی کا کام دکھا فیصدی بھی نہیں ہوا تھا کہ گزشتہ مہینے مارچ کے آخر میں بنگال سے ملی ہوئی دوسری دو ریاستوں بہار اور اڑیسہ کی بہت سی بستیوں اور مرکزی شہر جمشید پور اور راؤڑکیلا وغیرہ کے مسلمانوں پر اس سے کہیں گئی بڑی قیامت ٹوٹ پڑی ــ ان مقامات کے بعض جاننے والے مسلمانوں نے وہاں کی بربادی اور مظلومیت کا جو حال لکھا تھا وہ خود اپنے اندازہ اور قیاس سے باہر اور اتنا دردناک تھا کہ خود ہمیں شبہ ہوا کہ شاید ان لکھنے والوں نے کچھ زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن اسی ہفتے (اپریل کے تیسرے ہفتہ میں) مسٹر فرینک انتھونی نے (جو انگلو انڈین فرقہ کے لیڈر اور پارلیمنٹ کے آزاد ممبر ہیں) پارلیمنٹ میں جو تقریر ان فسادات کے متعلق اور عام ہندوستانی مسلمانوں کے عدم تحفظ کے بارہ میں کی ہے اور ہندوستان میں انصاف کے علمبردار اور سرودے لیڈر مسٹر جے پرکاش نارائن نے بعض فسادزدہ مقامات کا دورہ کرنے کے بعد جو خط پارلیمنٹ کے ممبران کے لیے ان فسادات ہی کے بارہ میں لکھا ہے (جو اسی ہفتے کے اخبارات میں شائع ہوا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے ہم کو خطوط لکھے تھے انھوں نے مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا ــــــ مسٹر جے پرکاش نرائن کے خط کا ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ " جمشید پور کے تباہ شدہ مسلمانوں کے کیمپوں میں صرف دیکھنے کے بعد میں اس قابل نہیں رہا کہ اور کیمپوں کو دیکھ سکتا " حکومت کے ذمہ داروں نے بھی حقیقت حال کو چھپایا اور ایوان حکومت سے تعلق رکھنے والے کسی مسلمان کو بھی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اصل واقعہ کے بارہ میں کچھ بتا! یا کم از کم سوال ہی کر لیتا۔ توفیق ملی تو مسٹر انتھونی اور جے پرکاش نرائن کو۔ سچ ہے

جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

الفرقان کے اسی شمارہ میں جناب وحید الدین صاحب (اعظم گڑھ) کا ایک مضمون "حالات بدل سکتے ہیں" شائع ہو رہا ہے، موصوف نے مضمون کے ساتھ تحریر فرمایا تھا کہ "اگر الفرقان میں اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا جائے تو بلاکسی حذف و ترمیم کے شائع کیا جائے کیونکہ میرے خیالات یہی ہیں" ــــ ہم نے اس فرمائش کا احترام کرنا ضروری سمجھا، اگر یہ پابندی نہ ہوتی تو ہم اس کے ابتدائی تمہیدی حصہ میں جو "سیاسی تدابیر کے جائزہ" سے متعلق ہے کہیں کہیں کچھ ترمیم کرتے۔ کیونکہ ہمارا احساس یہ ہے کہ غالباً شدت احساس کی وجہ سے بعض واقعات کی تعبیر میں اور اسی طرح نتائج کے استنباط میں محترم مضمون نگار سے کئی جگہ مبالغہ ہو گیا ہے ــــ لیکن مضمون کا جو مقصدی حصہ ہے اور جو اس کا اصل مدعا اور پیغام ہے اس سے ہمیں پورا اتفاق ہے اور موجودہ حالات میں وہ الفرقان کی اصل دعوت ہے۔ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝

معارف الحدیث

(مسلسل)

کتاب الحج

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اسلام کے پانچ ارکان میں سے آخری اور تکمیلی رکن "حج بیت اللہ" ہے۔

حج کیا ہے؟ ــــ ایک معین اور مقرر وقت پر اللہ کے دیوانوں کی طرح اس کے دربار میں حاضر ہونا اور اس کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی اداؤں اور طور طریقوں کی نقل کر کے اُن کے سلسلے اور مسلک سے اپنی وابستگی اور وفاداری کا ثبوت دینا اور اپنی استعداد کے بقدر ابراہیمی جذبات اور کیفیات سے حصہ لینا اور اپنے کو ان کے رنگ میں رنگنا۔

مزید وضاحت کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ذوالجلال والجبروت، احکم الحاکمین اور شہنشاہِ کل ہے اور ہم اس کے عاجز و محتاج بندے اور مملوک و محکوم ہیں۔ اور دوسری شان اس کی یہ ہے کہ وہ اُن تمام صفات جمال سے بدرجۂ اتم متصف ہے جن کی وجہ سے انسان کو کسی سے محبت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے وہ ــــ بلکہ صرف وہی ــــ محبوب حقیقی ہے۔ اس کی پہلی حاکمانہ اور شاہانہ شان کا تقاضا یہ ہے کہ بندے اس کے حضور میں ادب و نیاز کی تصویر بن کر حاضر ہوں۔ ارکان اسلام میں پہلا عملی رکن نماز اسی کا خاص مرقع ہے اور اس میں یہی رنگ غالب ہے۔ اور زکوٰۃ بھی اسی نسبت کے

ایک دوسرے رُخ کو ظاہر کرتی ہے ــــ اور اس کی دوسری شانِ محبوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ بندوں کا تعلق اس کے ساتھ محبت اور دالہیت کا ہو، روزہ میں بھی کسی قدر یہ رنگ ہے، کھانا پینا چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشات سے منہ موڑ لینا عشق و محبت کی منزلوں میں سے ہے، مگر حج اس کا پورا پورا مرقع ہے، سلے کپڑوں کے بجائے ایک کفن نما لباس پہن لینا، ننگے سر رہنا، حجامت نہ بنوانا، ناخن نہ ترشوانا، بالوں میں کنگا نہ کرنا، تیل نہ لگانا، خوشبو کا استعمال نہ کرنا، میل کچیل سے جسم کی صفائی نہ کرنا، چیخ چیخ کے لبیک لبیک پکارنا، بیت اللہ کے گرد چکر لگانا، اس کے ایک گوشے میں لگے ہوئے سیاہ پتھر (حجر اسود) کو چومنا اس کے در و دیوار سے لپٹنا اور آہ و زاری کرنا، پھر صفا و مروہ کے پھیرے کرنا، پھر مکہ شہر سے بھی نکل جانا اور منیٰ اور کبھی عرفات اور کبھی مزدلفہ کے صحراؤں میں جا پڑنا، پھر جمرات پہ بار بار کنکریاں مارنا، یہ سارے اعمال وہی ہیں جو محبت کے دیوانوں سے سرزد ہوا کرتے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام گویا اس رسمِ عاشقی کے بانی ہیں ــــ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادائیں اتنی پسند آئیں کہ اپنے دربار کی خاص الخاص حاضری حج و عمرہ کے ارکان و مناسک ان کو قرار دے دیا۔ انہی سب کے مجموعہ کا نام گویا حج ہے اور یہ اسلام کا آخری اور تکمیلی رکن ہے۔

اس سلسلہ "معارف الحدیث" کی پہلی جلد کتاب الایمان میں وہ حدیثیں گزر چکی ہیں جن میں اسلام کے ارکانِ پنجگانہ کا بیان ہے اور اُن میں آخری رکن "حج بیت اللہ" بتایا گیا ہے۔

حج کی فرضیت کا حکم راجح قول کے مطابق ۹ھ میں آیا ہے اور اس کے اگلے سال ۱۰ھ میں اپنی وفات سے صرف تین مہینے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی بہت بڑی جماعت کے ساتھ حج فرمایا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسی حجۃ الوداع میں خاص عرفات کے میدان میں آپ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ الآیۃ (المائدہ ع ۱)	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا۔

اس میں اس طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ حج اسلام کا تکمیلی رکن ہے۔

اگر بندہ کو صحیح اور مخلصانہ حج نصیب ہو جائے جس کو دین و شریعت کی زبان میں حج مبرور کہتے ہیں اور ابراہیمی و محمدی نسبت کا کوئی ذرہ اس کو عطا ہو جائے تو گویا اس کو سعادت کا اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا اور وہ نعمت عظمیٰ اس کے ہاتھ آ گئی جس سے بڑی کسی نعمت کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو حق ہے کہ تحدیث نعمت کے طور پہ کہے اور مست ہو ہو کر کہے۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کہ دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اس مختصر تمہید کے بعد حج کے متعلق ذیل کی حدیثیں پڑھیے!

حج کی فرضیت اور فضیلت:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَیْکُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا فَقَالَ رَجُلٌ اَکُلَّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَسَکَتَ حَتّٰی قَالَهَا ثَلٰثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُوْنِیْ مَا تَرَکْتُکُمْ فَاِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِکَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰی اَنْبِیَائِهِمْ فَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ فَاْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاِذَا نَهَیْتُکُمْ عَنْ شَیْءٍ فَدَعُوْهُ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں فرمایا اے لوگو تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے۔ لہذا اس کو ادا کرنے کی فکر کرو ——— ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہر سال حج کرنا ہم پر فرض کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سکوت فرمایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اس شخص نے تین دفعہ اپنا وہ سوال دوہرایا تو آپ نے (ناگواری کے ساتھ) فرمایا کہ اگر میں تمہارے اس سوال

کے جواب میں کہہ دیتا کہ "ہاں ہر سال حج کرنا فرض کیا گیا" تو اسی طرح فرض ہو جاتا اور تم ادا نہ کر سکتے ـــــ اس کے بعد آپ نے ہدایت فرمائی کہ کسی معاملہ میں جب تک میں خود تم کو کوئی حکم نہ دوں تم مجھ سے حکم لینے (اور سوال کر کر کے اپنی پابندیوں میں اضافہ کرنے) کی کوشش نہ کرو ـــــ تم سے پہلی امتوں کے لوگ اسی لیے تباہ ہوئے کہ وہ اپنے نبیوں سے سوال بہت کرتے تھے اور پھر ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے ـــــ لہذا (میری ہدایت تم کو یہ ہے کہ) جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو جہاں تک تم سے ہو سکے اُس کی تعمیل کرو اور جب میں تم کو کسی چیز سے منع کر دوں تو اس کو چھوڑ دو۔   (صحیح مسلم)

(تشریح) جامع ترمذی وغیرہ میں قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اس میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حج کی فرضیت کا یہ اعلان اور اس پر یہ سوال و جواب جو حضرت ابو ہریرہ کی مندرجۂ بالا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے آل عمران کی اس آیت کے نازل ہونے پر پیش آیا تھا۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔	اللہ کے واسطے بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے اُن لوگوں پر جو اسکی استطاعت رکھتے ہوں۔
(آل عمران ع ۱۰)	

حضرت ابو ہریرہ کی اس حدیث میں اُن صحابی کا نام مذکور نہیں ہے جنھوں نے حضور سے سوال کیا تھا کہ "کیا ہر سال حج کرنا فرض کیا گیا ہے؟" لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ کی اسی مضمون کی حدیث جس کو امام احمد اور دارمی اور نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے اس میں تصریح ہے کہ یہ سوال کرنے والے اقرع بن حابس تمیمی تھے۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا، ان کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ابھی پورا موقع نہیں ملا تھا اسی لیے ان سے یہ لغزش ہوئی کہ ایسا سوال کر بیٹھے اور جب حضور نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر دوبارہ اور پھر سہ بارہ سوال کیا ـــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا واجب ہو جاتا" اس کا منشا اور مطلب یہ ہے کہ سوال کرنے والے کو سوچنا اور سمجھنا چاہیے تھا کہ میں نے حج کے فرض ہونے کا جو حکم سنایا تھا اُس کا تقاضا اور مطالبہ عمر بھر میں بس ایک حج کا تھا اس کے بعد ایسا سوال کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا (اور ظاہر ہے کہ آپ ہاں جب ہی کہتے جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا) تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور اُمت سخت مشکل میں پڑ جاتی ــــ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگلی امتوں کے بہت سے لوگ کثرتِ سوال اور قیل وقال کی اسی بری عادت کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے نبیوں سے سوال کر کر کے شرعی پابندیوں میں اضافہ کرایا اور پھر اس کے مطابق عمل کر نہیں سکے۔

حدیث کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی اہم اور اصولی بات فرمائی ـــ آپ نے ارشاد فرمایا کہ

"جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو جہاں تک تم سے ہو سکے اُس کی تعمیل کرو اور جس چیز سے منع کر دوں اس کو ترک کر دو"

مطلب یہ ہے کہ میری لائی ہوئی شریعت کا مزاج سختی اور تنگی کا نہیں ہے بلکہ سہولت اور وسعت کا ہے، جہاں تک تم سے تعمیل ہو سکے اس کی کوشش کرو، بشری کمزوریوں کی وجہ سے جو کمی کسر رہ جائے گی اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اس کی معافی کی امید ہو۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَلَكَ زَادًا وَّرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا وَذٰلِكَ اَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ـــــ رواه الترمذی

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس سفر حج کا ضروری سامان ہو اور اس کو سواری میسر ہو

جو بیت اللہ تک اس کو پہونچا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج فرض ہے اُن لوگوں پر جو اس تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے بڑی سخت وعید ہے جو حج کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہ کریں۔ فرمایا گیا ہے کہ ان کا اس حال میں مرنا اور یہودی یا نصرانی ہو کر مرنا گویا برابر ہے۔ (معاذ اللہ) یہ اسی طرح کی وعید ہے جس طرح ترکِ نماز کو کفر و شرک کے قریب کہا گیا ہے ـــــ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے "اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (الروم ع ۵)۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک صلوٰۃ مشرکوں والا عمل ہے۔

حج فرض ہونے کے باوجود حج نہ کرنے والوں کو مشرکین کے بجائے یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دینے کا راز یہ ہے کہ حج نہ کرنا یہود و نصاریٰ کی خصوصیت تھی کیونکہ مشرکین عرب حج کیا کرتے تھے لیکن وہ نماز نہیں پڑھتے تھے اس لیے ترک نماز کو مشرکوں والا عمل بتلایا گیا۔

اس حدیث میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کے لیے جو سخت وعید ہے اس کے لیے سورۂ آلِ عمران کی اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کی سند پیش کی گئی ہے، جس میں حج کی فرضیت کا بیان ہے (یعنی لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے صرف حوالہ کے طور پر آیت کا یہ ابتدائی حصہ پڑھنے پر اکتفا کیا، یہ وعید آیت کے جس حصہ سے نکلتی ہے وہ اس کے آگے والا حصہ ہے یعنی "وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ" (جس کا مطلب یہ ہو کہ اس حکم کے بعد جو کوئی کافرانہ رویہ اختیار کرے یعنی باوجود استطاعت کے حج نہ کرے تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں وہ ساری دنیا اور ساری کائنات سے بے نیاز ہے۔) ـــــ اس میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کے رویہ کو "مَنْ كَفَرَ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور "اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ" کی وعید سنائی گئی ہے، اس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسے ناشکرے اور نافرمان جو کچھ بھی کریں اور جس حال میں مریں اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں ـــــ

قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث مسند دارمی وغیرہ میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُوْجِبُ الْحَجَّ قَالَ الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ.

——— رواہ الترمذی و ابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا کہ کیا چیز حج کو واجب کردیتی ہے۔ آپ نے فرمایا سامان سفر اور سواری۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) قرآن مجید میں فرضیت حج کی شرط کے طور پر "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا" فرمایا گیا ہے یعنی حج ان لوگوں پر فرض ہے جو سفر کرکے مکہ معظمہ تک پہونچنے کی استطاعت رکھتے ہوں — اس میں جو اجمال ہے غالباً سوال کرنے والے صحابی نے اس کی وضاحت چاہی اور دریافت کیا کہ اس استطاعت کا متعین معیار کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک تو سواری کا انتظام ہو جس پر مکہ معظمہ تک کا سفر کیا جا سکے اور اس کے علاوہ کھانے پینے جیسی ضروریات کے لیے اتنا سرمایہ ہو جو اس زمانہ سفر کے گزارہ کے لیے کافی ہو — فقہائے کرام نے اس گزارہ میں ان لوگوں کے گزارہ کو بھی شامل کیا ہے جن کی کفالت جانے والے کے ذمہ ہو۔

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ.

——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس آدمی نے حج کیا اور اس میں نہ تو کسی شہوانی اور فحش بات کا ارتکاب کیا اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر واپس ہوگا جیسا اُس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسکو جنا تھا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ"۔ اس آیت میں حج کرنے والوں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ خاص کر زمانۂ حج میں نہ شہوت کی باتوں اور اللہ کی نافرمانی والے سارے کاموں اور آپس کی جھگڑے بازی سے بچیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اس ہدایت پر عمل کرنے والوں کو بشارت سنائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو شخص حج کرے اور ایام حج میں نہ تو شہوت کی باتیں کرے اور نہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی کوئی ایسی حرکت کرے جو فسق کی حد میں آتی ہو تو حج کی برکت سے اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور وہ گناہوں سے بالکل ایسا پاک وصاف ہو کر واپس ہوگا جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے دن بے گناہ تھا ـــــ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ دولت نصیب فرمائے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعُمْرَةُ اِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک کفارہ ہو جاتا ہے ان کے درمیان کے گناہوں کا ـــــ اور "حج مبرور" (پاک اور مخلصانہ حج) کا بدلہ تو بس جنت ہے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَابِعُوْا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَاِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُوْرَةِ ثَوَابٌ اِلَّا الْجَنَّةُ ـــــ رواہ الترمذی والنسائی

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پے در پے کیا کرو حج اور عمرہ کیونکہ حج اور عمرہ دونوں فقر و محتاجی اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح لوہار اور سنار کی

بھٹی لوہے اور سونے چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے اور "حج مبرور" کا صلہ اور ثواب تو بس جنت ہی ہے۔ (جامع ترمذی سنن نسائی)

تشریح) جو شخص اخلاص کے ساتھ حج یا عمرہ کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں غوطہ لگاتا اور غسل کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ گناہوں کے گندے اثرات سے پاک صاف ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ دنیا میں بھی اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہوتا ہے کہ فقر و محتاجی اور پریشاں حالی سے اس کو نجات مل جاتی ہے اور خوشحالی اور اطمینان قلب کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور مزید برآں "حج مبرور" کے صلہ میں جنت کا عطا ہونا اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اَلْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللّٰهِ اِنْ دَعَوْهُ اَجَابَهُمْ وَاِنِ اسْتَغْفَرُوْهُ غَفَرَ لَهُمْ ــــــــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ اگر وہ اللہ سے دعا کریں تو وہ اُن کی دعا قبول فرمائے، اور اگر وہ اُس سے مغفرت مانگیں تو وہ اُن کی مغفرت فرمائے۔ (سنن ابن ماجہ)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَقِیْتَ الْحَاجَّ فَسَلِّمْ عَلَیْهِ وَصَافِحْهُ وَمُرْهُ اَنْ یَّسْتَغْفِرَ لَكَ قَبْلَ اَنْ یَّدْخُلَ بَیْتَهٗ فَاِنَّهٗ مَغْفُوْرٌ لَهٗ ــــــــــ رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی حج کرنے والے سے تمہاری ملاقات ہو تو اس کے اپنے گھر میں پہونچنے سے پہلے اس کو سلام کرو اور مصافحہ کرو اور اس سے مغفرت کی دعا کے لیے کہو کیونکہ وہ اس حال میں ہے کہ اُس کے گناہوں کی مغفرت کا فیصلہ ہو چکا ہے (اس لیے اس کی دعا کے قبول ہونے کی خاص توقع ہے) (مسند احمد)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ مَنْ خَرَجَ حَاجًّا اَوْ مُعْتَمِرًا اَوْ غَازِیًا ثُمَّ مَاتَ فِیْ طَرِیْقِہٖ کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ اَجْرَ الْغَازِیْ وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ اللہ کا جو بندہ حج یا عمرہ کی نیت سے یا راہِ خدا میں جہاد کے لیے نکلا، پھر راستہ ہی میں اس کو موت آگئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے واسطے وہی اجر و ثواب لکھ دیا جاتا ہے جو حج و عمرہ کرنے والوں کے لیے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کے لیے مقرر ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کے اس کریمانہ دستور و قانون کا اعلان خود قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ (النساء۔ ع ۱۴)	اور جو بندہ اپنا گھر بار چھوڑ کے ہجرت کی نیت سے نکل پڑے اللہ و رسول کی طرف پھر آجائے اس کو موت (راستہ ہی میں) تو مقرر ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ہاں، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی بندہ اللہ کی رضا کا کوئی کام کرنے کے لیے گھر سے نکلے اور اُس کے عمل میں آنے سے پہلے راستہ ہی میں اس کی زندگی ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس عمل کا پورا اجر اس بندہ کے لیے مقرر ہو جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت کا تقاضا ہے۔ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۳۵) مرزا منوچہر کے نام (تعزیت و نصیحت)

حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ برخوردار سعادت اطوار کو خوش وقت و مطمئن رکھے۔ اور اندوہِ گزشتہ کی باحسن وجوہ تلافی فرمائے ———

اے فرزند اقبال آثار! جوانی کا زمانہ جس طرح ہوا و ہوس کا وقت ہے تحصیل علم و عمل کا بھی وقت ہے ——— اس زمانۂ شباب میں باوجود غلبۂ موانع شہوانیہ و غضبیہ جو عمل بھی بمقتضائے شریعت وجود میں آتا ہے وہ دوسرے زمانے کے مقابلے میں زیادہ فوقیت اور اعتبار رکھتا ہے۔ اس لئے کہ مانع کا وجود جو کہ باعث رنج و محنت ہے عمل کے مرتبے کو آسمان پر لے گیا ہے اور عدمِ مانع نے جو کہ عدم رنج و مشقت کو مستلزم ہے عمل کے مرتبے کو پست کر دیا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ خواصِ بشر، خواصِ فرشتہ سے افضل ہیں کیونکہ طاعت بشر، موانع کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور عبادت فرشتہ، بے مزاحمت موانع ہے ——— سپاہیوں اور فوجیوں کی خدمات کے اعتبار و شمار کا وقت وہ ہوتا ہے جبکہ دشمنوں کا غلبہ ہو اس لئے کہ دشمن ہوا خواہ دولت و حکومت ہوتے ہیں، اُس وقت کی تھوڑی سی جد و جہد بھی بہت کچھ فوقیت اور اعتبار رکھتی ہے بمقابلہ اس جد و جہد کے جو ایسے ہنگامی دور کے

علاوہ کسی اور وقت ہو ـــــ یہ بھی معلوم ہے کہ ہوا و ہوس اللہ کے دشمنوں یعنی نفس و شیطان کے پسندیدہ ہیں۔ اور علم و عمل مقتضائے شریعت، حضرت رحمان جل سلطانہ کو مرغوب ہیں ـــــ عقلمندی و ہوشیاری سے یہ بات دور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو راضی کیا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ جو بے شمار نعمتوں کا بخشنے والا ہے ناراض ہو جائے ـــــ

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ الْمُوَفِّق ـــــ

مکتوب (۳۶) میر محمد نعمان اکبر آبادی کے نام

[منکرین عذاب قبر کے رفع شبہات میں]

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ ایک گروہ عذاب قبر کے بارے میں ـــ جس کا ثبوت احادیث صحاح مشہورہ بلکہ آیت ہائے قرآنی سے بھی ہے ـــ تردد بلکہ قریب قریب محال ہونے کا یقین رکھتا ہے ـــ اُن کا سب سے بڑا شبہہ یہ ہے کہ غیر مدفون (مثلاً دریا میں ڈوبے ہوئے، آگ میں جلے ہوئے درندوں کے پھاڑے ہوئے) مُردوں کے حالات ایک نہج اور طرز پر ہوتے ہیں۔ اُن میں حرکت متحقق ہوتی ہے، اضطراب نہیں ہوتا اور یہ بات تعذیب و ایلام کے منافی ہے تعذیب و ایلام کے لوازم میں سے جنبش و اضطراب ہے۔ (اس سے اُنھوں نے مدفون مردوں کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ قبر میں تعذیب و ایلام کا معاملہ نہ ہوگا)۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حیات عالم برزخ ـــ حیات دُنیوی کی جنس سے نہیں ہے کہ اُس کو حرکت ارادی اور احساس دونوں لازم ہیں۔ دُنیا کا انتظام، حرکت ارادی اور احساس ہی سے وابستہ ہے ـــ حیات برزخ میں کوئی حرکت درکار نہیں ہے بلکہ حرکت عالم برزخ کے منافی ہے۔ وہاں فقط احساس ہوگا اور یہی کافی ہے کہ جس سے الم و عذاب کو محسوس کرے۔ پس حیات برزخ گویا کہ نصف حیات دُنیوی ہے (اس لئے کہ حیات دُنیوی میں حرکت ارادی بھی ہے اور احساس بھی، اور حیات برزخی میں حرکت نہیں ہے صرف احساس ہے) اور اسی طرح حیات برزخی میں بدن سے رُوح کا تعلق، اُس تعلق کا نصف ہے جو رُوح کو بدن سے دنیا میں تھا۔ پس روا ہے کہ مُردگان غیر مدفون (غرق

شدہ، سوختہ شدہ، دریدہ شدہ) حیاتِ برزخی میں احساسِ عذاب و الم تو کریں اور کوئی حرکت و اضطراب اُن سے وجود میں نہ آئے اور جو کچھ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہی (بلا شک و شبہہ) صادق ہو ـــ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہوں اور اس اشکال کا اور اس قسم کے دوسرے اشکالات کا بالکل قلع قمع ہی کئے دیتا ہوں کہ طور و طریقۂ نبوت بالائے طور و طریقۂ عقل و فکر ہے ـــ وہ اُمور جن کے ادراک سے عقل قاصر ہوتی ہے اُن کا ادراک طور و طریقِ نبوت سے کیا جاتا ہے۔ عقل کافی ہو جایا کرتی تو پھر انبیا علیہم السلام کیوں مبعوث ہوتے اور عذابِ اُخروی کو اُن کی بعثت سے کیوں مربوط و متعلق کیا جاتا؟ ـــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ـــ (ہم نہیں ہیں عذاب کرنے والے یہاں تک کہ رسول کو بھیجیں) عقل ہر چند حجت ہے لیکن حجتِ بالغہ نہیں ہے اور وہ حجیت کے اندر کامل نہیں۔ حجتِ بالغہ، بعثتِ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ متحقق ہوتی ہے۔ اسی بعثتِ انبیاء نے مکلفین کی زبانِ عذر کو بند کر دیا ہے۔ (چنانچہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ـــ (ہم نے بھیجا رسولوں کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر تاکہ نہ رہے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ پر الزام پیغمبروں کے بھیجنے کے بعد ـــ اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے) ـــ اور جب ادراکِ عقل کی کوتاہی بعض اُمور میں ثابت ہو گئی پس جمیع احکامِ شرعیہ کو میزانِ عقل میں تولنا اچھی بات نہیں ہو گی ـــ جمیع احکامِ شرعیہ کو عقل کی ترازو میں تولنا استقلالِ عقل کا حکم لگانا اور طورِ نبوت کا انکار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے ـــ سب سے پہلے رسول پر ایمان لانے کی فکر اور اُن کی رسالت کی تصدیق کرنا چاہیے تاکہ تمام احکام میں اُن کو صادق سمجھا جائے اور اس ذریعے سے ظلماتِ شکوک و شبہات سے خلاصی میسر آئے ـــ اصل کو معلوم کرنا چاہیے تاکہ فروع بے تکلف و بے دشواری معقول و معلوم ہو جائیں۔ کسی فرع

کو اُس کی اصل کے ثابت کئے بغیر معلوم کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ اور اس تصدیقِ رسالت کی منزل تک پہنچے۔ نیز اطمینانِ قلب کے حصول کا نزدیک ترین راستہ ذکرِ الٰہی ہے ــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ــــ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَھُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (آگاہ ہو کہ ذکرِ خدا سے اطمینان حاصل کرتے ہیں دل۔ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے اُن کی حالت اچھی ہو گی اور اُن کی بازگشت بھی اچھی ہو گی)

(محض) نظر و استدلال کے راستے سے اس مطلبِ عالی تک پہنچنا بہت بعید ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود ــ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(اور اگر استدلال ہی مطلوب ہے تو) انبیاء علیہم السلام کا مقلد اُن کی نبوت کے اثبات کے بعد اور اُن کی رسالت کی تصدیق کے بعد (خود) استدلال کرنے والوں میں سے ہے۔ اُن اکابر کے اقوال کی تقلید اس وقت (یعنی بعد تصدیق و اثباتِ نبوت) عین استدلال ہے۔ مثلاً ایک شخص ہے کہ اُس نے ایک اصل کو دلیل سے ثابت کیا ہو۔ اب جو فروع بھی اُس اصل سے نکلیں گے سب اُسی استدلال سے ثابت ہو جائیں گے۔ اور اصل کے استدلال کی وجہ سے وہ شخص تمام فروع کے اثبات میں استدلال کرنے والا سمجھا جائیگا۔ ــــ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ ــــ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

عہ فقط استدلال پر اکتفا کرنے والوں کے پاؤں لکڑی کے ہیں اور ظاہر ہے کہ لکڑی کے پاؤں بودے ہوتے ہیں۔

عہ سپاس و حمد خداوندِ کریم کے لئے ہے کہ اُس نے ہم کو اس کی طرف رہنمائی فرمائی اور ہم ہرگز راستہ نہ پا سکتے اگر خداوندِ کریم ہم کو راہ نہ دکھاتا۔ بے شک ہمارے پروردگار کے بھیجے ہوئے پیغمبر حق و راستی کے ساتھ آئے۔

مکتوب (۳۸) ملا ابراہیم کے نام [حدیث ستفترق امتی الخ کے معنیٰ اور درجۂ ارباب فقر کی تحقیق]

جاننا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث تفرق امت... میں کلھم فی النار الا واحدۃ جو فرمایا ہے اس میں (اُن بہتر فرقوں کا) آتش دوزخ میں داخل ہونا اور عذاب میں رہنا مراد ہے۔ خلود و دوام عذاب مراد نہیں اس لئے کہ خلود و دوام منافی ایمان اور مخصوص بہ کفار ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ چونکہ اُن کے اعتقادہائے مذمومہ اُن کے دخول نار کا سبب ہیں. ناچار وہ سب کے سب داخل نار ہوکر اپنے خباثت اعتقاد کی بقدر معذب ہوں گے۔ برخلاف فرقۂ ناجیہ کے جس کے معتقدات عذاب نار سے نجات دینے والے اور سبب فلاح ہیں ـــــ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ فرقۂ ناجیہ کے بعض افراد اگر اعمال غلط کے مرتکب ہوں گے اور وہ اعمال (دنیا میں) توبہ کے ذریعے اور (آخرت میں) شفاعت کے ذریعے معاف نہ ہوئے ہوں گے تو جائز ہے کہ گناہ کی بقدر عذاب نار میں وہ بھی مبتلا ہو جائیں اور دخول نار اُن کے لئے بھی متحقق ہو ـــــ پس دوسرے (بہتر) فرقوں میں دخول نار تمام افراد کے حق میں ہے اگرچہ خلود و دوام نہ ہو اور فرقۂ ناجیہ کے اندر دخول نار بعض افراد کے ساتھ مخصوص ہے جنھوں نے اعمال سوء کا ارتکاب کیا ہوگا ـــ کلمہ کلھم میں اسی بیان کی طرف اشارہ ہے جو مخفی نہیں ہے۔ چونکہ یہ (بہتر) بدعتی فرقے اہل قبلہ ہیں اس لئے اُن کی تکفیر میں دلیری نہیں کرنا چاہیے تاوقتیکہ وہ ضروریات دینیہ کا انکار نیز متواترات احکام شرعیہ کا رد نہ کریں۔ اور دین کی یقینی و ضروری باتوں کو قبول کرتے

ع ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ـــ "بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں متفرق ہوئے اور میری اُمت میں ۷۳ فرقے ہوں گے' اُن میں سوائے ایک کے جو کہ ناجی ہوگا باقی سب ناری ہوں گے۔" صحابہؓ نے عرض کیا وہ نجات یافتہ فرقہ کون سا ہوگا؟" فرمایا۔" جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر ہوگا۔"

رہیں ــــ علماء نے فرمایا ہے کہ اگر (کسی شخص کی بات میں) ننانوے وجوہِ کفر ظاہر ہوں اور ایک وجہِ اسلام پائی جائے تو اُس ایک وجہ کو صحیح رکھا جائے اور حکم کفر نہ لگایا جائے۔

ــــ واللہ سبحانہٗ اعلم ــــ

نیز یہ بات بھی جاننا چاہیے کہ حدیث میں جو یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ اس اُمت کے فقراء اغنیاء سے نصف یوم پہلے بہشت میں جائیں گے تو اس نصف یوم سے مراد دُنیا کے پانسو سال ہیں اس لئے کہ یوم نزدِ حق تعالیٰ ہزار سال ہے آیت اِنَّ یومًا عِندَ ربّک کالفِ سَنَۃٍ مِمّا تعُدُّون ــــ اس معنیٰ کی گواہ ہے ــ اور اس مدت کی مقدار علمِ الٰہی کے سپرد ہے بغیر اس کے کہ روز و شب اور سال و ماہ متعارف (وہاں) متحقق و موجود ہوں ــ فقیر سے مُراد وہ فقیر صابر ہے جو احکام شرعیہ کی بجا آوری اپنے اوپر لازم کئے ہوئے ہے اور ممنوعات سے پرہیز کرتا ہے ــــ

فقر میں درجات مراتب ہیں بعض بعض کے اوپر ہیں اور سب سے بڑا مرتبہ مقام فنا میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور وہ (مقام فنا) یہ ہے کہ سوائے حق جلّ شانہٗ کے سب کو ناچیز قرار دے اور فراموش کردے اور جو شخص تمام مراتب فقر کا جامع ہے وہ افضل ہے بمقابلہ اُس کے جو اُن مراتب میں سے بعض رکھتا ہے اور بعض نہیں رکھتا پس جو شخص مقامِ فنا کے ساتھ ساتھ فقرِ ظاہر بھی رکھتا ہے وہ افضل ہے اُس شخص سے جو درجۂ فنا تو رکھتا ہے مگر ظاہری فقر نہیں رکھتا ــــ اس بات کو خوب سمجھ لیا جائے۔

؎ اللہ کے ہاں کہ ایک دن تمہارے حساب کے ایک ہزار سال کے برابر ہے ۱۲

حالات بدل سکتے ہیں

(از:- جناب وحید الدین خاں صاحب اعظم گڑھ)

"اے قریش کے لوگو! اے قریش کے لوگو!" ـــــ اب سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے ایک صبح کو اس آواز نے مکہ کی آبادی میں ہیجان پیدا کر دیا۔ پکارنے والا وہ شخص تھا جو پچھلے چالیس برس سے اپنی بے داغ زندگی کے لئے مشہور ہو چکا تھا بستی کے تمام معززین بستی کے باہر پہاڑی کے دامن میں اکٹھا ہو گئے۔ حاضرین سخت انتظار اور اضطراب کی حالت میں اپنے قابل احترام پکارنے والے کو دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کی بستی کا سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑا خیر خواہ، جو پہاڑی کے اوپر کھڑا ہوا ہے، پہاڑی کے دوسری طرف سے کسی زبردست حملہ آور دشمن کی خبر دینے والا ہے ـــــ مگر لوگ سخت مایوس ہوئے جب انھوں نے کوہ صفا کے مقرر کی تقریر سنی کیونکہ اس کی ساری تقریر کا خلاصہ صرف یہ تھا:

وَاللّٰهِ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ　　خدا کی قسم تمہارے عمل کے مطابق تم سے معاملہ کیا جائے گا۔

جمہرۃ خطب العرب، حصہ اول ص۵۱

لوگوں نے کہا ـــــ "کیا ہمیں اسی لئے بلایا تھا، بیکار ہمارا وقت برباد کیا۔" اور منتشر ہو گئے ـــــ

آج کچھ ایسی ہی صورت ان لوگوں کی ہے جو موجودہ حالات میں ہندستان کے مسلمانوں کو [illegible] کے کرنے کا کام بتا رہے ہیں۔ اگر ان مسلمانوں سے کہئے کہ ملک کی اکثریت تمہاری دشمن [illegible]

خلاف احتجاج کی تدبیریں بنایئے، اگر یہ انکشاف کیجئے کہ دستورِ ہند کی فلاں فلاں دفعات تمہارے لئے یہ امکان پیدا کرتی ہیں کہ تم عدالت میں اپنا مقدمہ لے جا کر اکثریت کے مظالم کا انسداد کر سکتے ہو تو یہ باتیں بہت جلد مسلمانوں کی سمجھ میں آجائیں گی۔ اس کے برعکس جب دین کا فہم رکھنے والے ان سے کہتے ہیں کہ اپنے خدا کو پکڑو، کیونکہ اس کے چھوڑنے ہی کے نتیجے میں یہ سارا وبال تمہارے سر پر پڑا ہے' تو یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ناصحین چونکہ خارجی دشمن سے براہِ راست مقابلے کی تدبیریں نہیں بتاتے بلکہ خود اپنے اندرونی دشمن کو زیر کرنے کی تلقین کر رہے ہیں اس لئے اس ملک کے مظلوم مسلمانوں کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے جو لوگ ذرا سنجیدہ ہیں وہ دل ہی دل میں سوچ کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ اور جو بیباک ہیں وہ فوراً کہہ اٹھتے ہیں ـــــ "مولوی سیاست نہیں جانتا" میں کہوں گا کہ یہ مولوی کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات ہے۔ اگر تم کو کہنا ہی تو یوں کہو کہ خدا سیاست نہیں جانتا اس کے جواب میں مولوی کی سیاست دانی پر تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

سیاسی تدبیروں کا جائزہ

اگلے صفحات میں میں مذکورہ بالا حل کی معقولیت اور اس کی دینی اہمیت پر گفتگو کروں گا۔ اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سیاسی تدبیروں کا جائزہ لے لیا جائے جس کو آج کل کا "مسلم تعلیم یافتہ طبقہ" بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور جو اس کے نزدیک ہندستانی مسلمانوں کے مسئلے کا واحد حل ہے۔ یہ عموماً تین قسم کی چیزیں ہیں۔

۱ــــ آئینی مطالبات،

۲ ـــــ عدالتی مرافعہ

۳ ـــــ انتخابی طاقت کا استعمال

آئینی مطالبہ اس سلسلے کی پہلی چیز آئینی مطالبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں جو حکومت قائم ہے۔ وہ ایک سکولر اور جمہوری آئین کے تحت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے ہر فرد اور ہر فرقہ کو تمام جائز انسانی حقوق یکساں طور پر حاصل ہیں۔ ان حقوق کی خاطر جد و جہد کرنے کے بھی تمام قانونی مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے بارے میں جس قسم کی ناانصافیاں دیکھ رہے ہیں ان کے خلاف آئینی جد و جہد کریں ان کو دور کرنے کیلئے قانونی مطالبات کی مہم چلائیں۔

مگر اس حل کے مجوزین کے متعلق میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ وہ الفاظ کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور حقیقت کی دنیا کی انھیں کچھ زیادہ خبر نہیں ہے۔ ان کا خیال شاید یہ ہے کہ ارباب اقتدار اس آئین کی دفعات کو بھول گئے ہیں جس کو انھوں نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آئین کی موجودگی میں مسلم اقلیت پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اگر مسلمان ایک بار اپنے حکمرانوں کو آئین کی یہ مقدس دفعات یاد دلا دیں تو حکومت کی مشنری بالکل دوسری سمت میں حرکت کرنے لگے گی۔ اور جس طاقت کا حال یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ اقلیت کو لوٹنے اور ذبح کرنے کیلئے کھلم کھلا فسادیوں اور بلوائیوں کا ساتھ دیتی ہے، وہ مظلوم اقلیت کی پشت پناہ بن کر کھڑی ہو جائے گی۔ کیونکہ آئین کے الفاظ کا تقاضا یہی ہے !

مگر افسوس کہ واقعات اس خوش گمانی کی تصدیق نہیں کرتے۔ ہر وہ شخص جس کی آنکھوں پر کسی قسم کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے۔ اب اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اتفاقی غفلت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ سوچا سمجھا ہوا ایک ہمہ گیر منصوبہ ہے جو مختلف طریقوں سے بالارادہ زیر عمل لایا جا رہا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قانونی تحفظ کی یہ سنہری دفعات دراصل ہمارے تحفظ کیلئے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ الفاظ کا ایک پردہ ہے جو عدم تحفظ کی واقعی صورت حال کو چھپانے کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں قانونی مطالبات کی مہم گویا ظالم سے خود اس کے ظلم کے خلاف فریاد کرنا ہے۔ ایک شخص جو اپنی طاقت کے بل پر فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ آپ کو قتل کرے گا، اس سے دس سال پہلے کے چند الفاظ یاد دلا کر کہنا ہے کہ تم مجھے قتل نہ کرو ——— ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوششوں کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ سالہا سال کی جد و جہد کے بعد جب آپ اپنا پیغام اس کے کانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ جواب میں کچھ دوسرے الفاظ بول دے اور اپنا منصوبہ بدستور جاری رکھے ——— اس سلسلے میں قیاس کرنے کی ضرورت نہیں۔ واقعات کی دنیا میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

ایک مثال لیجئے ——— دس سال پہلے دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت دیئے ہوئے ایک حق کو حاصل کرنے کے لئے اتر پردیش میں ایک زبردست جد و جہد کی گئی تھی۔ یہ دفعہ ہمارے

صدرِ جمہوریہ کو یہ حق دیتی ہے کہ کسی ریاست کی آبادی کا قابل لحاظ حصہ اگر ایک زبان بولتا ہو تو وہ ہدایت دے سکتا ہے کہ اس زبان کو ریاست کی علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے چنانچہ دستور میں درج شدہ زبانوں میں سے چودھویں زبان (اردو) کے حق میں اس رعایت کو حاصل کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو ہند نے اتر پردیش میں ایک بہت بڑی مہم چلائی اور فروری ۱۹۵۴ء میں ساڑھے بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک درخواست جس کا وزن چودہ من تھا صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہم اس ملک میں چاہتے ہیں، ان میں یہ سب سے زیادہ جائز اور بے ضرر قانونی مطالبہ تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ اگر یہ چودہ من کا بوجھ کسی غریب خاندان کو دیدیا جاتا تو اس کے مہینوں کے ایندھن کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ مگر اس زبردست جدوجہد کا اتنا فائدہ بھی قوم کو نہیں ملا اور ساری کوششوں کے باوجود ریاست کے اندر اردو زبان اب بھی اسی مظلومی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے جو اس کارروائی سے پہلے تھی۔ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ ایک دفعہ دستخطوں کے اس انبار کو پارسلوں میں بند کر کے نئی دہلی لے گیا۔ اور راشٹرپتی بھون کے گودام میں اس کو چھوڑ کر چلا آیا۔ گویا یہ ایک جنازہ تھا جو دھوم دھام سے اٹھا اور پھر خاموشی کے ساتھ قبر میں رکھ دیا گیا۔ اس درخواست کو پیش کئے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں مگر ابھی تک حکومت کی طرف سے اس کا باضابطہ جواب بھی نہیں دیا گیا۔ کیوں؟ — اس لئے کہ راشٹرپتی کے قانونی مشیر نے راشٹرپتی کو بتایا کہ اس کے سلسلے میں کچھ "قانونی" مشکلات حائل ہیں۔"

آئینی جدوجہد میں صرف یہی ایک خلا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ایک کلی تسلط کو جزوی خلاصی کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش ہے اور ایسی ہر کوشش بالفرض وہ کامیاب ہو جائے۔ جب بھی اپنے انجام کے اعتبار سے ناکام رہتی ہے۔ اگر کوئی منفرد نوعیت کا جزوی خلا ہو تو اس کو بلاشبہ آئینی جدوجہد کے ذریعہ درست کیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں پورے سماجی حالات کا رخ بدلا ہوا ہو، وہاں آئینی جدوجہد کی مثال ایک ایسے ہزار پا کی ہے جس نے اپنے سارے ڈنک گڑا دیئے ہوں اور آپ

اس سے کہیں کہ تمھارا فلاں ڈزنک انصاف کی رو سے صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں فلاں قانونی نقص پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہزار پا آپ کی اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے اپنے ایک ڈنک سے دستبردار ہو جائے تب بھی اصل مسئلہ بدستور باقی رہے گا۔

اسی اردو کے مسئلہ کو لیجئے اگر حکومت اس کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرے تو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، صورت حال میں کوئی حقیقی فرق پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس طرح کے کسی سرکاری فیصلے کا مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ چاہیں تو اپنے بچوں کو اردو[1] پڑھائیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی شخص اردو پڑھنے کی حماقت ہی کیوں کریگا۔ صورت حال یہ ہے کہ حکومت نے پورے ماحول میں ہر جگہ ہندی کو مسلط کر رکھا ہے۔ اس لئے اردو عملاً اب اس دنیا میں بے کار سی چیز بن گئی ہے۔ کوئی شخص اردو پڑھے تو اسکول میں اس کو اجنبی بن کر رہنا ہوگا، اعلیٰ تعلیمی وظائف حاصل کرنے کے لئے وہ نااہل قرار پائے گا۔ وہ دفتر اور کچہری میں جائے تو اس کو محسوس ہوگا کہ اردو کے ذریعہ کام نہیں چل سکتا۔ ملازمتوں میں اس کی اردو دانی اس کے لئے نااہلی کا سرٹیفکٹ ثابت ہوگی۔ ایسی حالت میں کوئی شخص اردو پڑھے تو کس لئے یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیمی تحریک کی کوششوں سے ابتدائی اسکولوں میں بعض شرائط کے ساتھ اردو تعلیم کی گنجائش جو منظور کی گئی ہے، اس کے لئے طلبہ نہیں ملتے کیونکہ سرپرست سوچتے ہیں کہ تعلیم کے بعد جب سارا کام ہندی میں کرنا ہے اور ساری ترقیاں اور کامیابیاں ہندی سے بندھی ہوئی ہیں تو وہ اپنے لڑکوں کو اردو پڑھانے کے بعد ان کی عملی زندگی کے لئے کون سا اردو کا جزیرہ تلاش کریں گے۔

مگر بات یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ اس سے آگے مزید مشکل یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندستان میں ریاست کے نام نہاد ترقی یافتہ تصور کو اپنایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے زمانے کی طرح حکومت صرف امن بحال رکھنے اور نظم و نسق قائم کرنے کی ذمہ دار نہیں ہوگی بلکہ وہ شہریوں کے تمام معاملات میں ان کی رہنمائی کرے گی۔ اس فیصلے نے حکومت کا دائرہ اتنا پھیلا دیا ہے کہ اب زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں حکومت اپنے قوانین اور اپنے دفاتر کے ساتھ موجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جہاں حکومت اس طرح زندگی کی تمام سرگرمیوں پر چھائی ہوئی ہو

[1] یا اسی طرح کی کچھ اور قانونی رعایات

وہاں سرکاری زبان کی حیثیت صرف محدود معنوں میں "سرکاری زبان" کی نہیں رہتی بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر معاملے کی زبان بن جاتی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو کام چلایا جا سکتا ہے اور نہ کسی میدان میں ترقی حاصل کی جا سکتی ہے ۱۸۴۴ء میں جب ہندستان میں برٹش کمپنی کی حکومت تھی، اس نے لوگوں کو انگریزی پڑھنے کی طرف مائل کرنے کے لئے ایک قانون منظور کیا تھا، جس کی رو سے سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیدیا گیا۔ مگر موجودہ حکومت کو ایسا کوئی قانون پاس کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب سرکاری ملازمت محض چند اسامیوں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اب تو ساری زندگی، بالواسطہ یا بلاواسطہ سرکاری ملازمت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اب صورت یہ نہیں ہے کہ جس کو سرکاری ملازمت کرنا ہو وہ سرکاری زبان سیکھے۔ بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ جس کو زندہ رہنا ہو وہ سرکاری زبان حاصل کرے۔ گویا اب چند لوگوں کو نہیں بلکہ تمام لوگوں کو سرکاری زبان سیکھنی ہے انگریزی قانون صرف خوش حال طبقے کے تھوڑے سے حوصلہ مند نوجوانوں کو انگریزی پڑھنے اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ مگر آج تو ہر شخص اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ وہ ہندی زبان سیکھے اور ہندی تہذیب میں اپنے آپ کو رنگے کیونکہ اس کے بغیر وہ سوشلسٹ طرز کے ہندستان میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ برطانوی حکومت نے ہندستان میں انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کو پھیلانے کی غرض سے جو اقدامات کئے تھے، ان کے لئے وہ آج تک بدنام ہے۔ مگر موجودہ سیاست دانوں کو شیطان نے "سوشلزم" کے نام سے ایک ایسا حربہ دیا ہے کہ وہ "سماجی ترقی" کے عنوان سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آج کے سوشلسٹ فرماں رواکو اپنے دین کی اشاعت کے لئے بدنام تلوار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سماجی اور اقتصادی اصلاح کا پروگرام اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ساری آبادی اپنی زبان اور اپنی تہذیب کو بدل کر اس کے دین میں شامل ہو جائے۔

عدالتی مرافعہ دوسری تدبیر جو سیاست جدید کے ماہرین بتا رہے ہیں وہ عدالتی مرافعہ ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ملک کے با اقتدار طبقہ کے خلاف اپنی شکایتوں کے سلسلے میں عدالت بالا میں مقدمہ دائر کریں مگر آپ جانتے ہیں کہ عدالت سے صرف انھیں چیزوں کے بارے میں

فیصلہ لیا جا سکتا ہے جو قانون کی مخصوص اور متعین دفعات کے تحت آتی ہو۔ اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ آپ خود اپنی زندگی میں جس مسئلے کو محسوس کر رہے ہیں اس کو قانونی طور پر بھی فی الواقع عدالت میں محسوس کرا سکیں گے۔ تاہم اگر کسی قابل بیرسٹر کو بیش قیمت فیس دے کر اور اس کے ضروری "راشن" کا انتظام کر کے آپ اس مشکل کو حل کر لیں اور کسی مسئلہ خاص میں عدالت کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے، جب بھی اس پر عمل درآمد کا انحصار اس بات پر ہے کہ حکومت بھی اس فیصلے کو دل سے مان لے۔ اگر حکومت اس سے اتفاق نہ کرے تو عدالت کی طرف سے کسی بھی قسم کی دروازہ بندی حکومت کو ایک نئے دروازے سے نکل جانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔

اس سلسلے میں "یوپی روڈ ٹرانسپورٹ ایکٹ ۱۹۵۱ء" کی مثال نصیحت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔ دس سال پہلے جب اترپردیش کی حکومت نے سڑکوں پر بس چلانے کو نیشنلائز کر لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ریاست کی سڑکوں پر بسیں چلانے کا اختیار صرف ریاستی حکومت کو ہوگا، تو ریاست کے سیکڑوں موٹر کا کام کرنے والے جن پر اس قانون کی زد پڑتی تھی، انھوں نے ہائی کورٹ میں اس قانون کو چیلنج کیا۔ ہائی کورٹ نے ان کی اپیل خارج کر دی اور حکومت کے اقدام کو صحیح قرار دیا۔ اس کے بعد وہ اس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے گئے اور انھوں نے وہاں اپنے مقدمہ کی زبردست پیروی کی۔ چنانچہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو سپریم کورٹ کی دستوری بنچ نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ یوپی حکومت کا یہ قانون دستور میں دیئے ہوئے اختیارات سے باہر ہے۔ سپریم کورٹ نے اس سلسلے کی تمام اپیلوں اور درخواستوں کو منظور کر لیا اور ہائی کورٹ کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ عدالت نے ہدایت کی کہ ریاستی حکومت کو اپیل کرنے والوں اور درخواست دینے والوں کے خلاف یوپی روڈ ٹرانسپورٹ ایکٹ کو نافذ ہونے سے روک دیا جائے۔

(نیشنل ہرالڈ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

مگر حکومت کی بلی چھیلے سے نکل بھاگی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس فیصلے کے باوجود آج ریاست کی سڑکوں پر ہزاروں سرکاری بسیں دوڑ رہی ہیں اور پرائیوٹ موٹریں یا تو اپنے مالکوں کے مکانوں میں پڑی ہوئی زنگ کھا رہی ہیں یا کباڑ خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ مماثل واقعات سے سبق نہیں لیتا جس بل میں وہ ایک بار ڈسا

گیا ہے۔ اسی نوعیت کی دوسری بل کے متعلق امید رکھتا ہے کہ اس میں سانپ نہیں ہوگا۔ ورنہ عدالتی مرافعہ ایک ایسا طریق کار ہے جو ہر شخص کے ذاتی تجربے میں اپنی ناکامی کو ثابت کر چکا ہے۔ کون بستی اور کون سا خاندان ہے جس کو اپنے کسی معاملے میں ملکی عدالتوں کے نقائص کا تجربہ نہ ہوا ہو اور وہ کون شخص ہے جو بے انصافی کے اس کاروبار سے ناواقف ہے جو انصاف کی کچہریوں میں روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر وہی عدالتی نظام جو شخصی مقدموں کے معاملے میں بار بار اپنی نااہلی ثابت کر چکا ہے۔ اس سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے قومی مقدمے کو بہترین طور پر حل کر دے گا۔ جبکہ قومی مقدمات میں مسئلے کی نزاکت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ شخصی مقدمات میں شخصی پیمانے کے مخالف فریق کا سامنا ہوتا ہے، جب کہ قومی مقدمات میں قومی پیمانے کے مخالف فریق کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا مسئلہ ہے جس کو ہم عدالت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ کہ جلسوں اور جلوسوں میں کھلم کھلا مسلمان دشمن تقریریں ہوتی ہیں اور اشتعال انگیز نعرے لگائے جاتے ہیں۔ کیا یہ کہ مخصوص تہواروں کے موقع پر بالقصد مسلمانوں پر اس طرح کیچڑ اور غلاظت ڈالی جاتی ہے کہ وہ مشتعل ہو جائیں اور رنگ کی ہولی کھیلنے والوں کو پوری بستی میں خون کی ہولی کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ کیا یہ کہ حکومت کی اسامیوں میں جان بوجھ کر مسلمانوں کا تقریباً بالکل کاٹ کیا جا رہا ہے اور کوئی مسلمان اتفاق سے کسی سرکاری عہدے پر موجود ہے تو اس کو اس قدر ذلیل اور تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو اپنی خودی کو ہمیشہ کیلئے دفن کر دے یا پھر استعفا دے کر بھاگ جائے۔ کیا یہ کہ سرکاری ٹیکس جو ملک کی تمام آبادی سے یکساں طور پر وصول کیا جاتا ہے اس کو بے شمار شکلوں میں ایک مخصوص فرقہ کے مفاد کے لئے بے دریغ خرچ کیا جا رہا ہے، کیا تہذیبی یگانگت پیدا کرنے کی اس کوشش کو ہم عدالت میں زیر بحث لانا چاہتے ہیں جس کو بجا طور پر ایک شخص نے تہذیبی جارحیت (Cultural Aggression) کا نام دیا ہے۔ کیا ہم اکثریت کی طرف سے اقلیت کو لوٹنے اور ہلاک کرنے کے ان مسلسل اور منظم واقعات کو عدالت میں لے جانا چاہتے ہیں، جن کو غلطی سے "فرقہ وارانہ فساد" کہا جاتا ہے اور جس نے مسلمانوں کی زندگی کو اس ملک میں اتنا غیر یقینی بنا دیا ہے کہ اب کسی بستی کے مسلمانوں کو نہیں معلوم کہ کس صبح یا شام کو

انھیں مارنا اور ان کی جائدادوں کو لوٹنا اور جلانا شروع کر دیا جائے گا۔ اور ملک کی پولیس اور فوج روکنے کے بجائے خود بھی ان کے اس مقدس کام میں ان کے ساتھ شریک ہو گی ——— غارتگری کے یہ واقعات اب اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اگر کسی دن ملک کی انشورنس کمپنیاں یہ اعلان کر دیں کہ مسلمانوں کی جان و مال کا بیمہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو بالکل تعجب کی بات نہیں ہو گی۔ کیونکہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کا بیمہ کرنا انشورنس کمپنیوں کے لئے فائدے کے بجائے خسارے کا سودا بن گیا ہے!

اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ اکثریت کے ان مظالم کا عدالت کے ذریعہ دفعیہ ہو سکتا ہے تو وہ یا تو قانون کی حدود کو نہیں جانتا یا پھر اصلاح حال کے لئے قانون کا حوالہ دے کر غلط فہمی پیدا کرنا چاہتا ہے کہ مسئلہ زیادہ سنگین نہیں، معمولی درجہ کا ہے کیونکہ معمولی اور چھوٹے مسائل ہی کو قانون کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل فریب اور دھاندلی ہے کہ موجودہ حالات کو قانونی طور پر قابل حل مسائل کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ یہ تو ملکی پیمانے پر ایک منظم غارت گری ہے جس میں حکومت پولیس فوج، سرکاری عملہ، اور اکثریتی فرقہ سب کے سب شریک ہیں۔ ایک ایسے ہمہ گیر طوفان کو قانون کے ذریعہ ٹالنے کی کوشش کرنا قانون اور مظلوم فرقہ دونوں کا مذاق اڑانا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس طوفان میں کون فیصلہ دے گا اور وہ کون ہو گا جو اس فیصلے کا نفاذ عمل میں لائے گا۔

انتخابی طاقت کا استعمال تیسری چیز جس پر سیاسی انداز میں سوچنے والے لوگ مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں بھروسہ کر رہے ہیں، وہ انتخابی طاقت کا استعمال ہے۔ اس کی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک کا انحصار اسمبلی کی ممبری پر ہے اور دوسرے کا انحصار مسلم ووٹوں کی تعداد پر۔ پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے نمائندے اسمبلیوں میں بھیج کر وہاں اپنی آواز پیدا کریں۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمان خود تو اسمبلیوں میں نہ جائیں۔ البتہ الکشن کے موقع پر اپنے ووٹوں کا سودا کیا جائے یعنی تمام مسلمان دو ٹرمل کر اپنا ایک انتخابی شرائط

نامہ (MAN DATE) تیار کریں جس میں بتایا گیا ہو کہ وہ صرف اس پارٹی کے حق میں اپنی رائیں استعمال کر سکتے ہیں جو کامیاب ہونے کے بعد ان کے فلاں فلاں کام کرنے کا وعدہ کرے۔ اس طرح جو پارٹی ان کی شرائط مان لے مسلمان اس کے نمائندوں کو اپنا ووٹ دیں۔ اس طریقے کو استعمال کر کے مسلمان انتخابی معاہدوں کے ذریعہ ہر پانچ سالہ مدت کے لئے اپنے مقاصد کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

بظاہر یہ تجویزیں بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں لیکن گہرائی سے دیکھئے تو ان کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہماری کچھ سیاسی تمناؤں نے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے واقعات کی دنیا سے صرف نظر کر کے اپنے خیال کی دنیا میں ایک فرضی قلعہ تعمیر کر لیا گیا ہے۔

اب پہلی صورت کو لیجئے اس کی دو ممکن صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان اپنے کچھ افراد کو خود اپنی طرف سے الکشن میں کھڑا کریں اور انھیں کامیاب کر کے اپنے قومی نمائندے کی حیثیت سے اسمبلی میں بھیجیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمان افراد دوسری سیاسی پارٹیوں کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں اور ان کے زینے کو استعمال کر کے اسمبلی کی نشستوں تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

اس سلسلے میں جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے، وہ صرف ان چند انتخابی حلقوں میں کارگر ہو سکتی ہے۔ جہاں مسلمان اب بھی اکثریت میں ہیں۔ اپنے اکثریتی علاقوں ہی میں مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی آدمی کامیاب کر سکیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے انتخابی حلقے سارے ملک میں صرف چند ہی ہیں[1]۔ پھر جمہوری نظام میں جہاں سارے فیصلے عددی طاقت کی بنیاد پر ہوتے ہیں، آپ کے چند نمائندے اگر کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچ بھی جائیں تو وہ کسی فیصلے پر کیوں کر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف احتجاجی تقریریں کر سکتے ہیں۔ جیسے یوپی اسمبلی میں گاؤکشی بل پیش ہونے کے موقع پر بعض مسلمان ممبروں نے شدید تنقیدیں کی تھیں۔ مگر ہر دانا شخص جو [illegible] جانتا ہے کہ اس طرح کی احتجاجی تقریروں کی حیثیت اس کے

---

[1] اب تو حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ انتخابی حلقے (CONSTITUENCIES) کی تقسیم میں مسلم اکثریت والی آبادیوں کی اس طرح قطع و برید کر دی جائے کہ ان کی عددی اکثریت انتخابات میں عملاً غیر مؤثر ہو جائے۔

سوا اور کچھ نہیں کہ ـــــ "کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔"

اسی طرح دوسری سیاسی پارٹیوں کے ٹکٹ پر کھڑے ہو کر اسمبلی میں پہنچنا بھی مسلمانوں کے قومی مسئلے کے حل کے لئے بالکل بے سود ہے کیونکہ جو مسلمان اس طرح کامیاب ہوتے ہیں وہ بحیثیت مسلمان اسمبلی کے ممبر نہیں ہوتے بلکہ وہ اس مخصوص پارٹی کے نمائندے ہوتے ہیں جس کے زینے کو استعمال کر کے وہ اس کرسی تک پہنچے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ مکمل طور پر پارٹی کی پالیسیوں کا احترام کریں۔ ایسے مسلم ممبروں سے یہ امید کرنا کہ وہ مسلمانوں کے قومی مسائل میں ان کے کچھ کام آسکیں گے، ایک خیال خام کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں میں یہ عبرت انگیز واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۵۱ء میں جب یوپی اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ ریاست کی سرکاری زبان ہندی ہوگی جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی، تو اس وقت کے ایک مسلم ممبر مولوی عبدالباقی صاحب (اعظم گڈھ) نے ایک ترمیم پیش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اصل تجویز میں حسب ذیل الفاظ بڑھا دئے جائیں:

"اور اردو بھی فارسی رسم الخط کے ساتھ" [1]

یہ ترمیم اردو کی بقا کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہے، اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس کو اسمبلی کے مسلم ممبروں کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ یوپی اسمبلی میں اس وقت مسلمان ممبروں کی مجموعی تعداد ۸۰ تھی لیکن جب رائے شماری ہوئی تو ۸۰ ممبروں میں سے صرف پانچ نے ترمیم کے حق میں ووٹ دیئے۔ باقی یا تو غیر حاضر رہے یا پھر انھوں نے کانگریس کی اصل تجویز کے حق میں ووٹ دیئے۔ ایک بزرگ نے تقریر میں تو مولوی عبدالباقی صاحب کی ترمیم کی حمایت

---

[1] واضح ہو کہ یہ ترمیم کوئی انوکھی چیز نہیں تھی کیونکہ کانگریس خود پہلے اسی نظریہ کی مبلغ رہی ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۵ء میں کہا تھا۔

"(آزاد ہندستان میں) رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ (فارسی اور دیوناگری) دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے اور لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ وہ جس خط میں چاہیں لکھیں۔" ـــــ آٹو بیاگرافی

کی مگر رائے شماری کے وقت ترمیم کے خلاف ووٹ دیا۔ ایک صاحب غیر جانبدار رہے۔ مولوی عبدالباقی صاحب کے بیان کے مطابق ان مسلمان نمائندوں نے اردو کی مخالفت اس لئے کی تھی کہ کانگریس ان سے خفا نہ ہو اور اگلے الکشن میں انھیں اپنے ٹکٹ سے محروم نہ کرے۔ (سیاست جدید ۲۲ دسمبر ۱۹۵۱ء) زبان کے بارے میں حکومت کا یہ فیصلہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ہمارے نمائندوں نے اپنی سیاسی موت کے اندیشے کو قوم کی موت کے مسئلے پر ترجیح دی۔ کیوں، اس لئے کہ یہ لوگ اگرچہ مسلمان تھے، مگر وہ کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچے تھے، اس لئے انھیں وہی کرنا تھا جو کانگریس چاہتی ہو۔

اسی طرح انتخابی معاہدہ (MAN DATE) کی جو صورت ہے، وہ بھی ایک دلفریب تخیل سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک ایسی تجویز ہے جو بار بار دہرائی گئی ہے اور بار بار ناکام ہوئی ہے۔ ہر بار الیکشن کے موقع پر مختلف پارٹیاں جو منشور (MANIFESTO) شائع کرتی ہیں وہ کیا ہے۔ یہ در اصل ووٹروں کی اپنی تمنائیں ہیں جن کو پارٹیاں اپنے ارادے کی شکل میں ظاہر کرتی ہیں۔ انتخابی مینی فسٹو پارٹی پروگرام سے زیادہ اس مقصد کے پیش نظر تیار کیا جاتا ہے کہ اس میں ان ووٹروں کے حوصلوں کی ترجمانی ہو سکے جن سے پارٹی کو ووٹ حاصل کرنا ہے۔ تاکہ وہ اس امید کے ساتھ اس پارٹی کو ووٹ دیں کہ — "جو کچھ ہم چاہتے ہیں، وہی کرنے کے لئے یہ لوگ اسمبلی میں جا رہے ہیں"۔ یہ مینی فسٹو اپنی حقیقت کے اعتبار سے مین ڈیٹ کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ جو کچھ ووٹر چاہتے ہیں، مینی فسٹو میں پارٹی خود اپنی زبان سے وہی کہہ دیتی ہے۔ جو انتخابی شرائط نامہ آپ اپنی طرف سے پیش کر کے ان سے منظور کرانا چاہتے ہیں، وہی وہ خود لکھ کر آپ کو دیدیتے ہیں۔ اس طرح گویا ہر پارٹی جو کسی الیکشن میں ووٹروں کو متاثر کر کے کامیاب ہوتی ہے، وہ دراصل اپنے ووٹروں سے ایک غیر تحریری مین ڈیٹ پر دستخط کرتی ہے۔ وہ ان سے ایک قطعی معاہدہ کرتی ہے۔ پھر کیا ان انتخابی معاہدوں کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔ کیا ووٹروں سے کئے ہوئے وہ وعدے کبھی پورے ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ووٹروں نے انھیں اپنے ووٹ دیئے تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انتخابی وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ وہ سیاسی بازیگری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ

ووٹروں کی وہ تمنائیں جن کو پارٹیاں یہ حیثیت دیتی ہیں کہ ان کو اپنا ذاتی پروگرام بنا کر پیش کریں۔ جب ان کا یہ حشر ہوتا ہے تو ان تمناؤں کا کیا انجام ہوگا جن کو کمیشن کر درج فہرست کرایا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے انتخابی معاہدوں سے امیدیں باندھے ہوئے ہیں وہ ایک ایسے تجربے کو آزمانا چاہتے ہیں جو بار بار دہرایا گیا ہے اور بار بار ناکام ہوا ہے۔

پھر مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدے تو اور زیادہ ناپائدار ہیں کیونکہ ہم جو تحفظات اور مقاصد اس ملک میں حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ملک کے جمہوری مزاج اور اکثریتی فرقے کے حوصلوں کے بالکل خلاف ہیں۔ وہ ملک کے سماجی منصوبوں سے براہ راست ٹکرانے والے ہیں۔ پھر کون پارٹی ہوگی جو عملی سیاست میں ان دو طرفہ تقاضوں کو نباہ سکے وہ مسلمانوں کو بھی خوش رکھے اور اپنے دوسرے ووٹروں کو بھی خفا نہ ہونے دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی پارٹی ہم سے ہمارے واقعی حوصلوں کے مطابق کوئی معاہدہ کرلے تو ایسا کاغذی معاہدہ قطعی طور پر سیاسی مصلحت کی وجہ سے ہوگا جس کو اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ خود ہی دفن کر دے گی۔ کیرلا کے تجربے میں اس کی مثال بھی ہمارے سامنے آچکی ہے۔ تیسرے عام الکشن میں کانگریس نے کیرلا میں وہاں کی مسلم لیگ سے انتخابی سمجھوتہ کیا تھا۔ اس سمجھوتہ کا اصل مقصد ریاست میں کمیونسٹ پارٹی کا مقابلہ کرنا تھا۔ کانگریس اپنے اس مقصد میں کامیاب رہی۔ اور الکشن کے بعد کیرلا مسلم لیگ کے ایک لیڈر مسٹر محمد کو یا ریاستی اسمبلی کے اسپیکر بنا دیئے گئے۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا۔ نومبر ۱۹۶۱ء میں مسٹر کویا کو اسپیکری سے استعفا دینا پڑا۔ انھوں نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "کانگریس کے شاملاکوں کے گوشت کے مطالبے کی وجہ سے مسلم لیگ — کانگریس کا اتحاد برقرار رکھنا ناممکن ہوگیا ہے۔"

خلا کہاں ہے

آپ کہیں گے پھر کیا ہم احتجاج اور مطالبات کی مہم کو ترک کردیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ ترک نہ کیجئے بلکہ اس مہم میں اپنے خدا کو بھی شریک کرلیجئے۔ اگر آپ ایسا کرسکیں تو یکایک آپ دیکھیں گے کہ طاقت کا توازن بدل گیا ہے کیونکہ خدا اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت

ہے۔ وہ جس کے ساتھ ہو جائے وہ کمزور نہیں رہتا۔ وہ جس کو غالب کرنا چاہے، کوئی اسے زیر نہیں کر سکتا۔ مذکورہ بالا تمام تدبیریں جن پر مسلمان اپنے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں اعتماد کر رہے ہیں، وہ سب اپنی مجرد شکل میں مسئلے کو معبودِ حکومت اور معبودِ عوام کے سامنے پیش کرنے کی صورتیں ہیں۔ مگر آپ کے مسئلے کا حقیقی حل یہ ہے کہ آپ اس کو اپنے معبودِ برحق کے سامنے پیش کریں۔ آپ اس کے لئے اپنے خدا سے درخواست کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمان اگر چھوٹے معبودوں کو چھوڑ کر اپنے مالک کی طرف پلٹ آئیں اور اس زمین پر یہ واقعہ ظہور میں آئے کہ آخری رسول کی امت اپنے رب کو پکار کر یہ کہہ رہی ہو کہ —— "خدایا تیرے بندوں پر ظلم ہو رہا ہے تو ان کی مدد فرما۔" تو میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے مصر میں بنی اسرائیل کو فرعون کے تسلط سے نجات دی تھی، تمھاری دعا کے ختم ہونے سے پہلے یہاں کے زمین و آسمان بدل چکے ہوں گے اور اگلے روز دیکھنے والے دیکھیں گے کہ اس ملک میں ایک نیا انقلاب آچکا ہے، جس طرح اس سے پہلے دیکھنے والوں نے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں۔

یہ شبہ نہ ہو کہ میں دنیوی تدبیروں کو بالکل بے کار اور قابلِ ترک قرار دے رہا ہوں۔ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم کا حکم تو خود قرآن میں موجود ہے۔ مگر دنیوی تدبیروں کے امکانی استعمال کے ساتھ دوسری حقیقت جو بتائی گئی ہے، وہ ہے وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ اور یہی وہ پہلو ہے جس پر میں اس وقت زور دینا چاہتا ہوں میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ تدبیریں اگر اپنے پیچھے محض وہ سیاسی اور آئینی قوت رکھتی ہوں جن کے حوالے سے انھیں پیش کیا گیا ہے، تو بلا شبہ وہ قطعاً بے اثر اور لاحاصل ہیں۔ محض آئینی دفعہ یا سیاسی طریق کار ہونا ان کے اندر وہ وزن پیدا نہیں کر سکتا جو ان کو بالفعل مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے آئین اور قانون چند الفاظ کا نام ہے اور اسی قسم کے کچھ دوسرے الفاظ سے بآسانی انھیں رد کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سیاسی طریق کار کی کامیابی انسانوں کی نیتوں اور ارادوں پر موقوف ہے اور انسان کی نیتیں و ارادے جتنا ذاتی اغراض کے قبضے میں ہوتے ہیں، اتنا کسی اصول اور معاہدے کے قبضے میں نہیں ہوتے۔ اس قسم کی کوئی جدوجہد اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب مزید کسی برتر ذریعہ سے اسے قوت پہنچی

ہو جب قضا و قدر کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا ہو۔

قرآن کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ محض کسی اصولی اور نظریاتی امکان نے کبھی کسی گروہ کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کیا ہے اور نہ صرف نظری طور پر ایک عمدہ سیاسی طریق کار کا انکشاف کسی جدوجہد کو اس کے مطلوب انجام تک پہنچانے کی کافی ضمانت ہے۔ کوئی بھی تحریک جو کامیاب ہوئی ہے وہ اسی وقت کامیاب ہوئی ہے، جب خارجی حالات ـــــ ایسے حالات جو کسی کے بس میں نہیں اور نہ ان کے بارے میں پیشگی کوئی اطلاع دی جا سکتی ہے ـــــ ان میں کوئی غیر معمولی تبدیلی تحریک کے مساعد ہو جائے۔ اور جو تحریک ناکام ہوئی ہے وہ اسی لئے ناکام ہوئی ہے کہ اس قسم کے حالات اس کے لئے پیدا نہیں ہو سکے۔ تاریخ میں ایسا بہت ہوا ہے کہ کسی تحریک کے لیڈر اپنے پروگرام کی نظری خوشنمائی پر مطمئن ہو کر سمجھنے لگے کہ وہ بہر حال کامیاب ہو کر رہیں گے۔ انھوں نے تحریک شروع کی اور بظاہر کافی نمایاں نظر آنے لگے۔ مگر اچانک قضا و قدر کے ایک فیصلے نے ان کے سارے عزم کو اس طرح لپیٹ کر رکھ دیا جیسے وہ بچوں کا گھروندا تھا جو ہوا کے جھونکے سے منتشر ہو گیا۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ بس اب یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اب اس کے غالب آنے کا کوئی امکان نہیں، اور اس کے بعد اچانک حالات میں ایک تبدیلی ہوتی ہے اور لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں کہ جو آگے تھا وہ پیچھے کر دیا گیا ہے اور جو پیچھے تھا اس کو اگلی نشستوں پر جگہ مل گئی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں روس میں کمیونسٹ تحریک کی کامیابی ایک ایسا واقعہ ہے جس کا انیسویں صدی کے اشتراکی مفکرین نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر روس میں اشتراکیت کیسے کامیاب ہوئی۔ اس کی واحد وجہ پہلی جنگ عظیم ہے جس نے زار کی حکومت کو بیحد کمزور اور وہاں کی پبلک کو سخت بیزار بنا دیا تھا۔ یہی وہ نازک حالات تھے جس نے وہاں کی کمیونسٹ تحریک کو یہ موقع دیا کہ وہ زار شاہی کے تخت کو الٹ کر سرخ شہنشاہیت قائم کر سکے۔ اسی طرح یہ واقعہ ہے کہ اگر دوسری جنگ عظیم نے برطانیہ عظمیٰ کو بے جان نہ کر دیا ہوتا تو ہندستان کو "یوم آزادی" منانے کے لئے شاید کسی اور ۱۵ اگست اور کسی دوسرے ۱۹۴۷ء کا انتظار کرنا پڑتا۔

سنہ ۱۹۴۵ء کے آغاز میں جب دوسری جنگ عظیم آخری مرحلوں سے گزر رہی تھی، بحر اسود کے کنارے ایک پر فضا روسی شہر یالٹا میں روس، امریکہ اور برطانیہ کے "بڑوں" کی کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس ۴ فروری سے ۱۱ فروری تک جاری رہی جس میں بہت سے فیصلے کئے گئے۔ دنیا کا موجودہ نقشہ بہت حد تک انھیں فیصلوں کا رہین منت ہے۔ اسی کانفرنس کے فیصلے کے مطابق روس کو یہ موقع ملا کہ وہ جرمنی سے لے کر بلغاریہ تک مشرقی یورپ کے ایک بڑے حصہ پر قابض ہو جائے اور اسی طرح اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ویٹو کا اختیار (VETO) (حق استرداد) جو عملاً آج امریکہ اور برطانیہ کے لئے غیر مفید ہے۔ مگر روس کے لئے مغربی طاقتوں کے مقابلے میں ایک قیمتی ہتھیار ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں بھی اسی کانفرنس میں فیصلہ ہوا تھا۔ اب اگر دوسری جنگ عظیم کا مہیب واقعہ وجود میں نہ آتا اور اٹلی اور جرمنی اور جاپان کے اتحاد سے نازک صورت حال نہ پیدا ہو گئی ہوتی اور بالکل معتدل حالات میں چرچل، روزولٹ اور اسٹالن ایک کانفرنس میں جمع ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ پانچ لاکھ الفاظ پر مشتمل یہ معاہدہ وجود میں آسکے۔

ابھی دو سال پہلے خود اپنے ملک میں ہم یہ منظر دیکھ چکے ہیں کہ چین کے حملے نے کس طرح حیرت انگیز طور پر سارے مسلمات بدل دیئے تھے۔ ہندستان جو اپنی غیر جانبداری پر فخر کرتا تھا اور دھڑے بندی کی سیاست کے لئے اس کے پاس نفرت آمیز الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہاں کھلم کھلا امریکن بلاک میں شمولیت کی تجویزیں پیش ہونے لگیں۔ پاکستان کے مقابلے میں یکایک سوچنے کا انداز بدل گیا اور دفاعی معاہدے سے لے کر آپس کے انتہائی نازک مسائل پر سمجھوتہ تک کی باتیں کی جانے لگیں پنڈت نہرو جو اس ملک کے دیوتا بن چکے تھے، ان کے بارے میں "نہرو استعفا دو" کے نعرے سنائی دینے لگے دہلی کے ایک اخبار نے اسی زمانے میں لکھا تھا "پنڈت نہرو نے کانگریس سے باہر سارے ملک کو اپنے خلاف کر لیا ہے اور اب کمیونسٹوں کے سوا کوئی ان کے ساتھ نہیں" اس نے لکھا کہ "پنڈت نہرو مخالف پارٹیوں کی تنقید کو غلط قرار دینے کے لئے دوسرے ملکوں کی مثال دیتے ہیں۔ کہ ملک کو کوئی خطرہ ہو تو تمام سیاسی پارٹیاں حکومت کی پشت پر ہو جاتی ہیں لیکن

وہ کیوں بھول گئے کہ پہلی جنگ یورپ میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر اسکوئتھ کی جگہ مسٹر لائڈ جارج نے اور دوسری جنگ یورپ میں مسٹر چیمبرلین کی جگہ مسٹر چرچل نے لے لی تھی۔" دوسرے لفظوں میں یہ کہ پنڈت نہرو کو حکومت چھوڑ دینی چاہئے تاکہ دوسرے بہتر لوگ ان کی جگہ لے سکیں۔

تحریکوں کی کامیابی کا راز اسی طرح کے غیر معمولی حالات کے پیدا ہونے میں ہے۔ اس طرح کے موافق حالات گویا وہ انقلابی زینہ فراہم کرتے ہیں جس کو استعمال کر کے تحریک یکایک آگے بڑھ جاتی ہے۔ کوئی تحریک محض اپنی عام اور مقررہ رفتار سے چلتی ہوئی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچتی۔ بلکہ ایک خاص مرحلے میں اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جو اس کے مفر کو کم کر کے اسے آگے بڑھا دیتا ہے جن تحریکوں کے لئے ناکامی مقدر ہوتی ہے وہ اٹھتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور جنھیں کامیاب ہونا رہتا ہے وہ اٹھتی ہیں اور چلتی رہتی ہیں یہاں تک کہ زمانہ ان کیلئے ایک ایسا زینہ فراہم کرتا ہے جہاں سے چھلانگ لگا کر وہ کامیابی کے مقام تک پہنچ جاتی ہیں ایسی تحریک کا چلنا دوسرے لفظوں میں اس وقت کا انتظار کرنا ہوتا ہے جب زمانہ اس کو چھلانگ لگانے کا یہ موقع عطا کریگا، ہر وہ تحریک جو کبھی اس زمین پر کامیاب ہوئی ہے اس کے ساتھ یہی قصہ پیش آیا ہے۔ اشتراکی تحریک کے لئے پہلی جنگ عظیم نے یہ زینہ فراہم کیا تھا، ہندستان کی تحریک آزادی کیلئے دوسری جنگ نے اس قسم کے زینے کا کام کیا۔ اسی طرح صدر اول کی اسلامی تحریک کے لئے مدینے کے باشندوں کا یکایک بڑی تعداد میں اسلام قبول کر لینا وہ زینہ ہے جس سے اسلامی تحریک جست لگا کر آگے بڑھ گئی اور سارے عرب پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

حالات میں اس قسم کی غیر معمولی تبدیلیاں کسی شخص یا تحریک کے بس میں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا فیصلہ کائنات کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ زمانہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ جب بھی زمانہ کسی تحریک کو کامیابی کا موقع دیتا ہے تو وہ دراصل اس کے حق میں خدا کا فیصلہ ہوتا ہے جو زمانے کے حالات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ باطل گروہوں کے ساتھ یہ معاملہ کچھ دوسرے اسباب و مصالح کے تحت ہوتا ہے اور اہل اسلام کے ساتھ اس لئے ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار بندوں کو ان کی وفاداری کا صلہ دے تاکہ ان کے لئے دین پر عمل کرنے کو آسان بنا دے۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں میں آپ کو لانا چاہتا ہوں۔ اس ملک کے مسلمان جن حالات

میں گھر گئے ہیں۔ اس سے نکلنے کی سبیل محض سیاسی پروگرام اور کسی آئینی جدوجہد میں نہیں ہے۔ اگرچہ ہم کو یہ سب بھی کرنا ہے —— ان سے نکلنے کا امکان تو اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ حالات کو ہماری جدوجہد کے لئے سازگار بنا دے۔ جب زمین و آسمان کا مالک مافوق ذرائع سے سیاسی اور تمدنی چٹانوں میں ایسے درّے پیدا کر دے جس سے نفوذ کر کے ہم آگے جا سکتے ہوں۔ وہ ایسی موافق آندھیاں چلائے جس سے ایک طرف مخالف کیمپ کی طنابیں اکھڑ جائیں اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کی راہ ہموار ہو رہی ہو، وہ ایسی بارش برسائے جو ایک کے لئے کیچڑ اور دلدل بنے اور دوسرے کے لئے سیرابی اور تازگی کا سامان فراہم کرے۔ وہ ایسا زلزلہ پیدا کرے جس سے بلندیاں پست ہو جائیں اور پستیاں ابھر کر اوپر آجائیں۔ وہ ایک فریق کے اوپر "رعب" اور دوسرے فریق کے اوپر "امنہ" نازل کرے۔ جب تک اس قسم کی غیر معمولی آسمانی مدد ہمارے ساتھ نہیں ہوگی کسی بھی قسم کی سیاسی اور قانونی مہم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی عقل کا تاریخ کا اور قرآن کا متفقہ فیصلہ ہے۔

خدا کی مدد کب آتی ہے

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے مقدمے کی کامیابی کا راز آئین کی ورق گردانی میں نہیں ہے بلکہ خدا کی نصرت کا استحقاق پیدا کرنے میں ہے۔ آئین کی دفعات بھی حقیقۃً اسی وقت ہمارے مقدمے کو مضبوط کر سکتی ہیں جب خدا کی غیر معمولی عنایات ہماری طرف مائل ہو گئی ہوں۔ اس استحقاق کا راز کیا ہے۔ اس کا جواب خدا کی کتاب میں ملے گا۔ وہ کتاب جو قیامت تک کے انسانوں کے لئے "ہدایت" ہے، جس کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ —— فِيهِ ذِكْرُكُمْ آیئے ڈھونڈیں کہ ہمارا نام اس کتاب میں کہاں لکھا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سوال کا جواب قدیم حاملین کتاب الٰہی کے واقعات میں ہے فرعون کے زمانے میں مصر میں بنی اسرائیل کے جو حالات تھے، اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج اس ملک میں ٹھیک انھیں حالات سے دوچار ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی، بنی اسرائیل کی مصری زندگی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس لئے بنی اسرائیل کو اس وقت جو حل بتایا گیا تھا وہی اس وقت ہمارے مسئلہ کا بھی حل ہے۔ انھوں نے اپنے معاملے میں جس طرح خدا

کی مدد حاصل کی تھی، اسی طرح ہم بھی آج اپنے آپ کو خدا کی مدد کا مستحق بنا سکتے ہیں۔ جب فرعون نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی نسل سرزمین مصر سے ختم کر دی جائے اور ان پر سخت ترین مظالم ڈھانے شروع کئے تو ان کے پیغمبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کا جو حل انھیں بتایا تھا، وہ یہ تھا:—

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ قَالُوا أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ

(اعراف ۱۲۹ — ۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ ملک اللہ کا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور انجام تو صرف متقیوں کے لئے ہے۔ بنی اسرائیل کے لوگوں نے کہا تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جا رہے تھے اور تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ پیغمبر نے جواب دیا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین کا اقتدار تم کو عطا کرے۔ پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

یہ الفاظ کسی تاریخ کی کتاب کے نہیں ہیں بلکہ خدا کی کتاب قرآن کے ہیں جو قیامت تک کے لئے ہدایت نامہ بن کر آیا ہے۔ جو اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس کے ماننے والے اس سے اپنے تمام سوالات کا جواب معلوم کریں۔ ان الفاظ میں دراصل کائنات کا مالک ہم کو ایک پیغام دے رہا ہے۔ یہ سابق حاملین کتاب کی سرگزشت کی صورت میں موجودہ حاملین کتاب کے مسئلہ کا حل ہے جو قرآن میں ہمیں بتایا گیا ہے۔

اس اقتباس میں بنی اسرائیل کے قومی مسئلے کا جو حل بتایا گیا ہے، وہ دو نکات پر مشتمل ہے۔ استعانت باللہ اور صبر۔ ٹھیک یہی بات سورہ یونس میں کہی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں استعانت باللہ اور صبر کے بجائے اقامت صلوٰۃ اور توکل کے الفاظ ہیں۔ یہ دونوں لفظ بظاہر دو قسم کے ہیں۔ مگر وہ حقیقۃً بالکل ایک ہیں۔ استعانت باللہ دراصل نماز کی روح ہے اور صبر و توکل ایک ہی حقیقت کے اظہار کے لئے دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس دوسرے مقام پر اسی کے ساتھ انھیں یہ بشارت بھی

دی گئی ہے کہ اگر تم نے اس پروگرام پر عمل کیا تو یقیناً تمھارے لئے خدا کی طرف سے "رزق طیب" اور "مُبَوَّءَ صِدْقٍ" کا انتظام کیا جائے گا (یونس - ۹۳) آیت کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ	اور موسیٰ نے کہا، اے میری قوم اگر تم اللہ
اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ	پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم
كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى	واقعی مسلم ہو۔ وہ بولے، ہم نے اللہ پر بھروسہ
اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا	کیا۔ خدایا ہم کو ان ظالموں کے لئے فتنہ
فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا	نہ بنا۔ اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں
بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝	کے مقابلے میں نجات عطا کر۔ اور موسیٰ اور
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ	ہارون کو ہم نے وحی بھیجی کہ مصر میں اپنی
اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا	قوم کے لئے کچھ گھر مقرر کر لو اور ان گھروں
وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ	کو قبلہ بنالو اور نماز قائم کرو اور ایمان
اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ وَبَشِّرِ	والوں کو خوش خبری دے دو ۔
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس ۸۴ - ۸۸)	

اب دیکھئے کہ یہ پروگرام ہم سے کن کن چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے ۔۔۔۔

۱۔ ان آیات میں خاص طور پر دو چیزوں کا ذکر ہے ۔۔۔۔ استعانت باللہ اور صبر۔ مگر یہ ہدایت جنھیں دی گئی وہ ہماری طرح کوئی منتشر اور متفرق لوگ نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک "قوم" تھی جس کا ایک "موسیٰ" تھا۔ یہ نبی کی قیادت کے تحت ایک منظم گروہ تھا جو نبی کے حکم سے چلتا تھا۔ اور نبی کے حکم سے رکتا تھا جس کے سارے معاملات نبی کے ارشادات کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ہندستان کے مسلمان اس طرح کی کوئی قوم نہیں ہیں اور نہ ان کے درمیان کوئی "موسیٰ" ہے۔ وہ ایک منتشر ریوڑ ہے جس کا کچھ حصہ جنگل میں کھو گیا ہے اور کچھ میدانوں میں بکھرا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے اندر اس اجتماعی حالت کو پیدا کریں جو ان احکام کے نزول کے وقت بنی اسرائیل میں موجود تھی کیونکہ اس کے بعد ہی ہم ان

ارشادات الٰہی کے مخاطب ہو سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آج ہمارے درمیان ایک شخص ہو جو ہم سے علیہ توکلوا کا مطالبہ کرے اور اس کے جواب میں قوم ہم آواز ہو کر کہے کہ علی اللہ توکلنا۔ اس کے بعد ہی ہم نصرت الٰہی کے استحقاق کی دوسری صفات اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں، اس کے بعد ہی ہم وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْن کا مصداق بن سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اجتماعی معاملات میں کوئی نتیجہ اجتماعی کوششوں ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ عمومی خشک سالی انفرادی دعاؤں سے نہیں ٹلتی۔ مگر جب بہت سے مسلمان جمع ہو کر یکجائی طور پر اس کی دعا کرتے ہیں تو یکایک آسمان میں بادلوں کے ٹکڑے تیرنے لگتے ہیں اور نماز ختم ہوتے ہی بارش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آج ہم جن اجتماعی مشکلات سے دوچار ہیں، ان کے سلسلے میں خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ہم اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب اجتماعی طور پر ہم نے اس کے استحقاق کا ثبوت دیا ہو۔

اجتماعیت سے مراد کمیونسٹ پارٹی کی طرح کوئی سخت قسم کی تنظیم نہیں ہے اور نہ یہ مراد ہے کہ اس کا کوئی ممبری فارم ہو اور ہر مسلمان اس فارم کی خانہ پری کر کے اس کا ممبر بنا ہو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں، وہ جس بستی میں ہوں ایک متحدالرائے دینی خاندان کی طرح رہیں، ذاتی اور جزوی معاملات یا فقہی مسالک میں اختلاف کے باوجود قومی سطح کے معاملات میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں ان کی مالیات کا اجتماعی نظم ہو، ان کے تعلیمی اور مذہبی مسائل اجتماعی سطح پر طے ہوتے ہوں وہ ایک آواز پر جمع ہو سکیں، اور ایک محاذ پر اپنی قوت لگا سکیں جس طرح ان کی مسجد کا ایک امام ہوتا ہے، اسی طرح ان کے قومی معاملات کا ایک سربراہ ہو جس پر سب اعتماد کریں اور جو سب کو ساتھ لے کر چل سکے ——— اس طرح کی اجتماعیت خواہ بظاہر کتنی ہی مشکل معلوم ہو۔ مگر "خدا کا ہاتھ" ایسی ہی اسلامی جماعت کے اوپر ہوتا ہے اس کے بغیر جماعتی سطح پر کسی گروہ کیلئے خدا کی سرپرستی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اس ابتدائی اہتمام کے بعد جو چیز سب سے پہلے ضروری ہے وہ استعانت باللہ ہے یعنی خدا سے مدد مانگنا۔ ہماری کامیابی کا راز سب سے بڑھ کر اس واقعہ میں ہے کہ ہماری جدوجہد میں خدا ہمارے ساتھ شریک ہو گیا ہو۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم خود اس کے لئے خدا کے آگے

طالب بن کر حاضر ہوئے ہوں۔ اگر ہم اپنے معاملے میں خدا کی مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم نے خدا سے اس کی درخواست کی ہو کیونکہ خدا کی مدد کسی کو خود بخود نہیں مل جاتی۔ خدا تو اسی کو دیتا ہے جو اس سے مانگے۔ جو اس سے بے نیازی ظاہر کرے، خدا اس سے بھی زیادہ اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

مادہ پرست ذہن سمجھتے ہیں کہ کسی کو ملنا اور کسی سے چھننا، یہ سب مادی اسباب کے تحت ہونے والے واقعات ہیں، وہ "ظاہر حیات" کو اصل حقیقت سمجھے ہوئے ہیں مگر اس دنیا کا اصل حاکم اور کارساز خدا ہے، وہی سارے واقعات کو وجود میں لاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "خدا کی مدد" کوئی موہوم لفظ یا محض ایک پراسرار قسم کا مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو بار بار کے تجربے میں اپنی واقعیت ظاہر کر چکی ہے۔

یہاں میں ایک واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ تقریباً ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے علاقے میں سخت خشک سالی ہوئی۔ برسات کا موسم گزرتا جا رہا تھا۔ مگر بارش کا کہیں پتا نہیں۔ کسان روزانہ صبح اٹھتے ہی آسمان کی طرف دیکھتے تھے مگر بادل کا ایک ٹکڑا بھی کہیں نظر نہ آتا تھا جس سے دل کو تسکین ہو۔ بالآخر جب مایوسی حد کو پہنچ گئی تو یہ تحریک ہوئی کہ استسقا کی نماز پڑھی جائے۔ اعظم گڈھ سے پندرہ میل کے فاصلے پر ایک میدان میں اطراف کی تمام بستیوں کے مسلمان جمع ہوئے۔ مرحوم مولانا محمد سعید صاحب ندوی، جو اس وقت مدرسۃ الاصلاح (سرائمیر) میں حدیث کے استاد تھے، انھوں نے نماز پڑھائی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہم لوگ سخت چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سفر کرکے وہاں پہنچے تھے اور اس حال میں نماز ادا کی تھی کہ جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ مگر نماز سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ واپس ہوئے تو راستے ہی میں بارش شروع ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے درختوں کے نیچے پناہ لی اور کچھ بھیگتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

یہ کوئی اتفاقی یا منفرد واقعہ نہیں بلکہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لئے یہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ کتنی ہی بار ایسے خدا نے ہم کو یہ منظر دکھایا ہے کہ خشک سالی میں عام مسلمانوں نے جمع ہو کر استسقا کی نماز پڑھی اور اس کے بعد ہی آسمان سے پانی کا سیلاب امنڈ پڑا۔ یہ تجربات

ایک طرف اس بات کا ثبوت ہیں کہ دنیا کا انتظام کسی اندھی بہری طاقت کے تحت نہیں ہے بلکہ وہ دیکھنے اور سننے والے خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بندوں پر مہربان ہے اور جب بندے اسے پکارتے ہیں تو وہ نظام عالم میں تغیر کر کے ان کی مدد فرماتا ہے۔ دوسری طرف اسی تجربے میں اس سوال کا جواب بھی ہے جو آج ہندستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ پریشان کئے ہوئے ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ اس خدا سے مدد مانگو جو سورج نکالتا ہے اور پانی برساتا ہے۔ جو تمہاری ایک دعا پر اپنے بادلوں کو لئے ہوئے تمہارے پاس دوڑا چلا آتا ہے۔ تم پکارو تو وہ پھر تمہارے پاس آئے گا، تم اس سے مدد مانگو تو وہ تمہاری مشکل کو آسان کر دے گا۔

جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، استعانت باللہ کی جگہ قرآن میں دوسرے مقام پر "اقامت صلوٰۃ" کا لفظ آیا ہے (یونس - ۸۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استعانت باللہ کی روح پیدا کرنے کا حقیقی ذریعہ کیا ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو خدا کی مدد کو اپنی طرف کھینچتی ہے ــــــ یہ نماز ہے۔

اس بحث کے ضمن میں نماز کا ذکر بعض ذہنوں کو بہت عجیب معلوم ہوگا۔ وہ کہیں گے عملی مسائل تو عملی پروگراموں کے ذریعہ حل کئے جاتے ہیں۔ ان کا نماز اور عبادت گزاری سے کیا تعلق۔ ان میں سے کوئی شخص اگر اس ضمن میں نماز کی اہمیت تسلیم بھی کرے گا تو صرف اس لحاظ سے کہ اس سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوگی، نماز باجماعت کا نظام ان کی منتشر طاقت کو مجتمع کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ کچھ لوگ جب بار بار ساتھ مل کر ایک قسم کا عبادتی عمل کریں گے تو ان میں ایک قوم ہونے کا احساس پیدا ہوگا اور اس طرح وہ مشترک مقصد کے لئے مشترک جد وجہد کے قابل ہو سکیں گے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

نماز سے اگر اس قسم کے کچھ "فائدے" ہوتے ہوں تو مجھے اس سے انکار نہیں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ قرآن وحدیث میں سخت ترین حالات میں نماز سے "استعانت" کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد اس قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب اس خدا سے تعلق جوڑنا ہے جو انسان کا بہترین سرمایہ ہے اور جس کو مکمل طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ حالات کو جب چاہے کسی کے خلاف کر دے۔ اور جس آن چاہے کسی کے موافق بنا دے۔ قرآن میں اِسْتَعِیْنُوْا

بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃ (بقرہ۔ ۱۵۳) کا مطلب نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو کر اس سے مدد طلب کرنا ہے نہ کہ نماز کی تنظیمی طاقت سے دشمن کے مقابلہ میں فائدہ اٹھانا۔

نماز اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے محض کچھ مقررہ حرکات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ خدا سے قریب ہونے کا ذریعہ ہے۔ وہ خدا کی توجہات مائل کرنے کی تدبیر ہے، وہ اپنے کو خدا تک پہنچانے کی کوشش ہے۔ نماز آدمی کے اندر وہ کیفیات پیدا کرتی ہے جب اس کی زبان سے دعا کے وہ بہترین کلمات نکلتے ہیں جو سیدھے خدا تک پہنچنے والے ہیں، اس نماز کو جب حقیقی طور پر ہم اپنی زندگیوں میں شامل کرلیں گے اسی وقت ممکن ہے کہ ہم خدا سے مانگنے والے بن سکیں۔ جو حقیقی معنوں میں نمازی ہو وہی حقیقی معنوں میں سائل بن سکتا ہے۔

ایسی نماز جب کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ محض پانچ وقت کی نماز نہیں رہتی بلکہ وہ اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے۔ ایسا شخص خدا سے جڑ جاتا ہے وہ ایک ایسی زندگی گزارتا ہے جس میں وہ اپنے رب کو پکار رہا ہو، اس کی یاد میں مشغول ہو، اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہوں۔ اس پر خدا کا تصور اتنا چھایا ہوا ہو کہ دنیا کا ہر واقعہ کسی نہ کسی پہلو سے اس کے ذہن میں خالق کی یاد دلانے والا بن جائے۔ اقامت صلوٰۃ محض مخصوص اوقات میں کچھ الفاظ اور رکعتوں کی تکرار نہیں بلکہ وہ خدا سے تعلق قائم کرنے کی ایک مسلسل کوشش کا نام ہے۔ نمازی بندے سے مراد وہ بندہ ہے جس کے دل میں خدا بس گیا ہو، جس کے لئے خدا ایک ایسی ہستی بن گیا ہو جسے وہ ڈھونڈ رہا ہو، جس سے وہ بے حد محبت کرتا ہو، جس کی نماز اس کی قلبی حالت اور اس کی پوری زندگی کا ایک مجسم اظہار ہو۔

آج مسلمانوں کو اسی قسم کا مستعین باللہ بننے کی ضرورت ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہر دوسری تدبیر پر مقدم ہے۔ کوئی تدبیر اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی جب تک یہ کیفیت ہمارے اندر نہ پیدا ہو چکی ہو۔ حکومت سے "ربط" پیدا کرنے سے پہلے مسلمانوں کو خدا سے ربط پیدا کرنا ہے۔ پریس سے آواز اٹھانے سے پہلے دل کی خاموش زبان سے خدا تک اپنی آواز پہنچانا ہے، دنیا کی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے خدا سے دادخواہ ہونا ہے، بیلٹ بکس کے پنج سالہ فیصلوں میں اپنی تقدیر ڈھونڈنے سے پہلے سال کی ان راتوں میں

قسمت آزمائی کرتی ہے جب قضا وقدر کی طرف سے نوع بنوع نوشتے لکھے جاتے ہیں (فیھا یفرق کل امر حکیم - دخان)

۳- استقامت کے ساتھ نصرت الٰہی کا استحقاق پیدا کرنے کی دوسری شرط صبر ہے۔ خدا کے دربار سے اسی کو ملتا ہے جو مانگنے کے ساتھ صبر کا ثبوت بھی دے رہا ہو۔ صرف لفظی طور پر مانگنا خدا کے یہاں سنا نہیں جاتا۔ اس کی طرف صرف "کلمہ طیب" ہی اٹھتا ہے اور "عمل صالح" اسے خدا تک لے جاتا ہے۔ جو قول کلمہ طیب نہ ہو اور جس کے پیچھے عمل صالح موجود نہ ہو، وہ ہرگز خدا تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ اور صبر عمل صالح کی آخری کیفیت ہے جب بندہ سخت ترین حالات کے باوجود اپنے رب کی مرضی پر جما رہتا ہے تو وہ عمل کا انتہائی ثبوت دیتا ہے اور اسی کا نام صبر ہے۔ جبکہ عمل صالح کا انتہائی وقت ہے، اسی لئے وہ قبولیت دعا کا بھی انتہائی وقت ہوتا ہے۔

صبر کے معنی ہیں جمنا۔ تمام مشکلات کے باوجود اپنے مسلک پر ڈٹے رہنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات جب آپ کو خدا کے راستے سے ہٹانے کے لئے زور کر رہے ہوں تو آپ اپنی ساری طاقت اس پر قائم رہنے میں لگا دیں۔ آپ ہر قسم کا نقصان برداشت کریں۔ مگر یہ برداشت نہ کریں کہ آپ کا خدا جو ہر آن آپ کو دیکھ رہا ہے، وہ آپ کو حق کے راستے سے ہٹا ہوا پائے۔ آپ کی دعا محض کچھ الفاظ کی تکرار نہ ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ بندہ خدا کی راہ پر قائم رہنے کے لئے اپنا آخری زور صرف کرتے ہوئے اپنے رب کو پکار رہا ہے کہ خدایا! تو میری مدد کے لئے آجا، کیونکہ میں صرف اپنی طاقتوں کے بل پر ٹھہر نہیں سکتا۔

اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے آپ اس ملک میں جو مہم چلانا چاہتے ہیں، اس میں آپ اسی وقت کامیاب ہوسکتے ہیں جب آپ خدا کو بھی اپنے ساتھ لے لیں اور خدا کو ساتھ لینے کی شرط صبر ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ بقرہ - ۱۵۳) خدا کا ساتھ آپ کو اسی وقت مل سکتا ہے جب آپ انتہائی مشکل حالات کے باوجود پورے صبر کے ساتھ خدا کی مرضی پر جمے رہیں۔ دنیا کی عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے محض وکیلانہ پیروی کافی ہوسکتی ہے۔ مگر جو شخص خدا کی تائید حاصل کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے اپنے مقدمے میں مخلص ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کے لئے وہ اٹھا ہے، اس کا وہ محض ایک دعوے دار نہ ہو، بلکہ اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنا چکا ہو۔ وہ ہر حال میں اس سے لپٹا رہنا چاہتا ہو۔ یہ مقصد اس سے جو کچھ کرنے کے لئے کہے وہ اس کو

کرے اور جو کچھ اس سے چھوڑنے کے لئے کہے، اس کو وہ چھوڑ دے۔ اسلام کی تاریخ سے ہم کو جو سبق ملتا ہے وہ یہی ہے۔ کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا آخری حد تک ثبوت دیدیا جائے کہ اہل ایمان ہر حالت میں خدا کے دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ جب یہ ثبوت مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ حالات کے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے جس میں اہل ایمان کو اپنی کامیابی کی راہیں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اس وقت وہ اقدام کرتے ہیں اور ان راہوں کو استعمال کرکے کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دوسرے مرحلے کا نام مدنی زندگی ہے۔

مجھے یہ کہنے کا موقع دیجئے کہ آپ کا مقدمہ ابھی اس پہلو سے بہت کمزور ہے۔ آپ کی پکار صبر کی کیفیت سے خالی ہے۔ ابھی آپ اپنی قومی مہم کو کرسی اور میز کی سطح پر چلا رہے ہیں۔ لیکن اگر اسے کامیابی تک پہنچانا ہے تو اس کو عمل اور قربانی کی سطح پر چلانا ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ کے سامنے ایک مسئلہ اردو زبان کا ہے۔ اردو آپ کی ملی زندگی کے لئے ضروری ہے اس لئے آپ اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ذرا دیکھئے اس معاملے میں آپ کی قوم کا کیا حال ہے۔ سینما کی کھڑکی پر ہمارے نوجوانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ مگر شبینہ مدارس میں انھیں پڑھنے کے لئے بلایئے تو وہ نہیں آئیں گے۔ سگریٹ اور پان میں بے تکلف پیسے خرچ کرینگے لیکن اگر ان سے کہئے کہ اردو کی ترقی کے لئے اردو اخبار اور کتابیں خریدو تو اس کے لئے ان کی جیب خالی ہوگی۔

یہی تمام معاملات میں مسلمانوں کا حال ہے۔ ان کی بہت بڑی تعداد بلکہ اکثریت اسلامی اوصاف سے بالکل خالی ہے۔ یہ حقیقت ہمارے لئے خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر شرک تک پایا جاتا ہے جو اسلام کے عین ضد ہے حتیٰ کہ ان کے اندر شرک جلی کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شرک کوئی معلوم چیز ہے اور اگر اس کا تعلق صرف نسل اور اصطلاحی قسم کے کفار و مشرکین سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک عقیدہ اور عمل ہے اور یہ عقیدہ اور عمل جہاں پایا جائے وہ شرک ہی کہا جائے گا، تو بلا شبہ عقیدۃً اور عملاً دونوں کا شرک آج مسلمانوں میں موجود ہے۔ کتنے ہی مزار ہیں جہاں وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو بتوں کو پوجنے والے اپنے بتوں کے لئے کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی بزرگان دین ہیں

جن کے ساتھ وہ سارے افعال و تصرفات منسوب کر دیئے گئے ہیں جو صرف خدا کا حصہ ہیں۔ سجدے سے لے کر دعا و استعانت تک کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہئے اور جس کو مسلمانوں نے اپنے اولیا، اور بزرگوں کے ساتھ روا نہ رکھا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں شرک پایا جا رہا ہو، اس کے لئے تو خدا کی طرف سے ـــــــ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (اعراف۔۱۵۲) کی دعید ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا کی نصرت او تائید کس طرح مل سکتی ہے۔

یہی حال فرض عبادات کا ہے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد فرائض سے سنگین حد تک غافل ہے۔ ہمارے درمیان کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ نہیں نکالتے اور استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتے، روزے کا ترک، جو دینی بے غیرتی کی انتہا ہے، وہ بھی اب ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ نماز جو اسلام کا اہم ترین رکن ہے، اس کو بے شمار لوگ مستقل اور علانیہ چھوڑے ہوئے ہیں حقیقی نماز تو درکنار رسمی نماز سے بھی ان کی زندگیاں خالی ہیں۔ حالانکہ نماز کو کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل قرار دیا گیا ہے، یہاں تک ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص نماز چھوڑ دے تو اللہ اپنا ذمہ اس سے اٹھا لیتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہم جب ایسے اعمال میں مبتلا ہوں جس نے ہم کو اللہ کے ذمہ سے محروم کر دیا ہو تو ایسی حالت میں نصرت و تائید کا کیا سوال۔ پھر تو یہی انجام ہو سکتا ہے کہ دنیا کی قومیں ہم پر بھوکے بھیڑئے کی طرح ٹوٹ پڑیں اور ہم کو اپنا لوالہ بنائیں۔

اخلاق و معاملات کے اعتبار سے دیکھئے تو اس میں بھی یہی صورت نظر آئے گی کوئی ایسی برائی نہیں ہے جو آج مسلمانوں میں نہ پائی جاتی ہو ـــــ جھوٹ، وعدہ خلافی چغل خوری، غیبت، دھوکا، پچھوراپن، خود غرضی، بخل، لگائی لگوج، بدزبانی، کم ظرفی، بدمعاملگی، کام چوری، بے صبری، عیب جوئی، بہتان تراشی، بدگمانی، دورخاپن، بے جا نمائش، اظہار امارت، اسراف، بدسلوکی، سنگدلی، بے رحمی سب کچھ ان کے اندر موجود ہے۔ اسی طرح چوری، رشوت، غبن، خیانت، قتل، حق ماری، کم تولنا، ان کا وصف عام بن چکا ہے۔ شراب، جوا، زنا، سود، رقص، موسیقی، فحاشی، بے پردگی، بے حیائی، لغویات میں اشتغال، ان کے لئے کوئی معیوب بات نہیں رہی جس قوم کا یہ حال ہو وہ اگر

خدا سے نصرت و تائید کی امید رکھتی ہے تو یہ بالکل فضول بات ہے کیونکہ خدا تو وہ ہے جس نے قوم شعیب کی بددیانتی کے جرم میں ان پر آگ کی بارش برسائی اور قوم لوط کی فحش کاری کی سزا میں آسمان سے ان پر پتھراؤ کیا اور ان کی بستی کو الٹ دیا پھر آپ کیا اسی خدا سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ بددیانتی اور بدکاری کی سرپرستی فرمائے گا۔

آج قوم کی بے شمار ضرورتیں محض سرمایہ کی کمی کی وجہ سے رکی ہوئی ہیں۔ آج مسلمانوں کو اپنی دینی اور دنیوی ضرورتوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لئے اونچے پیمانے کی اسلامی یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے۔ ان کو ایسے قومی فنڈ کی ضرورت ہے جو حاجت مند مسلمانوں اور نومسلموں کی کفالت کر سکے، نادار طلبہ کے تعلیمی اخراجات فراہم کرے اور قوم کے بے روزگار افراد کو روزگار پر لگانے میں مدد دے۔ ایسے تحقیقی اور اشاعتی ادارے کی ضرورت ہے جو جدید ضرورتوں کے مطابق مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر تیار کرے اور ان کو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں پھیلائے۔ ایسے طاقتور پریس کی ضرورت ہے جو قوم کے اندر اور باہر قوم کی آواز کو موثر شکل میں پہنچائے۔ اس طرح کی کتنی ہی قومی اور دینی ضرورتیں ہیں جو سرمایہ کے بغیر محض تخیل کی دنیا میں پڑی ہوئی ہیں اور اگر کچھ لوگوں کی بلند ہمتی نے کسی کام کو شروع کر دیا ہے تو وہ بھی "مفلس کے چراغ" کی طرح اپنے آغاز ہی سے ٹمٹما رہا ہے۔ قومی ضروریات کا یہ انجام ایسی حالت میں ہے جبکہ قوم میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے سرمایہ دار پائے جاتے ہیں جن میں سے صرف چند کی قربانی ان سارے کاموں کا آغاز کر سکتی ہے۔ مگر قوم کے ان سرمایہ داروں کے کے پاس اپنے سرمایہ کا مصرف شادیوں کی دھوم دھام اور عمارت کے مظاہروں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا نے زندگی کا قانون یہ بتایا ہے کہ دینی ضرورتوں میں اپنا سرمایہ خرچ نہ کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے (بقرہ - ۱۹۵) اس خدا سے ہم اس کے سوا اور کس بات کی توقع کر سکتے ہیں [illegible] ہم نے ہلاکت کا راستہ اختیار کیا ہے تو ہم ہلاکت ہی کے گڑھے میں گریں گے کسی اور منزل تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس حالت [illegible] کا شدید تقاضا ہے کہ ان کے درمیان بہت بڑے پیمانے پر وہ کام شروع کیا جائے جس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ یہ

کا کام عام حالات میں بھی اسلامی معاشرہ کا ایک اہم ترین جزو ہے اور موجودہ حالت میں تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر یہ کام بھی بس برائے نام ہی ہو رہا ہے اور جو ہو رہا ہے وہ بھی بیشتر اس طرح کہ اس کو نہ تو اعلیٰ صلاحیتیں حاصل ہیں اور نہ اعلیٰ وسائل و ذرائع۔ اب آپ ایک طرف اس صورت حال کو سامنے رکھئے اور دوسری طرف اس حدیث کو یاد کیجئے جس میں بتایا گیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو چھوڑنے کے بعد دعائیں تک مقبول نہیں ہوتیں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری تباہی کے اسباب کیا ہیں اور ہم کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کسی گروہ کے "مابقوم" کو وہ اسی وقت بدلتا ہے جب وہ اپنے "ما بانفس" کو بدل دیے۔ ایسی حالت میں مسلمان افراد کی مندرجہ بالا غیر مسلمانہ روش کے باقی رہتے ہوئے یہ امید کرنا ایک خیال خام کے سوا کچھ نہیں کہ اجتماعی مہمتوں کے سلسلے میں ان کی مطالبات کی مہم کبھی کامیاب ہو سکے گی۔ آپ نظام حاضر سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ دین کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے مگر خود آپ سے خدا کا دین جن باتوں کا تقاضا کر رہا ہے اس سے غافل ہیں۔ حالات کی باگ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے حکومت سے اپنے معاملات کے سلسلے میں مطالبہ کرنا گویا خدا سے یہ کہنا ہے کہ وہ آپ کو اس ملک میں مسلمان بن کر رہنے کا موقع دے لیکن آج کے موجودہ حالات میں آپ کو اسلام کے تقاضوں پر عمل کرنے کے جو مواقع دیئے گئے ہیں ان میں اگر آپ اپنی اسلامیت کا ثبوت نہیں دیتے تو کس بنا پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ مستقبل کے بارے میں آپ کی درخواست منظور کی جائے گی۔

حالات کی شدت

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے حالات بہت سخت ہو گئے ہیں۔ مگر یہ شدت خود بخود یا محض اتفاقاً وجود میں نہیں آ گئی ہے۔ بلکہ یہ بھی خدا کی طرف سے ہے۔ آپ کی بے عملی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے عمل کے لئے حالات سخت کر دیئے گئے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں۔ آپ وہ گروہ ہیں جس نے خدا کی زمین پر خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا اقرار کیا ہے۔ ایسے کسی گروہ کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر وہ اپنے عہد پر قائم رہے تو اس کے لئے زمین کو ہموار کر

دیا جاتا ہے۔ اور طاعت و بندگی کی تمام راہیں اس کے لئے آسان کر دی جاتی ہیں۔

(نور۔۔۔۵۵) لیکن اگر وہ اپنے عہد کو بھول جائے اور خدا کی اطاعت سے روگردانی کرے تو اس کو صبر کے امتحان میں ڈال دیا جاتا ہے، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جہاں دین پر عمل کرنا پہلے سے زیادہ دشوار ہو اس کی ایک مثال یہود کی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن کی ساتویں سورہ میں کیا گیا ہے۔

اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے جب امت مسلمہ ہونے کی وہ حیثیت یہود کو حاصل تھی جو آخری نبی کی بعثت کے بعد آپ کو دی گئی ہے۔ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایک شہر تھا جہاں یہودی آباد تھے۔ اس زمانے میں یہود کے لئے یہ قانون تھا کہ وہ ہفتہ (سبت) کے دن روزہ رکھیں اور صبح سے شام تک صرف عبادت و ریاضت میں گزاریں۔ دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے ان کی معاشیات کا انحصار زیادہ تر مچھلی پر تھا۔ وہ اس کو کھاتے تھے اور بیرونی علاقوں میں اس کی تجارت کرتے تھے۔ قانون سبت کے مطابق انھیں چاہیئے تھا کہ وہ چھ دن تک مچھلیوں کا شکار کرتے اور ساتویں دن اپنے اوقات کو فارغ کر کے اس خدا کی عبادت کرتے جس نے مچھلیاں اور زندگی کے سارے سامان دیئے ہیں۔ مگر انھوں نے اس حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی اور ہفتے کے سارے ہی دنوں میں شکار کرنے لگے۔ جب انھوں نے ایسا کیا تو قانون کو ان کے لئے اور سخت کر دیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا ہوا کہ مچھلیاں صرف سبت کے دن جس دن شکار کرنا ممنوع تھا، سطح کے اوپر رہتی تھیں اور بقیہ چھ دنوں میں سمندر کے نیچے چلی جاتی تھیں گویا پہلے اگر ہفتہ میں ایک دن روزہ رکھنے کا حکم تھا، تو اب حکم ہوا کہ پورا ہفتہ روزے میں گزارو۔ کیونکہ قانون سبت پر عمل کرنے کی صورت میں جب وہ مچھلیوں کے اوپر آنے والے دن شکار نہیں کر سکتے تھے تو بقیہ دنوں میں کیا کھاتے۔ یقیناً یہ بڑا سخت حکم تھا لیکن اگر یہود صبر کی روش اختیار کرتے اور ایک ہفتہ بھی انھوں نے ایسا گزارا ہوتا کہ خدا کے حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ سات دن بھوکے رہ جاتے تو آپ یقین مانئے کہ جس خدا کے حکم سے مچھلیاں پانی کے نیچے چلی گئی تھیں وہ انھیں حکم دیتا اور مچھلیاں ابل کر ان کے

گھروں میں آجاتیں اور ان کا شکار کرنے کے لئے انھیں دریا جانے کی بھی ضرورت نہ ہوتی مگر اس صورت حال کے پیش آنے کے بعد وہ ممنوع دنوں میں اور زیادہ شکار کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ایک دن کی مصیبت برداشت نہ کر سکے تھے، ان کو ہمیشہ کی سخت تر مصیبت میں ڈال دیا گیا۔ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ ان کی صورتیں مسخ ہو گئیں اور وہ بندر بنا دیئے گئے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

آپ اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہیں، وہ بھی کچھ اسی نوعیت کا واقعہ ہے مسلمانوں کی مسلسل بے حسی اور بے عملی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا ہے جو ابتدائی تنبیہ کے طور پر "قریۃ حاضرۃ البحر" کے ساتھ پیش آیا تھا۔ (اعراف۔۱۶۳) آج ان کے اوپر ایک ایسا نظام مسلط کر دیا گیا ہے جس نے دینی زندگی کو ان کے لئے پہلے کے مقابلے میں "سات گنا" زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔ آج ہمارے اوپر ایک ایسا تعلیمی نظام مسلط ہو گیا ہے جو ہماری نسلوں کے عقیدۂ ایمان کو چھین رہا ہے اور اس پر مزید یہ کہ یہ تعلیمی نظام زندگی کی تمام صورتوں سے اس درجہ وابستہ ہو گیا ہے کہ ہم اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ آج ہم کو ایک ایسے معاشی نظام میں ڈال دیا گیا ہے جہاں جائز طور پر روزی حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا پانی میں گرنے کے بعد بھیگے بغیر اس سے نکل آنا ــــ آج ہم اپنے آپ کو ایک ایسے سماج میں پاتے ہیں جہاں اس کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا کہ جائز اور ناجائز کی حدود کو بھول کر موقع پرستی کا طریقہ اختیار کیا جائے آج روزگار کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں اب کوئی شخص اس وقت تک اپنے لئے روٹی اور کپڑا حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنا سارا وقت اور ساری قوتیں اس کی جد وجہد میں لگا نہ دے۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوتی، ان سب سے زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ ہمارے اوپر ایک ایسا اقتدار مسلط ہے جو کھلم کھلا اسلام سے عناد رکھتا ہے، اس کے نزدیک "مسلمان" ہونا اتنا بڑا جرم ہے جس کی سزا ڈاکہ اور قتل سے بھی زیادہ سخت دی جا سکتی ہے۔

اس طرح آپ کو ایک ایسی حالت میں ڈال دیا گیا ہے جب کہ اسلام پر قائم رہنے کے لئے معمولی حالات سے زیادہ سخت جد وجہد کی ضرورت ہے۔ گویا پہلے اگر صرف عمل کا مطالبہ تھا تو اب قربانی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ آپ کے صبر کا امتحان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ معمولی

حالات میں آدمی کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اس کے مقابلے میں اسوقت کی ذمہ داریاں زیادہ شدید ہوتی ہیں جب کہ آدمی امتحان کے لئے کھڑا کر دیا گیا ہو۔ آج آپ امتحان کی حالت میں ہیں۔ اس لئے بندگی کا ثبوت دینے کے لئے آج آپ کو پہلے سے زیادہ جاں فشانی کی ضرورت ہے آپ کو زبردست قربانیوں کے ذریعہ اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے بندے بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ آپ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں مگر بندگی کی راہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یاد رکھئے ہر رکاوٹ جو دین کی راہ میں آتی ہے وہ اس لئے آتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمائے کہ وہ کس حد تک اس کے وفادار ہیں۔ یہ رکاوٹیں دراصل آپ کے اندر چھپے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ حکومت کی اسکیمیں جو آپ کی ملی زندگی کو ختم کرنے کے لئے شروع کی گئی ہیں۔ زمانے کا معاشی اور تمدنی نظام جو آپ کے لئے زندگی کو مشکل سے مشکل تر بناتا جا رہا ہے۔ اکثریت کے مظالم جن کا نشانہ آپ صرف اس لئے ہیں کہ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ یہ سب آپ کو آخری حد تک جھنجھوڑنے کے لئے ہیں۔ یہ آپ کے دینی احساسات کا آخری امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ کے اندر بے قراری کا وہ جذبہ ہے یا نہیں جو اس کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لئے ایک مومن کے اندر ہونا چاہئے۔ اگر یہ شدید ترین ضرب بھی آپ کے احساسات کو بیدار نہ کر سکے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ موت کی نیند سو چکے ہیں اب آپ کے اٹھنے کی کوئی امید نہیں۔

ہمارا خدا آج وہ منظر دیکھنا چاہتا ہے جب ہم نے دین کے لئے اپنی دنیوی خوش حالی اور ترقی کو برباد کر دیا ہو۔ آج اس کو ہمارے دل کی وہ بے قراری مطلوب ہے جو انتہائی خواہش کے باوجود کسی دینی کام کو نہ کر سکنے کی وجہ سے قلب مومن میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ان آنسوؤں کا انتظار ہے جو اس شدت احساس سے ہماری آنکھوں سے ڈھلک پڑیں کہ ہم خدا کے دین پر چلنا چاہتے ہیں مگر مجبوراً نہیں چل سکتے۔ اس کو وہ راتیں مطلوب ہیں جب ہم اس کے آگے سجدے میں پڑے ہوئے کہہ رہے ہوں کہ "خدایا تیری امت پر بڑا سخت وقت آگیا ہے، تو ان کی مدد فرما۔"

یہی آپ کے امتحان کا پرچہ ہے۔ خدا آج دیکھنا چاہتا ہے کہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا جذبہ آپ کے اندر کتنا ہے۔ دین کے مطابق زندگی بنانے کی کتنی تڑپ آپ کے

اندر پائی جاتی ہے، اپنے حالات میں آپ کو خدا کی طاقت پر کتنا بھروسہ ہے۔ بلاشبہ یہ امتحان آپ کو ایسے حالات میں دینا ہے جو اس امتحان کے لئے مشکل ترین حالات کہے جا سکتے ہیں۔ مگر خدا کی مدد ہمیشہ ایسے ہی حالات میں آتی ہے۔ سخت ترین حالات ہمیشہ اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ فیصلے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اور اگر اہل ایمان آخری حد تک اس چیز کا ثبوت دیدیں جو ان حالات میں ان سے مطلوب ہے تو خدا کے فرشتے آکر ان کی راہ کے تمام کانٹے ہٹا دیتے ہیں اور دین پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ یہ آپ کے لئے مایوسی اور دل شکنی کا وقت نہیں بلکہ انتہائی امید کا وقت ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ آپ زیادہ سے زیادہ استحقاق پیدا کرکے زیادہ سے زیادہ خدا کے انعام کے مستحق بن سکتے ہیں۔ مشکل حالات میں صبر کے ساتھ حق پر جمے رہنا ـــــ یہی وہ چیز ہے جو خدا کی مدد کو کھینچتی ہے اور اہل ایمان کو کامیابی کے مقام پر پہنچاتی ہے۔ ہندستان کے موجودہ حالات جن میں قومی حیثیت سے آپ کو اپنی موت نظر آرہی ہے اسی میں آپ کے لئے زندگی کے اسباب چھپے ہوئے ہیں بشرطیکہ آپ صبر اور تعلق باللہ کا ثبوت دیں۔ ہندستان کے مسلمان اپنی تاریخ کے ایک نہایت تاریک دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے اندر ہمت ہو تو اسی تاریک دور کے اندر وہ مواقع موجود ہیں جو ہمارے لئے ایک روشن دور کا آغاز بن سکیں۔ ایسے مواقع جو اس سے پہلے کبھی نہیں آئے اور جو اس کے بعد بھی شاید کبھی نہیں آئیں گے۔ بنی اسرائیل کی زندگی کا یہ واقعہ تاریخی الفاظ میں آپ کے لئے مستقبل کی خوشخبری ہے۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ	اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان
كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ	کو ہم نے مبارک ملک میں اس سرے
الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي	سے اس سرے تک قبضہ دیدیا۔
بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ	اور تیرے رب کا عمدہ قول بنی اسرائیل
رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي	کے حق میں پورا ہوا اس وجہ سے کہ
إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا	انھوں نے صبر کیا اور ہم نے فرعون
مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ	اور اس کی قوم کو اس کی تمام صنعت

وَقَوْمَهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ‌ ‌ و زراعت کے ساتھ تباہ کر دیا۔

(اعراف ــ ۱۳۷)

آپ کہیں گے کہ یہ حل جو تم ہم کو بتا رہے ہو وہ تو عجیب ہے کیونکہ ہمارے سامنے تو سیاسی اور تمدنی مسئلے ہیں اور تم ہم کو صبر اور تعلق باللہ کی تعلیم دے رہے ہو۔ مگر اس خدا کی قسم جس نے قرآن نازل کیا اور زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اگر اس ملک کے مسلمان ایک بار بھی فی الواقع اس کا ثبوت دیدیں اگر وہ دکھا دیں کہ خدا کے دین پر قائم رہنے کے لئے وہ ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہیں۔ تو صبح کی شام بھی نہ ہونے پائے گی کہ خدا کے فرشتے خدا کی مدد لے کر آسمان سے اتر پڑیں گے اور آپ کے سارے مسئلے اس طرح حل ہو جائیں گے گویا کہ وہ تھے ہی نہیں۔

خدا کی خدائی آج بھی ظاہر ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ہم اپنی بندگی ظاہر کرنے کے لئے تیار ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صالحیت

از:- جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (حیدر آباد)

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ" (پ۔ ۲۹۔ ع۔ ۱)

راہِ خدا کے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) اصحابِ بحث و افکار جنھیں حکماء و عقلاء کہا جاتا ہے، اور (۲) اصحاب کشف و ابصار جو عرفاء و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہلِ بحث و نظر مقدمات کی ترکیب، دلائل و براہین کی تقریر، اور نظر و استدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا، مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکماء و متکلمین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے لیکن نظر و استدلال کا انجام حیرت مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی حیرت کو "حیرتِ نُظّار" سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادمِ شکوک و تعارضِ دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔ اس کے برخلاف اصحابِ کشف و ابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کو "حیرت اولی الابصار" کہا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدۂ وحدانیت و الوہیت کا، آثار و عجائب ربوبیت کا، توالیٔ تجلیات کا، اور یہ حیرتِ محمود ہے۔ "رَبِّ زِدْنِیْ فِیْكَ تَحَیُّرًا" کی دعا اسی حیرتِ محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیوا حکماء و متکلمین، فلاسفۂ یونان کے اتباع میں انبیاء علیہم السلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگتے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کتوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں، کیونکہ کتے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھنجھوڑنے میں لگے ہیں! ان کی ضلالت و گمراہی کا سبب ان کی "عقلِ ناقص" کے سوا کچھ نہیں۔ ﴿فرحوا بما عندھم من العلم﴾۔

مصطفیٰ اندر جہاں آنگہ کسے گوید زعقل
آفتاب اندر فلک آنگہ کسے جوید سُہا!

اہلِ کشف وبصیرت وہ ہیں جو تصفیہ باطن، تخلیہ تخیل، کمالِ تبتل اور دوام توجہ سے منتہائے مقصود کو پہنچتے ہیں " وھوالوصول الی معرفة اللہ ولقائہ " انھیں صراط مستقیم کے جادہ پیما کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السّلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملّت حنیفی ودین مصطفوی ہے (صلوات اللہ علیہ علیہم اجمعین) یہ گروہ مقدس ان ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (یحبھم ویحبونہ) اور حضرت الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدیھم بروح منہ) یہ خدائے لم یزل ولا یزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ ہے (رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدماتِ عقلیہ کے قائم کیے بغیر کرلیتے ہیں، اور حق کو نورِ حق ہی سے پہچانتے ہیں۔ (افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ) انھیں نظر واستدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بینا کو رنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (افی اللہ شکٌّ فاطر السمٰوات والارض) چنانچہ کسی نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا کہ وجودِ صانع پر تمھاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:" لقد اغنی الصباح عن المصباح " مجھے دن کی روشنی نے چراغ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا ؎

حق را ز حق شناس نہ از حجت وقیاس
خورشید را چہ حاجت شمع است وشعلہ (جامی)

یہ مقدس ہستیاں درجۂ کمال پر فائض ہوتی ہیں، انھیں مکتب خانۂ " وعلّمناہ من لدنّا علما " سے سبق ملتا ہے، شکوک واوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السّلام کے علوم کی وارث۔ ان کی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے:۔ ؎

آنہا کہ ربودۂ الست اند — از عہدِ الست بازمستند
در منزلِ درد بستہ پابند — در دادنِ جاں کشادہ دستند
چالاک روند پس بیک گام — از جوئی حدوث بازجستند
فانی زخود وبدوست باقی — ایں طرفہ کہ نیستند وہستند

ایں طائفہ اند اہلِ توحید　　باقی ہمہ خویشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پہ ہوتی ہیں، دریائے توحید میں غرق ہوتی ہیں، خلق نے جو کچھ حکایتاً سُنا ہے وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لیے جو "غیب" ہے، ان کے لیے "شہادت" ہے۔ چنانچہ عارف رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:۔

دفترِ صوفی سوادِ حرف نیست　　جز دلِ اسپید ہمچو برف نیست

زادِ دانشمند آثارِ قلم　　زادِ صوفی چیست اسرارِ قدم

آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں　　پیر اندر خشت بیند بیش ازاں

در دلِ انگوری را دیدہ اند　　در فنائے محض شئی را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں، اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویۂ گم نامی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحبِ کمال ہستی سے اخذِ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربّانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشاداتِ عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبۂ صالحیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صالحین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ ایمان، وعمل صالح۔

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لندخلنھم فی الصّٰلحین (۲۹۔۶۔۱)

ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، توحید ایمانی ہے۔ اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے اور توحید داخل ہوتی ہے! جس ذات پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے، جس کا نتیجہ ابدی جہنم ہے۔

"وعد اللہ المنفقین والمنافقات والکفار نار جہنم خالدین فیہا"

(پ ۹۔ ع ۔ ۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے، جس کا نتیجہ خلود نار وحبط اعمال ہے۔

ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولٰئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ واولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون۔ (پ ۲۔ ع ۱۰)

ارتداد شرک کی طرح دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیے ناقابل معافی ! ۔

کفر و شرک، نفاق و ارتداد بڑے جرائم ہیں، سخت گندگی و نجاست ہیں۔ ان سے قلب کی تطہیر ضروری ہے یہ تطہیر ان سے توبہ اور لا الٰہ الا اللہ کے اقرار و تصدیق ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کو تمام انبیا (علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخرالزماں (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تک پیش کیا ہے۔ اور دعا کی ہے کہ :۔

"اللھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین ۵"

ایمان محض تصدیق قلب کا نام ہے، اور اعمال جوارح اس میں داخل نہیں ہیں، امور ذیل پر غور کرنے سے یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا سچ ماننے کو کہتے ہیں، حق تعالیٰ برادران یوسف علیہ السلام کی زبان سے فرماتے ہیں :۔

وَمَا انت بمومنٍ لَّنَا وَلَوْ کُنَّا صَادِقِیْنَ ۵۔	گو ہم سچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں آپ کو تو ہماری بات کا یقین آنے کا نہیں۔

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعل قلب قرار دیتے ہیں :۔

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم ۵	(جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے، مگر اس کا دل ایمان کی طرف مطمئن ہو (اس سے کچھ مواخذہ نہیں)، لیکن جو شخص ایمان لائے پیچھے کفر کرے، اور کفر کے لیے جی کھول کر، تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوگا، اور ان پر سخت عذاب ہوگا۔

(پ ۔ ۱۴۔ ع ۔ ۲۰)

یہاں قلب کو ظرف ایمان قرار دیا جا رہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرے میں سے نکال لیا جا رہا ہے، جو جبر و اکراہ کے سبب اعمال ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے۔ اور موردِ غضب خداوندی وہی شخص قرار دیا جا رہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کر لیا ہے۔

(۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمال نیک کی جزا اور ثواب کے لیے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ شرط مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

ومن یعمل من الصّٰلحٰت من ذکرا وانثی وھو مومنٌ فاولٰئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیراً۔ (پ۔ ۵۔ ع۔ ۱۸)	جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔
من عمل صالحاً من ذکرا وانثیٰ وھو مومن فلنحیینّہٗ حیوٰۃً طیبۃً ولنجزینّھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔ (پ۔ ۱۴۔ ع۔ ۱۸)	جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو بالطف زندگی دیں گے، اور اُن کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔
ومن اراد الاٰخرۃ وسعی لھا سعیھا وھو مومن فاولٰئک کان سعیھم مشکوراً۔ ۵ (پ۔ ۱۵۔ ع۔ ۲)	جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لیے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسی سعی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو، تو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔

(۴) حق تعالیٰ گنہ گاروں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں :-

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ۔ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً ۔ انہ ھو الغفور الرحیم ط (پ ۲۴۔ ع۔ ۳)	آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں، تم خدا کی رحمت سے نا امید مت ہو، بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا، واقعی وہ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

بہت سی آیتوں میں مغفرت ذنوب کی نوید ہے، اس کے برخلاف کفر کے لیے عذاب مخلد کی وعید ہے۔

ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ ثمّ ماتوا وھم کفارٌ فلن یغفر اللہ لھم ط۔ (پ ۲۶۔ ع۔ ۸)	بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے اللہ کے راستہ سے روکا پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے، سو خدا تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا۔

اگر اعمال داخل ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخل کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورت عدم تعمیل، کفر کی طرح عدم مغفرت اور دوام عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!۔

(۵) حق تعالیٰ نے دو صاحب تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو مومن کہہ کر یاد فرمایا ہے:۔

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما، فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیٔ الیٰ امر اللہ ج فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین ۰ انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔

(پ ۲۶ - ۶ - ۱۳)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو اور انصاف کا خیال رکھو۔ بیشک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلاح کرا دیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

اگر اعمال جزو ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو مومن نہ کہا جاتا، نہ ان میں صلح کرا دینے کی یہ وجہ بیان کی جاتی کہ مسلمان باہم بھائی ہیں۔

ان آیات بینات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ حق تعالیٰ نے صالح اسی شخص کو کہا ہے جو ایمان بھی رکھتا ہے اور عمل صالح بھی کرتا ہے۔ اب عمل صالح کے معنی کا تعین ضروری ہے۔

عمل صالح کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ صواب:۔ یعنی عمل کا موافق سنت صحیحہ کے ہونا۔

اخلاص:۔ یعنی شرکت غیر اللہ سے پاک صاف ہونا۔ نیت صحیحہ۔

وہی عمل صالح ہوگا جو موافق سنت صحیحہ ہو اور نیت صحیحہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے امتثال امر میں، انہی کی رضا و خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ ان تین خصوصیات کو اجمالی طور پر خوب سمجھ لو۔

(۱) نیت کے متعلق جو اصول حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے:۔ انما

الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی" آگے مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی ہے:۔ فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله ومن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او امراة ینکحها فهجرته الی ماهاجر الیه (رواه الشیخان) یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی، پھر جس نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوئی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی جو اس کو ملے گی یا کسی عورت کی طرف جس سے وہ نکاح کرے گا تو یہ ہجرت اسی کی طرف ہوئی"۔

یہ حدیث اصول دین میں سے ایک عظیم الشان اصل ہے، ارکان اسلام میں سے ایک اہم ترین رکن ہے۔ سارے اعمال کا نیت پر ہی دار و مدار ہے۔ بے نیت کے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، نہ اس کا کچھ اعتبار ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے، یعنی دوسری کتب حدیث کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) میں بھی ہے۔

(ii) اخلاص کے متعلق حضور انور کا یہ ارشاد بہت واضح ہے:۔

یا ایها الناس اخلصوا اعمالکم فان الله تبارك وتعالى لا يقبل من الاعمال الا ما خلص۔	یعنی اے لوگو تم اپنے اعمال کو خالص حق تعالیٰ کے لیے کرو کیونکہ حق تعالیٰ عمل خالص کے علاوہ کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

(رواہ البزار عن الضحاک بن قیس)

جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے، تو ارشاد ہوا:۔

اخلص دینك یکفیك العمل القلیل (رواہ الحاکم)	تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل کفایت کرے گا۔

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے امتثال میں اور ان ہی کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے اور اس سے ان ہی کی ذات مقصود ہوتی ہے تو وہ "خالص" ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صالح" کہلایا جاتا ہے۔

(iii) صالح ہونے کے لیے عمل کا مطابق کتاب و سنت ہونا ضروری ہے۔ "من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد" (اخرجه الشیخان) اس پر نص ہے۔ یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز نکالتا

ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے :۔ "من صنع امراً علی غیر امرنا فھو رد" (رواہ ابوداؤد)۔ ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ "من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد" (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں بدعت ہے گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمال صالحہ وافعال حسنہ بے حد و بے شمار ہیں تو ان اعمال ثابتہ کو چھوڑ کر افعال محدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا بیضہ نہیں تو کیا ہے! "بہتر بات تو خدا کی بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے! سب سے بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں ہر بدعت گمراہی ہے" (عن جابرؓ)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہ گار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ سمجھتا ہے، جی میں اُس کام کو برا جانتا ہے گو منھ سے نہ کہے، امید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو بُرا جانتا ہے اس سے کسی روز توبہ کرے گا! لیکن صاحب بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ کر کر رہا ہے! حضرت ابن ابی عاصمؒ نے حضرت ابوبکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روزانہ کے تجربے کو عجیب و غریب طریقے سے ظاہر کرتی ہے :۔

> "ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کر کے ہلاک کر دیا اور انھوں نے مجھے گناہ سے توبہ کر کے برباد کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو ہوئی و بدعت میں مبتلا کر کے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں اس لیے استغفار نہیں کرتے، اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں"

اسی لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :۔

"کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار"

ایمان اور عمل صالح کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لا معبود الا اللہ کے شغل میں مصروف ہو جاتا ہے، اور جملہ معبودان باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودان باطل اس کے حق میں تین ہیں :۔

دنیا، خلق، اور ہوائے نفسانی۔

لا معبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے سوا میں امورِ دنیا میں سے کسی کا مطیع و منقاد نہیں جب بھی امورِ دنیا سے کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اس کی نفی کرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں ! میرا ہر عمل میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے امتثال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکام الٰہیہ کے پابند ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں ! میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابل قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے اُن ہی کے بتلائے ہوئے طریقے سے اس کو انجام دوں !۔

اسی طرح میں خلق کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا و سمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطور کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کے بجائے یہی میرا معبود بن جاتا ہے، میں لا الٰہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خودنمائی، عُجب و کبر یا کسی لذت نفسانی کا گذر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ "ہر چہ جز بندہ آنی بندۂ آنی" اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کر کے کہ :-

"افرایت من اتخذ الٰہہٗ ھواہ"

میں لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرتا ہوں تاکہ ماسوی اللہ کی عبادت کی ذلت سے پوری طرح نجات پاؤں !۔ مجھے حضور انور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وہ بددعا یاد آتی ہے جو انھوں نے اُس شخص کے حق میں کی تھی جو مال و دولت کو، عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل ان ہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

تعس عبد الدینار و تعس عبد الدرھم و تعس عبد الخمیصۃ و انتکس

اذا شیک فلا انتقش

"تباہ ہو اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں رہے) منھ کے بل گرے پھر سر کے بل اُلٹ جائے، اور جب اس کے کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کانٹا نہ نکالے (اتنی بھی مدد نہ کرے کیونکہ وہ بندۂ زر ہے)۔"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کامل طور پر اٹھ جاتی ہے اور سر پر دل پر صرف حق تعالے کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات امر الٰہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزادی و حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو ہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہوتا۔

عارف رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے :۔

گر تو خواہی حری و دل زندگی　　بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود بہر بندگی است　　زندگی بے بندگی شرمندگی است

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی　　کفر باشد پیش او جز بندگی

ذوق باید تا دہد طاعات بر　　مغز باید تا دہد دانہ شجر!

عبدیت ہی حریت کا اصلی سبب ہے، حریت کیا ہے ؟ " ھو انقطاع الخاطر عن تعلق ماسوے اللّٰہ تعالیٰ بالکلیہ " ایسی آزادی اس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراض دنیا و خواہشات نفسانی سے اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑلی ہے! حریت نہایت عبودیت کا نام ہے "آزادگی بے بندگی" نہیں۔ ع

" کہ بندگان کن تو رستگار انند " (حافظ) ونعم ما قیل ؎

خواجگی را خواجگی از بندگی ست　　بندگی کردن کمال خواجگی ست

من ازاں روز کہ دربند توام آزادم　　پادشاہم کہ بدست تو اسیر افتادم

لا الہ الا اللّٰہ کے معنیٰ اوّل لا معبود الا اللّٰہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غایت تذلل و افتقار کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت امتثال امر الٰہی میں ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو، یعنی مقصود و محبوب اللّٰہ ہی ہو۔!

لا مقصود الا اللّٰہ، لا محبوب الا اللّٰہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الہ الا اللّٰہ کے۔

لا الہ الا اللّٰہ یعنی لا معبود الا اللّٰہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، خلق، دور اور ہوائے نفسانی یا جذبات کا تسلط اٹھ جاتا ہے لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود موجود رہ سکتے ہیں جن کا لا مقصود الا اللّٰہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے

ہیں اور ہوتے ہیں۔

(i) بہشت و مافیہا من الحور والقصور (ii) مقامات کشفی مثلاً کشف قبور، کشف قلوب، یا کشف بلا وغیرہ (iii) تجلیات قربی۔

مقصود حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی[1] اگر جنت کا سوال کیا جاتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ محل دیدار محبوب ہے۔ ؎

عاشقاں جنت برائے دوست می دارند دوست

ورضوان من اللہ اکبر" سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔

نہ ہی مقصود وہ مقامات کشفی ہیں جو اولیاء اللہ کو تبعاً حاصل ہوتے ہیں جیسے کشف قبور یا کشف قلوب یا کشف بلا۔ ؎

دریں منزل بود کشف و کرامات　　　ولے باید گزشتن زاں مقامات

نہ ہی وہ تجلیات قربی مقصود ہیں جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و غوثیت و قطبیت وغیرہ مقصود صرف ذات حق رہے، ان کا حضور، ان کا ذکر، ان کی فکر، ان کی یاد۔ ؎

یارب ز تو آنچہ من گدا می طلبم　　　افزوں ز ہزار پادشاہی طلبم
ہر کس ز در تو حاجتے می خواہد　　　من آمدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان سے غفلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے: ؎

از بس کہ خیالت بہ نظر می دارم
در ہر چہ نظر کنم تو ئی پندارم

یہ مقام تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے، لیکن وہ

---

[1] اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمال ایمان کے منافی ہے۔ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل کون ہوگا۔ باینہمہ قرآن و حدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں ان میں جنت کا سوال بار بار کیا گیا ہے اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندۂ مومن کا اصلی اور اولی مقصود و مطلوب بس حق تعالیٰ کی ذات اور اسکی رضا ہی ہونا چاہیے۔

"والذین آمنوا اشد حبا للہ" م۔م

اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضائے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے، جس حال میں رکھیں اس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں۔ ؎

معشوقہ کہ شد بکا مہا عائق من　　　گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائق من
وصل است ز من کام تو اے ہستی　　　تو عاشق کام خویش نے عاشق من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہان پر جاری ہوتا ہے کوئی اعتراض نہیں کرتے، اور: ۔ ؎

"ہر چہ از دوست می رسد نیکو است"

کہہ کر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، توافق بالقضا، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا خلاف نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم اور اس کی مشیت کا اس کو نتیجہ سمجھ کر اس سے محظوظ و خوش وقت ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس یہی نکلتا ہے کہ: ۔ ؎

عاشقم بر رنج خویش و درد خویش
بہر خوشنودی شاہ فرد خویش　(رومی)

اور عارف رومی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں: ۔ ؎

آں کسے را کہ چنیں شاہے کشد　　　سوئے بخت و بہترین جائے کشد
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　انچہ در وہمت نیاید آں دہد

اور ہر حال میں رضا ان کا مقام ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اب "لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم" کا یہ نفوس قدسیہ صحیح مصداق بن جاتے ہیں (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) یہ نتیجہ ہے جذبات اور عقلی پرواز کو اوامر الٰہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں قربان کر دینے کا۔ ؎

ایں راہ طریقت نہ بپائے عقل است　　　خاک قدم عشق ورائے عقل ست
مسے کہ ترشتہ چوں از ازلے تیر ست　　　اے خواجہ مپندار کہ جائے عقل ست　(الاعلم)

ترقی کا صحیح راستہ!

(جناب ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم، اے، پی، ایچ ڈی)

اصل موضوع پر کلام کرنے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ ہم ترقی کے مفہوم کی بابت اپنے ذہنوں کو صاف کرلیں، کیونکہ ہمارے اس خوف اور لالچ کے برق رفتار عہد نے مختلف قدروں ہی میں اہم تبدیلیاں نہیں کردی ہیں بلکہ اکثر الفاظ کے قالبوں میں نئے نئے معانی ڈال کر بقول غالب خرد کا نام جنوں اور جنوں کا نام خرد رکھ دیا ہے۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور ہمارا ذہن کسی اور طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ہمارے خیالوں میں پراگندگی اور سوچنے اور سمجھنے کے طریقہ میں کجی پیدا ہوتی ہے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ترقی کے معنی آگے بڑھنے کے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کس طرف؟ ہم کس شخص یا کس قوم کو ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں؟ ہمارا زمانہ مغرب سے مرعوبیت کا زمانہ ہے اور اگرچہ اب مشرقی قومیں بھی اپنے صدیوں کے خواب سے چونک کر غلامی کی زنجیریں توڑ کر اپنے گرد و پیش کو تھوڑی بہت تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی ہیں، مگر عام حالت اب بھی یہی ہے کہ جو سکے مغربی تہذیب ڈھال کر بھیج دیتی ہے وہ بلا تکلف ہمارے یہاں رائج ہو جاتے ہیں اور ہم کھرے اور کھوٹے میں فرق کرنے کی زحمت نہیں گوارہ کرتے۔

مغرب کا ذہن تمام تر مادہ پرست ہے اور اسے ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ یہ ثمرہ ہے روم تہذیب کا اور روم تہذیب کی بنیاد قدیم یونانی تہذیب نے رکھی تھی جو مادی ترقی اور حظ نفس کو مقصود بالذات سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس کی تعمیر ہی میں اس کی خرابی کی صورت

مضمر ہے۔

مغربی تمدن میں اولاً تو دینی شعور ہے ہی نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ زمانہ کے آگے آگے چلنے کے بجائے اس کے پیچھے چلتا ہے۔ اس تمدن کی بنیاد ابتدا میں سائنس اور صنعت و حرفت اور سیاسی جمہوریت پر رکھی گئی تھی لیکن اس کی نشو و نما تغلب و استعمار اور کمزور قوموں پر ظلم و استبداد کے ذریعہ حاصل کی ہوئی دولت سے ہوئی اور ہو رہی ہے اور پھر جوں جوں ترقی ہوتی گئی تن آسانی اور عیش پرستی کی تمام باتیں اس کا جزو بنتی گئیں، نتیجہ یہ ہے کہ عیاشی اور نمود نے اتنا فروغ پایا ہے کہ اعلیٰ اخلاقی خصائل تباہ ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس کے شیدائی یہ نہیں دیکھتے کہ روحانی عنصر نہ ہونے کی وجہ سے مغربی تمدن کس تیزی سے ہلاکت کی طرف جا رہا ہے۔

ایڈورڈ گبن نے تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تاریخ دراصل جرموں، غلطیوں اور نوع انسانی کی بدنصیبیوں کے رجسٹر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے" ہم بغیر کسی تصرف یا غلط بیانی کے یہی تعریف مغربی تمدن کی تاریخ پر بھی چسپاں کر سکتے ہیں۔ دو عظیم جنگیں، فسطائیت، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نہ جانے کتنے دوسرے فتنے اس کے بطن سے پیدا ہو چکے ہیں۔

ان سطور سے ہمارا مقصد مادی ترقی کی نفی کرنا نہیں ہے، صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر دنیاوی ترقی روحانی اور اخلاقی شعور کے ماتحت نہ ہو تو وہ کس درجہ خطرناک اور کیسے خطرات بن جاتی ہے۔

جس طرح انسان میں جسم اور روح کا امتزاج ہے اسی طرح اس کی ترقی کے بھی مادی اور روحانی دو پہلو ہیں اور دنیاوی ترقی اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب اسے اطاعت الٰہی کے زیر سایہ حاصل کیا جائے۔

جو تمدن ان دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ چھوڑ دے وہ غیر متدل اور ناقص ہے۔ صحیح تمدن وہی ہے جو دونوں کے مطالبوں اور تقاضوں کو تسلیم کرے

اوران میں عدل کرے، اور اپنے سامنے یہ نصب العین رکھے کہ انسان کے مادّہ کے ڈھیر کو انسانیت میں تبدیل کرنا ہی ترقی کا صحیح مفہوم ہے۔

لیکن اس متوازن ترقی کا راستہ صرف اسلام دکھا سکتا ہے کیونکہ وہ ایک طرف مادیت کی نفی نہیں کرتا اور نہ اس کے امکانات اور تقاضوں سے صرف نظر کرتا ہے اور دوسری طرف وہ ان بنیادی روحانی اور اخلاقی قدروں کا بھی محافظ ہے جو مادہ کے ڈھیر کو انسانیت میں تبدیل کرتی ہیں۔

ہم نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ دنیوی علم و عمل سے دین کا رابطہ توڑ دیا ہے کہیں صرف مادّی اور دنیوی بہبودی پر زور ہے کہ قابل توجہ یہی چیزیں ہیں اور اگر دینی اصول ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے نظر آئیں تو انہیں بلا جھجک قلمزد کر دینا چاہیئے۔ اور کہیں مذہب یا بالفاظ صحیح دینی تعلیم کو مرکز بنایا ہوا ہے کہ قدیم تعلیم و تہذیب کے دائرہ میں محدود رہو ورنہ جدید تعلیم و تہذیب تم کو جہنم میں پہونچا دے گی۔ نئے علوم و فنون جاننے والے طبقہ کی اکثریت اپنے قدیم تہذیبی سرمایہ سے ناواقف ہونے کے باعث دین سے عدم التفات کو ترقی کا وسیلہ سمجھتی ہے اور قدیم علوم و فنون کے وارث عصری رجحانات سے بیخبری کی وجہ سے پرانی بحثوں اور روایتی اندازِ فکر کے اسیر ہیں اور مذہب کے سانچہ میں ڈھال کر ایک ترقی یافتہ اور متوازن تمدن کی تشکیل کی ضرورت یا تو محسوس نہیں کرتے یا خود کو اس کا اہل نہیں پاتے۔

عام مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کی نوعیت شعوری نہیں بلکہ جذباتی ہوگئی ہے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے جسموں میں جھرجھری اب بھی پیدا ہو جاتی ہے، مسلمانوں کی زبوں حالی سے دل اب متاثر ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل سے تو ہم اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں مگر چلتے غیر اسلامی طریق پر ہیں اور زندگی غیر اسلامی اصولوں پر مرتب کرتے ہیں۔ بعض حضرات دین سے سیاست کا کام لینا چاہتے ہیں، بعض تجارت کا اور زیادہ تر تو اس سے کوئی کام ہی نہیں لینا چاہتے، حال و قال کا یہ بُعد ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھایا ہوا ہے۔ خدا کو مالک اور آقا مان کر

کوئے غیر میں گداگری کرتے ہم کو شرم نہیں آتی، جھوٹ کو ام الخبائث تسلیم کر کے چند بیگہ زمین کیلئے جھوٹا حلف اٹھا لینا ہمارے لئے ندا لجھن نہیں پیدا کرتا ہے خود غرضی اور باہمی عداوت سے رسمی طور پر عبرت اندوز ہونے کے لئے ہم ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن اپنی روزمرہ کی زندگی میں خلوص، ایثار اور خدمت کے جذبات پیدا کرنا ہمارے لئے محال ہے۔ مالی ابتری کے باوجود محنت اور کفایت شعاری پر ہماری طبیعتیں نہیں مائل ہوتیں۔ غرض خدا اور آخرت پر ایمان اور ہماری نمازیں اور ہمارے روزے ہم کو خود غرضی، جھوٹ، قوت پرستی، دولت کی طمع اور اس طرح کے دوسرے روحانی واخلاقی امراض سے نجات دلانے میں کارگر نہیں ہوتے، حالانکہ انھیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

سرچارلس لائی نے بڑے مزے کی بات کہی ہے کہ "ایشیا جیسا عملی سیاست کا اسکول کہیں نہیں ہے، جہاں نیکی اور انصاف کے نہایت پاکیزہ اور قابل تعریف اصولوں کے ساتھ چھین لو اور دبا بیٹھو کا پرانا طریقہ اب بھی رائج ہے اور جہاں فعال اور مسلمات کا تضاد کسی کو مطلق نہیں کھٹکتا۔"

یہاں اس سے بحث نہیں کہ آیا تنہا ایشیا ہی اس الزام کا مستحق ہے اور دنیا کے دوسرے برّاعظم اس سے بری ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ کل ایشیا پر یہ بات صادق آتی ہو یا نہ ہو مسلمانوں کی حالت ضرور ایسی ہی ہے، ان کے یہاں عقائد و اعمال میں مناسبت ہی معدوم نہیں بلکہ اس عدم مناسبت پر ان کا ضمیر ہلکی سی چٹکی بھی نہیں لیتا۔ اور یہ اس لئے ہے کہ اسلام سے ان کے تعلق کی نوعیت محض طبعی، رسمی اور نسلی ہو گئی ہے۔ دینداری کے معنی چند عقائد کا اقرار اور چند رسوم کی ادائیگی سمجھ لئے گئے ہیں اور زبان سے اسلام کے دین عمل، اور ضابطۂ حیات ہونے کا لاکھ دعویٰ کیا جائے معاشرت میں خوف خدا کو راہ نما بنانے پر کوئی راضی نہیں ہے۔

اسلام کی عظیم الشان عمارت کے چار ستون ہیں (۱) اعتقادات (۲) عبادات، (۳) اخلاقیات، اور (۴) معاملات۔ حضور سرور کائنات کی رسالت کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ ان چاروں عنوانوں کا مجموعہ تھی۔ آپ نے یہ حقیقت بار بار دہرائی کہ ہر انسان کا ایک

تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی مخلوقات کے ساتھ یعنی اس کا ایک رخ عالم غیب کی طرف ہے اور دوسرا عالم شہود کی طرف خدا اور بندہ کے تعلق کے جن اجزا کا تعلق ہماری قلبی و ذہنی کیفیات سے ہے ان کو اعتقادات کہتے ہیں اور جن اجزا کا تعلق ہمارے جسم و جان اور مال و دولت سے ہے وہ تین ابواب یعنی عبادت اخلاق اور معاملہ میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ اسلام کی تکمیل کے لئے ان چاروں کا استحکام ضروری ہے۔ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں آمنوا کے ساتھ ساتھ وعملوا الصّٰلحٰت پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔

دراصل اعمالِ حسنہ ہی ایمان کی پختگی کی پہچان ہیں، ویسے ہی جیسے درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص ایمان کا تو دعویدار ہو مگر اس کے اعمال میں ایمان کے مطابق اچھائی نہ پائی جاتی ہو تو یہ کھلی ہوئی علامت اس بات کی ہوگی کہ ایمان اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں تک نہیں پہونچا ہے۔ احادیث میں اس مضمون کی کمی نہیں۔ مثلاً

"مومنوں میں اسی کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں" (سنن ابی داؤد)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے" (بخاری)

"جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں" (بخاری)

"اچھے خلق ہی کو اسلام کہتے ہیں"

"قیامت کی ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی اور چیز نہ ہوگی۔"

"خوش اخلاق دنیا اور آخرت کی نیکی کو لے گیا"

"بخل اور بداخلاقی دو ایسی چیزیں ہیں جو مومن میں کبھی جمع نہیں ہوتیں۔"

"جو آدمیوں کو زیادہ نفع پہونچاتا ہے وہی زیادہ اچھا آدمی ہے۔"

"جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہیں وہ مسلمان نہیں۔" (کنز العمال)

مختصر یہ کہ اسلام اور زندگی میں ایک نہ ٹوٹنے والا رابطہ اور علاقہ ہے اور اس کی ہمہ گیر تعلیم کے ثمرات سے ہم تب ہی اپنی جھولیاں بھر سکتے ہیں جب ہم اس کو اپنی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی کرلیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی ترقی کا مدار اپنے اندر سچا مذہبی جذبہ بیدار کرنے پر ہے تاکہ ہمارے تمدن کی بنیاد ابدی اخلاقی قدروں پر ہو۔ وہ طرز زندگی اور وہ تمدن جو مادی اغراض سے مغلوب ہو کر منشائے حق کو پس پشت ڈال دیتا ہے خود بھی برباد ہو جاتا ہے اور انسانیت کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کی تعمیر ریت کی دیواروں پر ہوتی ہے اور جب وہ اپنے ہی پیدا کئے ہوئے معائب کے بوجھ سے بیٹھنے لگتا ہے ——— جیسا کہ ضروری ہے ——— تو ہمسایوں کو بھی تباہ کر ڈالتا ہے۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے، لیکن جن کی آنکھیں مغرب کی جگمگاہٹ سے خیرہ ہو گئی ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی عمر ابھی صرف ڈیڑھ سو سال ہی ہے اور اتنی ہی عمر میں جو تاریخی اعتبار سے کچھ بھی نہ ہوئی، اس میں انحطاط کی علامتیں پیدا ہو گئی ہیں اور اس کے مستقبل کی بابت سخت اندیشے ظاہر کئے جا رہے ہیں۔

تہذیب اپنے عروج کو نہیں پہونچ سکتی جب تک انسان اپنی زندگی کا رشتہ رضائے الٰہی سے نہ جوڑے، اور مادی ترقی صرف اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب روحانی اور اخلاقی اقدار سے اس کا رشتہ قائم رہے۔ ایک متوازن اور عادلانہ نظام تمدن تشفیٔ نفس نہیں بلکہ احتساب نفس ہی کے سہارے وجود میں آسکتا ہے اور مسلمان کسی اور ذہنی فضا میں مسلمان کی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکتے۔

ہم کو چاہئے کہ اسلام کے آب حیات سے اپنے معاشرہ کو سیراب کریں ہم میں ایک ایسی جماعت ہو جو اسلام کے عقائد اور اصولوں کو لیکر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے

اور زندگی کے نشیب و فراز اور اس کے ہمیشہ بدلتے ہوئے حالات اور مسائل میں ان کو برت کر دکھائے تاکہ قوم کو صحیح عملی ہدایت ملے اور قوم میں پختہ دینی شعور اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ یہی چیز ہمیں ترقی کے صحیح راستہ پر لگا سکتی ہے اور اسی کی اس وقت ضرورت ہے اور اگر نظر کو ذرا وسیع کر کے دیکھا جائے تو قرآن کی اس آیت میں بھی ہم کو یہی حکم ملے گا۔

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ	اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونا چاہئے
يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ	جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور انھیں
بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ	اچھے کام کرنے کی ترغیب دے اور برے
عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاُولٰٓئِكَ	کاموں سے روکے اور یہی لوگ ہیں
هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (آل عمران)	فلاح پانے والے۔

یہ عمل جس طرح ہماری فلاح اخروی کا ضامن ہے۔ دنیوی فلاح و ترقی کے صحیح راستہ پر پڑنا بھی اسی پر موقوف ہے۔

ہم نے بدقسمتی سے اسلام کی سماجی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھا اور یہ نہیں دیکھا کہ یہی وہ صفت تھی جس نے اسلام کو روایتی مذاہب سے ممتاز کر کے اُسے ایک تاریخی حقیقت بنا دیا تھا۔

ہماری تاریخ کے نازک دوروں میں ایسی عظیم المرتبت شخصیتیں ضرور اُبھریں جنھوں نے معاشرہ کے بارے میں اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنی جانوں تک کی بازی لگا دی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام اندر و باہر کے بے شمار خطروں کا مقابلہ کر کے آج بھی ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے قائم ہے لیکن عام طور پر ہمارے دینی رہنماؤں کی اکثریت نے اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا، نہ ذہنی اور علمی سطح پر اور نہ عمل کے میدان میں، مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں اور گھروں، کالجوں، کھیتوں اور کارخانوں کی درمیانی خلیج پر پل بنانے کی کوشش ادھوری ہی رہی اور زندگی کو دین سے اور دین کو زندگی سے قوت کی لہریں جیسی کہ پہنچنی چاہئے تھیں نہیں پہونچ

سکیں۔ اسلام کا دین دنیا کی تفریق اور اس بارے میں افراط و تفریط پوری قوم کا مزاج بنا ہوا ہے جو ہزار خرابیوں کی جڑ ہے۔

اسلام کی وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں جن کے بحسن و خوبی انجام دینے کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ دراصل اسلام آیا اسی لئے تھا کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہی رکھدے (سیرت ابن ہشام جلد اوّل) یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اس سے یہ کام نہیں لیتے، جب تک ہم نے اسلام کی روح سے اپنی زندگیوں کو منسلک رکھا دنیا نے اس صداقت کا حیرت انگیز مظاہرہ دیکھا لیکن خلافت راشدہ کے بعد جب یہ رشتہ کمزور پڑ گیا اور ملک گیری مسلمانوں کے فعال طبقہ کا نمایاں مقصد بن گئی تو اسلام ایک سیاسی قوت کی طرح دنیا کے بڑے حصہ پر تو چھایا رہا، مگر اس کے جسم سے اس کی روح جدا ہو گئی۔ یہ کوئی اچھی شکل نہ تھی اور انجام [illegible] ہوا جو ہر ایسی سیاسی طاقت کا بالآخر ہوتا ہے جو اچھے اخلاقی اصولوں سے تربیت نہیں لیتی۔ روحانی امراض نے معاشرہ کو کھوکھلا کر دیا، زندگی کے خانے کمزور پڑ گئے اور رفتہ رفتہ دولت و حکومت بھی جاتی رہی۔

ہماری بہبودی اسی میں ہے کہ ہم روحانیت اور مادیت کے امتزاج کی اسلامی تشریح و توضیح کو اپنی اجتماعی زندگی میں جذب کرلیں، جب تک یہ نہ ہوگا ہم ترقی سے یونہی محروم رہیں گے جیسے کہ آج ہیں۔

علامہ اقبال اور عارفانِ کامل

از

قاضی محمد عدیل عباسی

علامہ اقبال کا کلام مولانا رومؒ کی تعلیمات کا از ابتدا تا انتہا مظہر ہے۔ اقبال نے اپنے کلام کا آغاز ہی اس سے کیا ہے کہ خواب میں مرشدِ رومی نے ہدایت فرمائی اور بموجب ہدایت مریدِ ہندی نے مطالعۂ کائنات بصورت حقائق اسلام پیش کیا ؎

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید
از پسِ کہسار آمد پدید

پیرِ رومی خاکِ را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

ذرّہ از خاکِ بیابان رخت بست
تا شعاعِ آفتاب آرد بدست

موجم و در بحرِ او منزل کنم
تا درِ تابندہ حاصل کنم

روحِ خود بنمود پیرِ حق سرشت
کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

(یعنی حضرت مولانا رومؒ خواب میں تشریف لائے جنھوں نے فارسی زبان میں گویا قرآن تصنیف کیا ہے۔) اور فرمایا ؎

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن!
بزم را از ہائے و ہو آباد کن!
خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را
از قمِ خود زندہ تر کن زندہ را

یعنی ایک نیا اندازِ حقائقِ قدیم کو دے۔ تب اقبال کے قلب میں گرمی آئی ؎

زیں سخن آتش بہ پیراہن شدم
مثلِ نے ہنگامہ آبستن شدم
برگرفتم پردہ از رازِ خودی

وا نمودم سرِّ اعجازِ خودی

یعنی مولانا روم کے اس پیغام سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے معرفتِ نفس اور نفس کے حقائق یعنی رازِ خودی پر جو پردہ پڑا ہے اُس کے اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ اقبال اعتراف کرتا ہے کہ اُس نے اپنے کلام کا فیض مولانا روم سے حاصل کیا کس جذب و مستی سے کہتا ہے ؎

مُطرب غزلے بیتے از مُرشدِ رُوم آور
تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

یعنی تمنا ظاہر کرتا ہے کہ مرشد روم سے ایک غزل کیا ایک شعر ہی مل جائے تاکہ میری جان آتشِ تبریز میں غوطہ زن ہو جائے۔ رُومی اقبال کے لئے سند ہیں اور جا بجا ان کو بطورِ سند پیش کیا ہے ؎

گفت رومی ہر بناءِ کہنہ کآباداں کنند
می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

یعنی رومی نے کہا ہے اور رومی کا قول غلط نہیں ہو سکتا ہے کہ جب کسی پُرانے مکان کی جگہ نیا مکان بنایا جاتا ہے تو پُرانے مکان کی بنیادیں برباد کر دی جاتی ہیں یہی حال مسلمانوں کی تعمیر نو کا ہے تباہیاں نئی تعمیر کا پیش خیمہ ہیں چنانچہ تمام شعرا کے جام و سبو کو اقبال نے کھنگھالا تو کچھ نہ کچھ آمیزش ہر جگہ ملی اگرچہ یہ آمیزش لطیف تھی لیکن رومی نے کہا کہ ؎

آمیزشے کجا گہرِ پاکِ او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

یعنی جتنے پیغامات شعراء صاحبانِ حقیقت جو کے ہیں سب میں کچھ نہ کچھ آمیزش ہے لیکن رومی کے جامِ معرفت میں براہِ راست انگور کے خوشہ کی شراب ہے۔ چنانچہ اقبال اکثر بوعلی سینا کو فلسفہ و حکمت کے لئے اور رومی کو حق آگہی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قطعہ

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم | دستِ رُومی پردۂ محمل گرفت
آں فرو تر رفت تا گوہر رسید | ایں بہ گردابے چوں خس منزل گرفت

یعنی فلسفی تو غبارِ ناقہ میں ہی گم رہتا ہے لیکن اہلِ معرفت پردہ محمل تک پہنچ جاتے ہیں فلسفی گرداب میں تنکے کی طرح چکر لگاتا ہے اور عارف سمندر کی تہ میں جاکر موتی لے آتا ہے۔

رُومی کے تلمذ کا تو اقبالؔ علانیہ اعتراف کرتے ہیں اور اسی کو باعثِ فخر قرار دیتے ہیں، اس سے تو ان کا سارا کلام بھرا پڑا ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے رُوم و تبریز است

یعنی مجھ کو دیکھو ایسا ہندوستان میں دوسرا نہیں ملے گا۔ میں ایک برہمن کا لڑکا اور روم و تبریز کا رمز آشنا ہوں (نوٹ: اقبالؔ کے آباؤ اجداد برہمن تھے)۔ لیکن اقبال مجدد صاحبؒ سے بھی حد درجہ متاثر ہیں اور ان سے بھی بہت سی باتیں مستعار لی ہیں اور سیکھی ہیں چنانچہ حضرت مجدد صاحب کے بارے میں اقبال اپنی نذرِ عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں شیخ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار

فلسفہ

لیکن عقیدت، مداحی، ادب اور نیازمندی سے زیادہ اس وقت سوال شاگردی اور استفادہ کا ہے۔ اقبالؔ کے کلام پر حضرت مجدد صاحب کی تعلیم و تلقین کی ہر جگہ چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اقبالؔ خود ایک بڑا فلسفی ہے چنانچہ اپنی فلسفہ دانی پر خود ہی اظہارِ خیال کیا ہے اور جا بجا کیا ہے ؎

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں کمیاب ہے صہبا

دوسری جگہ ایک سید زادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

میں اصل کا خاص سومناتی	آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیدِ ہاشمی کی اولاد	میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں	پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے	اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

لیکن وہ فلسفہ یا خرد کو وبال تصور کرتا ہے۔ کہتا ہے ؎

انجامِ خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

چنانچہ مولانا رُومؒ کے قول کے مطابق کہ "زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است" اقبالؔ جا بجا عقل کی مذمت اور عشق کی بارگاہ میں سرِ نیاز خم کرتا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

چنانچہ میلادِ آدم کے بارے میں ارشاد ہے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

مغرب کی نقاب کُشائی کرتے ہوئے فلسفہ کی اصل حقیقت کو کس طرح آشکارا کیا ہے

مُکدّر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی

"عقل" اور "فلسفہ" کے بارے میں اقبالؔ نے یہ جو کچھ کہا ہے یہ بعینہٖ حضرت مجددؒ کی تعلیم ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ضرورت اور انسانیت پر اُن کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے اور عقل و فلسفہ کے طریقے پر تنقید کرتے ہوئے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"اگر ان اکابر (انبیاء علیہم السلام) کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو انسانی عقلیں صانعِ عالم کی ہستی کے علم و اثبات اور اُس کے صفات و کمالات کے ادراک سے عاجز و قاصر رہتیں ـــ قدیم فلاسفہ (حکماء یونان) جو اپنے کو عقلِ کل سمجھتے تھے، وجودِ صانع کے مُنکر تھے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ محض عقل اس دولتِ عظمیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اُس کی توحید کے علم و ادراک سے قاصر ہے اور نبوت کی رہنمائی کے بغیر دولتِ خانۂ توحید کا سُراغ نہیں مل سکتا، یہی حال تمام سماعی حقائق ملائکہ، حشر نشر، جنت و دوزخ وغیرہ کا ہے ...... عقل ان تمام باتوں کے ادراک

سے قاصر ہے . . . . . جس طرح عقل کی پرواز حسن ظاہری سے اوپر ہے کہ جس بات کا ادراک ظاہری حواس سے نہیں ہو سکتا، عقل اُس کا ادراک کر لیتی ہے اسی طرح طریق نبوت طریقِ عقل سے بلند و بالا ہے۔ جن حقائق کا علم عقل سے حاصل نہیں کیا جا سکتا وہ نبوت کے توسل سے معلوم ہو جاتے ہیں . . . . . اگر عقل ان معاملات میں رہنمائی کے لئے کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان ضلالت و گمراہی کے میدان میں سرگرداں نہ ہوتے اور حق تعالیٰ کی معرفت اُن کو سب سے زیادہ حاصل ہوتی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ذات و صفاتِ حق کے معاملہ میں سب سے زیادہ جاہل ہم نے اسی گروہ کو دیکھا ہے۔ الٰہیات کے بارے میں اُن کی حماقتیں اور سفاہتیں حد سے گزری ہوئی ہیں ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کُلّ آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حُکمِ اکثر است

(مکتوباتِ امام ربانی دفتر سوم مکتوب ۲۳)

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

" ہو سکتا ہے کہ کچھ حقیقتیں بجائے خود صحیح اور واقعی ہوں اور ہماری ناقص عقلیں اُن کو مستبعد سمجھتی ہوں۔ اگر تمام حقائق کے ادراک کے لئے عقل کافی ہوتی تو بوعلی سینا جیسے حکماء اور فلاسفہ کے عقلی فیصلوں میں کبھی غلطی نہ ہوتی، حالانکہ ایک ایک مسئلہ میں انھوں نے ایسی مضحکہ خیز غلطیاں کھائی ہیں کہ بقول امام رازی " یضحك منه الصبیان" (سُن کے چھوٹے بچوں کو بھی ہنسی آجائے) "۔۔۔

آگے فرماتے ہیں :۔

" ہمارا مطلب و مدّعا یہ نہیں ہے کہ عقل رہنمائی کے قابل ہی نہیں ہے، بے شک وہ بھی دلیل اور راہنما ہے لیکن کامل رہنما نہیں ہے۔ انسانیت کے لئے کامل رہنما بس انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے "

(دفتر سوم مکتوب نمبر ۴۴)

اقبال نے عارفین سے یعنی جو حیات و کائنات کی حقیقتوں کو قلب کی نظر سے دیکھتے ہیں اُن کے فن کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ خود اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا بلکہ مسلّمات کو زبان دبیان کی خوبیوں سے آراستہ کر کے پیش کرتا ہے اس لئے وہ اپنے اوپر عام شاعری کا اطلاق پسند نہیں کرتا ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست

یعنی وہ آدمی جو میرے اُوپر شعر و سخن کی تہمت لگائے اُس سے کسی خیر کی اُمید نہ رکھنا۔ مطلب یہ ہے کہ میں حقائقِ ایمان و اسلام کو پیش کرتا ہوں، شاعری کے عام چلن سے تعلق نہیں رکھتا ؎

بکوئے دلبراں کارے نہ دارم
دل زارے، غمِ یارے نہ دارم

یعنی میں شاعر کیسے ہو سکتا ہوں کیونکہ نہ مجھے کوئے جاناں سے واسطہ ہے، نہ دلِ زار رکھتا ہوں اور نہ کسی یار کا غم۔ اس طرح وہ صرف اسلام کا مطرب و مغنی ہے اور اسلام اُس نے عارفانِ کامل سے سیکھا ہے۔

وحدتِ وجود

خدا، رُوح اور مادہ کے بارے میں طرح طرح کی کم فکریاں اور مضحکہ خیز حد تک غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں چنانچہ ان بعض ناقابلِ قبول باتوں کو جگہ جگہ مسلمانوں نے بھی قبول کر لیا جن کی برابر ہر زمانہ میں کتاب و سُنّت کی روشنی میں اصلاح ہوتی چلی آئی ہے چنانچہ انہی میں ایک عقیدہ وحدتِ وجود کا ہے جس کے اصطلاحی معنی عام طور سے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ صرف خدا کا وجود ہے بقیہ وا ہمہ ہے اسے مختلف مذاہب اور عقائد میں طرح طرح سے اور بڑے رُومانی انداز سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں یہ سوامی شنکر اچاریہ کا لایا ہوا ویدانتی فلسفہ کہلاتا ہے۔ جب بُدھ جی نے خُدا کا نہ اقرار کیا اور نہ انکار کیا اور بُدھ مذہب بڑے زور و شور سے پھیل گیا تو سوامی شنکر اچاریہ یہ دوسرا انتہا پسندانہ عقیدہ لے کر اُٹھے اور اُنھوں نے یہ تعلیم

دینی شروع کی کہ بس خدا کا وجود ہے اور کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے روح کے وجود کا بھی انکار لازم آتا ہے۔ اسی فلسفہ کو حال میں سوامی ویکانند نے اپنایا اور ہمالیہ پہاڑ سے راس کماری تک اس کی تبلیغ کرتے رہے۔ وہ جب کسی کو خط لکھتے تھے تو اس کو اس طرح مخاطب کرتے تھے: "میں خود فلاں کی شکل میں۔" اس عقیدے نے بعض اسلامی مفکرین اور صوفیہ کو بھی متأثر کیا۔ چنانچہ غالب کہتا ہے ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اسلامی تاریخ میں "منصور حلاج" کا قصہ شہرت عام رکھتا ہے جس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ واقعہ ادب و شعر میں بھی پوری طرح پیوست ہو گیا ہے اور بڑے رومانی انداز سے اس کے تذکرے آئے ہیں۔ اقبال نے اس کی تردید زوردار سے زوردار الفاظ میں پوری قوت اور بڑی شاعرانہ محاکات کے ساتھ کی ہے۔ چنانچہ اپنی ایک تصنیف "زبور عجم" میں ایک خاص باب "گلشن راز جدید" باندھا۔ اس میں مختلف سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ اس کا تفصیلی تذکرہ طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ مگر دیکھئے کس یقینِ کامل اور کس تیور سے کہتا ہے ؎

جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے
نمی آید بہ فکر جبرئیلے

یعنی دنیا ظاہر ہے اور پھر بھی اس کے وجود کے لئے دلیل تلاش کی جاتی ہے۔ یہ بات جبرئیل کی فکر میں بھی آنے والی نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ خودی، خود آگاہی اور خدا آگاہی پر زور دیتا ہے کیونکہ اس سے اپنا یعنی روح یا ایغو کا وجود لازم قرار پاتا ہے۔ اقبال نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا، روح اور مادہ تینوں کا وجود ہے اور خدا روح اور مادہ کا خالق ہے اور یہی صحیح اسلامی عقیدہ ہے۔ درحقیقت جب اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو اُن کو نہ محض کتابی علوم سے حل کیا جا سکتا ہے اور نہ عقلی موشگافیوں سے بلکہ ایک بڑی دلیل کسی عارفِ کامل کا تجربہ ہونا چاہئے جس نے باطن کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہو اور جو ان منازل سے گزرا ہو۔ دراصل ایسا ہی مردِ خود آگاہ جانی بوجھی راہوں اور اپنے اُوپر گزری ہوئی

کیفیات و واردات کو بیان کرتا ہے تو وہ یقین کے لئے وہی استواری پیدا کرتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پرندوں کے ٹکڑوں کے مل کر ہوا میں اُڑنے سے ہوا تھا۔ علمائے ظاہر جو بڑے سے بڑا درجہ رکھتے تھے اُن کو شاہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کا حوالہ دے کر مندرجہ بالا قسم کی دلیل سے اطمینانِ قلب حاصل کرتے ہوئے پایا گیا ہے۔ اقبالؔ نے بھی یہ یقین حضرت مجدد صاحبؒ کے تجربہ سے حاصل کیا تھا حضرت مجددؒ نے اپنے کئی مکتوبات میں اپنی یہ سرگزشت لکھی ہے کہ:-

"میں بچپن سے اور موروثی طور پر توحید وجودی کا قائل اور علمی و ذہنی طور پر گویا اس پر مطمئن تھا اس کے بعد جب میں نے راہِ سلوک میں سفر شروع کیا تو شروع میں مجھے یہی راہ منکشف ہوئی اور انہی علوم و معارف کا ورود ہوتا رہا جو اس راہ یعنی توحیدِ وجودی سے مناسبت رکھتے تھے۔ اس کے بعد اس فقیر پر ایک دوسری نسبت کا غلبہ ہوا اور اُس میں درجہ بدرجہ ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ میں اُس مقام تک پہنچ گیا کہ میں نے یقین کے ساتھ محسوس کر لیا اور گویا دیکھ لیا کہ توحید وجودی دراصل اس راہ کی ایک منزل ہے۔ اصل مقام مقامِ عبدیت ہے جہاں تک عنایتِ الٰہی نے مجھے آخر میں پہنچایا۔"

اپنی یہ سرگزشت ایک مکتوب میں لکھ کر آخر میں فرماتے ہیں:-

"ایں زماں کمال ایں مقام در نظر در آمد و علو آں واضح گشت و از مقامات گذشتہ تائب و مستغفر شد"[1] (دفتر اول، مکتوب ۱۵)

رُوح کا وجود

یہی حال رُوح کے وجود کا ہے۔ صوفیا کی ایک اصطلاح "نفی خودی" کی تھی۔ اس کا مطلب رُوح کے وجود سے انکار نہ تھا لیکن اقبالؔ نے شاعری کی رنگینی اور رومانیت کے لئے اس اصطلاح سے خوب فائدہ اُٹھایا اور اپنا کلام ہی اثباتِ خودی سے شروع کیا جنانچہ کسی صوفی نے کیا خوب شعر کہا ہے۔ شعری خوبیوں کے لحاظ سے شعر کتنا لاجواب ہے ملاحظہ ہو

[1] اس زمانہ میں اس مقام کا کمال اور اُس کی رفعت کا علم ہوا اور اس علم کے بعد گزشتہ مقامات و احوال سے میں نے توبہ و استغفار کیا۔

خود را نہ پرستیدہ عرفاں چہ شناسی
کافر نہ شدی لذتِ ایماں چہ شناسی

اسی کے بارے میں اقبال کہتا ہے

خود را کنم سجودے دیر و حرم نماندہ
ایں در عرب نماندہ آں در عجم نماندہ

اور تلقین یہ ہے کہ

شمعِ خود را ہمچو رومی بر فروز
روم را در آتشِ تبریز سوز

وہ کس ذوق و شوق سے وجد کے عالم میں آواز دے رہا ہے۔ قطعہ

زمن گو صوفیانِ باصفا را خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمت آں خود پرستم کہ با نورِ خودی بیند خدا را

اور وحدتِ وجود پر پھر یوں وار اس طرح کرتا ہے

دگر از شنکر و منصور کم گوئے

یعنی سوامی شنکر اچاریہ اور منصور کا ذکر ترک کرو۔ ان غلط باتوں سے باز آؤ۔

عشقِ رسولؐ

اقبال نے جس طرح رومی اور حضرت مجدد الف ثانی سے فیض حاصل کیا ہے اُسی طرح وہ جنید بغدادی۔ عطار۔ عراقی۔ بایزید۔ ملا جامی اور تمام مشہور عارفانِ کامل سے استفادہ کرتا ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ خودی کے مضامین کے عنوانات یہ ثابت کریں گے کہ اقبال کا ماخذ قرآن و حدیث کے علاوہ وہ شرحیں بھی تھیں جو صاحبانِ کیف و سرور نے اپنی خود آگاہی و خدا آگاہی سے مجتمع کی تھیں۔ آئیے ذرا ان عنوانات پر نظر ڈالیں۔ "مقصدِ حیاتِ مسلم اعلائے کلمۃ اللہ است و جہاد اگر محرک جوع الارض باشد در مذہبِ اسلام حرام است" ۔۔۔۔ "پیشکش بحضور ملتِ اسلامیہ" جس کا پہلا شعر یہ ہے

اے ترا حق خاتم اقوام کرد
بہر تو ہر آغاز را انجام کرد

"مقصودِ رسالتِ محمدیہ" "تشکیل و تاسیسِ حریت و مساوات و اخوت بنی نوعِ آدم است"۔ "حریتِ اسلامیہ و سترِ حادثہ کربلا"۔ "وطن اساسِ ملت نیست"۔ "پختگیِ سیرۃِ ملیہ از اتباعِ آئینِ الہیہ است"۔ "حسنِ سیرتِ محمدیہ از تادب بہ آدابِ محمدیہ است"۔ "مرکزِ ملتِ اسلامیہ بیت الحرام است"۔ "کمالِ حیاتِ ملیہ ایں است کہ ملت مثلِ مرد احساسِ خودی پیدا کند و تولید و تکمیلِ ایں احساس از ضبطِ روایاتِ ملیہ ممکن گردد"۔ "شرحِ اسمائے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ" وغیرہ وغیرہ اور اقبال کا پیام "عشقِ رسول" تمام عارفانِ زمانۂ قدیم و جدید کے مسلک کا نچوڑ ہے وہ کہیں عراقی کے حسبِ ذیل شعر کو عنوان قرار دیتا ہے جو انھوں نے روضۂ نبوی کے بارے میں کہا ہے ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یعنی آسمان کے نیچے یہ ایک ادب کی جگہ ہے، یہاں آکر جنید اور بایزید کے بھی ہوش گم ہو جاتے ہیں۔

اور کہیں ملا جامی کی گراں قدر نعتوں پر رشک کی نگاہ ڈالتا ہے ؎

کشتۂ اندازِ ملا جامیم
نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

اور خود جا بجا عجیب عجیب انداز سے اس پر روشنی ڈالتا ہے جس میں "گرمیِ آہِ بیتابانہ" "لغزشِ مستانہ" کی عجیب شان ہے۔ قطعہ

من چہ گویم از تولایش کہ چیست | خشک چوبے در فراقِ او گریست
ہستیِ مسلم تجلی گاہِ او | طورہا لرزد ز گردِ راہِ او
پیکرم را آفرید آئینہ اش | صبحِ من از آفتابِ سینہ اش

اور پیام یہ ہے کہ ؎

لشکرے پیدا کند از سلطانِ عشق
جلوہ گرشو بر سرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرحِ "انی جاعل" سازد ترا

عارفانِ کامل کے خم خانۂ عشق سے سیراب ہونے کے بعد وہ اپنے شاعرانہ کمالات کو آلۂ کار بناتا ہے اور ہر معمولی چیز سے ایک دلسوز سبق دیتا ہے۔ "صبحِ درخشاں" "شتابِ ریگ" "ماہ داختر" "صبح کا ستارہ" اور دیگر مناظرِ فطرت کے تذکروں سے اسلام کی تعلیمات کو دلوں کے اندر جاگزیں کرتا ہے۔ یہ سب فیض اُن عارفانِ کاملین کا ہے جن کا وہ معتقد ہے اور جن کا اُس نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ برگساں اور نیٹشا وغیرہ کا خوشہ چیں نہیں اُن پر حرف زن ہے چنانچہ ملاحظہ ہو اُس کی ہمت مردانہ۔ نیٹشا کے بارے میں وہ کس جوانمردی سے کہتا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اُس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

مگر ہمارے ملک کے اہلِ علم جن کے خیالات کا سدرۃ المنتہیٰ یہ ہے کہ وہ کسی تصنیف یا تالیف یا ادب و شعر کے مجموعہ کو کسی فرانسیسی، جرمن، برطانوی مفکّر کے خیالات کا ترجمہ یا اُس کا چربہ ثابت کردیں۔ اُنھوں نے اقبال کو بھی انھیں فلسفیوں کا مقلد قرار دے دیا اور صرف اُس کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود مجتہد ہے اور اُس نے صرف علما و صوفیائے اسلام سے سبق لیا ہے۔

متعصبانہ افترا پردازی کی ایک بہت مکروہ مثال

(از۔ سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان۔)
ترجمہ۔۔۔ از مولوی محمد اقبال اعظمی

(مسیحیت کے ایک زبردست مبلغ اور فارن مشن ایسوسی ایشن کے معروف لیڈر ڈاکٹر گلوور نے اپنی ایک کتاب میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف تنقید کی شکل میں بہت ہی ذلیل قسم کی افترا پردازی کی تھی۔ پاکستان کے سابق اکاؤنٹنٹ جنرل سید محمد جمیل صاحب نے جو ہمارے دوستوں میں ہیں اپنی کتاب ( ) میں اسکو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ ذیل میں اسی کے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے)

ہے ڈاکٹر گلوور جو اسی بیسوی صدی کے ایک زبردست مشنری اسٹیٹمین اور بین الاقوامی فارن مشن ایسوسی ایشن کے ایک نمایاں لیڈر ہیں، ان کی ایک کتاب سنہ ء میں نیویارک سے ہارپر اینڈ برادرس نے شائع کی ہے جس کے چوتھے باب کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔

"تہذیب و حریت اور حق و صداقت کو تین چیزوں سے نقصان پہونچا ہے اور ان میں سے جن عناصر کا دنیا کو اب تک انکشاف ہو سکا ہے، ان میں "محمد کی تلوار" اور "قرآن" کا درجہ سب سے اونچا ہے، یہ دونوں تہذیب و حریت اور صداقت کے شدید ترین دشمن ہیں۔۔۔۔۔"

اور اس سے پہلے اسی کتاب میں کچھ اسی طرح کے بلکہ اس سے زیادہ تکلیف دہ الفاظ میں قرآن اور اسلام کو "خراج عقیدت" پیش کرتے ہوئے مصنف مذکور نے لکھا ہے۔

"قرآن حقائق و خرافات، قوانین اور افسانے اور غلط تاریخی روایات و اوہام کا ایک عجیب مجموعہ ہے، نیز اتنا غیر واضح ہے کہ اسے بغیر تفسیر کے سمجھا نہیں جا سکتا، مسلمانوں کا عقیدہ ایک خدا کے ماننے کا ہے لیکن ان کا خدا ایک بحیثیں اور جابر بے رحم ذات ہے جس کا خود اس کی مخلوق سے کوئی واسطہ بھی نہیں ہے۔"

"اسلام ایک خوفناک اور ڈراونی دوزخ اور ایک شہوانی لذتوں سے بھری ہوئی جنت کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی نمازیں ایک ہی فارمولا کی بے معنی تکرار معلوم ہوتی ہیں، اس کے روزے غریب تر اس کا زکوٰۃ و صدقات کا نظام نہایت معمولی اور لاحاصل ہے۔"

"اور جہاں تک عیسائی مشن اور اس کی تبلیغ پر اسلام کی اثر اندازی کا تعلق ہے، اور ہماری تبلیغی جدوجہد کو اسلام سے جو عظیم نقصان پہونچا ہے اس کی تعبیر ہم ان الفاظ سے زیادہ خوبی کے ساتھ نہیں کر سکتے جو سر ولیم نے اس سلسلہ میں لکھے ہیں جن سے صرف ہمارے اپنے ذاتی عقیدہ ہی کی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ ہمارا اندازہ ہے کہ یہی بالعموم ہماری پوری عیسائی تبلیغی مشنری کی متحدہ و متفقہ آواز ہے! وہ کہتے ہیں کہ:

"وہ لوگ ایک ناقابل تلافی نقصان اور غلط دھوکے میں ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک صحیح اور سعادت بخش زندگی اور صلح و خیر کی راہ ہموار کرتا ہے!— واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت سے روکنے اور دور کرنے کا اس سے زیادہ کوئی دانشمندانہ اور ماہرانہ طریقہ ایجاد نہیں کیا جا سکتا تھا—— افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ترقی پذیر ممالک، جو مسیحیت کے نور اور حریت سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے اور اس کے سایہ میں آگے بڑھ رہے تھے، اسلام نے نہ صرف انھیں پیچھے دھکیل دیا بلکہ اس کی "تاریکیوں" اور "ظلمتوں" کی ان پر پوری چھاپ پڑ گئی——"

پھر اسی رو میں ڈاکٹر گلوور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"وہ خالص ایک مشرقی تھے، جنہوں نے زبردستی اپنا تسلط قائم کیا ان کا یہ مشرقی تصور تھا کہ ایک بادشاہ کا یہ حق ہے کہ اپنی طبعی خواہشات کو جائز و ناجائز جس طریقہ سے بھی چاہے پورا کرے اور ان کا عزم تھا کہ وہ ہر اس انسان کے مقابلہ میں تلوار اٹھائیں گے جو ان کے خیال

سے موافقت نہیں رکھتا، ان کے سپاہی وحشیانہ توڑ پھوڑ اور تخریب و غارت گری کو اپنا اصول بنائے ہوئے تھے، اور ہر حال میں بس حریف پر غلبہ اور فتح کے پیاسے تھے، ان کے پیغمبر کی ہدایت تھی کہ وہ ہر اس شخص سے مقاتلہ و مبارزہ کریں جو ان کے طریقہ کا منکر ہو۔"

یہ افترا پردازی اور دروغ بیانی جس کی مثال ملنی بھی مشکل ہے ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جو کوئی بے پڑھا لکھا عامی آدمی یا ابن الوقت سیاسی لیڈر نہیں کہ اس کو لکھنے والے کی لاعلمی یا اس کی سیاسی مکاری پر محمول کر لیا جائے، بلکہ یہ اس بیسویں صدی کے ایک زبردست مشنری مدبر و ذمہ دار اور بین الاقوامی فارن مشن ایسوسی ایشن کے ممتاز زعیم و رہنما ڈاکٹر گلوور کے سوچے سمجھے ریمارکس ہیں جن کو انہوں نے اپنے عالمی سامعین و ناظرین کے سامنے بطور رپورٹ کے پیش کیا ہے جنہیں دیکھنے کے بعد بلا اختیار یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا ان کے نزدیک اس طرح کی ہرزہ سرائی افترا پردازی اور ذہنی پستی ہی اس جیسے دینی عہدہ اور مرتبہ کے لئے (جس کی طرف سے ڈاکٹر موصوف نمائندگی کر رہے ہیں) واجبی کوالیفکیشن تو نہیں ہے؟ -

ڈاکٹر گلوور خوب واقف ہوں گے، اور انھیں اگر علم و تاریخ سے ذرا بھی تعلق رہا ہے تو یقیناً ان کو معلوم ہو گا کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ خود یورپ کا اندرونی علمی و ذہنی ریکارڈ اس بات کو وضاحت کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ :

اسلام انسانی آزادی، اخوت، اور علم و ثقافت کا زبردست علمبردار ہے۔ اور اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ ڈاکٹر گلوور جیسا پڑھا لکھا آدمی اور PROGRESS OF WORLDWIDE MISSIONS جیسی ذمہ دارانہ کتاب کا مصنف ان چیزوں سے ناواقف ہو گا لیکن اگر خدانخواستہ اب تک ان کو اس کی توفیق نہیں ہو سکی ہے تو کم از کم اب انھیں ول ڈیورنٹ کی مشہور و معروف تصنیف AGE OF FAITH ایڈورڈ گبن

کی "DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE" اور جان ولیم ڈراپر کی "HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE" نیز ایچ، جی، ویلز کی "OUTLINE OF HISTORY" ضرور پڑھ لینی چاہیئے یہ صرف چند نام ان درجنوں معیاری مغربی مصنفوں میں سے ہیں جو اپنی مغربی عصبیت کے باوجود جو ان سب کا ایک مشترک فطری و قومی ورثہ ہے اپنی کتابوں میں اسلام کی لائی ہوئی واضح ہدایات اور ان کی ضوافشانی کی صاف صاف شہادت دیتے ہیں ہم ڈاکٹر گلوور اور ان جیسے لوگوں کی معلومات کے لئے یہاں صرف دو مصنفوں کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں، ہم یہ وضاحت مکرر کر دینا چاہتے ہیں کہ جن کے اقتباسات ہم یہاں دے رہے ہیں وہ کوئی اسلام کے بہی خواہ یا دکیل ہرگز نہیں بلکہ اس کے خلاف وہ مغربی عیسائی تہذیب کے مخلص حامی اور زبردست علمبردار ہیں، ـــ

ول ڈورنٹ "AGE OF FAITH" میں قرون اولیٰ میں اسلام کی اشاعت اور ترقی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"عدم تشدد اور رواداری کی پالیسی کے باوجود یا اس کے سبب سے اس نئے مذہب نے تھوڑی ہی مدت میں بہت سے عیسائیوں، تقریباً تمام زرتشتیوں نیز ایشیا، مصر اور شمالی افریقہ کے بہت سے یہودیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا......

رفتہ رفتہ ان ممالک کی غیر مسلم آبادی نے عربی زبان عربی لباس اور قرآنی قوانین وعقائد کو اختیار کر لیا، اور جہاں یونان اپنی ہزار سالہ حکومت کے باوجود ناکام ہو چکا تھا اور رومی فوجیں اپنے ملکی دیوتاؤں سے بیزار رہ کر انھیں چھوڑ چکی تھیں، اور "بیزنطینی قدامت پسندی" (BYZENTIN ORTHODOXY) کے خلاف ارتداد و انحراف کا ایک زبردست ہنگامہ کھڑا ہو چکا تھا دہاں محمد ازم یعنی اسلام تقریباً بغیر کسی جبر اور غیر معمولی تبلیغی جدوجہد کے صرف ایمان وعبادت ہی کی حد تک نہیں بلکہ انسانوں کے دلی اخلاص اور مکمل و مضبوط حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا

ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنے محبوب دیوتاؤں کو جنھیں وہ اللہ کا نائب سمجھتے تھے یکسر بھول جاتے ہیں، اسلام نے چین، انڈونیشیا، ہندوستان، فارس، عرب اور مصر سے لیکر مراکش اور اسپین تک کی سینکڑوں انواع و اقسام کے انسانوں کی نفسیات کو ان کے قلب و ضمیر کی گہرائیوں میں چھو کر دیکھا اور پھر ان کے روحوں اور جسموں پر یکساں حکومت کی، اس نے انھیں تسلی بخش امید اور پائدار خود اعتمادی عطا کی، اور آج بھی تقریباً پینتیس کروڑ اس کے عشاق ذبعین ہیں جنھیں وہ ان کے مابین تمام سیاسی تفریقوں اور تقسیموں کے باوجود دینی اخوت و بھائی چارگی اور اسلامی خاندان کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر کے ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔"

"مشرق ادنیٰ کے یہودیوں نے عربوں کا اپنے آزاد کنندہ محسنین کی طرح خیر مقدم کیا، ...... وہ عربوں کی حکومت میں عیسائیوں کے برابر ہو کر رہے اور ایک مرتبہ انھیں پھر یہ آزادی ملی کہ وہ یروشلم (بیت المقدس) میں قیام اور عبادت کر سکیں، انھیں ایشیا، مصر اور اسپین میں (زندگی کے تمام میدانوں میں) وہ کامیابی اور ترقی حاصل ہوئی کہ عیسائی راج میں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی! ..... عرب کے باہر مغربی ایشیا کے عیسائی حسب سابق بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے مذہب پر عمل کرتے رہے، اور شام تو تیسری صدی ہجری تک بغیر کسی مزاحمت کے بڑی حد تک ایک عیسائی ملک رہا ...... خلیفہ مامون کے زمانہ (   ) میں ہمیں اسلامی حکومت میں گیارہ ہزار عیسائی چرچوں، سینکڑوں یہودی معبدوں اور مجوسی آتشکدوں کا پتہ چلتا ہے، عیسائی تقریبات اور میلے کھلم کھلا اور آزادی کے ساتھ منائے جاتے تھے اور عیسائی زائرین پورے امن و اطمینان کے ساتھ فلسطین میں اپنے مقدس مقامات کی زیارت

کے لیے جاتے تھے، نیز صلیبی مجاہدین جب بارہویں صدی عیسوی میں مشرق ادنیٰ پہونچے تو انہوں نے خاصی بڑی تعداد میں عیسائی خانوادوں کو پورے اطمینان کے ساتھ وہاں رہتے ہوئے دیکھا۔"

"اور "منحرف مسیحی" جن پر قسطنطنیہ، یروشلم، اسکندریہ اور انطاکیہ کے مسیحی پیشواؤں نے عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا، اب اسلامی حکومت میں وہ آزاد اور پرامن ہو گئے اور ان کے مذہبی جھگڑے بے معنی و بے بنیاد ثابت ہوئے ..... نویں صدی عیسوی میں انطاکیہ کی مسلمان حکومت نے چرچ پر ایک مخصوص محافظ دستہ مقرر کیا، عیسائی راہبوں اور راہباؤں کے کنیسے اور معابد (NONASTERIES AND NUNERIES) اموی حکمرانوں کے زمانہ میں چمکے، عرب حکمراں عیسائی راہبوں کی زراعتی ترقیات اور احیاء موات (بنجر زمین کو قابل کاشت بنانا) کے سلسلہ کی کوششوں کی قدر کرتے تھے اور اپنے سفروں میں وہ عیسائی معابد میں قیام اور وہاں کی مہمانی سے خوش ہوتے تھے، ایک زمانہ میں ان دونوں مذہبوں کے درمیان تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ ایک عیسائی سینہ پر صلیب لٹکائے اپنے مسلمان دوست سے مسجد میں جاکر بلا روک ٹوک ملاقات اور گفتگو کرتا تھا، مسلم حکومت کے انتظامیہ میں سینکڑوں عیسائی ملازمین مقرر تھے اور علی الاعلان وہ اتنے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کئے جاتے جس سے بعض اوقات عام مسلمانوں کو شکایت ہو جاتی، دمشق کے سینٹ جان کے والد سرجیس (SERGIUS) عبدالملک کے چیف وزیر مالیات تھے اور کنیسہ کا آخری یونانی "فادر" سینٹ جان خود اس راجیہ سبھا کی صدارت کرتا تھا جس کے ہاتھ میں دمشق حکومت کی باگ تھی۔" (ص ۲۱۸ تا ۲۱۹)

"جب ساتویں صدی عیسوی کا عرب میں فاتحین مصر اور مشرق ادنیٰ کی طرف بڑھے تو وہاں کی نصف آبادی نے بڑھ کر اس حیثیت سے ان کا خیر مقدم

کیا، کہ انھوں نے بیز نطینی عیسائی حکومت کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی مظالم سے انھیں آزاد کرایا اور نجات دلائی۔"

چوتھی صدی عیسوی کے وسط سے اب تک کے کینسہ کے موقف کے بارے میں وِلڈ ڈرنٹ کا بیان، گو مختصر ہے مگر خاصا واضح ہے، وہ کہتا ہے کہ:

"ایک مرتبہ فتح حاصل ہونے کے بعد کلیسا عدم تشدد اور رواداری کا وعظ کہنا اور اس کی دعوت دینا بند کر دیتا تھا۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بے ادب و گستاخ نا قدا تیچ، جی، ویلز تک نے بھی اپنی کتاب OUT LINE of HISTORY میں تسلیم کیا ہے کہ:

"اسلام نے دنیا میں اچھے تعامل کی ایک عظیم روایت قائم کی اور پھیلے ہوئے ظلم و استبداد اور سماجی انارکی سے بہت آزاد اور دور ایک ایسے معاشرہ کو وجود دیا جس کے مثل اعلیٰ و ارفع معاشرہ اس سے پہلے دنیا نے نہیں دیکھا تھا ــــ"

نیز لکھتا ہے: کہ

"اسلام نے اپنے جمہور صحابیین سے ان کے وجدان وضمیر کو ٹٹولنے کے بعد جو اپیل کی اور جس بات کی دعوت دی وہ یہ تھی کہ "اللہ سچائی اور انصاف والا ہے" ــــ اور بلا شبہ اس عقیدہ اور فکر کی ایماندارانہ تصدیق نے اس وہم و شک، نفاق اور تفریقات کی دنیا میں اللہ والوں اور امانت دار انسانوں کے لئے باہمی اخوت و بھائی چارگی کا راستہ ہموار کر دیا ...... اسلام نے دلوں پر اور دماغوں پر قبضہ کر لیا کیونکہ وہ سب سے اچھا سماجی اور سیاسی نظام تھا جسے زمانہ پیش کر سکتا تھا، اور یہ اس لیے بھی ہوا کہ اس نے ہر طرف سیاسی طور پر مغلوب و لاچار مظلوم اور ستائی ہوئی ان پڑھ اور غیر منظم و غیر متمدن قومیں اور بے حس، خود غرض اور بیرحم حکومتیں پائیں جن کا پبلک سے کوئی ربط نہیں تھا، برخلاف اس کے

اسلام ان سب فکروں میں جو اب تک دنیا کے تجربہ میں آچکے تھے
سب سے زیادہ اپٹوڈیٹ، اور پاکیزہ سیاسی فکر تھا۔"

اسلام کے ناقابل انکار اور بے مثل سماجی، علمی اور ثقافتی اضافوں اور اس کی بخششوں کے بارے میں اس طرح کی بیسیوں شہادتیں اور بیانات کوٹ کئے جاسکتے ہیں، یقین ہے کہ ڈاکٹر گلودر خود بھی مسلمانوں کی اس ثقافتی برتری سے ناواقف نہ ہوں گے جس کی وجہ سے مسلم عالمی قیادت تاریخ کے ایک لمبے اور مسلسل عرصہ میں ممتاز اور نمایاں رہی اور اسی وجہ سے غیر مسلم ناقدین نے بھی اپنی اسلام دشمنی اور قومی و مذہبی عصبیت کے باوجود اسلام کے اس اضافہ اور تفوق کا اقرار کیا ہے،

اور اگرچہ ــــ جیسا کہ ایچ ویلز کا بیان ہے ــــ آرام طلبی اور عیش پرستی کے آجانے کے بعد جس نے عربوں کی ذکاوت اور قوت ارادی کو مفلوج کر دیا ان کی وہ عظمت اور دوسروں پر اثر اندازی باقی نہیں رہی اور وہ خود اپنے ہاتھوں تباہ ہوئے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بقیہ دنیا اپنے ٹکنیکل جوش، مادی ترقی اور سماجی آزادی کے باوجود اب تک مسلمانوں کے قائم کئے ہوئے انسانی مساوات اور ترقی پذیر کلچر کے حامل اس بہترین غیر طبقاتی نظام کے برابر تو کیا عشر عشیر بھی لانے سے قاصر ہے۔

ڈاکٹر گلودر اور ان جیسی مسموم ذہنیت رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ اس تاریخی حقیقت سے بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ انسانی تاریخ میں بار بار غیر متمدن جنگجو قوموں نے ان تہذیبوں کو تباہ کیا ہے جو دولت کی فراوانی کے باعث آرام طلب اور عیش پسند ہوگئی تھیں اسی تاریخی تجربہ کے مطابق تاتاریوں نے اس وقت کی مسلم تہذیب کے مرکز بغداد کو بلکہ گویا پوری اسلامی قلمرو کو تباہ کیا اور مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں لیکن آخر میں اسلام کے اصول اور تعلیمات سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ فاتح ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے کو اس مفتوح اسلامی تہذیب کا غلام بنا دیا ــــ اور

ع
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

کیا ڈاکٹر گلوور بتا سکتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے سوا کسی اور مذہب
اور تہذیب کے ساتھ کبھی کیا یہ واقعہ پیش آیا ہو کہ اس کے فاتحوں نے اس کی
غلامی قبول کی ہو۔

دیگر اداروں کی خاص مطبوعات

قرآنی علوم

تفسیر ابن کثیر (اردو) پانچ ضخیم جلدوں میں
مکمل سٹ -/-/۵۵

درس قرآن :- قرآن پاک کی عام فہم تفسیر، ترجمہ تحت اللفظ و با محاورہ
ایک ایک صفحے کے درس کی شکل میں
جلد اول (منزل اول) -/-/۱
جلد دوم (منزل دوم) -/-/۱
جلد سوم (منزل سوم) -/-/۱

قصص القرآن (مکمل)
از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
جلد اول -/-/۸
جلد دوم -/-/۴
جلد سوم -/-/۵
جلد چہارم -/-/۷
(مجلد میں فی جلد -/-/۱ کا اضافہ)

فہم قرآن :- از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی
قیمت مجلد -/-/۲

وحی الٰہی :- از مولانا اکبرآبادی
قیمت -/-/۴

قرآنی شخصیتیں :-
(از مولانا دریابادی)
قرآن پاک میں جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کا مختصر تحقیقی تعارف۔
قیمت -/۲۵/۲

حیوانات قرآنی (از مولانا دریابادی)
قرآن پاک میں مذکورہ حیوانات کا تفسیری تذکرہ۔ -/-/۲

جغرافیۂ قرآن :- قرآن میں مذکور مقامات و بلاد کا جغرافیائی تعارف
قیمت -/۲۵/۲

بشریت انبیاء :- مولانا (عبد الماجد دریابادی)
قرآن مجید سے انبیاء علیہم السلام کی بشریت کا قابل دید اثبات
قیمت -/۲۵/۲

قصص و مسائل :- از مولانا دریابادی
قیمت -/-/۲

تدوین قرآن :-
(از مولانا مناظر احسن گیلانی)
قیمت مجلد -/۵۰/۱

قرآن اور تعمیر سیرت :-
از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (ایم اے پی ایچ ڈی)
مجلد -/-/۶
غیر مجلد -/-/۵

قرآن اور تصوف :
از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (حیدرآباد)
قیمت مجلد -/-/۳

رہنمائے قرآن :-
قیمت -/-/۱

لغات القرآن (کامل)
اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل و مبسوط تشریح (۶ جلدوں میں)

جلد اول -/-/۵	دوم -/-/۵
سوم -/۵۰/۴	چہارم -/-/۹
پنجم -/-/۶	ششم -/۵۰/۴

(مجلد میں فی جلد ایک اضافہ)

الفوز الکبیر (اردو)
اصول تفسیر پر شاہ ولی اللہ کے محققانہ رسالہ کا اردو ترجمہ
قیمت -/-/۱

علوم حدیث

بخاری شریف (اردو)
(تین مجلد جلدوں میں)
قیمت مکمل -/-/۲۵

موطا امام مالک (مترجم)
بخاری شریف سے بھی پہلا مستند مجموعۂ حدیث
قیمت مجلد -/-/۱۲

شمائل ترمذی (مع شرح خصائل نبوی)
از شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی
قیمت -/-/۶

مشکوٰۃ شریف
(اردو)
(دو ضخیم جلدوں میں)
قیمت مکمل مجلد -/-/۲۶

ترمذی شریف (اردو)
(۲ جلدوں میں)
قیمت مجلد -/-/۱۶

انتخاب صحاح ستہ (اردو)
(مع متن عربی)
قیمت -/-/۵

مشارق الانوار (مترجم)
بخاری اور مسلم کی ۲۲۴۲ قولی احادیث کا گرانقدر اور مقبول و معروف مجموعہ
قیمت مجلد -/-/۱۰

حصن حصین (مترجم)
(اردو اور عربی)
رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول دعاؤں کا مستند اور مقبول مجموعہ
قیمت مجلد -/-/۵

مختصر شعب الایمان (اردو)
از امام بیہقی
قیمت -/-/۱

مختصر خصائل نبوی :-
قیمت -/-/۱

بستان المحدثین :-
کتب حدیث کا تعارف اور ائمہ محدثین کا تذکرہ
از شاہ عبد العزیز صاحب
قیمت -/-/۵

صحیفۂ ہمام بن منبہ
ایک انمول اور تاریخی تحفہ
قیمت -/۵۰/۳

مسند حمیدیؒ۔ (۲ جلد)
امام بخاریؒ کے استاذ امام حمیدیؒ کا مرتب کیا ہوا احادیث کا مجموعہ۔ جو صحیح بخاری کا خاص مآخذ ہے
قیمت -/-/۱۸

ترجمان السنّہ:-
از حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی (مقیم مدینہ طیبہ)
جلد اوّل ——— -/-/۱۰
جلد دوم ——— [illegible]
جلد سوم ——— [illegible]
(ہر جلد میں نئی جلد [illegible])

علم الحدیث:-
(از مولانا عبداللہ العمادی)
قیمت ——— -/۱/۲۵

کتابت حدیث:-
مؤلفہ
مولانا سید منت اللہ شاہ رحمانی
قیمت مجلد ——— -/۱/۲۵

تدوین حدیث:-
از مولانا
(سید مناظر احسن گیلانیؒ)
تدوین حدیث کی نہایت مفصل و محققانہ تاریخ
جس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ——— کہ
احادیث کا جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقے پر پہنچا ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں
قیمت مجلد ——— -/۶/۵۰

تاریخ وسیرت

رحمۃ للعالمینؐ (کامل ۳ جلد)
(از قاضی محمد سلیمان منصور پوری)
قیمت ——— -/-/۲۰

النبی الخاتمؐ:-
سیرت نبوی پر مولانا گیلانیؒ کی قابل دید کتاب
قیمت ——— -/۳/۷۵

اسلام (آغاز و ارتقاء):-
ترجمہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی
قیمت ——— -/-/۹

رحمت عالمؐ:-
علامہ سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے
قیمت ——— -/۱/۷۵

اصح السیر:-
مولانا عبدالرؤف دانا پوریؒ کی نہایت مستند و معتبر سیرت نبویؐ۔
قیمت -/-/۱۰

مقالاتِ سیرت:-
از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے (پی ایچ ڈی)
یہ سیرت محمدیؐ پر آٹھ گرانقدر مقالوں کا مجموعہ ہے
جن کو
مولانا سید ابو الحسن ندوی نے اپنے مقدمہ میں دل کھول کر دادِ تحسین پیش کی ہے!
قیمت مجلد ——— -/۴/۵۰

عہد نبویؐ کے میدان جنگ
از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب
جس میں غزوات نبویؐ پر حرب (جنگی سائنس) کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے متعدد جنگی میدانوں کے نقشے بھی شامل کتاب ہیں
قیمت ——— -/۱/۵۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات
یعنی شاہانِ عالم، عرب کے حکمرانوں و قبائلی سرداروں سے آپؐ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات
از سید محبوب رضوی
قیمت ——— -/۲/۲۵

صدّیق اکبرؓ:-
از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی
صدر شعبۂ دینیات
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)
قیمت ——— -/-/۸

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے (اوّل) سرکاری خطوط
اسلامی تاریخ کا ایک نادر باب اور ایک بیش بہا دستاویز!
جسے ایک ریسرچ اسکالر نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے
۴۰۰ سے اوپر خطوط، ایک حصہ میں خالص اردو اور دوسرے حصہ میں عربی متن۔ ہر قیمت پر خریدنے کے لائق
قیمت مجلد ——— -/-/۱۲
غیر مجلد ——— -/-/۱۱

حضرت ابو بکرؓ کے سرکاری خطوط
"حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط" کے بعد اُن مرتب کی دوسری قابل قدر پیشکش اسی طرز پر۔
قیمت مجلد ——— -/-/۵

حضرت ابو بکرؓ و فاروق اعظمؓ
از (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)
قیمت مجلد ——— -/-/۸
دونوں ایک جلد میں -/۹/۵

تاریخ الخلفاءؓ۔ از علامہ سیوطیؒ
مترجمہ۔ اقبال الدین احمد
خلفائے راشدینؓ سے مصر کے فاطمی خلفاء تک کے دور کی مکمل تاریخ
قیمت ——— -/-/۱۲

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی
(از مولانا گیلانیؒ)
قیمت مجلد ——— -/-/۱۲

امام ابو حنیفہؒ اور ان کی تدوین قانون اسلامی
(از ڈاکٹر حمید اللہ)
قیمت ——— -/۶۲/-

ائمۂ اربعہ:-
(از رئیس احمد جعفری)
چاروں اماموں کی سوانح حیات اور اجتہادی خدمات
قیمت مجلد ——— -/-/۱۰

سیرۃ النعمان:-
قیمت مجلد ——— -/-/۴
غیر مجلد ——— -/-/۳